سرپرست

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

مدیر

خلیل الرحمٰن سجاد ندوی

قیمت 5-50

جنوری ۱۹۹۲ء مطابق جمادی الاخری ۱۴۱۲ھ

جلد ... ۶۰ — شمارہ ... ۱

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

مدیر	سرپرست
خلیل الرحمٰن سجّاد ندوی	حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

قیمت :- ۵/۵۰

سالانہ چندہ

	عام خریداری	اعزازی	لائف ممبری
ہندوستان	۶۰/-	۱۲۰/-	۲۰ سال کا عام خریداری زرتعاون
پاکستان	۱۲۰/-	۲۴۰/-	" "
دیگر ممالک ذریعہ ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر	۵۰ ڈالر	" "
" " بحری ڈاک	۱۵ "	۳۰ "	" "

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :- ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور

برطانیہ میں ترسیل زر کا پتہ :- MR. RAZI, 90-B, HANLEY ROAD
LONDON N4 3DW

فہرست

نمبر شمار	فہرست مضامین	مضامین نگار	صفحہ نمبر
۱	نگاہ اولیں	مدیر	۳
۲	معارف الحدیث	حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ	۵
۳	کیا قمری مہینوں کے اثبات میں علم ہئیت سے مدد لی جاسکتی ہے۔	مولانا محمد برہان الدین سنبھلی	۱۴
۴	تقویۃ الایمان اور شاہ محمد اسمٰعیل کے خلاف برپا شورش تاریخ وحقیقت کے آئینے میں (قسط ۵)	مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی	۲۷
۵	احادیثِ عذابِ قبر کا عقیدہ "غیر اسلامی تصور" ہے۔ (تیسری قسط)	مولانا محمد شعیب اللہ خاں مفتاحی	۳۷
۶	الفرقان کی ڈاک	مدیر	۴۶

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کیلئے سالانہ چندہ فوراً ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا اطلاع مہینے کے آخر تک موصول نہ ہونے کی صورت میں اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی روانہ کیا جائے گا۔

ہمارا پتہ: منیجر ماہنامہ الفرقان نظیر آباد (۳۱۔ نیا گاؤں مغربی) لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸ (یو، پی الہند)

محمد حسان نعمانی پرنٹر و پبلشر نے اسکائی لائن پرنٹرس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہ اولیں

مدیر

الفرقان کی عمر کے ۵۹ سال پورے ہوئے اور اس شمارہ سے ۶۰ ویں جلد کا آغاز ہو رہا ہے — ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں پر اس عرصہ میں جو حالات گذرے ہیں، اور جن سازشوں اور آزمائشوں کا انھیں مسلسل سامنا ہے، انکے دیکھتے ہوئے وہ تمام کوششیں جن سے کسی درجہ میں بھی مسلمانوں کو یا انکے کسی حلقہ کو دینی، فکری، علمی، اخلاقی، کسی بھی حیثیت سے کچھ فائدہ پہنچا ہو، بلاشبہ قابلِ قدر ہیں، اور انھیں مجموعی طور پر اللہ تعالیٰ کی توفیق وعنایت کا کرشمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

الفرقان سے بھی اگر اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کی کچھ خدمت لی ہے تو یہ بھی اسی کا فضل وکرم اور اسی کی توفیق ہے، اور اسی سے قبولیت کی بھی دعا ہے، اور عفو ودرگذر کی بھی۔

گذشتہ چند ماہ قبل الفرقان کے موجودہ حالات کا تذکرہ کیا گیا تھا، اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ بہت سے لوگوں نے اس کیلئے توسیع اشاعت کی کوشش شروع کردی، کچھ لوگوں نے لائف ممبری یا عطیات کے ذریعہ تعاون کی راہ اختیار کی، لیکن ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ ہمارے بہت سے قارئین نے ہمیں الفرقان کے مضامین کے بارے میں اپنے خیالات اور تجویزوں سے آگاہ کیا۔ اپنی صاف صاف گذارشات کے جواب میں ہمیں اپنے بعض باذوق قارئین کی صاف صاف باتیں سن کر بہت لطف بھی آیا، اور ان سے بہت فائدہ بھی ہوا۔

بہت دن سے خود ہمیں الفرقان کے مضامین میں تنوع کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، ان مخلصانہ مشوروں سے مزید تقویت ہوئی، توفیق الٰہی شاملِ حال رہی تو انشاء اللہ آئندہ کچھ مہینوں میں ہمارے قارئین کو کچھ تبدیلی محسوس ہوگی۔

ایک فیصلہ تو ہم نے یہ کیا ہے کہ "الفرقان کی ڈاک" کے نام سے ایک مستقل کالم شروع کیا جائے جس میں ہم اپنے قارئین کے منتخب خطوط شائع کیا کریں گے۔ اس سلسلہ کا آغاز اسی شمارہ سے کیا جا رہا ہے۔

اس کالم کے تحت ہماری کوشش رہے گی کہ مختلف مسائل کے بارے میں ہمارے قارئین کے جو مختلف نقطہائے نظر ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں وہ پوری صراحت کے ساتھ اور بلاکم وکاست الفرقان کے پورے حلقہ تک پہنچ جائیں — ہو سکتا ہے کہ اس سے اس مشکل کا تھوڑا سا اندازہ ہمارے قارئین کو ہو جائے جس کا سامنا الفرقان

جیسے کسی رسالے کے مدیر کو کرنا پڑتا ہے، الفرقان کی ایک ذمہ داری تحریف و تبدیلی سے اس دین کی حفاظت ہے جس کی وجہ سے اسے ان فتنوں اور غلطیوں پر مسلسل نگاہ رکھنی پڑتی ہے جن کی زد براہ راست دین پر اور بنیادی عقائد پر پڑتی ہے، اور اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان انحرافات اور گمراہیوں سے عام مسلمانوں کو بچانے کیلئے صاف صاف گفتگو کی جائے جن سے ایک سیدھے سادھے مسلمان کا بچنا بعض حالات میں دشوار ہو جاتا ہے ــــ تاہم ہمیشہ اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ اس سلسلہ کی جو تحریریں الفرقان میں چھپیں ان کا انداز خیر خواہانہ اور لب و لہجہ ناصحانہ ہو، ان سے کوئی فرد یا فرقہ بے آبرو نہ ہو، کسی کی تضحیک یا کسی پر طعن و تشنیع نہ ہونے پائے

دوسری طرف الفرقان ربط ملت کا پرجوش داعی ہے، اسے الحمد للہ اس کا پورا احساس ہے کہ یہ وقت وہ ہے جبکہ پوری ملت اسلامیہ اسلام دشمنوں کے نرغے میں ہے چنانچہ اسکے مضامین و مشتملات کا زیادہ تر حصہ ملت کی مثبت ذہنی تربیت کے مقصد کیلئے وقف رہتا ہے، یہی حال ادارہ الفرقان کی تمام مطبوعات کا ہے۔

علاوہ ازیں الفرقان میں سیرت نبوی، صحابہ و تابعین اور اللہ کے صالح بندوں کی زندگیوں کے واقعات بھی پیش کئے جاتے رہتے ہیں، اسکے پڑھنے والوں میں علماء اور طلبہ بھی ہیں، لہذا اس میں علمی و فقہی مضامین بھی پیش کئے جاتے ہیں، وقتی مسائل اور حالاتِ حاضرہ کے تناظر میں مفید اور علمی معروضات بھی پیش کئے جاتے رہتے ہیں ــــ غرض کہ نہایت مختلف بلکہ متضاد ذہنی و فکری پس منظر، اور مختلف ضروریات رکھنے والے مجمع (AUDIENCE) کو مخاطب کرنے میں جو مشکل پیش آتی ہے، اسی قسم کی مشکل کا سامنا مستقل طور پر غریب مدیر الفرقان کو رہتا ہے، اور تقریباً ہر ماہ کے شمارہ کے بعد مختلف مضامین کے بارے میں قارئین کے بالکل مختلف قسم کے تبصرے موصول ہوتے رہتے ہیں۔ اور ایسا ہونا بالکل فطری بھی ہے اور بعض پہلوؤں سے نہایت مفید اور قابل قدر بھی۔

بہرحال یہ قصہ تو کسی اور وقت چھیڑنا ہے، اس وقت تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ "الفرقان کی ڈاک" کے تحت جو خطوط پیش کئے جاتے رہیں گے، انشاء اللہ اس سے محترم قارئین الفرقان کے مختلف خیالات و رجحانات کا اندازہ براہ راست ہوتا رہے گا ــــ ہمارے لئے یہ بات بالکل کافی ہے کہ ان سب بظاہر مختلف و متضاد آراء کے پیچھے اسلام اور امت کی خیر خواہی کے سوا کوئی اور جذبہ کارفرما نہیں ہے، فرق ہے تو اپنی اپنی ذہنی کیفیتوں کا جو ماحول تعلیم و تربیت، تجربوں اور مشغولیتوں کے اثر سے نشو و نما پاتی ہیں، اور جن کے درمیان قدرِ مشترک کو پالینے والا ہی اس اعتدال سے بہرہ ور ہو سکتا ہے جس کی تمنا سے کوئی دل خالی نہیں، پھر بھی وہ ہنوز اگر جنس نایاب نہیں تو جنس کمیاب ضرور ہے ؎

کلٌّ یدعی وصلاً بلیلیٰ ولیلیٰ لا تقر لھم بذاک

(باقی ص۳۶ پر)

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ

معارف الحدیث

کتاب المناقب والفضائل (۲۷)

فضائلِ اہلبیتِ نبوی: ازواجِ مطہرات اور ذریتِ طیبہ (۱)

یہ ایک حقیقت ہے جس میں کسی شک شبہ کی گنجائش نہیں کہ "اہل البیت" کا لفظ قرآن مجید میں ازواج مطہرات ہی کیلئے استعمال ہوا ہے، سورۃ الاحزاب کے چوتھے رکوع میں ازواج مطہرات کو کچھ خاص ہدایات دینے کے بعد فرمایا گیا ہے۔ "اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا" ـــــــ جس کا مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے پیغمبر کی بیویو! تم کو جو یہ خاص ہدایتیں دی گئیں ہیں ان سے اللہ کا مقصد تم کو زحمت و مشقت میں مبتلا کرنا نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ ان ہدایات سے یہ ہے کہ تم کو ہر قسم کی ظاہری و باطنی برائی اور گندگی سے مطہر اور پاک صاف کر دیا جائے" ـــــــ جو شخص عربی زبان کی کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے اس کو سورۂ احزاب کے اس پورے رکوع کے پڑھنے کے بعد اس میں کوئی شک شبہ نہیں ہوگا کہ یہاں "اہل البیت" کا لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات ہی کے لئے استعمال ہوا ہے ـــــــ لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ قرآن پر ایمان رکھنے والے ہم مسلمانوں کا حال آج یہ ہے کہ "اہل البیت" کا لفظ سن کر ہمارا ذہن ازواجِ مطہرات کی طرف بالکل نہیں جاتا بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہرا، اور ان کے شوہر حضرت علی مرتضیٰ، اور ان دونوں کی ذریّت (رضی اللہ عنہم) ہی کی طرف جاتا ہے۔

"اہل البیت" کا لفظ قرآن مجید میں سورۂ احزاب کے علاوہ صرف ایک جگہ اور سورۂ ہود کے چھٹے رکوع میں بھی آیا ہے، جہاں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب بڑھاپے کی اس عمر کو پہونچ گئے تھے جس میں عام قانونِ فطرت کے مطابق اولاد کی امید نہیں کی جاسکتی، اور لاولد تھے، تب اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے فرشتوں کی ایک جماعت نے آکر انھیں اور ان کی زوجۂ محترمہ حضرت سارہ کو ایک بیٹے کے تولد کی بشارت دی، حضرت سارہ نے ازراہِ تعجب کہا: "أَأَلِدُ وَأَنَا عَجُوزٌ وَّهٰذَا بَعْلِي شَيْخًا" ــــ (میں خود بڑھیا اور میرے یہ میاں بھی بوڑھے تو اب کیا میں بچہ جنوں گی؟) ــــ اس کے جواب میں فرشتوں نے کہا: أَتَعْجَبِيْنَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ إِنَّهُ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ــــ (محترمہ! کیا آپ اللہ کے تکوینی حکم کے بارے میں تعجب کرتی ہیں، آپ "اَهْلُ الْبَيْت" پر تو اللہ تعالیٰ کی خاص رحمتیں اور برکتیں ہیں) ــــ ظاہر ہے کہ اس آیت میں بھی "اَهْلُ الْبَيْت" سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجۂ محترمہ حضرت سارہ ہی کو مخاطب کیا گیا ہے۔

عربی زبان و محاورات سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ کسی شخص کے "اَهْلُ الْبَيْت" کا اولیں مصداق اس کی بیوی ہی ہوتی ہے، اسی طرح فارسی میں "اہل خانہ" اور اُردو میں "گھر والے" یا "گھر والی" بیوی ہی کو کہا جاتا ہے، ماں، بہن، بیٹی اور داماد اور ان کی اولاد کے لئے "اَهْلُ الْبَيْت" اور "اہلِ خانہ" اور "گھر والوں" کا لفظ استعمال نہیں ہوتا، الغرض اس میں شک شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ "اہل البیت" کا لفظ قرآن مجید میں ازواجِ مطہرات ہی کے لئے استعمال ہوا ہے اور وہی اس کی اولیں مصداق ہیں ــــ البتہ یہ بات حدیث شریف سے ثابت ہے کہ جب سورۂ احزاب کی مندرجہ بالا آیت: "إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا" نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہرا، اور ان کے دونوں صاحبزادوں حضرت حسن اور حضرت حسین اور ان کے ساتھ ان کے شوہر اور اپنے چچازاد بھائی حضرت علی مرتضیٰ

(رضی اللہ عنہم اجمعین) کو ایک کملی میں اپنے ساتھ لیکر دعاء فرمائی: " اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اَھْلُ بَیْتِیْ فَاَذْھِبْ عَنْھُمُ الرِّجْسَ وَطَھِّرْھُمْ تَطْھِیْرًا" ــــــ (اے اللہ! یہ بھی میرے اہلِ بیت ہیں ان سے بھی ہر طرح کی برائی اور گندگی کو دور فرما دے اور ان کو مکمل طور سے مطہّر و پاک صاف فرما دے) ــــــ بلاشبہ حضورؐ کی یہ دعا قبول ہوئی اور سورۂ احزاب والی آیت میں ازواج مطہرات کا " اَھْلُ الْبَیْتِ " کے لفظ سے ذکر فرما کر ان پر اللہ تعالیٰ کے جس خاص انعام کا ذکر فرمایا گیا تھا، اُس میں اور لفظ " اہل البیت " کے اطلاق میں یہ حضرات بھی شامل ہو گئے، اس بنیاد پر یہ حضرات بھی لفظ " اہل البیت " کا صحیح مصداق ہیں لیکن جیسا کہ تفصیل سے عرض کیا جا چکا، قرآن مجید میں یہ لفظ ازواجِ مطہرات ہی کے لئے استعمال ہوا ہے، اور وہی اس کی اولین مصداق ہیں۔

الغرض یہ بات کہ ازواجِ مطہرات آپ کے اہلِ بیت میں سے نہیں ہیں بلکہ اس لفظ کا مصداق صرف آپ کی ایک بیٹی، ایک داماد، اور دو نواسے ہیں، نہ تو زبان کے لحاظ سے درست ہے نہ قرآن و حدیث سے ثابت ــــــ بلکہ ایک خاص فرقہ کے فنکاروں کی سازش کے نتیجہ میں اس غلطی نے اُمّت میں عرفِ عام کی حیثیت اختیار کر لی، اور ہماری سادہ دلی کی وجہ سے اس طرح کی بہت سی دوسری غلط باتوں کی طرح اس کو بھی قبولِ عام حاصل ہو گیا، اور جیسا کہ عرض کیا گیا حالت یہ ہو گئی کہ " اہلِ بیت " کا لفظ سن کر ہمارے اچھے پڑھے لکھوں کا ذہن بھی ازواجِ مطہرات کی طرف نہیں جاتا جو قرآن مجید کی رو سے اس لفظ کی اولین مصداق ہیں۔

اب اس عاجز نے لفظ " اہل البیت " کے صحیح مفہوم کو امت میں رائج کرنے کی نیت سے " اہلِ بیتِ نبوی " کے عنوان کے تحت ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات اور آپ کی ذرّیتِ طیبہ دونوں کے فضائل و مناقب لکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔

وَاللّٰہُ الْمُوَفِّقُ وَھُوَ الْمُسْتَعَانُ۔

اَزْوَاجِ مطہّرات

جیسا کہ حدیث وسیرت کی مستند روایات سے معلوم ہوتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات جو منکوحہ بیوی کی حیثیت سے آپ کے ساتھ تھوڑی یا زیادہ مدت رہیں، وہ کُل گیارہ ۱۱ ہیں، اُن کے اسماءِ گرامی یہ ہیں :-

۱. حضرت خدیجہ بنتِ خویلد۔ ۲. حضرت سودہ بنت زمعہ۔ ۳. حضرت عائشہ صدیقہ
۴. حضرت حفصہ بنت عمر بن الخطاب۔ ۵. حضرت زینب بنت خزیمہ۔ ۶. حضرت امّ سلمہ
۷. حضرت زینب بنت جحش ۸. حضرت امّ حبیبہ۔ ۹. حضرت جویریہ بنت الحارث
۱۰. حضرت صفیہ بنت حُیَیّ بن اخطب۔ ۱۱. حضرت میمونہ (رضی اللہ عنہن وارضاہن)

ان میں سے حضرت خدیجہؓ اور حضرت زینب بنتِ خزیمہؓ نے حضورؐ کی حیات میں وفات پائی۔

ان گیارہ ۱۱ کے علاوہ بنو قریظہ میں سے ریحانہ بنت شمعون کے متعلق بھی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود بنی قریظہ کی غداری کی وجہ سے ان کے خلاف کارروائی کی، اور ان کی بقایا کو گرفتار کیا گیا تو اُن میں یہ ریحانہ بھی تھیں، انھوں نے اسلام قبول کرلیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کرکے اپنے نکاح میں لے لیا لیکن بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حضورؐ کی منکوحہ بیوی بننے کا شرف حاصل نہیں ہوا، بلکہ یہ باندی کی حیثیت سے آپ کے ساتھ رہیں، یہاں تک کہ حضورؐ کی وفات سے چند روز پہلے اور ایک روایت کے مطابق حجۃ الوداع سے واپس آنے کے بعد حضورؐ کی حیات ہی میں وفات پاگئیں۔

زوجیت کا شرف

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کا شرف بجائے خود یقیناً اعلیٰ درجہ کی فضیلت اور اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمت ہے، اور فرقِ مراتب کے باوجود یہ تمام ازواجِ مطہرات کو یکساں طور پر حاصل ہے، اسی طرح ازواج مطہرات کو جو خصوصی احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے گئے ہیں،

وہ بھی یکساں طور پر ان سبھی کیلئے ہیں، قرآن مجید میں "وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ" فرما کر ان کو تمام اہلِ ایمان کی مائیں قرار دیا گیا ہے۔ اسی بنیاد پر آپ کی وفات کے بعد آپ کے ہر اُمّتی اور ہر صاحبِ ایمان کے لئے ان میں سے کسی کے ساتھ نکاح کرنا ابدُ الآباد تک اسی طرح حرام قرار دیدیا گیا ہے جس طرح اپنی حقیقی ماں کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے۔

یہاں تک ازواجِ مطہرات کے صرف اسماءِ گرامی لکھے گئے ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کے شرف سے متعلق مختصراً کچھ اشارات کئے گئے ہیں، آگے انشاء اللہ ان اُمہات المومنین کا بقدرِ ضرورت تعارف، قابلِ ذکر خصوصی احوال و اوصاف، ان میں سے ہر ایک کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے کی تفصیل اور اس کے خاص اسباب و محرکات، نیز ان کی وفیات کا تذکرہ ناظرین کرام مطالعہ فرمائیں گے، اور انشاء اللہ ان سوالات و شبہات کا جواب بھی ان کو مل جائے گا، جو ازواجِ مطہرات کی تعداد کے بارے میں کچھ شیاطین الانس کی وسوسہ اندازی سے ان کے دلوں میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

امّ المومنین حضرت خدیجہ (رضی اللہ عنہا)

یہ پہلی خوش قسمت خاتون ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کے شرف سے مشرف ہوئیں، ان کے والد خویلد بن اسد مکہ کے ایک دولتمند اور معزز تاجر تھے، حضرت خدیجہؓ کی پہلی شادی ابو ہالہ تمیمی سے ہوئی تھی ان سے دو بیٹے (ہالہ اور ہند) پیدا ہوئے، کچھ مدت کے بعد ابو ہالہ کا انتقال ہو گیا تو ان کا دوسرا نکاح عتیق ابن عابد مخزومی سے ہوا، ان سے بھی ایک بیٹی پیدا ہوئی لیکن عتیق کی عمر نے بھی زیادہ وفا نہ کی ـــــ پھر جبکہ خدیجہ کی عمر قریباً ۳۵-۳۶ سال کی ہو گئی تھی، ان کے والد خویلد کا بھی انتقال ہو گیا، اب تجارتی کاروبار کی ذمہ داری خود حضرت خدیجہ کو سنبھالنی پڑی ـــــ مکہ میں رواج تھا کہ لوگ نفع میں مقررہ شرح سے شرکت کی بنیاد پر دوسرے لوگوں کے ذریعہ بھی تجارتی کاروبار کرتے تھے (جس کو فقہی اصطلاح میں "مضاربت" کہا جاتا ہے) اپنے والد اور شوہر کے انتقال کے بعد حضرت خدیجہؓ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معصومانہ سیرت، امانت و دیانت، صداقت شعاری و راست بازی

کا مکہ میں عام شہرہ تھا، یہاں تک کہ آپ "الامین" کے لقب سے معروف تھے اسی وجہ سے حضرت خدیجہؓ نے ایک دفعہ چاہا کہ آپ ان کا مال تجارت لیکر ملک شام جائیں اور پیشکش کی کہ منافع میں جتنا حصہ اب تک میں دوسروں کو دیتی رہی ہوں آپ کو اس سے دوگنا دونگی آپ نے اپنے چچا ابوطالب سے مشورہ کے بعد اس کو قبول فرمایا، خدیجہؓ نے اپنے غلام میسرہ کو بھی آپ کے ساتھ کر دیا، اس تجارتی سفر میں اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی برکت دی، اور پہلے جو نفع ان کو ہوا کرتا تھا اس سے دوگنا نفع ہوا، اس کے علاوہ حضرت خدیجہ کے غلام میسرہ نے آپ کے حسن اخلاق، معصومانہ سیرت کا تجربہ اور کچھ غیر معمولی خارق عادت کرامتی قسم کی باتوں کا بھی مشاہدہ کیا، واپس آنے پر ان کا تذکرہ میسرہ نے حضرت خدیجہؓ سے بھی کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکاح

حضرت خدیجہ ایک دولتمند شریف الطبع خاتون ہونے علاوہ ظاہری حسن وجمال، باطنی محاسن اخلاق، کردار کی بلندی، فیاضی اور پاکبازی جیسے اوصاف حمیدہ میں بھی ممتاز تھیں اسی بناء پر وہ طاہرہ کے لقب سے مشہور تھیں اسی وجہ سے قریش مکہ کے بہت سے معزز حضرات کی طرف سے ان کو نکاح کا پیغام دیا گیا لیکن دو شوہروں سے بیوہ ہو جانے کے باقی زندگی اسی طرح گذارنے کا ارادہ کر لیا تھا، اس لئے کسی کا پیغام قبول نہیں کیا۔۔۔ مگر میسرہ نے تجارتی سفر سے واپسی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اپنے تجربات اور مشاہدات بیان کئے تو خود ان کے دل میں آپ سے نکاح کی خواہش پیدا ہوئی، اور اس مقصد کیلئے ایک دوسری خاتون نفیسہ بنت اُمیّہ کو رازدارانہ طور پر آپ کے پاس بھیجا، نفیسہ کا بیان ہے کہ ۔۔۔ میں آپ کے پاس آئی اور کہا کہ "آپ نکاح کیوں نہیں کر لیتے؟ آپ نے فرمایا کہ میں نادار اور خالی ہاتھ ہوں کس طرح نکاح کر سکتا ہوں، میں نے کہا کہ اگر کوئی ایسی عورت آپ سے نکاح کرنے کی خواہشمند ہو جو ظاہری حسن وجمال اور طبعی شرافت کے علاوہ دولتمند بھی ہو اور آپ کی ضروریات کی کفایت کرنے پر بھی خوشدلی سے آمادہ ہو تو آپ اس سے نکاح کر لینا پسند کریں گے؟۔۔۔ آپ نے دریافت کیا کہ

ایسی کون خدا کی بندی ہو سکتی ہے؟ میں نے کہا: خدیجہ بنت خویلد — آپ نے اپنے چچا ابو طالب سے ذکر فرمایا، انھوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا تو آپ نے نفیسہ کو جواب دیدیا کہ اگر خدیجہ اسکے لئے آمادہ ہیں تو میں بھی راضی ہوں۔

نفیسہ نے آکر حضرت خدیجہ کو اس کی اطلاع دی، پھر خدیجہ نے نفیسہ ہی کے ذریعہ آپ کو بلوا کر براہِ راست بھی آپ سے بات کی، اس گفتگو ہی میں طے ہو گیا کہ آپ اپنے خاندان کے بزرگوں کو لیکر فلاں دن میرے یہاں آجائیں، چنانچہ آپ اپنے چچا ابو طالب اور دوسرے خاندانی بزرگوں کو لیکر جن میں حضرت حمزہ بھی تھے، خدیجہ کے گھر پہونچ گئے، انھوں نے بھی اپنے چچا عمرو ابن اسد کو بلوا لیا، اور قریش کے اس دور کے رواج کے مطابق انھیں کی ولایت میں نکاح ہو گیا، اس وقت آپ کی عمر پچیس سال تھی، اور حضرت خدیجہ کی چالیس سال، آپؐ کا یہ پہلا نکاح تھا جو بعثت سے قریباً پندرہ سال پہلے ہوا۔

اولاد

اس رشتہ ازدواج کے کچھ مدت بعد (ایک مشہور تاریخی روایت کے مطابق ۵ سال بعد) آپ کے پہلے صاحبزادے پیدا ہوئے، جن کا نام "قاسم" رکھا گیا، انھیں کے نام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کنیت "ابو القاسم" رکھی، ان کا صغر سنی ہی میں انتقال ہو گیا، ان کے بعد آپ کی سب سے بڑی صاحبزادی "زینب" پیدا ہوئیں، ان دونوں کی پیدائش آغاز نبوت سے پہلے ہی ہوئی، اس کے بعد ایک صاحبزادے پیدا ہوئے، ان کا نام عبد اللہ رکھا گیا، ان کی پیدائش دورِ نبوت میں ہوئی اسی لئے ان کو طیب اور طاہر کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا انتقال بھی صغرِ سنی ہی میں ہو گیا، پھر ان کے بعد مسلسل تین صاحبزادیاں پیدا ہوئیں، جن کے نام رقیہ، ام کلثوم، اور فاطمہ رکھے گئے، چاروں صاحبزادیوں کا تذکرہ آگے "ذریت طیبہ" کے عنوان کے تحت ناظرین کرام ان شاء اللہ مطالعہ فرمائیں گے۔

حضرت خدیجہؓ کی بعض قابلِ ذکر خصوصیات

معلوم ہے کہ قریش کا قبیلہ بلکہ عام طور سے اہلِ مکہ بُت پرستی کے شرک میں مبتلا تھے، اور یہ شرک انھیں اتنا پیارا تھا کہ اس کے خلاف کوئی لفظ سننا بھی ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھا، لیکن جاہلیت کے اس دور میں گنتی کے دوچار آدمی ایسے بھی تھے جن کو فطری طور پر بت پرستی سے نفرت تھی، ان میں ایک حضرت خدیجہ بھی تھیں ــــ اس دور کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ واحد خاتون تھیں جو شرک وبت پرستی سے بیزار تھیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان پر دوسرے بہت سے انعامات کے علاوہ دولتمندی کی نعمت سے بھی نوازا تھا ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال اس کے برعکس تھا، انھوں نے اپنی پوری دولت گویا آپ کے قدموں میں ڈالدی، اور آپ کو اس سلسلہ کی فکروں سے آزاد کردیا، قرآن مجید سورۂ "والضحیٰ" میں اسی صورتحال کے بارے میں فرمایا گیا ہے "وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ" (اے پیغمبر! تم کو تمہارے پروردگار نے مفلس اور نادار پایا پھر مستغنی کردیا) ــــ اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ زید ابن حارثہ، حضرت خدیجہ کے زرخرید غلام تھے، انھوں نے دیکھا کہ زید کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص اُنس ومحبت ہے، اور آپ کا معاملہ بھی زید کے ساتھ خصوصی درجہ کی شفقت وپیار کا ہے، تو انھوں نے زید کو حضورؐ ہی کی ملکیت میں دیدیا، پھر آپؐ نے ان کو آزاد کردیا، اور عربوں کے اُس وقت کے رواج کے مطابق ..... ان کو اپنا "منھ بولا بیٹا" بنا لیا، یہاں تک کہ اُن کو زید ابن حارثہ کے بجائے زید ابن محمد ہی کہا جانے لگا۔

پھر جب نکاح کے پندرہ سال بعد اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شرفِ نبوت سے سرفراز فرمایا، اور آپ پر وہ شدید غیر معمولی حالات آئے جن کا ذکر بیانِ مناقب کے شروع ہی میں آغازِ نبوت والی حدیث کے حوالے سے کیا جاچکا ہے، تو اُس وقت آپ کو جس طرح کی دانشمندانہ و ہمدردانہ تسلی کی ضرورت تھی وہ اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق سے حضرت خدیجہ ہی سے ملی، اور جیب وہ آپ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو مکہ کی پوری آبادی میں ... صحیح العقیدہ

نصرانی اور توریت وانجیل کے عالم تھے، اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غارِ حرا کی واردات اور سرگذشت سنکر یقین و وثوق کے ساتھ آپ کے مبعوث من اللہ نبی ہونیکی بات کہی تو حضرت خدیجہ نے بھی انکی اس بات کو دل سے قبول کر لیا، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات واوصاف کے پندرہ سالہ تجربہ کی بنا پر پہلے ہی سے ان کا دل آپ کی ہر بات کی تصدیق کیلئے تیار ہوچکا تھا، اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ پوری اُمّت میں وہ سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث من اللہ نبی ہونے کی تصدیق کرنیوالی ہیں۔

پھر جب آپ نے بحکم خداوندی توحید اور دینِ حق کی دعوت کا کام شروع کیا تو پوری قوم آپ کی دشمن بنکر کھڑی ہوگئی، ہر ممکن طریقہ سے آپ کو ستانا برسوں تک ان بدنصیبوں کا محبوب ترین مشغلہ رہا، مظلومیت کے اس پورے دور میں حضرت خدیجہ نہ صرف آپ کی غمخوار و غمگسار بلکہ پوری طرح شریکِ حال رہیں، یہاں تک کہ جب ان ظالموں نے مکہ کی قریباً پوری آبادی کو اپنے ساتھ لیکر آپ کا اور آپ کے خاندان بنو ہاشم کے اُن تمام لوگوں کا بھی جنھوں نے اگرچہ آپ کی دعوتِ اسلام کو قبول نہیں کیا تھا لیکن نسبی اور قرابتی تعلق کی وجہ سے آپ کی کسی درجہ میں حمایت کرتے تھے بائیکاٹ کرنیکا فیصلہ کیا، اور آپ اور آپ کے وہ قریبی رشتہ دار بھی شعب ابی طالب میں محصور کر دیئے گئے، اور ایسی ناکہ بندی کی گئی کہ کھانے پینے کی ضروریات بھی ان کو نہ پہونچ سکیں، یہاں تک کہ ان لوگوں کو کبھی کبھی درختوں کے پتے کھا کر گذارہ کرنا پڑا — اس حالت میں بھی حضرت خدیجہ شعب ابی طالب میں آپ کے ساتھ رہیں، حالانکہ ان کے لئے بالکل ممکن تھا کہ وہ ان دنوں اپنے گھر ہی رہتیں۔

حضرت خدیجہ کے سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہ پورے پچیس سال تک آپ کی رفیقۂ حیات کی حیثیت سے آپ کے ساتھ رہیں، اور اس پورے دور میں آپ نے کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا، نبوت کے دسویں سال ہجرت سے قریباً تین سال پہلے رمضان المبارک سنہ ۱۰ نبوی میں عمر کے ۶۵ ویں سال وفات پائی۔

اس وقت تک نہ تو نماز پنجگانہ فرض ہوئی تھی اور نہ نمازِ جنازہ کا حکم ہوا تھا، اس لئے ان کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کو اپنے مبارک ہاتھوں سے قبر میں اتارا، اور رحمتِ خداوندی کے سپرد کیا۔ (رضی اللہ عنہا وارضاھا)

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی
استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

کیا قمری مہینوں کے اثبات میں علم ہیئت سے مدد لی جا سکتی ہے

(۱)

ملیشیا کے خوبصورت ترین ساحلی شہر پینانگ (PENANG) میں سائنس یونیورسٹی کے ماہر علم ہیئت (ASTRNOMER) پروفیسر محمد الیاس صاحب (جنھوں نے امکان رویت کی بنیاد پر ایک عالمی قمری کلنڈر بھی مرتب و شائع کیا ہے) کی دعوت پر، مورخہ ۸ تا ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو "انٹرنیشنل کانفرنس برائے عالمی اسلامی کلنڈر" —— اعلیٰ پیمانہ اور بہترین انتظامات کے ساتھ —— منعقد ہوئی جس میں ۲۵ ملکوں —— امریکہ، یورپ، کینیڈا، آسٹریلیا، عرب ممالک اور برصغیر ہند و پاک، بنگلہ دیش وغیرہ —— کے ۱۰۰ سے زیادہ ماہرین فن اور علماء شریک ہوئے اس میں یہ مقالہ (عربی میں) صاحب مقالہ نے پڑھا (اس کا انگریزی ترجمہ تمام شرکاء میں تقسیم کر دیا گیا تھا) جسے غیر معمولی اہمیت دی گئی، وہاں کے سب سے بڑے انگریزی اخبار (NEW STRAITS TIMES) نے نمایاں طور پر شائع کیا اور کانفرنس کا رخ متعین کرنے میں مؤثر ثابت ہوا، ذیل میں اس کا اردو ترجمہ —— قدرے اختصار کے ساتھ —— پیش کیا جا رہا ہے۔

جدید وسائل راحت اور اسباب آسائش کی فراہمی اور فراوانی نے جہاں زندگی کو پر راحت بنا دیا ہے وہیں بعض مسائل پیدا اور ذہنی انتشار کے اسباب بھی مہیا کئے ہیں، ان وسائل و اسباب میں خبر رسانی کے جدید ذرائع، رصد گاہوں کا قیام اور ان کی فراہم کردہ اطلاعات بھی ہیں، یہ چیزیں اپنے

اندر بہت سے مفید پہلو رکھنے کے ساتھ بعض دوسرے اثرات مرتّب کرنے کا سبب بھی بنتی ہیں، مثلاً کسی جگہ چاند ہو جانے کی ریڈیو کے ذریعہ موصول ہونے والی خبر (بالخصوص عید کے چاند کی خبر) جہاں پہنچتی ہے ـــ اور کہاں نہیں پہنچتی ؟ ـــ وہاں ایک خاص قسم کا اثر چھوڑتی اور عموماً انتشار کا سبب بن جاتی ہے بلکہ یہی صورتِ حال رصد گاہوں کی طرف سے جاری کردہ ـــ چاند کے بارے میں ـــ اطلاعات کے نتیجہ میں بھی پیدا ہو جاتی ہے، حالانکہ چاند ـــ خواہ عید کا ہو یا رمضان کا، اس سے براہِ راست بہت سے احکام شرعیہ وابستہ ہیں، اسلئے ہونا تو یہ چاہیئے کہ جس طرح نماز، روزہ وغیرہ عبادات کے مسائل میں صرف شریعت کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اسی طرح چاند اور اس سے متعلق تمام امور میں بھی تنہا شرعی حکم کی طرف متوجہ ہوا جائے اور اسی سے راہنمائی حاصل کی جائے !

مہینوں کی آمد و رفت کے بارے میں شرعی اصول

اس بارے میں شریعت کی تعلیمات و ہدایات کیا ہیں ؟ یہ جاننے کے لئے راقم الحروف اپنی ہی ـــ ایک انیس ۱۹ سال پہلے لکھی ـــ تحریر کا نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہے :-

"اسلامی احکامات سے معمولی آگاہی رکھنے والوں پر بھی یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ اسلام تمام امور میں سادگی و بے تکلفی اور فطری طریقے اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے ـــ اور ہر ہمہ گیر مذہب کے لئے ایسا کرنا ضروری بھی ہے ـــ کیونکہ آلات اور فنی حسابات کے جاننے والے لوگوں اور اس سے متعلق ضروری چیزوں اور آلات کا ہر جگہ مہیا ہونا یقینی نہیں ہوتا ـــ اگر ان ـــ فنی اصول و آلات ـــ پر احکام شرعیہ کا دار و مدار ہوتا تو وہ بہت سے لوگوں بلکہ شاید اکثریت کے لئے ناقابلِ عمل ہو جاتے ـ یا طویل مدّت (آلات کی ایجاد کا زمانہ آنے تک) عمل نہ ہو سکتا ـ

اسلام ـــ جس کے مخاطب عرب و عجم، دیہاتی و شہری آبادیوں سے دور اور وسائلِ زندگی سے مہجور، صحرا نورد و بادیہ نشین اور خلا زو کوہ پیما (غرضیکہ ہر طرح اور ہر سطح کے لوگ ہیں) اس کے قوانین میں سب ہی کی رعایت کی گئی ہے، اس وجہ سے ہر عمل کا وہ طریقہ

بتایا گیا ہے جو سب کے لئے آسان ہو اور اس کی تعمیل "تکلیف مالا یطاق" کا مصداق نہ ہو — یہی وجہ ہے کہ شریعت کے وہ احکام جن کا تعلق خاص وقت سے ہے (مثلاً نماز) ان کیلئے سورج کے طلوع و غروب اور اسکے ڈھلنے کو معیار بنایا گیا ہے، اسی طرح خاص مہینوں سے وابستہ احکام کے لئے چاند کی رویت (کھلی آنکھوں سے نیا چاند بغیر کسی آلہ کی مدد کے — نظر آجانے) کو۔ چاند کے افق پر موجود ہونے کو نہیں — مدار حکم قرار دیا گیا، کیونکہ چاند سورج ہی روشنی کے وہ منارے ہیں جن کی تابانی وضیا پاشی — اور ان کے وجود — سے سارا عالم اور اس کا ہر گوشہ منوّر و روشن اور مستفید ہو رہا ہے نیز ان کا اثر ہر جگہ پہنچ رہا ہے — هو الذی جعل الشمس ضیاء والقمر نورا وقدره منازل لتعلموا عدد السنین والحساب ما خلق الله ذالك إلا بالحق (سورۃ یونس آیہ: ۵) چنانچہ رمضان و عید کی آمد و رفت کیلئے صحیح احادیث میں — وہی فطری اور سادہ اصول بتایا گیا ہے جو اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے — یعنی فنی چیزوں کی فراہمی، آلات رصدیہ اور علم حساب کی احتیاج کے بغیر یہ مسئلہ حل کیا جائے۔ اسی لئے حکم دیا گیا، "صوموا لرؤیته وأفطروا لرؤیته فإن أغمی علیکم فاقدروا له ثلاثین[ع]"، مطلب یہ ہے کہ چاند دیکھنے کیلئے دوربین اور دیگر آلات رصدیہ و قواعد حسابیہ سے مدد لینے کی ضرورت نہیں — اور نہ ان کے لئے کسی پریشانی میں مبتلا ہونے کی حاجت — بلکہ جب نیا چاند (۲۹ کو) نظر آجائے تب روزہ رکھنا شروع کردیا جائے (اگر رمضان کا چاند ہے) اور عید کرلی جائے (اگر عید کا مہینہ ہے) اگر چاند نظر نہ آئے تو تیس ۳۰ دن پورے کرلینے کے بعد اگلا دن اس ..... کے لئے خود ہی متعین ہے۔[۱]

---

[۱] "رویت ہلال کا مسئلہ" (بتغیر یسیر) از محمد برہان الدین سنبھلی۔

[ع] یہ حدیث صحیح مسلم ص ۳۴۷ ج ۱ (کتبخانہ رشیدیہ دہلی) میں ہے — بخاری شریف ص ۲۵۶ ج ۱ میں بھی اسی کے ہم معنی روایت ہے، اسی سے ملتے جلتے الفاظ دیگر احادیث میں بھی ملتے ہیں مثلاً "صوموا لرؤیته وأفطروا لرؤیته" — نیز — إذا رأیتموه فصوموا وإذا رأیتموه فأفطروا فإذا أغمی علیکم فاقدروا له ثلاثین۔ (بخاری ص ۲۵۶ ج ۱ ومسلم ص ۳۴۷ ج ۱)

مہینہ کی آمد نیا چاند دیکھنے پر موقوف ہے۔

مذکورہ بالا اقتباس کے اس پہلو پر خاص طور سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مہینہ کی آمد کے لئے چاند کی رویت (کھلی آنکھ سے دیکھ لئے جانے) پر موقوف رکھا ہے یعنی نئے چاند کا افق پر موجود ہونا، یا اسکے نظر آنے کے صرف عقلی امکان پر دارومدار نہیں رکھا ــــ یہ بات اگرچہ مذکورہ بالا حدیث کے الفاظ "فإن أغمي عليكم" سے بھی معلوم ہو رہی ہے کیونکہ اس تعبیر کا واضح مفہوم یہی ہے کہ ممکن ہے، چاند افق پر موجود ہو لیکن کسی رکاوٹ ــــ بادل یا گرد و غبار ــــ کی وجہ سے ۲۹ کو نظر نہیں آرہا ہے تو بھی شرعی حکم یہی ہے کہ تیس۳۰ دن پورے کر لینے کے بعد اگلا مہینہ شروع کیا جائے، لیکن سنن ابوداؤد و ترمذی میں جو الفاظِ حدیث ملتے ہیں ان سے یہ پہلو اور زیادہ واضح ــــ بلکہ متعین ــــ ہو جاتا ہے کہ اسکے علاوہ کسی اور معنیٰ کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی ـ (یہ اگلی بحث بھی راقم کی کتاب "رویت ہلال کا مسئلہ" سے ہی ماخوذ ہے)

سنن أبي داؤد میں ہے :-

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ... لا تصوموا حتى تروه ثم صوموا حتى تروه فإن حال دونه غمامة فأتموا العدة ثلاثين (ابوداؤد ص۳۱۵ ج۱ مطبع مجیدی کانپور) یعنی (رمضان کا) نیا چاند دیکھے بغیر روزہ نہ رکھو، پھر (رمضان کے مہینہ کی آمد کے بعد) برابر روزہ رکھتے رہو جب تک اگلا چاند (عید کا) نہ دیکھ لو ــــ اگر اسکے نظر آنے میں بادل حائل ہو جائے تو تیس۳۰ کی گنتی مکمل کر لو۔

اور ترمذی کی روایت یہ ہے :- (ص۱۰۷ ج۱ مکتبہ رحیمیہ ـ دیوبند)

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم .... صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته فإن حالت دونه غيابة فأكملوا ثلاثين يومًا۔ ترمذی کی روایت کا مفہوم بھی وہی ہے جو ابوداؤد والی حدیث کا ہے، البتہ ترمذی کے الفاظ ("غیابة") زیادہ عام ہیں

ان الفاظ کے اندر بادل، گرد و غبار وغیرہ سب ایسی چیزیں شامل ہیں جو چاند کے نظر آنے میں رکاوٹ بنیں [" غیایۃ " کی تشریح کے لئے دیکھئے مجمع البحار ج۴ ص۵۸ (دائرۃ المعارف حیدرآباد) اور" المنجد" مادہ " غی"]

ان الفاظِ حدیث سے اس کے علاوہ اور کوئی مفہوم نکل ہی نہیں سکتا کہ اگر چاند افق پر موجود بھی ہو مگر اسکے کھلی آنکھوں سے نظر آنے میں بادل یا اور کوئی چیز حائل ہو گئی ہو اور چاند نظر نہ آسکا ہو ـــ تو ایسی صورت میں بھی شریعت کا حکم یہی ہے کہ تیس ۳۰ دن پورے کرلئے جائیں اس سے یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مہینہ کی آمد و رفت کا دار و مدار ـــ شرعًا ـــ رویت ہلال پر یعنی چاند کے دیکھ لینے پر ہے اسکے افق پر موجود ہونے، یا امکان رویت پر نہیں ـــ اور اسی سے یہ بھی معلوم ـــ بلکہ ثابت ـــ ہو جاتا ہے کہ حسابی طریقہ یا آلات رصدیہ کے ذریعہ ثابت ہونے والا نیا چاند ـــ شرعی احکام کیلئے ـــ بنیاد نہیں بن سکتا، کیونکہ آلات اور حسابی قواعد کے ذریعہ ـــ زیادہ سے زیادہ ـــ نئے چاند کا امکان معلوم ہو سکتا ہے، جس کے لئے عمومًا فقہی کتابوں میں "تولید ہلال" یا "ولادت قمر" وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اور انگریزی میں اسے "نیو مون" (NEW MOON) کہا جاتا ہے درحقیقت چاند اپنی رفتار کے خاص مرحلے میں سورج کے بالکل محاذات میں آجاتا ہے (اس لئے یہ حالت "قران شمس و قمر" بھی کہلاتی ہے) اور چاند کا ظاہری وجود قطعًا چھپ جاتا ہے، گویا وہ سورج کے روشن جسمانی دائرہ کے اندر غائب ہو جاتا ہے، یہ کیفیت ۲ دو تین ۳ منٹ رہتی ہے اس کے بعد تدریجًا دونوں کے درمیان دوری ہوتی ہے تو پھر چاند کا ظاہری وجود نمایاں ہونے لگتا ہے اور تقریبًا بیس ۲۰ گھنٹہ بعد قابل رویت بن جاتا ہے ـــ ظاہر ہے کہ چاند کی مذکورہ بالا حالتیں ـــ ولادت سے لے کر قابلِ رویت ہونے تک ـــ شرعی احکام کے لحاظ سے ناقابلِ التفات ہیں البتہ جب رویت ثابت ہو جائے تب وہ مدار حکم بنے گی۔ اس سے پہلے نہیں، بتانے کی ضرورت نہیں کہ آلات اور حسابی قواعد، 'رویت' (آنکھ سے دیکھنے) کا کام نہیں کرسکتے

جس پر شرعی احکام موقوف ہیں ــــ یہ بات اگرچہ ـ احادیث بالا سے ــ بداہتہً اور صراحۃً ثابت و معلوم ہو رہی ہے کہ مزید کسی تائید کی ضرورت نہیں رہتی لیکن مزید اطمینان کے لئے یہاں ایک مشہور شامی فقیہہ علامہ ابن عابدینؒ ــــ صاحب ردالمختار ــ کا بیان نقل کیا جا رہا ہے :ـ

صرح بہ علماءنا من عدم الاعتماد على قول اهل النجوم في دخول رمضان لأن ذالك مبني على أن وجوب الصوم معلق برؤية الهلال لحديث "صوموا لرؤيته" وتوليد الهلال ليس مبنيا على الرؤية بل على قواعد فلكية وهي وإن كانت صحيحة في نفسها لكن إذا كانت ولادته في ليلة كذا فقد يرى فيها الهلال وقد لا يرى، والشارع علق الوجوب على الرؤية لا على الولادة	ہمارے علماء نے اس بات کی صراحت کردی ہے کہ رمضان (وغیرہ) کی آمد کے لئے ستاروں کی رفتار کے ماہرین کے قول پر اعتماد نہیں کیا جائے گا کیونکہ روزہ کا وجوب از روئے حدیث نبوی "صوموا لرؤیتہ" رمضان کا نیا چاند دیکھنے پر موقوف ہے جبکہ قران شمس و قمر (چاند کی ولادت) چاند دیکھنے پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ فلکی قواعد پر مبنی ہوتی ہے جو اگرچہ فی نفسہٖ صحیح ہیں لیکن کبھی ان قواعد کے مطابق چاند نظر آتا ہے کبھی نہیں آتا، حالانکہ چاند کی پیدائش پر شرعی حکم موقوف نہیں ہے بلکہ چاند نظر آنے پر شریعت نے وجوب صوم کو (روزہ کا وجوب) موقوف کیا ہے۔
(ص ۲۸۹ ج ۱ مکتبۂ نعمانیہ دیوبند)	

رویت کا پیشگی تعین ناممکن

جیسا کہ اوپر متعدد بار ذکر آیا "رویت ہلال" کا ثبوت آلات وحسابی قواعد سے نہیں ہوسکتا۔ اگرچہ مذکورہ بالا دلائل سے یہ حیثیت پوری طرح ثابت ومعلوم ہوجاتی ہے مگر خدا کی شان دیکھئے کہ اس کے علاوہ جدید ترین ذرائع معلومات سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، پاکستان کے ایک مشہور صاحب قلم عصری تعلیم یافتہ ضیاء الدین صاحب جن کے متعدد قابل قدر مقالات "رویت ہلال" کے موضوع پر شائع ہوچکے ہیں اور ان سب کا مجموعہ 'رسالہ' کی شکل میں لندن میں شائع ہوا ہے۔عہ موصوف نے یونیورسٹی آف لندن آبزرویٹری کے شعبۂ فزکس وعلوم فلکیات کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر سے اس موضوع پر خط وکتابت کرکے معلومات حاصل کیں، ڈائرکٹر مذکور نے جو اس کا جواب دیا اس کا خلاصہ — ضیاء الدین صاحب موصوف کے ہی الفاظ میں — یہاں مختصراً پیش کیا جارہا ہے:۔

"آپ (ضیاء صاحب) کے ..... استفسار کے متعلق کہ آیا رصدگاہی سائنسداں کوئی ایسا معیار قائم کرنے کے قابل ہوچکے ہیں جس سے نیا چاند نمودار ہونے والی شام کی یقینی پیش گوئی کی جاسکے، مجھے افسوس ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔"

آگے چل کر — ڈاکٹر صاحب — مزید لکھتے ہیں:۔

درحقیقت رویت ہلال کے متعلق کوئی بھی مفروضہ قائم نہیں کیا جاسکتا — مجھے افسوس ہے کہ میرے خیال میں کوئی ایسا سائنسی طریقہ نہیں ہے جس سے اس موقع پر اسلام کی ضروری شرائط (آنکھ سے نیا چاند دیکھنے کی بابت) پوری کی جاسکیں۔

("رویت ہلال" موجودہ دور میں ص ۱۵ از ضیاء الدین طبع لندن)

عہ پوری امت میں صرف چند حضرات ایسے گذرے ہیں جنکے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ وہ حسابی طریقہ سے بھی نئے چاند کے ثبوت کے قائل تھے، لیکن جمہور امت نے یہ قول — دلائل کثیرہ کی بنا پر — رد کردیا ہے تفصیل کے لئے دیکھئے حافظ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری ج ۴ ص ۱۰۴ نیز مرقاۃ ج ۴ ص ۲۴۴ شامی ج ۲ ص ۔۔ ہدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۲۲۵ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے "رویت ہلال کا مسئلہ" از:۔ محمد برہان الدین سنبھلی از ص ۳۰ تا ۴۴ (دوسرا ایڈیشن)

عہ رسالہ کا نام ہے "رویت ہلال" موجودہ دور میں" ملنے کا پتہ۔ 15 CALDERN ROAD - LONDON

ضیاء الدین صاحب نے اپنے اسی رسالے میں مشہور عالم رصدگاہ "گرین ویچ" کی سائنسی ریسرچ کونسل کے فلکیاتی قرطاس ۶ کا ترجمہ بھی دیا ہے۔ یہاں اس کا ایک حصہ نقل کیا جا رہا ہے:

"ہر ماہ نئے چاند کے پہلی مرتبہ نظر آنے والی تاریخوں کے متعلق پیش گوئی کرنا ممکن نہیں، کیونکہ ایسے کوئی قابلِ اعتماد اور مکمل طور پر مستند مشاہدات موجود نہیں ہوتے جنھیں ان شرائط کو متعین کرنے میں استعمال کیا جا سکے جو چاند کے اول بار نظر آجانے کے لئے کافی ہوں۔"

مزید لکھتے ہیں:۔

"یہ امر واضح ہے کہ "رویت ہلال کے متعلق کوئی بھی پیش گوئی غیر یقینی ہوتی ہے[1]۔"

ان سب تفصیلات کے پیش نظر، صادق و مصدوق (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشاد:۔

"انا امۃ امیۃ لا نکتب ولا نحسب الشھر ھکذا وھکذا مرۃ تسعا وعشرین ومرۃ ثلاثین" (بخاری ص۲۵۶ ج۱ و مسلم ص۳۴۷ ج۱)

کی معنویت و صداقت اور بھی زیادہ واضح و مدلل ہو جاتی ہے۔

حدیث بالا (انا امۃ امیۃ الخ) کا مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ (یعنی امتِ مسلمہ) عبادات و دیگر شرعی احکام کے لئے (مہینوں وغیرہ کی آمد و تعیین کے بارے میں) حساب و کتاب پر مدار رکھنے کے مکلف نہیں ہیں، اسی لئے شرعی حکم یہ ہے کہ اگر سادہ انداز میں چاند نظر آجائے تو انتیس ۲۹ دن کا مہینہ ہوگا ورنہ تیس ۳۰ روز کا۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحؒ نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ شریعت کے احکام کا مدار ظاہری امور (علامات) پر رکھا گیا ہے، فنی موشگافیوں اور حسابات پر نہیں رکھا گیا بلکہ شریعت نے تو حسابات وغیرہ پر (شرعی احکام کا) دار و مدار رکھنے کی کوششوں سے بھی روکا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغۃ ص۵۱ ج۲)

---

[1] ان دونوں تحریروں کی اصل کا عکس آگے (ضمیمہ ۱ و ۲) میں ملاحظہ کیجئے۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ حساب کی وہ صورت جس میں مشاہدہ کے درجہ کا یقین حاصل ہو جائے شرعاً قابلِ لحاظ ہے جیسا کہ حدیث کے مشہور شارح ابن بطال رحؒ نے کہا ہے:-

انما لنا أن ننظر فی علم الحساب ما یکون عیاناً أو کالعیان (عمدۃ القاری ج ۵ ص ۱۹۹)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

حساب کی بنیاد پر نئے چاند کی آمد درست سمجھنے والوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ "رویت" کے معنی "علم" کے بھی آتے ہیں لہٰذا اس حدیث (صوموا لرؤیتہ) کا یہ مطلب لینا صحیح ہے کہ "نئے چاند کا علم ہو جانے پر روزہ رکھو"۔ لیکن ایسا کہنے والے عربی زبان سے پوری واقفیت رکھتے نہیں معلوم ہوتے، کیونکہ "رویت" کا لفظ جب "علم" کے معنی میں آتا ہے تو وہ افعال قلوب میں ہوتا ہے جس کے بعد دو مفعولوں[ع] کا آنا (جو دراصل ایک پورا جملہ ہوتا ہے) ضروری ہوتا ہے، حالانکہ اس حدیث میں (صوموا لرؤیتہ" میں) ایک ہی مفعول آیا ہے علاوہ ازیں یہ کہ "نصوص" میں استعمال ہونے والے الفاظ کے وہی معانی و مفاہیم حجت ہیں جو قرن اول سے لے کر آج تک جمہور علماء نے لئے ہیں ـــ اگر ایسا نہ کیا گیا تو پھر "صلاۃ" و "صوم" جیسے الفاظ کے مصداقات بھی بآسانی بدلے جا سکتے ہیں۔ کہ "صلاۃ" بمعنی "دعا" اور "صوم" بمعنی "عدم تکلم" خود قرآن مجید میں مستعمل ہوئے ہیں تو کیا اس بنا پر یہ کہنا درست ہوگا کہ "نماز" "روزہ" کی جگہ بس "دعا" (پرارتھنا) اور "مون برت رکھنا" (خاموش رہنا) کافی ہوگا؟

ع یہ قاعدہ اگرچہ معروف ہے لیکن مزید اطمینان کے لئے ایک نہایت معتبر و مستند ادیب و محدث (علامہ بدر الدین عینیؒ شارح بخاری) کا حوالہ پیش کیا جاتا ہے، موصوف بخاری کی شرح عمدۃ القاری میں (باب قول اللہ ..... وکلوا واشربوا الخ" کی تفسیر میں وارد ایک حدیث کی تشریح کرتے ہوئے) لکھتے ہیں:-

"قولہ رؤیتھما" بضم الراء وسکون الهمزة ..... وهو من رأی بالعین ..... فیتعدی إلی مفعول واحد وإذا کان بمعنی العلم یتعدی إلی مفعولین (عمدۃ ج ۱ ص ۲۹۵، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ)

ایک شبہ اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال کا جواب دینا بھی مناسب معلوم ہو رہا ہے وہ یہ کہ جب نمازوں ـــ اور روزوں ـــ کے ابتدائی و انتہائی اوقات کی تحدید و تعیین کے لئے آلات و حسابی طریقے وضابطے (مثلاً گھڑیاں وجنتریاں) قابل اعتماد قرار دیئے جاتے ہیں تو رویت ہلال کے بارے میں انھیں قابلِ اعتناء کیوں نہیں سمجھا جاتا؟ اس کا ایک علمی جواب تو یہ ہے کہ نمازوں کے لئے اوقات "ظرف" ہیں اور روزہ کے لئے رمضان "معیار" ہے مطلب یہ ہے کہ فرض نماز کا وقت بہت وسیع ہوتا ہے کہ مسنون طریقے سے پڑھی جائے تو اس کا وقت کافی بچ جاتا ہے یعنی حسابی طریقہ سے وقت کی تحدید و تعیین کئے جانے کی صورت میں غلطی کے امکان کی تلافی کا خاصا موقعہ اور وقت ملتا ہے کہ (حسابی طریقہ سے معلوم ہونے والے وقت سے) کچھ مؤخر کرکے نماز پڑھی جائے اور پہلے ختم کر دی جائے ـــ لیکن رمضان المبارک سے روزہ کا تعلق ایسا نہیں ہے کہ احتیاطاً ـــ حسابی طریقہ سے رمضان کی آمد مان لینے کی صورت میں غلطی کے امکان کی تلافی کرنے کے لئے ـــ روزہ کو کچھ (مثلاً ایک دن) مؤخر یا مقدم کیا جا سکے، کیونکہ اس سے ترکِ فرض یا ارتکابِ حرام لازم آئیگا۔

علاوہ ازیں ـــ جیسا کہ اوپر معلوم ہوا ـــ رمضان المبارک وغیرہ کی آمد کا مدار شرعاً "رویت ہلال" (آنکھ سے چاند دیکھنے) پر ہے اور یہ (رویت) ایک خالص عملی چیز ہے ـــ حسابی یا نظریاتی نہیں ہے ـــ کیونکہ حساب یا آلات ـــ زیادہ سے زیادہ ـــ رویت کا امکان بتا سکتے ہیں ـــ رویت کے عملاً واقع ہونے نہ ہونے کی اطلاع نہیں دے سکتے ـــ اور اب تو اس کی تائید جدید ترین رصدگاہوں کے اعلیٰ ذمہ داروں و ماہرین کے اقوال سے بھی ہوگئی۔ (حوالے ابھی گذر چکے ہیں) اس کے برخلاف نماز، روزہ کے ابتدائی و انتہائی اوقات کا معاملہ ہے کہ وہ سورج کی حالتوں و اثرات پر موقوف ہے، جو ہر سال کی متعین تاریخوں میں مقررہ شکل ہی کے اندر ـــ یقینی طور سے ـ ظاہر و مرتب ہوتے ہیں ان میں تبدیلی نہیں ہوتی اس لئے ایک سال کے تجربات پوری عمر کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔

لیکن

اسلام کے فطری مذہب ہونے کا تقاضہ

ان سب باتوں کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اسلام کے فطری وطبعی مذہب ہونے اور شرعی احکام کے عقل سلیم کے مطابق ہونے کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ اس ..... میں کوئی بات ایسی نہ ہو جو فطرت صحیحہ اور عقل سلیم سے واقعۃً ٹکراتی ہو ـــــ جیسا کہ مشہور مالکی عالم اور اصول فقہ کی شہرہ آفاق کتاب "الموافقات" کے مصنف ابو اسحاق شاطبی نے ثابت کیا ہے، چنانچہ کتاب مذکور کا ایک عنوان یہ ہے "کل معنی لا یستقیم مع الاصول الشرعیہ أو القواعد العقلیۃ لا یعتمد علیہ" (الموافقات ج۱ فہرست ـــ دار المعرفۃ بیروت ـ لبنان اسی بنا پر یہ کہنا اور سمجھنا غالباً غلط نہ ہو گا کہ اگر بدیہی اور یقینی طور پر یہ ثابت ہو جائے کہ فلاں .. .. روز رویت کا عقلاً امکان نہیں ہے تو اس روز کی رویت ثابت ماننا خلافِ شریعت ہو گا۔

ایک ضروری بات

اس سے قبل یہ وضاحت ضروری ہے کہ عقل کے خلاف، یا عقل سے متصادم ہونا ایک بات ہے اور عقل سے بالاتر ہونا، یا سمجھ میں نہ آنا دوسری بات (شریعت کے کسی حکم کا عقل کے خلاف" نہ ہونا اوپر بیان ہوا ہے عقل سے بالاتر ہونے کی نفی نہیں کی گئی ہے) اسی کے ساتھ ـ اور اسی سے متعلق ـــ ایک اور ضروری امر کا ملحوظ رکھنا بھی ناگزیر ہے وہ یہ کہ کسی چیز کے عقل صریح اور بداہت کے خلاف ہونے کا فیصلہ کرنا بہت نازک کام ہے اس وجہ سے عوام اور (خاص طور پر) عقلیت زدہ لوگوں کو تو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس بارے میں کوئی فیصلہ دیں اور اسے معیار بنایا جائے اگر ایسا ہوا تو پھر شاید شریعت کے بہت کم احکام واوامر ایسے باقی بچیں گے جو "عقل" کی سان پر چڑھا کر "غیر معتدل" نہ قرار دیئے جا سکیں یا ان میں کتر بیونت کر کے انھیں مسخ کرنے کی کوشش

نہ کی جاسکے! بنابریں یہ بہت ضروری ہے کہ اس بارے میں فیصلہ کرنے کا حق تنہا ان حضرات کی جماعت کو — فرد کو نہیں — دیا جائے جو ایک طرف علم صحیح میں رسوخ رکھتے ہوں دوسری طرف انھیں عقل سلیم سے بھی حصۂ وافر ملا ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسئولیت عند اللہ اور آخرت کی جوابدہی کا صرف انھیں یقین ہو بلکہ ہر وقت اس کا استحضار رہتا ہو!

کسی محال بات پر شہادت کا حکم

یہ بات شرعاً بھی تسلیم شدہ ہے کہ عقلاً جو بات ناممکن ہو یعنی محالات کے قبیل سے ہو — اس پر کسی ثقہ شخص کی شہادت و روایت بھی معتبر نہیں ہوتی بلکہ ایسی شہادت نامقبول قرار دی جاتی ہے اسی بنا پر اصول حدیث کی تمام اہم اور معتبر کتابوں میں ایک اہم قاعدہ یہ بھی بنایا گیا ہے کہ "جو حدیث" عقل صریح" کے خلاف ہو وہ موضوع ہے" — مثلاً مشہور محدث و مصنف حافظ ابن حجر عسقلانی اصول حدیث کی معتبر ترین کتاب میں لکھتے ہیں:- "من القرائن التی یدرک بہا الوضع مایؤخذ من حال الراوی .... ومنہا مایوخذ من حال المروی کان یکون مناقضاً لنص القرآن والسنۃ المتواترۃ أو الاجماع القطعی او صریح العقل (شرح نخبہ ص۹)

اسی طرح ایک دوسرے کثیر التصانیف عالم علامہ سیوطیؒ نے اپنی مشہور کتاب "تدریب الراوی" میں نقل کیا ہے:- "ان من جملۃ دلائل الوضع أن یکون مخالفاً للعقل" (تدریب ص۱۷۶ ج۱) اور ایک جگہ یہ نقل کیا ہے:- "إذا رأیت الحدیث یباین العقول فاعلم أنہ موضوع (ایضاً ص۱۷۷ ج۱)

اس قاعدے کی روشنی میں بلا تکلف یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اگر کوئی ثقہ شخص نئے چاند دیکھنے کی گواہی ایسی صورت میں دیتا ہے جبکہ عقلاً رویت محال ہو تو اس کی گواہی رد کر دینی چاہیئے۔

فلکی حساب کی صحت کے دلائل

اہلِ فن (علم ہیئت کے ماہرین) کہتے ہیں کہ سورج، چاند کی رفتار کی بابت حساب قطعی

اور یقینی ہوتا ہے۔ اس بات کی فی الجملہ تائید قرآن مجید کی متعدد آیات سے بھی ہوتی لگتی ہے، مثلاً قرآن مجید میں ہے "وسخر الشمس والقمر کل یجری لأجل مسمیٰ" (سورۃ الرعد) "الشمس والقمر بحسبان" (الرحمٰن) "والقمر قدرناہ منازل" (سورۃ یٰس) ان آیات کی تفسیر میں محقق علمائے مفسرین کے جو اقوال منقول ہیں ان سے اس پہلو کی مزید تائید و تقویت ہوتی ہے، مثلاً محقق کبیر علامہ شوکانی نے اپنی تفسیر فتح القدیر میں (الشمس والقمر بحسبان کی تفسیر میں) لکھا ہے :- "جعلهما محل حساب ..... وسيرهما على تقدير لا يزيد ولا ينقص" (فتح القدیر ص ۱۴۳ ج ۲) ایک اور جگہ (کل یجری إلی أجل مسمی کی تفسیر میں) لکھا ہے :- "المراد بالأجل درجاتهما ومنازلهما التي تنتهيان إليها لا يجاوزانها" ایک دوسری جگہ لکھا ہے :- "يجريان بحساب ومنازل لا يعدوانها ولا يحيدان عنها ..... يعني أن بهما تحسب الأوقات والآجال" اور "والقمر قدرناه منازل" کے تحت لکھا ہے : أي قدرنا مسيره في منازل القمر هي مسافته التي يقطعها في يوم وليلة بحركته الخاصة ..... ينزل القمر كل ليلة لا يتخطاها (فتح ص ۴۲۵ ج ۴) ان سب تشریحات کا حاصل یہی ہے کہ چاند سورج کی رفتار نہایت محکم اور مقرر ہے، مقررہ رفتار و حساب سے یہ دونوں سر مو تجاوز نہیں کرتے۔

بنا بریں یہ کہنا ہوگا کہ اگر کوئی شخص ایسے وقت میں چاند دیکھنے کا دعوی کرتا ہے جبکہ عقلاً اس کا نظر آنا یعنی حسابی طور سے اس کا دیکھا جانا ممکن نہ ہو تو یہی کہا جانا چاہئے کہ اس شخص کو وہم ہوا ہے (اگر یہ جان بوجھ کر غلط بیانی نہیں کر رہا ہے) اور بعض اوقات ایسے موقعہ پر چاند دیکھنے کا دعوے کرنے والوں نے اپنے وہم کا اعتراف بھی کرلیا ہے۔ اس طرح کے متعدد واقعات علامہ طنطاوی نے اپنے رسالہ "مسئلة رؤية الهلال" میں ذکر کئے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ فلکی حسابات اور علم ہیئت سے نئے چاند کی آمد کا حکم تو شرعاً ثابت کرنا صحیح نہیں ہے البتہ اس فن اور حساب کے ذریعہ چاند کی رویت کے دعوے کی صحت جانچنے کا کام لیا جاسکتا ہے یا مختصر الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ فن ہیئت سے رویت کے سلسلے میں ایجابی تو نہیں

مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

تقویۃ الایمان اور شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ

کے خلاف برپا شورش

تاریخ و حقیقت کے آئینہ میں

(قسط ۵)

باب اول (۲)

شاہ محمد اسمٰعیل، معاصرین، مخالفین، تذکرہ نگاروں اور اکابر خاندان کی نظر میں

تذکرہ نگاروں کا اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ شاہ اسمٰعیل سولہ[16] سترہ[17] سال کی عمر (۱۲۰۹-۱۰ھ) میں سب متداول علوم کی تعلیم سے فارغ ہو گئے تھے، اس کے بعد بائیس[22] تئیس[23] سال تک اپنے چچاؤں کی خدمت میں حاضر اور ہمہ وقت ان کے دریائے فضل و کمال کے جرعہ نوش رہے جس شخص کی نوعمری اور زمانۂ تعلیم میں یہ کیفیت ہو کہ وہ شاہ عبدالقادر کے روبرو مجلس درس میں مولانا فضل امام خیرآبادی جیسے ماہر معقولات تجربہ کار استاد کو خود اپنے علم کے متعلق سوچنے پر مجبور کردے اس کی شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کی صحبتوں میں برسہا برس شبانہ روز حاضری کے بعد علوئے مرتبت اور روز افزوں کمالات کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔

اسی ندرت و امتیاز نے ان کو اپنے سب اہلِ خاندان، بزرگوں اور معاصرین کی آنکھوں کا تارا اور محبوب بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ شاہ شہید کے بعض تمام عمر کے ساتھی اور بے تکلف رفقائے درس بھی انکے ایسے ہی مداح و قصیدہ خواں ہیں جیسے عام افراد کسی بڑے ممتاز مایۂ ناز عالم اور ارباب

فقر و معرفت کے معتقد و حلقہ بگوش ہوتے ہیں، اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ چند ایسے افراد بھی جو شاہ شہیدؒ کے سخت ناقد و مخالف تھے اور ہمیشہ شاہ صاحب کے نظریات و تعلیمات کی تردید و تنقید میں مشغول رہے وہ بھی ان کے علمی مرتبہ اور فہم و بصیرت کے معترف تھے۔ شاہ محمد اسمٰعیل کے متعلق ایسے اعترافات کا خاصا وسیع ذخیرہ ہے مگر اس کی تفصیل کے لئے ایک دفتر چاہیئے جس کی ان صفحات میں گنجائش نہ ضرورت، تاہم شاہ شہید کے ہم عصر مخالفین قریب العہد تذکرہ نگاروں اور خاندان کے اکابرین خصوصاً حضرت شاہ عبدالعزیز کے شاہ شہید کے متعلق اقوال و کلمات میں سے ہر طبقۂ خیال کے ایک ایک دو دو اقتباسات بطور نمونہ مشتے از خروارے درج ذیل ہیں۔ اور ان سب کا حاصل یہی ہے کہ:

عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں

مولوی عبدالقادر خیف، رام پوری کا مشاہدہ اور تبصرہ

مولوی عبدالقادر خیف رام پوری جو بڑے ذی علم جہاں دیدہ و تجربہ کار ناقد و مبصر شخص تھے بار بار دلی آئے گئے، شاہ عبدالعزیز انکے بھائیوں اور اس وقت موجود خاندان ولی اللٰہی کے سب اصحاب کو دیکھا، برتا، خاندان ولی اللٰہی کے علاوہ دہلی کے اور سب اصحاب علم و ہنر سے ملاقاتیں کیں، انکی حیثیت و علمی مقام کا اندازہ کیا جس کے تاثرات ان کے روزنامچہ میں جھلک رہے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ وقائع نگار کی نگاہ تیز اور مشاہدہ غضب کا ہے، بہر حال یہی عبدالقادر خیف شاہ اسمٰعیل کے متعلق رقم طراز ہیں:۔

"اکنوں یادگار جد و اعمام	اب دادا اور چچاؤں کی یادگار
مولوی محمد اسمٰعیل است کہ	مولوی محمد اسمٰعیل ہیں جو ذہن کی
بجودت ذہن و قوت	تیزی اور توجیہ کی صلاحیت میں
توجیہ بے عدیل است،	بے نظیر ہیں اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت

خدا نگہبان او باد"[1] ونگہبانی فرمائے۔

یہ اُس وقت کا مشاہدہ اور اطلاع ہے جب شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالعزیزؒ زندہ تھے (رمضان المبارک ۱۲۳۰) نیز شاہ محمد اسمٰعیل کے علاوہ شاہ محمد اسحٰق شاہ محمد یعقوب، شاہ مخصوص اللہ، مولانا شاہ عبدالحی بڈھانوی وغیرہ سب دہلی میں موجود اپنے اپنے حسب صلاحیت علمی و دینی خدمات میں مشغول تھے، مگر مولوی عبدالقادر کی باریک بین ناقدانہ نگاہ نے شاہ ولی اللہ اور ان کے جملہ صاحبزادگان کا علم و کمال صرف شاہ اسمٰعیل کی ذات میں مجتمع پایا۔

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے!

ایک اور فاضل معاصر کا خراج تحسین

شاہ محمد اسمٰعیل شروع رجب ۱۲۳۹ھ (اوائل مارچ ۱۸۲۴ء) میں سفر حج سے واپسی کے وقت پھلواری شریف اترے، وہاں مولانا شہید کا وعظ ہوا، اگلے روز بعض علمی دینی مسائل پر مولانا شاہ ابوالحسن پھلوارویؒ سے عام مجلس میں گفتگو ہوئی، اس مجلس میں حاضر سجادہ نشین صاحب کے کسی رفیق نے اس کی روداد قلم بند کی ہے۔ یہ مجلس مذاکرہ ۳ رجب ۱۲۳۹ھ کو خانقاہ پھلواری میں منعقد ہوئی، اس میں تقریباً چالیس علماء اور اہل ذوق شاہ محمد اسمٰعیل کے ساتھیوں میں سے نیز پھلواری اور خانقاہ پھلواری میں موجود علماء اور طلبہ حاضر تھے، یہ گفتگو اس تحریر کے مرتب محمد جعفر (؟) کے بقول نہایت محبت آمیز پر لطف دلچسپ اور جملہ خوبیوں سے آراستہ تھی،

---

[1] یہ فارسی اقتباس وقائع عبدالقادر خاں کے خطی نسخہ کے حوالہ سے مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: فہرست مخطوطات اردو، رضا لائبریری رام پوری ص۵۰۲ ج ۱۔ (رام پور: ۱۹۶۷ء)

نیز رجوع فرمایئے:

"علم و عمل" ترجمہ وقائع عبدالقادر خاں، مترجمہ معین الدین افضل گڑھی مع حواشی ابوبکر اطاہر دہلوی مرحوم ص۲۴۸ ج ۱۔ (کراچی: ۱۹۷۰ء)

فریقین ایک دوسرے کے دلائل و تقریر پر صدائے مرحبا بلند کر رہے تھے، اسی روداد کا مرتب جو شاہ محمد اسمٰعیل کا شاگرد ہے نہ مرید، نہ تحریک سید احمد شہیدؒ سے کسی طرح وابستہ اور اس مسلک کا پیرو ہے، وہ شاہ شہید کا ان الفاظ میں تعارف کراتا ہے :-

"امابعد: ایں تذکرہ ایست مملو از
فوائد بسیار و تبصرہ ایست مشحون از
فوائد بے شمار در بیان مجلس شریف
وسخن و کلام لطیف کہ ہنگام مراجعت
صاحب الفضائل احسن الشمائل جمیل
الخصائل عالی الہمت وافی العزیمت
حاجی بیت اللہ الصمد سید احمد اعلی
اللہ ہمتہ ...... از سفر حجاز و ایام
تشریف آوری خدمت ایشاں در قصبہ
متبرکہ پھلواری، صانہا اللہ تعالیٰ
عن الآفات والبواری، فاضل
مدقق و محقق علامۂ دوراں، مخزن
خلق جمیل صاحب قدر جلیل مولوی
اسمٰعیل صاحب دہلوی، برادر زادۂ
سرآمد فضلاء ....
ـہ المشتہر الفارغ من البیان مصروف
الہمۃ نحو الشریعۃ معین اہل السنۃ
والجماعت ناصر الملۃ الحقہ،

حمد و صلوٰۃ کے بعد یہ تذکرہ ہے بہت
سے فوائد سے پُر اور تبصرہ ہے بے شمار
فوائد کا حامل اس مبارک مجلس اور
کلام لطیف کی تحریر میں، جو (بے شمار)
خصوصیات کے جامع، عمدہ عادات
بہترین اخلاق والے عالی ہمت
بے پناہ حوصلہ والے حاجی بیت اللہ الصمد
(حضرت) سید احمد (شہید رائے بریلوی)
اللہ تعالیٰ ان کی ہمت کو اور بلند فرمائے،
کی سفر حجاز سے واپسی اور قصبہ بابرکت
پھلواری شریف میں (خدائے کریم اس کو
آفات اور تباہی سے محفوظ رکھے)
تشریف آوری کے موقع پر فاضل
باریک بیں، محقق علامۂ زماں، اخلاق
عالیہ کے خزانے، عالی مرتبت مولوی اسمٰعیل
صاحب دہلوی جو فاضلوں کے سردار،
شہرت و تعارف سے بالاتر، اپنی ہمت
(عالیہ) شریعت کی خدمت میں مصروف

صاحب التحفۃ الاثنا عشریۃ ملا عبدالعزیز الدہلوی .... الخ [1] | فرمانے والے، سنت جماعت کے مددگار ملت حقہ کی دستگیری فرمانے والے تحفۂ اثنا عشریہ کے مصنف ملا (شاہ) عبدالعزیز دہلوی کے بھتیجے ہیں۔

ہر چند کہ اس تحریر کا مرتب تحریک سید احمد شہید کا مؤید اور شاہ محمد اسمٰعیل کے اکثر نظریات سے متفق نہیں ہے مگر منصف مزاج، علم و فضل کا رمز آشنا اور اہلِ کمال کا قدرداں ہے اس لئے اختلاف نظریات کے باوصف شاہ شہید کا حقیقی تعارف کرانے میں اس کو تأمل نہیں ہوتا اور اسکے الفاظ بتا رہے ہیں کہ شاہ اسمٰعیل کس مرتبہ کے عالم اور کس قدر ہر طبقۂ خیال کے علماء میں معروف و مقبول تھے۔

مفتی صدرالدین آزردہ کی چشم دید شہادت اور رائے

اسی سلسلہ کی ایک اور چشم دید گواہی مفتی صدرالدین آزردہ کی ہے، یہ بات محتاج تحریر نہیں کہ مفتی صاحب شاہ محمد اسحٰق رح کی دہلی سے ہجرت (۱۲۵۸ھ) کے بعد نہ صرف دہلی بلکہ شمالی ہند کے غالباً سب سے ممتاز عالم ادیب محقق اور غیر متنازعہ شخص تھے، ہر قسم کے علمی دینی ادبی فقہی موضوعات پر ان کی رائے ہر مکتبۂ فکر کے علماء اور ہر مجلسِ کمال میں اہم اور لائق اعتنا سمجھی جاتی تھی، مفتی صاحب کی ایک خصوصیت یہ ہے جس میں ان کا کوئی ہمعصر و معاصر ان کا قرین و ہمسر نہیں کہ ان کے ابتداء عہد درس و افادہ سے عصر حاضر تک تمام تذکرہ نگاران کی مدح و ثنا راست گوئی حقانیت اور پاکیزگیٔ کردار پر یک زبان و متفق ہیں، کوئی ایک معتبر تذکرہ نگار بھی ان روایات سے اختلاف نہیں کرتا، اسی کا درجۂ کمال یہ ہے کہ نامور مورخ مولانا عبدالحی حسنی نے مفتی صدرالدین آزردہ کے تعارف

---

[1] رسالہ روداد مذاکرہ، مرتبہ محمد جعفر، مکتوبہ بقلم ممنون علی بہاری۔ ۲۰ جمادی الاول ۱۲۴۲ھ مخزونہ ذخیرہ مخطوطات شبلی لائبریری۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ ـــــ یہ روداد فارسی میں بڑے سائز کے چوبیس صفحات پر مشتمل ہے ـــــ اقتباس مذکورہ میں جہاں نقطے لگے ہوئے ہیں وہ عبارت ضائع ہو گئی ہے۔

میں اس قسم کے کلمات درج کئے ہیں جو ابن الزملکانیؒ کے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی شان میں لکھے گئے الفاظ کی ترجمانی کرتے ہیں۔

مفتی صدرالدین آزردہ سے شاہ محمد اسمٰعیل اور تقویۃ الایمان کے متعلق دریافت کیا گیا تو مفتی صاحب نے ان الفاظ میں اپنی رائے اور شہادت قلم بند فرمائی :۔

"تقویۃ الایمان کو نظر اجمالی سے دیکھا ہے، باعتبار اصول اور اصل مقصد کے بہت خوب ہے اور مولوی اسمٰعیل صاحب کو ایسا دیکھا کہ پھر کسی کو ایسا نہ دیکھا، یہ لوگ ان میں سے ہیں کہ جن کے حق میں حق سبحانہٗ تعالیٰ نے فرمایا ہے :۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ[1]

اور یہ فرمایا :۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ[2]

وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ[3]

پس جو ان کو کافر و گمراہ کہے وہ آپ گمراہ ہے"[4]

---

[1] ترجمہ۔ اور چاہئے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کریں برائی سے اور وہی پہنچے مراد کو۔ (سورۂ آل عمران ۴۔۱۰۔ ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ)

[2] بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور لڑے اللہ کی راہ میں وہ امیدوار ہیں اللہ کی رحمت کے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے (سورۂ بقرہ ۲۱۸ ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)

[3] اور اللہ خاص کر لیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جسکو چاہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے (سورۂ بقرہ ۱۰۵ ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)

[4] بعض تحریروں میں مفتی صاحب کے اس فتوی یا رائے کی استنادی حیثیت پر شبہ ظاہر کیا گیا ہے اس لئے یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ تحریر پہلی مرتبہ مفتی صدرالدین آزردہ کی زندگی میں شائع ہوئی تھی اسکے بعد کثرت سے (باقی اگلے صفحہ پر)

مولانا محمد محسن بن یحییٰ ترہتی مؤلف الیانع الجنی کی بے لاگ رائے

تیرہویں صدی ہجری کے بلند پایہ ادیب، محدث اور اسانید پر مشہور کتاب "الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبد الغنی" کے مؤلف مولانا محمد محسن بن یحییٰ ترہتی[1] نے اپنی کتاب میں شاہ اسمٰعیل کا بہت بلند اور نہایت وقیع الفاظ میں تعارف کرایا ہے۔ حال آں کہ مولانا زید ابو الحسن کا یہ قول بالکل صحیح اور مطابق واقعہ ہے کہ: "مولانا ترہتی اسمٰعیلیہ مکتبِ فکر (؟) سے نہیں ہیں[2]" بلکہ مولانا فضل حق خیرآبادی کے آخری دور کے ممتاز شاگرد اور مولانا کے زمانۂ ملازمت لکھنؤ و الور میں سفر و حضر کے رفیق رہے ہیں، ترہتی کا ہر لحاظ سے مولانا خیرآبادی کے اہم ترین تلامذہ میں شمار کیا جاتا ہے اُن کا شاہ محمد اسمٰعیل سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں، نہ تلمذ و ارادت کا نہ افکار و خیالات کا اس کے باوجود ترہتی شاہ محمد اسمٰعیل رح کا ایسا تعارف کراتے ہیں کہ ترہتی کی تحریر میں ایسا شاندار تعارف بہت کم کسی کو نصیب ہوا ہے یہ اس وقت ہے جب کہ مولانا خیرآبادی کے شاہ محمد اسمٰعیل اور انکے نظریات و تحریک سے اختلافات کا چرچا عام تھا اور مولانا خیرآبادی کے زمانۂ قیام لکھنؤ میں ہی مولا کے ایک شاگرد نے وہ کتاب لکھی تھی جو امتناع النظیر کے نام سے متعارف ہے اور مولانا خیرآبادی کی تصنیف سمجھی جاتی ہے اس لئے ظاہر ہے کہ شاہ اسمٰعیل اور مولانا خیرآبادی کے درمیان اختلاف

(باقی حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) مختلف مآخذ میں درج کی گئی کم سے کم تیرہ چودہ کتابوں اور رسالوں میں میری نظر گزری ہے، تاہم میں نے اسی پہلی اشاعت پر اعتماد کیا ہے، ضمناً یہ بھی عرض ہے کہ اس رسالہ و تحریر کے اولین نا مفتی صاحب کے واقف احباب میں تھے۔ رسالہ فضائل عالم باعمل مرتبہ مولانا محمد حسین فقیر مفتی دہلوی صـ (مطبوعہ مجتبائی دہلی، باہتمام نصیب علی) رسالہ فضائل عالم باعمل بعد میں بھی کئی مرتبہ چھپا ہے۔

[1] تمام تذکرہ نگار اور خود شیخ محمد محسن بھی ترہتی (ت۔ ر۔ ہ۔ ت۔ ی) لکھتے ہیں، مگر محمد ایوب قادری کا خیال ہے کہ صحیح نزہتی (ن۔ ز۔ ہ۔ ت۔ ی) غالباً اول ہی صحیح ہے۔

[2] مولانا اسمٰعیل اور تقویۃ الایمان۔ صـ ۱۲ (دہلی: ۱۴۰۲ھ)

کاکوئی پہلو مولانا نزہتی کی نگاہ سے پوشیدہ نہ ہوگا اس مبحث کی تحریرات و تالیفات بھی مؤلف البانع الجنی کی نظر سے گزر گئی ہوں گی اور مولانا خیرآبادی کے نزہتی پر احسانات اور خیرآبادی کے احساسات بھی نزہتی کے ذہن میں تازہ و محفوظ ہوں گے اس کے باوجود وہ شاہ محمد اسمٰعیل کے ثناخواں اور ان کے تعارف و تذکرہ کے حریص ہیں، مولانا نزہتی لکھتے ہیں :-

ومنهم ابن اخيه اسمٰعيل ابن	اور منجملہ تلامذہ شاہ عبدالعزیز آکے بھتیجے
عبد الغني وكان من اذكى الناس	شاہ اسمٰعیل بن عبدالغنی ہیں جو اپنے زمانہ کے
بأيامه وكان اشدهم في دين	ذہین ترین انسانوں میں سے تھے دین کے
الله واحفظهم للسنة يغضب له	معاملہ میں بہت سخت تھے اور سنتوں کی بے حد
ويندد بالهوا وينم على البدع	حفاظت (پابندی) اور عمل کرنیوالے تھے اسی
واهلها.	کی وجہ سے غصہ کرتے تھے اور اسی کی دعوت
من مصنفاته كتاب الصراط	دیتے تھے، بدعات اور اہل بدعت کو
المستقيم في التصوف والايضاح	نہایت برا سمجھتے اور کہتے تھے.
في بيان حقيقة السنة والبدعة	انکی تالیفات میں سے صراط مستقیم ہے
مشهوران يرغب الناس	تصوف میں اور ایضاح (الحق الصریح)
فيهما ومختصر في اصول الفقه	سنت اور بدعت کی حقیقت واضح
وتنوير العينين انفرد فيها	کرنے میں بہت مشہور ہیں، لوگوں کی ان
بمسائل عن جمهور اصحابه	دونوں کتابوں کے نہایت انسیت اور
واتبعه عليها اناس من المشرق	وابستگی ہے، اور ایک مختصر سی کتاب ہے
ومن بنجالة وغيرها،	اصول فقہ میں، اور تنویر العینین ہے جس
اكثر عددًا من حصى	میں شاہ محمد اسمٰعیل نے اپنے سلسلے کے جمہور
البطحاء۔	علماء سے الگ رائے اختیار کی ہے (مگر)

وله كتاب آخر في التوحيد	مؤلف کا ان مسائل میں مشرقی علاقے
والاشراك فيه امور في حلاوة	اور بنگال وغیرہ میں بے شمار لوگوں نے
التوحيد والعسل واخرى	اتباع کیا ہے اور ان کی پیروی کرنیوالوں
في مرارة الحنظل، فمن قائل	کی تعداد حدِّ شمار سے کہیں زائد ہے۔
انها دُسّت فيه، وقائل	نیز شاہ محمد اسمٰعیل کی ایک اور کتاب
انه تعمدها. والله تعالىٰ	ہے توحید اور شرک کے بیان میں اس میں کچھ
عالم بالسرائر، ولكل امرئٍ	باتیں ایسی ہیں جن میں توحید نامی (عمدہ)
ما نوى.	شیریں کھجور[1] اور شہد کی سی شیرینی ہے،
أُستُشهِدَ في الغزوة المشهورة	اور کچھ ایسی کہ ان میں اندرائن کی
حين هجم عليهم العدوّ و	کڑواہٹ ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ
كفرة السلك وخذلهم من كانوا	(موخرالذکر) باتیں اس میں (بعد میں)
في دارهم ونكثوا بيعة	ملائی گئی ہیں اور کچھ کا خیال ہے کہ یہ باتیں
امامهم حتى صاروا مع	(مصنف نے جان بوجھ کر) لکھی ہیں۔
للعدوّ يداً واحداً واعانوهم	اللہ تعالیٰ ہی چھپی ہوئی باتوں کا زیادہ
على دماء المسلمين وربما	جاننے والا ہے اور ہر ایک کیلئے ویسا ہی
سفكوها والله اعلم.[2]	معاملہ ہے جیسی اس نے نیت کی۔

[1] ایک نہایت عمدہ شیریں کھجور کا نام توحید ہے جو مٹھاس میں شہد کی طرح ضرب المثل ہے۔

[2] الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبد الغنی ص۱۰۹ ص۱۱۰ (مؤلفہ رجب ۱۲۸۰ھ۔ مدینہ منورہ) طبع اول بتصحیح ونگرانی مولف۔ (صدیقی بریلی: ۱۲۸۷ھ)۔ ص۶۲ طبع دوم (دیوبند: ۱۳۴۹ھ)

مولانا ترہتی نے الیانع الجنی میں اپنے استاذ مولانا فضل حق خیرآبادی کا بھی تعارف کرایا ہے مگر یہ تعارف بہت مختصر اور صرف درج ذیل کلمات پر مشتمل ہے:۔

الشيخنا العلامة النحرير الذى لم تر العيون مثله اعنى ابا العلاء فضل الحق العمرى الخيرآبادى (ص۳۲)

شاہ محمد اسمٰعیل ایک مشہور لڑائی میں
شہید کر دیئے گئے تھے، جب ان پر ان کے
دشمنوں کافر سکھوں نے حملہ کیا اور بعض
اُن لوگوں نے جو اِن (شاہ اسمٰعیل) کے ساتھ
تھے بدعہدی کی، ان کو نقصان پہنچایا اور
اپنے امام کی بیعت توڑ دی، یہاں تک کہ
وہ اپنے اور مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ
مل گئے، انکے دست راست بن گئے، اور مسلمانوں
کا خون بہانے کے لئے ان کی مدد کی اور خود
بھی بہایا اور اللہ بہتر جاننے والا ہے۔

(باقی صفحہ ۳۵ کا)

احذق النظار والاصولیین فی زمانہ والشاعر الادیب العربی المفلق فی اوانہ۔ (ص۱۰)

ان کلمات کا ان الفاظ سے موازنہ کیجئے جو اوپر شاہ محمد اسمٰعیل کی شان میں گزرے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شہیدؒ اور مولانا خیرآبادیؒ کے مقام اور علم و مرتبہ میں کیا فرق و امتیاز تھا، اگرچہ دونوں ایک استاد کے شاگرد اور ایک درس گاہ کے متعلم تھے مگر خدمت دین احیاء شریعت اور معاشرت و ملازمت کے لحاظ سے ان کا مقام و مذاق اور ان کا مذاق و مقام اور ا آلیانع الجنی میں مولانا خیرآبادی کا دو موقعوں پر اور ذکر ہے مگر دونوں جگہ ضمناً صرف نام درج ہے کوئی کلمۂ تعارف و تحسین درج نہیں۔

باقی نگاہ اولیں صفحہ ۴ کا

اسی طرح کے کچھ اور مستقل عنوانات کا اضافہ انشاء اللہ آئندہ شماروں میں کیا جاتا رہے گا۔
ایک مستقل عنوان "سوال وجواب" کے نام سے بھی شروع کیا جا رہا ہے جس کے تحت آپ کے سوالات و اشکالات کو حل کرنے کی کوشش کی جائے گی ــــ آپ اپنے سوالات و اشکالات مدیر الفرقان کے نام صاف تحریر میں تحریر فرمائیں، اور لفافے پر "سوال وجواب" ضرور لکھ دیں۔
الفرقان کے سائز میں بھی تبدیلی زیر غور ہے ہو سکتا ہے کہ اسی شمارے سے سائز بدل دیا جائے۔
بہرحال آیئے ایک نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ نئی جلد کا آغاز کریں، اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ آئندہ سالوں میں آپ کے "الفرقان" سے بہتر سے بہتر خدمت لیتا رہے۔ آمین

مولانا مفتی شعیب اللہ خاں صاحب
ناظم مدرسہ مسیح العلوم، بنگلور

احادیثِ عذابِ قبر پر اعتراضات

اور

ان کے جوابات

(تیسری قسط)

اب ہم ان اعتراضات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو مؤلف "شمع حقیقت" کی طرف سے عذاب قبر کی بعض احادیث پر اٹھائے گئے ہیں۔

مگر پہلے یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف "شمع حقیقت" قاضی محمد علی صاحب نے اپنے مضمون "عذاب قبر" میں صرف تین حدیثوں کو پیش کیا ہے اور ان پر اعتراضات اٹھا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ احادیث ناقابلِ اعتبار ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ اگر یہ تینوں روایات ناقابل اعتبار تھیں تو ان تینوں روایات کو چھوڑ کر مؤلف نے ذخیرۂ احادیث میں جمع بے شمار احادیث کو کیوں نظر انداز کر دیا؟ یہ تو ظاہر ہے کہ کسی ایک دلیل کے ٹوٹ جانے سے مدلول کا بطلان ثابت نہیں ہوتا، مثلاً نماز کے متعلق احادیث میں سے ایک دو یا کئی احادیث ضعیف نکل آئیں تو اس سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ نماز ہی باطل ہے، کیونکہ ایک دو یا کئی روایات کے ضعیف یا موضوع یا ناقابلِ قبول ہونے سے، اس سلسلے کی تمام روایات غلط نہیں ہو جاتیں۔ اسی طرح عذاب قبر کے متعلق اُن تینوں

روایات کے قابلِ اعتراض ہونے سے اس سلسلے کی دوسری تمام روایات تو غلط نہیں ہو جاتیں۔

ایک حدیث پر چار اعتراضات

اب ہم مؤلف "شمع حقیقت" کی پیش کردہ تین روایات پر اُن کی طرف سے کئے گئے اعتراضات کا جائزہ لیں گے۔

سب سے پہلے مؤلف نے امام بخاریؒ کی وہ حدیث پیش کی ہے جس میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک قبرستان پر ہوا اور آپ نے فرمایا کہ دو قبر والوں پر عذاب ہو رہا ہے، ایک کو چغلخوری کی وجہ سے اور ایک کو پیشاب سے بے احتیاطی کی بنا پر، پھر آپ نے ایک شاخ کو دو حصوں میں تقسیم فرما کر، ہر قبر پر ایک ایک گاڑ دیا، اور فرمایا کہ جب تک یہ سبز رہیں گی، ان کے عذاب میں تخفیف رہے گی۔

یہ حدیث مع حوالہ اوپر "مطلق عذابِ قبر کی حدیثوں" کے تحت، حدیث نمبر ۵ پر تفصیل سے گزر چکی ہے، اس حدیث پر مؤلف "شمع حقیقت" نے چار اعتراضات کئے ہیں۔

۱۔ صرف دو قبروں پر عذاب ہو رہا تھا، باقی کیوں محفوظ تھیں؟

۲۔ یہ دو قبریں کافروں کی تھیں یا مسلمانوں کی؟ پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عذاب میں تخفیف کرانے کا حق کس نے دیا؟ یعنی اللہ تعالیٰ تو ان پر عذاب کرتا ہے اور رسول معاذاللہ اسے روکتے ہیں؟

۳۔ رسول اکرم کو کیسے معلوم ہوا کہ قبر میں عذاب ہو رہا ہے؟ وحی آئی تھی تو قرآن میں کیوں اس اہم بات کا ذکر نہیں؟ بغیر وحی کے معلوم ہوا تو علم غیب ثابت ہوگا مگر قرآن کہتا ہے کہ ہم نے تمھیں علم غیب نہیں دیا؟

۴۔ رسول اکرم کے اس فعل پر صحابہ نے کیوں نہ عمل کیا اور کیوں نہ قبروں پر سبز ٹہنیاں ڈالیں؟

پہلے اعتراض کا جواب

ان میں سے پہلا اعتراض کہ عذاب صرف دو قبروں پر ہو رہا تھا، باقی کیوں محفوظ تھیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ بے سوچے سمجھے محض منکرین حدیث کے اٹھائے ہوئے اشکالات سے متاثر ہو کر کر دیا گیا ہے، کیونکہ حدیث میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ عذاب قبر صرف دو قبروں میں ہو رہا تھا اور باقی قبریں محفوظ تھیں، حدیث میں یہ ہے کہ دو قبروں پر عذاب ہو رہا ہے۔ باقی قبروں کا عذاب سے محفوظ ہونا حدیث میں مذکور نہیں ہے، مشہور قاعدہ ہے العدد لا ینفی الزائد کہ عدد زائد کی نفی نہیں کرتا، باقی قبروں کے محفوظ رہنے کی جو بات اس حدیث سے مؤلف نے پیدا کر کے اس کو اعتراض کی بنیاد بنایا ہے۔ اِس بات کا اس روایت میں کوئی تذکرہ ہی نہیں ہے۔

اب رہی یہ بات کہ پھر آپ نے دو ہی قبروں کا ذکر کیوں کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپؐ کو جتنی بات کا علم دیا گیا آپؐ نے وہ بتا دیا، کیونکہ نبی پر جس قدر علم کی بات منکشف کی جاتی ہے وہ اتنا ہی بتاتا ہے، اور یہ انکشاف نبی کے اختیار میں نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے اختیار میں ہوتا ہے وہ جب چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے، ان پر منکشف کرتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے جدا ہو جانے پر حضرت یعقوبؑ کو جس قدر رنج ہوا اس کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ انھوں نے نہ معلوم کتنی دعائیں کیں اور کیا کیا درخواستیں خدا کے دربار میں پیش فرمائیں، مگر یوسف علیہ السلام کا انھیں علم نہ ہوا، مگر ایک موقعہ پر انھیں یوسفؑ کی خوشبو دور ہی سے محسوس ہو گئی، انی لأجد ریح یوسف اس کے بعد حضرت یوسف کا کُرتا ان کے بھائیوں نے لا کر پیش کیا، تو آپ نے ان سے فرمایا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ مَیں خدا کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے (سورۂ یوسف) اب سوال یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ کا علم برسوں تک حضرت یعقوبؑ کو نہ ہوا، پھر اچانک ان کی خوشبو اور وہ بھی اُن کے کُرتے سے میلوں دور سے محسوس ہو گئی تو آخر اس کے بارے میں کیا کہا جائے گا......؟

ـــــ یہی کہا جائے گا کہ جب خدا نے چاہا بتا دیا اور جب تک چاہا بے خبر رکھا، اسی طرح یہاں بھی اللہ کے نبی کو دو قبروں کا عذاب دکھا دیا گیا اور باقی کا نہیں، اس میں اعتراض کی آخر کونسی بات ہے؟

دوسرے اعتراض کا جواب

دوسرے نمبر پر مؤلف "شمع حقیقت" نے دو باتیں پیش کی ہیں۔ ایک تو یہ سوال اٹھایا ہے کہ وہ دو قبر والے کافر تھے یا مسلمان؟ مگر اس سوال سے وہ آخر کہنا کیا چاہتے ہیں، اس کو انھوں نے ظاہر نہیں کیا ہے اس لئے ہم بھی ان کے مقصد سے اعراض کرتے ہوئے اس سوال کا جواب دے کر آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔

ان قبر والوں کے بارے میں علماء کے قیاسات مختلف ہیں بعض کہتے ہیں کہ وہ کافر تھے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ مسلمان تھے، اکثر علماء نے دوسرے قول کو راجح قرار دیا ہے۔ اور ان حضرات کے مؤیدات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ مذکورہ بالا حدیث میں ہے کہ وہ کسی بڑے گناہ کی وجہ سے نہیں عذاب دیئے جا رہے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں کافر نہیں تھے، ورنہ ان پر کفر کی وجہ سے بھی عذاب ہوتا۔

۲۔ اسی حدیث کے ایک طریق میں ہے کہ یہ دو قبریں نئی تھیں (فتح الباری ۱/۳۲۱) اس سے ظاہر یہی ہے کہ یہ مسلمانوں کی قبریں تھیں نہ کہ جاہلیت کے زمانہ کے لوگوں کی۔

۳۔ امام احمد نے ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ جنت البقیع میں گذرے اور فرمایا کہ تم نے آج کس کو یہاں دفن کیا ہے؟ (فتح الباری ۱/۳۲۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو قبر والے مسلمان تھے، اولاً تو اس لئے کہ جنت البقیع مسلمانوں کا قبرستان ہے اور دوسرے اس وجہ سے کہ آپؐ نے سوال صحابہ سے کیا تھا کہ تم نے آج کس کو دفن کیا ہے اور ظاہر ہے کہ مسلمان جن کو دفن کریں گے وہ عام عادت میں مسلمان ہی ہونگے۔

بہرحال مسئلہ اختلافی ہے۔ اور جمہور کے نزدیک یہ قبر والے مسلمان ہی تھے اور ان پر عذاب چغلخوری اور پیشاب سے بے احتیاطی کی وجہ سے ہو رہا تھا۔

اس نمبر میں دوسری بات مؤلف "شمع حقیقت" نے یہ فرمائی ہے کہ رسول اکرم کو عذاب میں تخفیف کرانے کا حق کس نے دیا؟ جب خدا عذاب کرنا چاہتا ہے تو رسول اس کو کیسے روک سکتے ہیں؟

سچی بات یہ ہے کہ اعتراض ہمیں بہت ہی سطحی سا لگا، کیونکہ کون نہیں جانتا کہ دعا کے ذریعہ عذاب میں تخفیف کرانا اور شفاعت کے ذریعہ تخفیف کرانا، بلاشبہ ثابت ہے اور یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عبدیت کے بالکل منافی نہیں، اور آپ نے اس موقعہ پر یہی کیا ہے، مؤلف نے اپنے مضمون کے آخر میں جس کتاب کے دیکھنے کا مشورہ دیا ہے، یعنی "عذاب برزخ" مؤلفہ ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی، اس میں بھی اس حدیث میں مذکور اس عمل کو دعا ہی قرار دیا ہے۔ (دیکھو ص ۳)

آپؐ کے اس عمل کی حیثیت شفاعت سے زیادہ نہیں تھی (فتح الباری ۱/۳۲۰) اور اسکی تائید صحیح مسلم کی ایک طویل حدیث سے ہوتی ہے جس میں ہے کہ اللہ کے رسول نے حضرت جابرؓ کو دو شاخیں لاکر ایک داہنے طرف اور دوسری بائیں طرف گاڑ دینے کا حکم فرمایا، حضرت جابرؓ کے اس پوچھنے پر کہ آپؐ نے کس وجہ سے ایسا کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ:-

انی مررت بقبرین یعذبان فاحببت بشفاعتی ان یرفہ ذلک عنھما مادام الغصنان رطبین۔ (مسلم ۲/۴۱۸)

میں ایسی دو قبروں کے پاس سے گزرا جن پر عذاب ہو رہا تھا، پس میں نے چاہا کہ میری شفاعت و سفارش سے ان سے یہ (عذاب) کم کر دیا جائے جب تک کہ یہ شاخیں سبز و تر ہیں۔

اس میں صاف طور پر اللہ کے رسول علیہ السلام نے شفاعت کا ذکر کیا ہے، یہ قصہ

بعض علماء کے نزدیک وہی ہے جس کا ذکر ابن عباسؓ کی بخاری کی روایت میں ہے اور جس پر یہاں بحث ہو رہی ہے' اور بعض کے نزدیک یہ قصہ دوسرا ہے' تاہم اس سے اتنا معلوم ہوا کہ اس طرح کے عمل کا منشا دراصل شفاعت ہے۔

رہا یہ سوال کہ اگر یہ دعا وسفارش تھی تو ان شاخوں کو گاڑنے کی کیا ضرورت تھی، دعا وسفارش تو زبان سے ہوتی ہے، اس کے بہت سے جوابات ہیں۔ ان میں سے ایک جواب یہ ہے کہ تخفیف عذاب کی مدت کے لئے بطور علامت شاخ کو گاڑا گیا تھا، اور اس کی تائید مسلم شریف کی پیش کردہ روایت کے دوسرے نسخہ سے ہوتی ہے جس میں ہے کہ فاجیبت شفاعتی الخ یعنی تخفیف عذاب کے لئے میری شفاعت ان دو سبز شاخوں کے سوکھ جانے تک قبول کر لی گئی ہے، (شرح مسلم للنووی ج ۱ ص ۱۴۱)

تیسرے اعتراض کا جواب

مؤلف "شمع حقیقت" کا تیسرا اعتراض یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کو کیسے معلوم ہوا کہ عذاب ہو رہا ہے' اگر وحی آئی تھی تو قرآن میں اس اہم بات کا ذکر کیوں نہیں؟ الخ

اس اعتراض سے صاف ظاہر ہے کہ مؤلف منکر حدیث ہیں، وہ قرآن کی وحی کے سوا دوسری وحیوں کو تسلیم نہیں کرتے، حالانکہ خود قرآن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کے نبیؐ پر قرآن کی وحی کے علاوہ اور وحی بھی نازل ہوتی تھی، یہاں صرف ایک دو مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

(۱) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ ۔ (بقرہ: ۱۴۳)

اور ہم نے وہ قبلہ جس پر آپ اب تک قائم تھے، صرف اس لئے مقرر کیا تھا کہ یہ جان لیں کہ کون رسول کی اتباع کرتا ہے اور کون اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس قبلہ پر آپ اب تک یعنی مسجد حرام کو قبلہ قرار دینے تک قائم رہے وہ بھی ہم نے مقرر کیا تھا یعنی مسجد حرام سے قبل مسجد اقصیٰ کا قبلہ مقرر کرنا بھی ہمارا کام ہے اب مؤلف سے ہم پوچھتے ہیں کہ وہ قرآن میں ہمیں کوئی ایسی آیت کا حوالہ دیں جس میں مسجد اقصیٰ کو قبلہ قرار دیا گیا ہے، اگر ایسی آیت نہیں پیش کی جاسکتی اور یقیناً نہیں پیش کی جاسکتی تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ نے قرآن کے علاوہ ایک اور وحی سے مسجد اقصیٰ کو قبلہ مقرر فرمایا تھا جس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، معلوم ہوا کہ وحی قرآن کے علاوہ بھی ہوتی تھی :۔

(۲) مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّينَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَائِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ (الحشر ۵)

کھجوروں کے درخت جو تم نے کاٹے یا جو کھڑے رہنے دیئے یہ دونوں کام اللہ کی اجازت سے تھے۔

یہ غزوۂ بنو نضیر کے موقعہ پر نازل ہونے والی آیت ہے، صحابہ نے اللہ کے نبی کے حکم سے بنو نضیر کی کھیتیوں اور ان کے باغات میں سے بہت سے باغات کو جلا دیا اور کاٹ دیا۔ اور اس پر بعض لوگوں نے مسلمانوں کو فسادی کہا تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی تھی، اس میں بتایا گیا کہ یہ سب کچھ اللہ کی اجازت سے عمل میں آیا ہے، کیا میں مؤلف سے پوچھ سکتا ہوں کہ یہ اجازت اللہ تعالیٰ نے کس آیت میں نازل فرمائی تھی اور کیا وہ اس کو پیش کرسکتے ہیں۔

یقیناً نہیں پیش کرسکتے، معلوم ہوا کہ یہ اللہ کی اجازت دوسری قسم کی وحی سے بتائی گئی تھی، جس کو وحی غیر متلو کہا جاتا ہے۔

اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ ان دو قبروں پر عذاب کا ہونا بھی وحی سے آپ کو بتایا گیا تھا اور وہ وحی متلو (قرآن) سے نہیں بلکہ وحی غیر متلو سے بتایا گیا تھا، اگر مؤلف اس کو ماننے کو تیار نہیں تو پہلے صاف صاف اعلان کیجئے کہ میں حدیث کو نہیں مانتا، پھر اسی پر بحث کرلیجئے، ہم اس کے لئے تیار ہیں۔

چوتھے اعتراض کا جواب

مؤلف نے چوتھا اور آخری اعتراض یہ کیا ہے کہ صحابہ نے اس پر عمل کرتے ہوئے سبز شاخیں کیوں

نہ گاڑیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ۔

۱۔ اولاً تو یہ کہنا کہ صحابہ نے اس پر عمل نہیں کیا، علی الاطلاق صحیح نہیں ہے بلکہ حضرت بُریدۃ الاسلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے وصیت کی تھی کہ ان کی قبر پر دو شاخیں رکھی جائیں، اس کو امام بخاری نے تعلیقاً روایت کیا ہے (الجنائز باب الجریدۃ علی القبر) اور ابن حجر نے لکھا ہے کہ اس کو ابن سعد نے موصولاً روایت کیا ہے (فتح الباری ۳/۲۲۳) ابن حجر نے اس پر سکوت کیا ہے، جو اس کی دلیل ہے کہ روایت ان کے نزدیک کم از کم حسن ہے یا صحیح ہے جیسا کہ علماء نے لکھا ہے۔

۲۔ ثانیاً حضرات صحابہ کا اس پر عمل نہ کرنا اس وجہ سے ہے کہ یہ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہر موقعہ پر ہر قبر کے لئے نہیں کیا تھا بلکہ اس طرح کا واقعہ دو یا تین دفعہ پیش آیا تھا، ایک تو وہی جس کا ذکر زیر بحث حدیث ابن عباس میں ہے۔ دوسرے وہ جو بروایت مسلم حضرت جابرؓ سے اوپر نقل کیا گیا اور تیسرے وہ جس کو ابن حبّان نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک قبر پر سے گذرے اور کھڑے ہو گئے پھر فرمایا کہ دو شاخیں لاؤ، پھر آپؐ نے ان میں سے ایک کو قبر کے سرہانے اور ایک کو پیروں کے پاس رکھ دیا۔ (فتح الباری ۱/۳۱۹) اور چوتھے ابن ماجہ نے بسند ضعیف حضرت ابورافع سے نقل کیا ہے کہ ہم ایک جنازے میں اللہ کے نبی علیہ السلام کے ساتھ تھے، آپؐ نے قبر سے کچھ آواز سنی تو حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ سبز شاخ لاؤ، پھر آپؐ نے اسکے دو حصہ کرکے، ایک کو سر کے پاس ایک کو پیروں کے پاس رکھدیا۔ (فتح الباری ۱/۳۱۹)

ان میں سے پہلے اور دوسرے واقعہ کو بعض علماء ایک ہی قرار دیتے ہیں اور آخری روایت ضعیف ہے، اس طرح دو تین روایات ہی میں اس قسم کے واقعہ کا ذکر ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نبی بھی ہر قبر کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کرتے تھے بلکہ بعض خاص مواقع ہی پر کرتے تھے، اس لئے صحابہ نے اس کو اللہ کے نبی کے ساتھ مخصوص سمجھ کر اس پر عمل نہ کیا۔

یہ وجہ ہے جس کی وجہ سے صحابہ نے اس پر عمل نہ کیا اور ہمارے علماء نے بھی اسکی اجازت

نہیں دی، اور بعض بدعات و خرافات کے پیشِ نظر اس کو بالکلیہ ترک کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

اب مؤلف بتائیں کہ صرف اس وجہ سے کہ صحابہ نے اس کو عام معمول نہیں بنایا، حدیث صحیح کو کیسے رد کیا جا سکتا ہے؟ جبکہ صحابہ کا اسے عام معمول نہ بنانا ایک معقول وجہ سے تھا۔

بہرحال مؤلف نے جو اعتراضات اس حدیث پر اٹھائے تھے، اُن کا مدلل جواب ہو گیا ہے' اب ہم دوسری حدیثوں پر اٹھائے گئے اعتراضات کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں

ایک شبہ اور اس کا جواب

مؤلف شمعِ حقیقت لکھتے ہیں:-

> صحیح بخاری میں ہے کہ قبر میں فرشتہ صرف رسول کے بارے میں پوچھتا ہے من رَسُولُكَ دوسری کتابوں میں ہے کہ چار سوال پوچھتا ہے' ابن ماجہ میں ہے کہ تین سوال پوچھتا ہے، من ربك، ما دینك، ما علمك، اور جب خاطر خواہ جواب نہیں ملتے تو منکر نکیر اسے مارتے ہیں۔ الخ۔ (شمع حقیقت ص۳۲۱)

مؤلف کی اس عبارت سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہ تأثر دینا چاہتے ہیں کہ اِن روایات میں تعارض ہے۔ لہٰذا یہ ناقابلِ اعتبار ہیں، انھوں نے اگرچہ صریح الفاظ میں تعارض کا دعویٰ نہیں کیا ہے، تاہم اگر ان کا ان متعدد روایات کو اس انداز سے پیش کرنے کا مقصد تعارض کو ظاہر کرنا ہے' جیسا کہ ہمارا اندازہ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان میں حقیقتہً کسی بھی قسم کا تعارض نہیں ہے، کیونکہ کسی روایت میں ایک اور دوسری میں دو باتوں کے بیان کرنے سے تعارض لازم نہیں آتا۔ ممکن ہے اللہ کے رسول نے کبھی ایک سوال کبھی دو اور کبھی تین یا چار بتائے ہوں کیونکہ اللہ کے رسول کو جتنی بات کا علم ہوتا تھا، آپ بتاتے تھے' اور آپ کو تدریجاً بہت سے علوم عطا کئے گئے تھے۔

نیز یہ بھی امکان ہے کہ صحابہ یا دیگر راویوں نے کبھی موقعۂ فرصت پاکر تمام سوالات کا ذکر کیا ہو اور کبھی وقت کی تنگی یا سیاق و سباق یا کسی اور ضرورت کی بنا پر اختصار سے کام لیا ہو جو حضرات احادیث

الفرقان کی ڈاک

(۱)

سدھارتھ نگر سے مولانا عبدالرؤف رحمانی نے تحریر فرمایا ہے:۔

مکرمی و محترمی حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی حفظہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ـــــ مع الخیر طالب الخیر ہوں۔

آپ کی علالت، مزاج کی ناہمواری اور پاؤں کی تکلیف کا عارضہ، آنکھوں کی تکلیف کا سانحہ برابر الفرقان میں پڑھتا رہا۔ خدا شاہد ہے ہمیشہ آپ کیلئے دعائے خیر کرتا رہا۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی کی طرح آپ کیلئے بھی خداوند کریم سے شفائے کامل و درازیٔ عمر اور قوت و نشاط کیلئے دعا کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ آپ کا سایۂ عاطفت تا دیر ملّتِ اسلامیہ کے سروں پر قائم رکھے۔

الفرقان شمارہ دسمبر ۱۹۹۱ء صفحہ ۲۵ پر سورۂ فتح کی آیت غلط چھپ گئی ہے۔ یبتغون فضلا من اللہ و رضوانا کی جگہ پر نعمہ لکھا ہے۔ جہاں پر فضلا من اللہ و نعمہ ہے وہاں یبتغون نہیں ہے۔ (سورۂ حجرات)

دوسری بات یہ عرض ہے کہ تقویت الایمان اور شاہ محمد اسمٰعیل رحؒ کے سلسلہ میں جو مضمون مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی حفظہ اللہ کا چھپ رہا ہے وہ بڑا ہی معیاری اور مثالی ہے، جی چاہتا ہے کہ اُن کو اس مضمون کے سلسلہ میں دعا و ثنا و شکریہ کے کلمات پر مشتمل ایک خط لکھ دوں۔ اگر وہ کہیں مل پائیں تو اُن کا قلم چوم لوں۔ بہت ہی بسط اور شرح و تحقیق کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔ اللہ آپ کے مولانا خلیل الرحمٰن سجّاد ندوی کو زندہ و پائندہ رکھے کہ ایسے اعلیٰ درجے کے مضامین سے اپنے رسالے کو مزیّن فرمارہے ہیں۔ خدا آپ سب کو خوش رکھے اور خدمتِ دین کی توفیق دے۔ ناچیز دعاگو

۶ر۱۱ء ..

(۲)

اسکندریہ (مصر) سے جناب یونس علی صاحب (خریداری نمبر 750/A) لکھتے ہیں۔

محترمی خلیل الرحمٰن سجاد ندوی صاحب۔ السلام علیکم

الفرقان ستمبر ۱۹۹۱ء دستیاب ہوا۔

آپ کا اداریہ جس میں آپ نے الفرقان کی مالی مشکلات کا حال بیان کیا ہے اُس سے دلی تکلیف ہوئی، خاص طور سے اس لئے کہ الفرقان مسلمانوں کی خاص طور سے ہندوستان کے مسلمانوں کی رہنمائی دینی و دنیوی میں اپنے حصہ کی مناسبت سے ادا کر رہا ہے۔ اگرچہ میری نگاہ میں الفرقان کے کچھ مضامین اپنی افادیت کے لحاظ سے محدود ضخامت کے اندر غیر ضروری قرار پاتے ہیں مثلاً ستمبر ۱۹۹۱ء کے ہی پرچہ کو لے لیجئے۔ تقویۃ الایمان کا مضمون پچھلی صدی یا موجودہ صدی سے منتقل موضوع بحث رہا ہے۔ اور بحث کسی بھی شکل میں اس موضوع پر وقت کا ضیاع ہے، میں معلوم کرنا چاہوں گا کہ یہ مضمون شامل کر کے آپ نے دین کی یا عام مسلمان کی کیا خدمت کی ہے۔ دوسرا مضمون سفرحج سے عام شخص کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے سوائے آپ کے چند احباب کے جن کا آپ نے تذکرہ کیا ہے برسبیل خاطر مدارات یا اپنی ارادت کی بنا پر۔ بہر حال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ الفرقان میں ایک تہائی جگہ ان مضامین نے پائی جس کے لئے کوئی خاص جواز نہیں تھا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اس طرح کا الفرقان عام قاری کے لئے کس قدر دلچسپ ہو سکتا ہے پھر آپ کا تقاضا ہے کہ الفرقان کی توسیع اشاعت کی فکر اوڑھ لیں۔

میں نے آپ کے لکھے ہوئے بہت سے مضامین پسند کئے اور خاص طور سے حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کے یعنی آپ کے والد محترم کے مضامین بہت ہی گراں قدر ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز اور صحت دے پچھلے بہت سے پرچوں میں بریلوی عقیدے پر بہت کچھ لکھا گیا۔ میں خود بریلی کا رہنے والا تھا، پھر ۱۹۴۹ء میں پاکستان آگیا۔ پورا خاندان مولانا احمد رضا خاں صاحب سے یا ان کے خانوادے کے بیعت رہا ہے لیکن دین کی معلومات حاصل ہونے پر میں نے محسوس کیا کہ

بریلی عقیدے کے لوگ عام حنفی مسلمان ہیں سوائے چند حرکات یا یوں کہہ لیجئے بدعات کے اور وہ بھی محض سنی سنائی باتوں پر عمل کرتے ہیں جبکہ ان کا دین سے جواز نہیں ہے۔ میں اپنے بچپن سے بریلی اور دیوبندی...... یا ان کی زبان میں وہابی کی چپقلش سنتا چلا آرہا ہوں۔ میرے والد مرحوم اور خاندان کے تمام لوگ وہابیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ کوئی فرقہ سمجھتے تھے، غالباً ان سب باتوں سے نہ دیوبند کو فائدہ ہوا اور نہ بریلی والوں کو ۔۔۔ ہاں نقصان مسلمانوں کا ہوا کہ ان میں تفرقہ پڑ گیا اور اب اس کو بھی سو سال سے اوپر کا عرصہ ہو گیا ہے۔ ہندوستان کا حال معلوم نہیں لیکن پاکستان میں دونوں کے درمیان نہ صرف وسیع خلیج ہے، بلکہ ایک دوسرے نے مسجدیں بھی علیحدہ کر لی ہیں، خدا کے واسطے آپ اس میں وقت ضائع نہ کریں۔ اور نہ ہی الفرقان کے قیمتی صفحات اس پر کالے کئے جائیں۔ غیر مسلم قوموں کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، خاص طور سے عیسائی جو بہت سے فرقوں میں بٹ گئے ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں اختلافات طے کرنے کے لئے بات چیت، مفاہمت، رواداری، محبت، ہمدردی سے ایک دوسرے کے نقطہ نگاہ کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے.......

آپ نے ۲۰ سال کے زرِ تعاون ہندوستان سے باہر رہنے والوں کیلئے ۵۰ ڈالر رکھے ہیں، آپ نے کس طرح ۲۰ سال کے زرِ تعاون کا تخمینہ لگا کر ۵۰ ڈالر مقرر کئے ہیں، دنیا بھر میں مہنگائی ہر سال بڑھتی جا رہی ہے، اور ۲۰ سال میں کسقدر ہو جائے گی، آپ اس وقت اندازہ نہیں کر سکتے، بہر حال یہ آپ کے سوچنے کی بات ہے۔

میری زندگی کی بہت بڑی خواہش ہے کہ میں دیوبند کو دیکھ سکوں میرے دل میں دیوبند کیلئے بہت احترام ہے۔ ۴۰ سال کے بعد ایک سرکاری کام سے دہلی آیا۔ آگرہ میں تاج محل دیکھا اور اپنے شہر بریلی کو صرف ڈیڑھ دن دیکھ سکا۔ اگر حالات ٹھیک ہو جائیں تو پھر ہندوستان کا چکر لگانے کا خیال ہے۔

اخیر میں آپ کے لئے آپ کے والد صاحب کے لئے دل سے دعائیں کرتا ہوں کہ آپ مسلمانوں کی پوری تندہی سے خدمت کرتے رہیں۔

آپ کا دینی بھائی

یونس علی

فروری ۱۹۹۲ء مطابق رجب و شعبان ۱۴۱۲ھ

جلد ... ... ۶۰ | شمارہ ۲

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سرپرست: حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

مدیر: خلیل الرحمٰن سجاد ندوی

قیمت :- ۵/۵۰

سالانہ چندہ

	عام خریداری	اعزازی	لائف ممبری
ہندوستان	۶۰/-	۱۲۰/-	۲۰ سال کا عام خریداری زر تعاون
پاکستان	۱۲۰/-	۲۴۰/-	" " " " "
دیگر ممالک ذریعہ ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر	۵۰ ڈالر	" " " " "
" " بحری ڈاک	۱۵ "	۳۰ "	" " " " "

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :- ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور

برطانیہ میں ترسیل زر کا پتہ :- MR. RAZI, 90-B HANLEY ROAD LONDON N4 3DW

فہرست

نمبر شمار	فہرست مضامین	مضامین نگار	صفحہ
۱	نگاہ اولیں	مولانا عتیق الرحمٰن صاحب سنبھلی	۳
۲	معارف الحدیث	حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ	۷
۳	دولت عثمانیہ کے دورِ اصلاحات کا مختصر جائزہ	مولانا عتیق احمد بستوی	۱۴
۴	تقویۃ الایمان اور شاہ محمد اسمٰعیل کے خلاف برپا شورش تاریخ و حقیقت کے آئینے میں (قسط ۶)	مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی	۲۰
۵	کیا عذابِ قبر کا عقیدہ غیر اسلامی تصور ہے (چوتھی قسط)	مولانا محمد شعیب اللہ خاں صاحب	۳۰
۶	حضرت شیخ الحدیثؒ اور تبلیغی کام ۔ ایک سوال اور اس کا جواب	حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ	۴۱

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہوگئی ہے، براہِ کرم آئندہ کیلئے سالانہ چندہ فوراً ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا اطلاع مہینے کے آخر تک موصول نہ ہونے کی صورت میں اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی روانہ کیا جائے گا۔

ہمارا پتہ: منیجر ماہنامہ الفرقان، نظیر آباد (۳۱ - نیا گاؤں مغربی) لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸ (یو پی الہند)

محمد حسان نعمانی پرنٹر و پبلشر نے سینٹرآف میڈیا پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عتیق الرحمن سنبھلی

نگاہِ اوّلیں

موجودہ حالات میں ہمارا کیا فرض ہے

[راقم السطور ان دنوں لکھنؤ میں ہے۔ اور مدیر الفرقان میاں خلیل الرحمن سجاد کچھ وقت کیلئے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اُن کی عدم موجودگی کی وجہ سے اِن صفحات کی خانہ پُری میرے قلم سے ہو رہی ہے ——————— عتیق]

ہندوستان کی آزادی کے لئے کتنی قربانیاں دی گئی ہیں! یہ ابھی تک کسی ایسے ماضی کا قصہ نہیں بنا ہے جس کے چشم دید گواہ ناپید ہوں، ستر، اسی سال کے ہزاروں لاکھوں آدمی ابھی موجود ہیں، جو آزادی کے لئے دی گئی، طرح طرح کی قربانیوں کا آنکھوں دیکھا حال بتا سکتے ہیں، وہ بتا سکتے ہیں کہ کس طرح لوگوں نے برطانوی حکومت کے ہاتھوں ماریں کھائیں، جیلیں کاٹیں (وہ جیلیں کہ جن میں سیاسی قیدیوں سے اخلاقی قیدیوں والی درد انگیز مشقتیں لی جاتی تھیں) اپنے گھر والوں کو فاقے کرائے، اولاد کے مستقبل داؤں پر لگائے، حکومت کی ملازمتیں ترک کردیں، بڑی بڑی آمدنیوں پر لات ماردی۔ اور کتنے نوجوانوں نے اس تحریک آزادی پر اپنا تعلیمی اور معاشی مستقبل بھینٹ چڑھا دیا، تحریک کے ۴۲ء والے مرحلے کا حال تو راقم الحروف کو بھی خاصی حد تک یاد ہے۔

آزادی کا یہ سنجیدہ پس منظر ذہن میں ہوتے ہوئے جب آج کے ہندوستان پر نظر پڑتی ہے، تو رنج والم کو اپنا اظہار کرنے کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔

جن لوگوں کے ہاتھ میں آزادی کے فوراً بعد ملک کی باگ ڈور آئی وہ اِس مقام اور مرتبے کے حقدار تھے، اور ملک کی بھاری اکثریت اُنھیں اعتماد کی نظر سے دیکھتی تھی، اور اُنھیں بھی اس اعتماد اور اپنی پوزیشن کے وقار کا لحاظ تھا۔ اِن اوّلین لوگوں کے بعد جن لوگوں نے اُن کی جگہ سنبھالی وہ قدرتی طور پر اُن (اگلوں) کے جیسے احترام اور اعتماد کا استحقاق نہیں رکھتے تھے، چنانچہ اُن کے اقتدار کو حریفوں کے چیلنج کا سامنا ہوا، جو کہ ہر اقتدار اور بالخصوص سیاسی اقتدار کا خاصّہ ہے تو انھوں نے عوامی اعتماد کی کمی پوری کرنے کے لئے سیاسی حربوں اور ہتھکنڈوں کے ذریعہ اپنے اقتدار کو بچانے کی راہ اختیار کی۔

سیاست کبھی بھی زیادہ دن تک ہتھکنڈوں کے بغیر نہیں چلتی۔ لیکن سیاسی ماحول کو بلکہ عام ملکی ماحول کو بھی، اگر صحتمند رکھنا منظور ہو تو اِن ہتھکنڈوں کے لئے کچھ حدود قائم کرنا بہرحال ضروری ہے، مغرب جس سے جمہوریت کا نظام ہم نے مستعار کیا ہے، وہاں یہ نظام اسی لئے اب تک کافی آرام سے چل رہا ہے کہ ہارنے جیتنے اور جیت کو ممکن حد تک یقینی بنانے کے لئے جو داؤں پیچ آزمائے جاتے ہیں وہ کچھ حدود وقیود کے بہرحال پابند رہتے ہیں، اور ان حدود سے گزرنے کے مقابلے میں ہار جانا قبول کرلیا جاتا ہے، بدقسمتی سے مغرب کی یہ ریت، جو قابلِ تقلید تھی، ہم نے نہیں اپنائی۔ بلکہ اس کے بجائے ہر قیمت پر اقتدار بچانے کی بُری روایت ڈالدی گئی، اور اسکے نتیجے میں ہر قیمت پر اقتدار حاصل کرنے کا ذہن اُن لوگوں میں پیدا ہو گیا، جو اقتدار سے باہر تھے اور خواہشمند تھے کہ ملک کا اقتدار اُن کے ہاتھ میں آئے۔

ہر قیمت پر اقتدار بچانے اور اُسے محفوظ تر کرنے کی روایت جو ہندوستانی سیاست میں مسز اندرا گاندھی سے پڑی تھی، اُس کی برہنہ ترین مثال ان کے جانشین اور فرزند مسٹر راجیو گاندھی کے آخری عہد میں عدلیہ کو سوفی صدی غیر قانونی کارروائی کے لئے استعمال کرکے بابری مسجد کا تالا کھلوانے اور پھر مسجد کی موقوفہ زمین (جو اَب متنازع کہلاتی ہے) پر رام مندر کا سنگ بنیاد رکھوانے کی صورت میں قائم ہوئی، جس میں دستور اور قانون کو علانیہ بے معنیٰ اور بے آبرو کر دیا گیا، اُس دن کے بعد سے ہمارے ملک کی سیاست جس درجہ بے مہار اور اصول وآئین ہی نہیں عام رکھ رکھاؤ تک سے بے نیاز ہوئی ہے، اس پر رنجیدہ اور فکرمند نہ ہونا کسی بھی حسّاس آدمی کیلئے ممکن نہیں، مسٹر وی پی سنگھ نے اپنے اقتدار کے تحفظ کیلئے

جس طرح مسٹر اڈوانی کی انتہائی شرانگیز اور فتنہ ساماں رتھ یاترا کو اُس آخری لمحے تک چھوٹ دی جبتک کہ مصالحت کی کوئی بھی امید انھیں نظر آتی رہی وہ کیونکر کسی وزیراعظم سے توقع کی جانے والی بات تھی؟ پھر مسٹر سنگھ کی حکومت کا خاتمہ یقینی ہوا تو اُنہی کی پارٹی کے اندر مخالف لیڈر کا کردار ادا کرنے والے مسٹر چندر شیکھر نے کانگریس کے مسٹر راجیو گاندھی کا سہارا پا کر وی پی سنگھ کے خلاف ٹھیک وہی نہ سمجھنے والا کردار ادا کیا جو ۱۹۷۹ء میں جنتا حکومت کے رکن آنجہانی چرن سنگھ نے مسز اندرا گاندھی کا اشارہ پاکر اپنے پارٹی لیڈر اور وزیراعظم مسٹر مرارجی ڈیسائی کے خلاف ادا کیا تھا۔

بھارتیہ جنتا پارٹی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جو کچھ بھی نقطۂ نظر رکھتی ہو، ہمیں اس کے مخالفانہ نقطۂ نظر کے باوجود کچھ خوش گمانی تھی کہ وہ مسلمانوں کے لئے نہ سہی ہندوؤں کے لئے اور اس ملک کے لئے شاید کچھ مخلصانہ خدمت گزاری کا جذبہ رکھتی ہو، اور اُسے موقع ملے گا تو شاید کچھ کرنے کی کوشش کرے، مگر یہ دیکھ کر بیحد افسوس ہو رہا ہے کہ اقتدار تک پہنچنے کی دُھن میں یہ پارٹی ملک اور عام آدمی کے مفاد سے بے نیازی برتنے میں اپنے تمام حریفوں کو مات دیدینا چاہتی ہے۔

ملک کی اقتصادی پوزیشن کمزوری کے کس درجے پر پہنچ گئی ہے؟ عام نظم و نسق کا کیا حال ہے؟ شہروں میں غربت اور گندگی کے مناظر کیسے ناگفتہ بہ ہوتے جا رہے ہیں، اہلکاروں میں رشوت اور فرض ناشناسی کی گرم بازاری نے عام آدمی کی زندگی کیسی اجیرن کر دی ہے؟ اور ملک کے مختلف حصوں میں بےچینی اور علیحدگی پسندی کے رجحانات کیا آگاہی دے رہے ہیں؟ ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں جو ہر شخص پر کھلی ہوئی نہ ہو، مگر ان حالات میں وہ پارٹی جس کو ملک کی محبت اور خیر خواہی کا سب سے بڑا دعویٰ ہے، کن فضول مسئلوں (NON-ISSUES) کو ملک اور قوم کے اوّلین مسائل بنا کر اکثریتی عوام کے ذہن میں اُتار رہی ہے؟ ـــــ بابری مسجد کو گرا کر ـــــ یا ہٹا کر ـــــ اُسکی جگہ پر رام مندر بنانا ـــــ اور کشمیر سے متعلق دستور کی دفعہ ۳۷۰ کو دستور سے نکلوانا! ـــــ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوستان کا کوئی دانا دشمن ہندوستان کی بدخواہی میں اس سے زیادہ اور کیا سوچ سکتا تھا کہ وقت کے واقعی اور سنگین مسائل سے ملک کی اکثریت کو غافل کیا جائے، اور غفلت کیلئے تدبیر بھی وہ استعمال کی جائے جو

بجائے خود کچھ کم قابل تھو؟ مسلمانوں کے خلاف نفرت اور عداوت کی جو آگ ہندو اکثریت میں بھڑکائی جارہی ہے اور پھر اسکے جو اثرات قدرتی طور سے مسلم ذہن پر مرتب ہو رہے ہیں، کچھ اور نہ بھی ہو تو ملک کو تباہی کے راستے پر ڈالنے کے لئے یہی ایک عامل کافی ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ بی جے پی اور اسکی حلیف جماعتوں کے اس رویّے کی خطرناکیوں کو اس دفعہ ہندوؤں کے سنجیدہ اور اہلِ علم طبقے میں بھی پریشانی کی نظر سے دیکھا جارہا ہے، اور کافی لوگ اسکے خلاف سامنے آرہے ہیں، لیکن اس میں اصل امتحان ہم مسلمانوں کا ہے کہ ہم اس رویّے کے مقابلے میں صرف اپنی اور اپنے حقوق کی حفاظت ہی کی فکر کرتے ہیں، جو بلاشبہ ہمارا حق ہے، یا اسکی بھی کوئی تدبیر سوچتے ہیں کہ ہندو عوام کے ذہن میں اسلام اور مسلم دشمنی کا مزید زہر بھرا نہ جاسکے۔ اور جو بھر دیا گیا ہے اُس سے ان کو نجات دلائی جاسکے؟ —— پہلی چیز اگر ہمارا حق ہے تو دوسری ہمارا فرض ہے، اسلام اور مسلمان کی جو تصویر یکطرفہ طور پر ہندوؤں کے ذہن میں زہر کے طور پر بھری جارہی ہے، اسکی کاٹ کیلئے بھرپور اقدام ہمارا فرض ہے، اور یہی وقت جبکہ اسلام اور مسلمان کو ہندو ذہن میں ایک زندہ مسئلہ بنا دیا گیا ہے، اس کام کے لئے بہترین وقت بھی ہے کہ اسلام اور مسلمان کی سچی اور واقعی تصویر ابنائے وطن کے سامنے لائی جائے، اللہ ہمیں توفیق دے، اور راہ کو آسان کرے۔

لائف ممبران کے لئے زرتعاون

گذشتہ شمارے میں الفرقان کی ڈاک کے عنوان کے تحت جناب یونس علی صاحب اسکندریہ (مصر) کا ایک خط شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے دیگر باتوں کے علاوہ لائف ممبری کے زرتعاون کے بارے میں لکھا ہے کہ:۔

"آپ نے کس طرح ۲۰ سال کے زرتعاون کا تخمینہ لگا کر ۵۰ ڈالر مقرر کئے ہیں۔ دنیا بھر میں ہر سال مہنگائی بڑھتی جارہی ہے، اور ۲۰ سال میں کسقدر ہو جائے گی، آپ اس وقت اندازہ نہیں کرسکتے ...."

جناب یونس علی صاحب کے علاوہ بعض دوسرے حضرات نے بھی ہماری توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات تو ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ نہ معلوم کس غلط فہمی کی بنا پر بھائی یونس علی صاحب نے ۲۰ سال کا زرتعاون ۵۰ ڈالر لکھدیا ہے جبکہ ہمارے اعلان اور شائع شدہ شرح کے مطابق بیرونی ممالک کے خریداران کیلئے ۲۵/ ڈالر سالانہ چندہ کے حساب سے ۲۰ سال کا زرتعاون ۵۰۰/ ڈالر ہوتا ہے۔

رہی دوسری بات تو واقعی ہم نے اس طرف توجہ نہیں دی کہ ۲۰ سال میں گرانی میں کیا اضافہ ہوگا اس پر انشاء اللہ غور کرکے کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔ محمد حسان نعمانی۔ ناظم ادارہ الفرقان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ

مَعَارِفُ الْحَدِيْث

کتاب المناقب والفضائل (۲۸)

فضائلِ اہلبیت نبوی: ازواجِ مطہرات اور ذریت طیبہ (۲)

فضائلِ ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضؓ

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: أَتَى جِبْرِيْلُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: "يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هٰذِهٖ خَدِيْجَةُ قَدْ أَتَتْ مَعَهَا إِنَاءٌ فِيْهِ إِدَامٌ وَطَعَامٌ، فَإِذَا أَتَتْكَ فَاقْرَأْ عَلَيْهَا السَّلَامَ مِنْ رَبِّهَا وَمِنِّيْ وَبَشِّرْهَا بِبَيْتٍ فِي الْجَنَّةِ مِنْ قَصَبٍ لَا صَخَبَ فِيْهِ وَلَا نَصَبَ"

——— رواہ البخاری ومسلم

ترجمہ: ۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، انھوں نے بیان کیا کہ جبرئیلؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ اے رسولِ خدا! یہ خدیجہ آرہی ہیں ان کے ساتھ ایک برتن ہے اس میں سالن اور کھانا ہے، جب وہ آپ کے پاس آجائیں تو انکو انکے پروردگار کی طرف سے سلام پہونچایئے اور میری طرف سے بھی،

اور انکو خوشخبری سنا یئے جنت میں موتیوں سے بنے ہوئے ایک گھر کی جس میں نہ شور وشغب ہوگا اور نہ کوئی زحمت و مشقت ہوگی ـــــ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح: ـــ حدیث کا مطلب واضح ہے کسی تشریح و وضاحت کا محتاج نہیں، لیکن اس میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ حضرت جبریلؑ کی یہ آمد کہاں اور کب ہوئی، جس میں انھوں نے حضرت خدیجہؓ سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات کہی۔

فتح الباری میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اسی حدیث کی شرح کرتے ہوئے طبرانی کی ایک روایت کے حوالہ سے لکھا ہے: إِنَّ ذٰلِكَ كَانَ وَهُوَ بِحِرَاءَ ـــــــ یعنی جبرئیلؑ کی یہ آمد اُس وقت ہوئی تھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حراء میں تھے ـــــــ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ واقعہ غارِ حراء میں حضرت جبرئیلؑ کی اُس پہلی آمد کے بعد کا ہے جس کا ذکر اسی سلسلۂ معارف الحدیث کتاب المناقب کے شروع میں "آغازِ وحی و نبوت" کے تحت پوری تفصیل سے کیا جا چکا ہے ـــــــ اسی سے ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضرت جبرئیلؑ کی پہلی آمد اور آغازِ نبوت کے بعد اس غارِ حراء میں آپ کی خلوت گزینی کا سلسلہ بالکل ختم اور منقطع نہیں ہو گیا تھا ـــــ یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ جہاں آپ طویل مدت تک خلوت گزیں ہو کر اللہ تعالیٰ کے ذکر و عبادت میں مشغول رہے ہوں، اور جہاں اس کے عظیم المرتبہ حامل وحی فرشتے جبرئیل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا نزول آپ پر شروع ہوا ہو، اُس کے بعد آپ کا اس مقدس مقام سے کوئی تعلق نہ رہا ہو ـــــ الغرض اس روایت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آغازِ نبوت کے بعد بھی آپ غارِ حراء میں کبھی کبھی قیام فرماتے تھے، اسی دور میں یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت جبرئیلؑ آئے اور آپ کو مطلع کیا کہ آپ کی زوجۂ محترمہ خدیجہؓ آ رہی ہیں اور آپ کیلئے کھانے کا کچھ سامان لا رہی ہیں، جب وہ آئیں تو آپ اُن کے پروردگار کی طرف سے اور میری طرف سے بھی اُنکو سلام پہونچائیں، اور اُن کو موتیوں سے جنت میں بنے ہوئے ایک ایسے گھر کی بشارت دیں جس میں نہ شور وشغب ہوگا، اور نہ کسی قسم کی زحمت اور نہ تکلیف ہوگی۔

اس حدیث سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی تین خاص فضیلتیں معلوم ہوئیں۔

۱۔ وہ ایک معزز دولتمند اور بوڑھی خاتون ہونے کے باوجود حضور کیلئے کھانے پینے کا سامان گھر پر تیار کر کے غارِ حراء تک خود لیکے گئیں، جو کہ اُس وقت شہر مکہ مکرمہ کی آبادی سے قریباً ڈھائی تین میل کے فاصلہ پر تھا، اور حراء کی بلندی کی وجہ سے اس پر چڑھنا اچھے طاقتور آدمی کیلئے بھی آسان نہیں (راقم سطور کو خود بھی اس کا تجربہ ہے) بلاشبہ حضرت خدیجہؓ کا یہ عمل ایسا ہی تھا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی بارگاہ میں اس کی خاص قدر ہو۔

۲۔ دوسری بڑی فضیلت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انکو ربّ العرش اللہ تعالیٰ کا سلام اور اسی کے ساتھ اس کے عظیم المرتبہ فرشتے جبرئیل امین کا سلام پہونچایا گیا ہے۔

۳۔ جنت میں ان کیلئے موتیوں سے بنے ہوئے بیت (گھر) کی بشارت دی گئی جس کی خاص صفت یہ بیان کی گئی کہ نہ تو اس میں کسی قسم کا شور وشغب ہوگا اور نہ کسی طرح کی زحمت وتکلیف اٹھانی پڑے گی، جیسا کہ دنیا کے گھروں میں عام طور سے اپنے گھر والوں کا یا پاس پڑوس کا شور وشغب آرام و یکسوئی میں خلل انداز ہوتا ہے اور جس طرح گھر کی صفائی اور درستی وغیرہ میں زحمت وتکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔

عَنْ عَلِیٍّ (رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ) قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: خَیْرُ نِسَائِہَا مَرْیَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ، وَخَیْرُ نِسَائِہَا خَدِیْجَۃُ بِنْتُ خُوَیْلِدٍ ـــــــــــ رواہ البخاری ومسلم

ترجمہ:۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرماتے تھے کہ اس (دنیا) کی عورتوں میں سب سے بہتر مریم بنتِ عمران ہیں، اور اس (دنیا) کی عورتوں میں سب سے بہتر خدیجہ بنتِ خویلد ہیں ـــــــــــ (صحیح بخاری ومسلم)

تشریح:۔ حدیث کے ظاہری الفاظ سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہماری اس دنیا کی تمام عورتوں میں سب سے بہتر اور بالاتر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ حضرت مریم بنتِ عمران اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ محترمہ ام المؤمنین حضرت خدیجہ بنتِ خویلد ہیں، اگر حدیث کا مطلب

یہی ہو تو یہ سمجھا جائیگا کہ یہ دونوں مرتبہ میں برابر ہیں ـــــ بعض شارحین نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ حضرت مریم پہلی امتوں کی تمام عورتوں میں بہتر اور بالاتر ہیں، اور حضرت خدیجہ اس امتِ محمدیہ کی تمام عورتوں میں بہتر اور بالاتر ہیں، اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ امت خیر امم ہے۔ یعنی پہلی تمام امتوں سے بہتر اور بالاتر ہے، اس لئے حضرت خدیجہ بہ نسبت حضرت مریم بنت عمران کے بہتر اور برتر ہوں گی ـــــ واللہ اعلم

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: مَا غِرْتُ عَلٰى أَحَدٍ مِّنْ نِسَاءِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا غِرْتُ عَلٰى خَدِيْجَةَ وَمَا رَأَيْتُهَا، وَلٰكِنْ كَانَ يُكْثِرُ - ذِكْرَهَا، وَرُبَّمَا ذَبَحَ الشَّاةَ ثُمَّ يُقَطِّعُهَا أَعْضَاءً، ثُمَّ يَبْعَثُهَا فِي صَدَائِقِ خَدِيْجَةَ فَرُبَّمَا قُلْتُ لَهٗ: كَأَنَّهٗ لَمْ تَكُنْ فِي الدُّنْيَا امْرَأَةٌ إِلَّا خَدِيْجَةُ، فَيَقُوْلُ: إِنَّهَا كَانَتْ، وَكَانَتْ، وَكَانَ لِيْ مِنْهَا وَلَدٌ ـــــ رواہ البخاری ومسلم

ترجمہ: ـ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انھوں نے فرمایا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں سے کسی پر ایسا رشک نہیں آیا جیسا کہ خدیجہ پر آیا، حالانکہ میں نے ان کو دیکھا نہیں لیکن آپ انکو بہت یاد کرتے اور بکثرت ان کا ذکر فرماتے، کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ آپ بکری ذبح فرماتے، پھر اس کے اعضاء کے الگ الگ ٹکڑے کرتے، پھر وہ ٹکڑے خدیجہ سے میل محبت رکھنے والیوں کے یہاں بھیجتے تو میں کسی وقت کہہ دیتی: دنیا میں بس خدیجہ ہی ایک عورت تھیں! اور آپ فرماتے کہ وہ ایسی تھیں، ایسی تھیں، ایسی تھیں، اور ان سے میری اولاد ہوئی ـــــ (صحیح بخاری ومسلم)

تشریح: ـ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جن اخلاقِ حسنہ سے نوازا تھا، اُن میں ایک احسان شناسی کا وصف بھی تھا، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

نکاح میں آنے کے بعد آپ کی جو خدمتیں کیں، اور دورِ نبوت کے آغاز میں جس طرح وہ آپ کیلئے تقویت اور تسلی کا ذریعہ بنیں، اور پھر دینِ حق کی دعوت کے وقت جس طرح وہ شدائد و مصائب میں آپ کی شریکِ حال رہیں، اور انکے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ نے جو خصوصیات انکو عطا فرمائی تھیں (جن میں سے کچھ کا ذکر اوپر آچکا ہے) ان کا حق تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انکو کبھی فراموش نہ کرتے، اور احسان شناسی کے جذبہ کا تقاضا تھا کہ آپؐ ان کا اور انکی خدمات واحسانات کا دوسروں کے، خاص کر اپنی ازواج مطہرات کے سامنے ذکر فرماتے، یہی آپؐ کا عمل تھا، یہاں تک کہ اس سلسلہ میں آپؐ کا ایک یہ بھی معمول تھا کہ کبھی کبھی آپؐ بکری ذبح کرتے تو اسکے گوشت کے پارچے حضرت خدیجہؓ سے میل محبت کا تعلق رکھنے والی خواتین کو ہدیہ کے طور پر بھیجتے آپؐ کا یہی وہ طرزِ عمل تھا جس کی بناء پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے آپؐ کی ازواجِ مطہرات میں سے کسی پر ویسا رشک نہیں آیا جیسا کہ آپؐ کی پہلی مرحومہ بیوی خدیجہؓ پر آتا تھا، حالانکہ میں نے انکو دیکھا بھی نہیں تھا (کیونکہ انکے بچپنے ہی میں وہ وفات پاگئی تھیں) —— اسی سلسلۂ بیان میں حضرت صدیقہؓ نے خود ہی اپنی اس کمزوری کا ذکر فرمایا کہ میں" ایسے وقت جب آپ اپنی مرحومہ بیوی خدیجہؓ کی خوبیوں کا ذکر فرماتے تو کبھی کہہ دیتی: کہ دنیا میں بس خدیجہؓ ہی ایک عورت تھیں"۔ تو آپؐ فرماتے: کہ وہ ایسی تھیں، ایسی تھیں، ایسی تھیں"۔ مطلب یہ ہے کہ آپؐ اُن کی خدمات واحسانات اور خوبیوں کا ذکر فرماتے، اس سلسلہ میں آپؐ ان کی اس خصوصیت کا بھی ذکر فرماتے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں کے ذریعہ مجھے اولاد عطا فرمائی —— کیونکہ ان کے علاوہ دسؓ بیویوں میں سے کسی سے بھی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

یہاں یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ حضرت ماریہ قبطیہؓ سے ایک صاحبزادے پیدا ہوئے تھے، جن کا نام آپؐ نے ابراہیمؑ رکھا تھا، وہ شیرخوارگی ہی کے ایام میں قریباً صرف ڈیڑھ سال کی عمر پاکر انتقال فرماگئے تھے، لیکن حضرت ماریہؓ آپؐ کی ازواجِ مطہرات میں سے نہیں تھیں، بلکہ آپؐ کی مملوکہ تھیں، جنکو اسکندریہ کے صاحبِ حکومت مقوقس نے کچھ اور ہدایا کے ساتھ آپؐ کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر بھیجا تھا، پھر وہ حضرت ابراہیم کی پیدائش کے بعد شریعت کے حکم کے مطابق "ام ولد" ہوگئیں تا آنکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ۵ سال بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں وفات پائی۔ (رضی اللہ عنہا وأرضاہا)

اُمُّ المؤمنین حضرت سودہ بنت زمعہ (رضی اللہ عنہا)

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالی کے حکم سے قوم کو بُت پرستی اور جاہلیت والی زندگی چھوڑ کر خدائے واحد کی پرستش اور اسی کی فرمانبرداری والی زندگی کی دعوت کا کام شروع کیا، تو پوری قوم آپ کی دشمن بن کر کھڑی ہو گئی، لیکن چند ایسے سلیم الفطرت افراد بھی تھے، جنکے دلوں نے آپؐ کی دعوتِ حق کو ابتدائی دور ہی میں قبول کر لیا، اُن میں ایک سودہ بنتِ زمعہ عامریہ بھی تھیں، انکی شادی اپنے چچا زاد بھائی سکران سے ہوئی تھی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوتِ اسلام کی دشمنی میں عام مشرکین قریش کے ساتھ تھا حضرت سودہؓ نے مصلحت اس میں سمجھی کہ وہ اپنے اسلام کو ظاہر نہ کریں ___ جس وقت وہ مناسب سمجھتیں تو اپنے شوہر سکران کے سامنے ایسی باتیں کرتیں جن سے اس کا دل بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور اسلام کی حقانیت کے بارے میں سوچنے لگے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کی توفیق سے ان کے شوہر سکران نے بھی کچھ مدّت کے بعد اسلام قبول کر لیا، اور پھر میاں بیوی دونوں نے اپنے ایمان واسلام کا علانیہ اظہار بھی کر دیا جس کے بعد ان دونوں پر بھی کفارِ قریش کی طرف سے ظلم وستم کا سلسلہ شروع ہو گیا جو بڑھتا ہی گیا ___ بالآخر ان مظالم سے تنگ آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ پر ان دونوں نے بھی بہت سے دوسرے مظلوم اور ستم رسیدہ مسلمانوں کی طرح ملک حبشہ کی طرف ہجرت کی ___ چند برس کے بعد ان کے شوہر سکران کا حبشہ ہی میں انتقال ہو گیا، تو یہ بیوہ ہو کر مکہ مکرمہ واپس آ گئیں اور اپنے والد کے پاس رہیں۔

نبوت کے دسویں سال جب ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ کی وفات ہوئی تو آپؐ فطری طور پر ان کی مفارقت کے صدمہ سے سخت غمگین تھے، علاوہ اس کے ایک پریشان کن صورت حال یہ پیدا ہو گئی کہ گھر میں صرف کم عمر چار بچیاں تھیں جنکی دیکھ بھال کرنے والا اور خانہ داری کی دوسری ضرورتیں پوری کرنیوالا کوئی نہ تھا ___ عثمان بن مظعون کی بیوی خولہ بنت حکیم نے اس صورتِ حال کو محسوس کر کے آپؐ سے عرض کیا کہ آپ کو جلدی نکاح کر لینا چاہیئے! آپؐ نے فرمایا: تمھاری نگاہ میں کون ایسی خاتون ہیں جنکو

تم ان حالات میں مناسب سمجھتی ہو؟ انھوں نے سودہ بنتِ زمعہ کا نام لیا، جو بیوہ اور سن رسیدہ تھیں، آپؐ نے ایمان میں انکی سابقیت، پھر حبشہ کی طرف ہجرت اور شوہر سکران کی وفات کے بعد ان کی بیوگی کے صدمہ کا لحاظ فرماتے ہوئے ان سے نکاح کرنے کا ارادہ فرمالیا، اور خولہ سے فرمایا: تم خود ہی انکو میرا پیغام پہونچاؤ ـــــ خولہ کا بیان ہے کہ میں سودہ کے پاس پہونچی اور ان کو مبارکباد دیتے ہوئے آپ کا پیغام پہونچایا، اُنھوں نے کہا کہ "میں دل و جان سے راضی ہوں" البتہ بہتر یہ ہے کہ تم میرے والد زمعہ سے بھی اس سلسلہ میں بات کر و، میں اسی وقت انکے پاس بھی گئی، اور پیام پہونچایا، انھوں نے بھی اپنی رضامندی ظاہر کی، ساتھ ہی اُنھوں نے کہا کہ تم خود سودہ سے بھی دریافت کرو، میں نے بتایا کہ میں ان سے بات کر چکی ہوں، وہ بڑی خوشدلی کے ساتھ رضامند ہیں، بالآخر زمعہ نے خولہ بنت حکیم ہی کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلوایا، اور آپ کے ساتھ اپنی بیٹی سودہ کا نکاح کر دیا، اُس وقت حضرت سودہ کی عمر قریبًا پچاس سال تھی ـــــ نکاح کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت فرمانے تک تین سال منکوحہ رفیقۂ حیات کی حیثیت سے تنہا وہی آپ کے ساتھ رہیں ـــــ ان کے اوصاف و احوال میں ان کی سیر چشمی، استغناء، دنیا سے بے رغبتی، اور فیاضی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ ان کے مذکورہ بالا امتیازات کی وجہ سے ان کے ساتھ احترام کا خاص رویہ رکھتے تھے، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے درہموں سے بھری ہوئی ایک تھیلی، ان کی خدمت میں بھیجی، لانے والے سے پوچھا: کیا تھیلی میں کھجوریں ہیں؟ انھوں نے کہا نہیں! اس میں درہم ہیں، آپ نے فرمایا: کھجوریں ہوتیں تو کھانے کے کام میں آجاتیں، یہ کہہ کر تھیلی لے لی، اور اس میں بھرے ہوئے سب درہم ضرورتمندوں پر تقسیم فرما دیئے۔

حضرت عمرؓ کے اخیر دورِ خلافت ۲۲ھ میں قریبًا ۷۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔

(رضی اللہ عنہا وارضاہا)

مولانا عتیق احمد بستوی
استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

دولتِ عثمانیہ کے دورِ اصلاحات کا مختصر جائزہ

دسویں صدی ہجری، سولہویں صدی عیسوی کے آخر تک دولتِ عثمانیہ دنیا کی عظیم تر سلطنت تھی، اس کا داخلی نظم ونسق، فوجی نظام، عدل وانصاف اس وقت کی تمام حکومتوں میں بے مثال تھا، عثمانی فتوحات کا سیلاب بڑی تیزی سے یورپ، ایشیا، افریقہ میں بڑھ رہا تھا، عثمان خاں اوّل سے لیکر سلیمانِ اعظم قانونی تک دولتِ عثمانیہ کے تخت پر دس ایسے فرمانروا تخت نشین ہوئے جو اپنی عقل وتدبّر، شجاعت وسیاست، سلیقۂ جہانگیری وجہاں بانی میں بے نظیر تھے، تاریخِ عالم میں بہت کم کسی سلطنت کو مسلسل ایسے دس فرمانروا نصیب ہوئے ہوں گے، سترہویں صدی سے اس کی فتوحات کا سیلاب ختم ہوا سلیمان اعظم قانونی ہی کے دور میں سلطنتِ عثمانیہ کے اسباب زوال کی نشوونما شروع ہوگئی لیکن اسکے بعد بھی مدت تک یورپ کے قلب ودماغ پر دولتِ عثمانیہ کی سطوت وشوکت، قوت وجبروت کی دھاک بیٹھی رہی، سلطان محمد رابع کے عہد میں ویانا کے دوسرے محاصرہ (۱۶۸۳ء) کی ناکامی اور ترکوں کی شکست فاش کے بعد دولتِ عثمانیہ کا خوف اہلِ یورپ کے دلوں سے تقریبًا ختم ہوگیا، اور پڑوسی سلطنتوں نے حملے شروع کر دیئے، اٹھارہویں صدی عیسوی میں دولتِ عثمانیہ کے زیادہ تر معرکے روس اور اسٹریا سے پیش آئے، روس اور اسٹریا کی فوجیں اگرچہ یورپ کے جدید اصولِ حرب پر ٹریننگ پا چکی تھیں پھر بھی دولتِ عثمانیہ کی فوجوں نے غیر معمولی جانبازی وشجاعت سے انکا مقابلہ کیا، دشمن کی

جنگی مہارت اور جدید آلاتِ حرب کے مقابلہ میں جو کمی تھی اسے عثمانیوں نے اپنے جوشِ ایمانی اور جذبۂ جہاد سے پورا کیا، پورا زور صرف کر دینے کے باوجود روس و اسٹریا سلطنت عثمانیہ کے بہت تھوڑے علاقوں پر قبضہ کر سکے، انیسویں صدی میں بڑی تیزی سے عثمانی مقبوضات کا سقوط شروع ہوا سترہویں صدی میں جب عثمانی فوجوں کو بعض محاذوں پر شکست ہونے لگی، اسی وقت سے دولتِ عثمانیہ کے خاص خاص حلقوں میں ملک کی فوجی تنظیم اور نظامِ سلطنت کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا جانے لگا اور اربابِ فکر نے جدید اصلاحات کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا اور دن بہ دن یہ رجحان بڑھتا رہا، اٹھارہویں صدی کے آخر میں مصر پر نپولین کے حملے نے عثمانی فوجوں کی تنظیم و تربیت کی ناکامی دو و دو چار کی طرح واضح کر دی اس کے بعد بڑی تیزی سے ہمہ جہتی خصوصاً فوجی اصلاحات جاری کی جانے لگیں۔

مندرجہ ذیل صفحات میں ہم مختصراً ان اصلاحات کو پیش کر کے ان پر حقیقت پسندانہ تبصرہ کریں گے، ان اصلاحات کو ہم چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ (۱) سلطان سلیم ثالث سے پہلے کا دور، (۲) سلیم ثالث کا دور (۳) محمود ثانی کا دور (۴) سلطان عبدالمجید کا دور۔

اصلاحات کا دورِ اوّل

سلطان سلیم ثالث سے پہلے کے دور میں ہمیں دولتِ عثمانیہ کی تاریخ میں اصلاحات کے دھندلے نقوش اور متفرق اقدامات ہی ملتے ہیں، کوئی منصوبہ بند سرگرمی اور تحریک نہیں ملتی مختلف سلاطین و وزراء نے وقتی ضرورت اور ملکی مصالح کی بنا پر بعض اصلاحی قدم اٹھائے جن سے ملک کے قدیم انتظامی ڈھانچے میں کوئی دیرپا، انقلابی تبدیلی نہیں آئی، مراد رابع (۱۰۲۳ھ/۱۶۲۳ء تا ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء) نے سلطنت کا روز بروز زوال و اضمحلال دیکھ کر چند فوجی اصلاحات کیں۔ اناطولیہ کے قاضی عسکر کی مدد سے بعض انتظامی تبدیلیاں بھی کیں[1] سلطنت کے قوانین کو سختی کے ساتھ نافذ کیا، ان افسروں اور سرکاری ملازمین کو عبرتناک سزائیں دیں، جو بددیانتی، رشوت ستانی اور ظلم و ستم کے مرتکب ہوتے تھے کوپریلی

---

[1] حرکۃ الاصلاح العثمانی۔ ڈاکٹر عبداللطیف البحراوی۔

خاندان کے وزراء نے بھی ملکی نظم و انتظام کے سلسلے میں بعض اہم اقدامات کئے لیکن ان کے اقدامات زیادہ تر عیسائی رعایا کے ساتھ حسنِ سلوک اور انھیں انصاف دلانے سے متعلق تھے مصطفیٰ کوپریلی نے تمام پاشاؤں کے نام احکام جاری کئے کہ عیسائی رعایا پر کسی قسم کی سختی نہ کی جائے، اُن احکام کی پابندی نہ کرنے والوں کو سخت سزائیں دیں۔ عیسائیوں کو نیا کلیسا تیار کرنے کی ممانعت تھی مصطفےٰ کوپریلی نے یہ پابندی ختم کر دی۔ حسین کوپریلی نے فوج، بحریہ، مالیات، مدارس و جوامع، اوقاف و مساجد تمام شعبوں میں کچھ نہ کچھ اصلاحات جاری کیں[1]۔

سلطان احمد ثالث کے دور میں قسطنطنیہ میں پہلا مطبع قائم ہوا، اس کے آغاز سے پہلے مفتیِ اعظم اور علمائے کرام نے مطبع کی شرعی حیثیت پر بحثیں کیں۔ اور بڑے غور و خوض کے بعد تصحیح اور جودتِ طبع کی شرط کے ساتھ مطبع جاری کرنے کی اجازت دی لیکن اس وقت احتیاطاً خالص دینی کتابوں کی طباعت روک دی، کچھ دنوں بعد جب اسکی صحت طباعت اور تصحیح پر اعتماد ہو گیا، تو دینی کتابوں کی طباعت کی بھی اجازت دیدی[2]، دولتِ عثمانیہ عملاً بھی اسلامی حکومت تھی اسلئے اسکے سربراہ کوئی نیا قدم اٹھانے سے پہلے مفتیِ اعظم سے شرعی حکم دریافت کرتے اور ان کے فتوی کے بعد ہی اسے بروئے کار لاتے۔

سلطان محمود اول (۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء، ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء) نے فوجی نظام کی اصلاح پر خصوصی توجہ دی، فوجی اصلاحات کا راستہ ہموار کرنے کیلئے فنون جنگ پر یورپین کتابوں کا ترجمہ کرا کے انکی اشاعت کی تاریخ، جغرافیہ، ترکی زبان و ادب وغیرہ کے موضوع پر بھی بہت سی کتابیں اسکے عہد میں شائع ہوئیں اسی کے عہد میں احمد پاشا نے توپ خانہ کی اصلاح کی اور اسکدار میں انجینیرنگ کا ایک اسکول قائم کیا لیکن ینی چری کی شدید مخالفت کی بنا پر یہ اسکول بند کرنا پڑا۔

محمود اول کے بعد سلطان مصطفےٰ ثالث (۱۱۷۱ھ/۱۷۵۷ء، ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء) نے بھی اصلاحات کے میدان میں چند اہم قدم اٹھائے، اگرچہ مسلسل جنگوں کی وجہ سے وہ وسیع پیمانے پر اصلاحات برپا نہ کرسکا۔

---

[1] دولت عثمانیہ۔ ڈاکٹر محمد عزیر۔ [2] حرکۃ الاصلاح العثمانی ص۹۳ ڈاکٹر عبداللطیف البحراوی۔

اس کا صدر اعظم راغب پاشا یورپ کی علمی ترقیات کا گرویدہ تھا، اسکی حوصلہ افزائی سے یورپین مفکرین نیوٹن۔ وولٹر وغیرہ کے افکار و خیالات کا ترکی میں ترجمہ ہوا، مصطفیٰ ثالث بسا اوقات ممالک یورپ کے سفراء کو مدعو کر کے اصلاحات سے متعلق تبادلۂ خیالات اور مشورے کیا کرتا تھا، اس نے بعض فرانسیسی ماہرین کی مدد سے بارود خانہ قائم کیا اور توپ و تفنگ کے فنون کی تعلیم کیلئے ایک مدرسہ بھی قائم کیا۔ راغب پاشا نے اپنی جیب خاص سے قسطنطنیہ میں ایک عظیم الشان پبلک لائبریری قائم کی۔ اور متعدد شفاخانے اسی کے عہد میں تعمیر ہوئے۔

سلطان عبد الحمید اوّل (۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء - ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۹ء) نے بھی اصلاح کی کوششیں جاری رکھیں، صلحنامہ کینارجی (۱۷۷۴ء) کے بعد سلطان نے فوجی اصلاحات کو اپنا میدان عمل بنایا۔ فرانسیسی جرنلوں کی مدد سے اس نے توپ خانہ کو مضبوط کیا اور ترقی دی، فوجی انجینیرنگ کالج قائم کر کے نوجوانوں کو فوجی انجینیرنگ کی اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ اس کے عہد میں فنونِ جنگ پر کتابوں کی تصنیف اور ترجمہ میں خاصی پیش رفت ہوئی سلطان کے معتمد قبطان پاشا حسن جزائری نے بحریہ کو خاصی ترقی دی، ایک انگریز جہاز ساز کی مدد سے اس نے نئے طرز کے جنگی جہاز تیار کرائے۔

اصلاحات کا دوسرا دور

۱۲۰۳ھ/۱۷۸۹ء میں سلطان سلیم ثالث ستائیس ۲۷ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، سلیم ثالث سلطان مصطفیٰ ثالث کا اکلوتا لڑکا اور سلطان عبد الحمید اول کا چہیتا بھتیجا تھا فطری طور پر بڑا ذکی و ذہین تھا، عبد الحمید اول نے اسکی تعلیم و تربیت کے بہترین انتظامات کئے۔ بہ ظاہر سرائے سلطانی میں نظر بند ہونے کے باوجود عبد الحمید اول کی شفقت و محبت نے اسے پوری آزادی دے رکھی تھی ان حالات سے فائدہ اٹھا کر اس نے تخت نشینی سے پہلے ہی امورِ سلطنت کی پوری واقفیت بہم پہونچائی اور اپنے کو حکمرانی کا اہل بنا لیا، اس کے باپ مصطفیٰ ثالث نے اس کے لئے اپنے دورِ حکومت کی ایک سرگزشت چھوڑی تھی جس میں اس کے دور کے خاص خاص واقعات درج تھے، اور دولت عثمانیہ

کے انحطاط وزوال اور نظامِ سلطنت کے فساد وانتشار پر تبصرہ اور اصلاحات کا ایک مفصل خاکہ تھا، تخت نشینی کے بعد اس نے ایک اطالین طبیب لورنزو کو اپنا ہمراز اور مشیر خاص بنایا، لورنزو سے اس نے مغربی یورپ کی سلطنتوں، وہاں کے نظامِ مملکت، فوجی تنظیم اور اسباب ترقی کے سلسلہ میں پوری واقفیت حاصل کی، کئی سال تک شاہ فرانس اور اس کے وزراء سے خفیہ خط وکتابت رکھی اور فرانسیسی تہذیب وثقافت کا گرویدہ ہوگیا۔

زمامِ سلطنت سنبھالنے کے بعد سلیم ثالث نے اصلاحات کا ہمہ گیر وہمہ جہت منصوبہ تیار کیا اور اس پر کاربند ہوگیا، سلیم ثالث کی اصلاحات کو ہم تین بڑے خانوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ (۱) انتظامی (۲) فوجی (۳) معاشرتی۔

(۱) انتظامی اصلاحات

سلطان سلیم ثالث کے دور میں دولتِ عثمانیہ چھبیس[۲۶] ولایتوں پر مشتمل تھی، یہ ولایتیں ایک سو تریسٹھ (۱۶۳) علاقوں میں تقسیم تھیں جن کو لوا کہا جاتا تھا، ہر لوا میں متعدد قضا یا ضلع ہوتے تھے، ہر قضا (ضلع) عموماً ایک شہر اور اس کے ماتحت علاقوں پر مشتمل ہوتا تھا، ولایت کا حاکمِ اعلیٰ پاشا ہوتا تھا، جس کی حیثیت وزیر کے برابر ہوتی تھی، پاشا اپنی ولایت کی ایک یا چند لواؤں پر براہِ راست حکومت کرتا تھا، بقیہ لواؤں کے حکام پر اس کی سیادت تسلیم کی جاتی تھی۔ پاشا کا تقرر عموماً ایک سال کیلئے ہوا کرتا تھا، بسا اوقات یہ منصب بڑی رشوت دیکر حاصل کیا جاتا، پاشائی کے امیدواروں کے پاس عام طور پر اس منصب کی "خریداری" کیلئے کافی رقم نہ ہوتی اسلئے وہ کسی دولت مند یونانی یا ارمنی ساہوکار سے بھاری قرض لیکر یہ رشوت ادا کرتے، قرض دینے والے ساہوکار کا ایک معتمد ایجنٹ پاشا کے ساتھ بہ طور سکریٹری کے رہتا اور عموماً صوبے کا اصلی حکمراں وہی ہوتا، یہ عیسائی ایجنٹ اپنے ہم مذہب عیسائی رعایا کو بہت تنگ کرتے اور ان پر نئے نئے ظالمانہ ٹیکس عائد کرتے تاکہ رشوت میں دی ہوئی بھاری رقم سود کے ساتھ وصول ہوجائے، پاشا اور اسکے کارندوں کی ولایت کے باشندوں پر اتنی مضبوط گرفت ہوتی کہ انکی شکایتیں بابِ عالی تک

نہیں پہونچ پاتیں لیکن اگر باشندوں کی طرف سے پاشا کی پرزور شکایتیں باب عالی تک پہونچ جاتیں اور تحقیق کرنے پر صحیح ثابت ہوتیں تو پاشا کو نہ صرف معزول کر دیا جاتا بلکہ جرم کی سنگینی کی صورت میں قتل کر دیا جاتا تھا مگر اس کی نوبت کم ہی آتی تھی، باب عالی کی طرف سے پاشا کی مدد کے لئے دو یا تین آدمی مقرر کئے جاتے جن کا انتخاب اسی ولایت کے باشندے کرتے انھیں اعیان کہا جاتا تھا بسا اوقات اعیان بھی پاشاؤں کے ساتھ ظلم و ستم میں شریک ہو جایا کرتے۔

سلطان سلیم ثالث نے اولاً تو اسکی کوشش کی کہ حکام اور پاشاؤں کے تقرر میں رشوت ستانی کا سلسلہ بند ہو، افسروں اور اہل کاروں کا تقرر کارکردگی اور لیاقت کی بنیاد پر ہو، رشوت اور سفارش کی بنیاد پر نہ ہو، ثانیاً قانون بنا دیا کہ پاشا کا تقرر بجائے ایک سال کے تین سال کیلئے ہوا کریگا تاکہ اسے ولایت کو ترقی دینے اور وہاں تعمیری اور رفاہی منصوبے بروئے کار لانے کیلئے خاصا وقت مل سکے اور تین سال کی مدت پوری ہونے کے بعد پاشا کا دوبارہ تقرر صرف باشندگان ولایت کی رضامندی سے کیا جائے، سلیم ثالث نے پاشاؤں کے اختیارات بہت کچھ کم کر دیئے اور قانون بنا دیا کہ ملک کے باشندوں سے خراج اور عشر وغیرہ مرکزی حکومت کے کارندے وصول کریں گے، پاشاؤں کو خراج، مالگذاری وصول کرنے کا کوئی حق نہیں، اسی طرح اس نے مرکزی حکومت میں صدرِ اعظم کے اختیارات میں بہت کمی کر دی، اسے پابند بنایا کہ تمام اہم امور میں دیوان سے مشورہ لیا کرے۔

سلیمان قانونی نے بڑی مستحکم اور منصفانہ بنیادوں پر نظام جاگیرداری قائم کیا تھا جس میں کلیتہً ظلم و ستم کا سدِّ باب کر دیا گیا تھا لیکن مرکزی حکومت کی روز افزوں کمزوریوں کی وجہ سے جاگیرداروں نے سلیمان قانونی کی عائد کردہ پابندیاں اور قوانین نظر انداز کر دیئے اور بڑی حد تک خود سر و خود مختار ہو بیٹھے، جسکے نتیجے میں ملک میں ابتری بڑھتی گئی محنت کش، کسان، مزدور طبقہ کا استحصال کیا جانے لگا ان حالات کا جائزہ لیکر سلیم ثالث نے نظام جاگیرداری منسوخ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور قانون بنا دیا کہ موجودہ جاگیرداروں کے مرنے پر انکی جاگیریں ضبط کر لی جائیں اور آئندہ ان جاگیروں کی آمدنی سرکاری خزانہ میں جمع کی جائے اور اس سے نئی فوج کے مصارف ادا کئے جائیں۔ (جاری)

مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

تقویۃ الایمان اور شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ کے خلاف برپا شورش

تاریخ و حقیقت کے آئینہ میں

(قسط ٦)

باب اوّل (۳)

شاہ شہید کے ایک معروف مخالف مولوی قلندر علی زبیری پانی پتی کی رائے

شاہ محمد اسمٰعیل کے کمال علم کے وہ اصحاب بھی معترف ہیں جو خود شاہ شہید کے سخت مخالف ان کی تحریرات و نظریات کے شدید ترین ناقد تھے، منجملہ ان افراد کے مولوی قلندر علی زبیری پانی پتی بھی تھے[1] مولوی زبیری مولانا فضل حق خیرآبادی کے شاگرد اور شاہ شہید کی تردید و تغلیط میں اپنے استاد کے قدم بہ قدم تھے، لیکن اس کے باوجود وہ شاہ شہید کی علمی صلاحیت کے معترف ہیں،

---

[1] مولوی قلندر علی زبیری کے حالات بہت کم دستیاب ہیں، ان کے پاس ایک اچھا کتب خانہ تھا جس کا بڑا حصہ چند سال پہلے ردّی میں بکا ہے ـــــ اس ذخیرہ کی کچھ کتابیں مولوی قلندر علی کی بعض تحریرات، اور اسی ذخیرہ میں موجود رسالہ کلی طبعی (جو غالباً مولانا خیرآبادی کی تالیف ہے) میری نظر سے گزرا ہے اور مولوی قلندر علی کی بعض تحریروں کے فوٹو اسٹیٹ بھی میرے پاس موجود ہیں۔

کئی موقعوں پر اس کا اظہار بھی کیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

ولا ارتاب ان المولوی اسمعیل	اور بلاشک مولوی اسمٰعیل دہلوی حافظ
الدهلوی کان حافظاً عالما	قرآن وعالم باعمل وحاجی تھا ان کو
عاملا کان له حظ من العلم	علم سے بہرۂ (وافر) اور فہم وسمجھ کا
ونصیب من الفهم"[1]	ایک حصہ حاصل تھا۔

ایک موقع پر اپنے استاذ مولانا خیرآبادی کی رائے کی صاف تردید کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

وانا ایضا لا نکفر هذا المولوی	میں بھی مولوی اسماعیل حافظ وحاجی
العالم الحافظ الحاج، بهذا	کی بسبب اس خطا فکری کے تکفیر
الخطاء الفکری والخلل النظری	نہیں کرتا ہوں یہ شخص فقط امکان
لا یقول هذا الرجل بوقوع نظیر	نظیر خاتم الانبیاء کا قائل ہے،
نبینا لیلزم علیه ما یلزم بل	اس کے وقوع کا قائل نہیں کہ اسکی
یقول بالامکان فقط"[2]	تکفیر ہووے۔

---

[1] تنزیل التنذیر فی نظیر البشیر والنذیر مولوی قلندر علی زبیری ص۱۸۴ (مطبع بدبیاس جموں، باہتمام پنڈت شنکر ناتھ : ۱۲۸۲ھ) دونوں عبارتوں کا ترجمہ مولوی زبیری کا ہے البتہ پہلے اقتباس کے ترجمہ میں قوسین میں جو لفظ درج ہے وہ محرر سطور کا ہے۔

[2] کتاب مذکور ص۱۸۵۔ اس کتاب "تنزیل التنذیر" کی وجہ سے چند سال پہلے پہلی مرتبہ یہ کہا گیا ہے کہ: "مولانا فضل حق خیرآبادی نے بحالت اسیری انڈمان جاتے ہوئے اپنے شاگرد مولانا قلندر علی زبیری کو خاص طور پر یہ نصیحت کی کہ میں تقویۃ الایمان کا بالاستیعاب رد نہیں کرسکا اس لئے یہ کام تم سرانجام دینا۔" حرف آغاز بر طبع جدید "باغی ہندوستان" از جناب عبدالحکیم شرف قادری ص۳۵ (لاہور: رمضان المبارک ۱۳۹۸ھ) ہمیں اس قول کی صداقت اور مولانا خیرآبادی سے منسوب اس وصیت میں شبہ ہے۔ تفصیل آئندہ کسی موقع پر آئے گی۔

یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ مولانا قلندر علی زبیری صاحب نے ان دونوں عبارتوں میں شاہ شہیدؒ کے لئے صرف "مولوی" کا لفظ لکھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پہلے اقتباس میں "کان حافظاً عالماً عاملاً" اور دوسرے اقتباس میں "العالم الحافظ الحاج" کے الفاظ تحریر فرمائے اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ان کے دل میں حضرت شہیدؒ کی کس درجہ دینی عظمت تھی۔

مولانا فضل امام خیرآبادی کا اعتراف کمال اور کلمۂ حق

مولانا فضل حق خیرآبادی کے دو ممتاز شاگردوں کی رائے کے بعد مناسب ہے کہ مولانا خیرآبادی کے استاذ اور والد ماجد مولانا فضل امام خیرآبادی کے وہ الفاظ نقل کئے جائیں، جس میں مولانا فضل امام نے شاہ محمد اسمٰعیل کے فضل وکمال کا صاف اعتراف کیا ہے اور شاہ محمد اسمٰعیل سے مولانا فضل حق کی مخالفت پر برملا تنبیہ اور ناگواری ظاہر کی ہے، مولانا فضل امام (متوفی ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۹ء) کے ایک شاگرد مولوی محمد ابراہیم لاہوری نقل کرتے ہیں کہ:-

ذکر یوم کنت فی حضرت	ایک دن کا واقعہ ہے جب میں اپنے
مشفقی واستادی مولائی	مشفق اور استاذ اپنے آقا سردار وسند
سیدی سندی مولانا	مولانا فضل امام کی خدمت میں حاضر تھا
فضل امام رحمۃ اللہ علیہ۔	(وہاں) اس بحث کا تذکرہ ہوا۔۔۔۔
وکان تذکرۃ فی بحث الذی	۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جو شاہ (محمد اسمٰعیل)
فی مولانا شہید ومولائی	شہید اور مولانا فضل حق (اللہ تعالے
فضل حق غفر اللہ ذنوبھما	ان دونوں کے گناہوں کو معاف کرے
وستر عیوبھما فقال استاذی	اور ان کے عیوب کی پردہ پوشی فرمائے)
لا ینبغی لولدی وقرۃ عینی	کے درمیان تھی، اس وقت میرے استاد
فضل حق ان یبحث مع الذی	(مولانا فضل امام) نے فرمایا، میرے
ھو امام محقق عصرہ	نور چشم بیٹے (فضل حق) کے لئے مناسب

وملتقی دھرہ، وھو صادق فی دعواہ[1]

نہیں تھا کہ اُس شخص کے ساتھ بحث (واختلاف) کرے جو اپنے زمانے کے محققین کا امام اور اپنے عہد کا (ذہین اور) فاضل ترین شخص ہے اور وہ شخص (شاہ محمد اسمٰعیل) اپنے دعوے میں سچا ہے۔

شاہ محمد یعقوب برادر شاہ محمد اسحٰق کے تأثرات ومشاہدات

مذکورہ اعترافات ان لوگوں کے تھے جنھوں نے شاہ محمد اسمٰعیل سے ملاقاتیں کیں، ان کے متعلق ان کے قریبی لوگوں اور رفقاء سے جانا سنا لیکن وہ حضرات شاہ اسمٰعیل کی نسبت کیا کہتے ہیں، جنھوں نے طفولیت، زمانۂ تعلیم واصلاح وتربیت تک شاہ شہید کو دیکھا، ان کے شب وروز کی مصروفیات کا مشاہدہ کیا، ان کے ظاہر وباطن کو پرکھا اور شاہ شہید کی زندگی کے تمام نشیب وفراز ان کی نگاہ میں رہے، ایسے قریبی اور باخبر اشخاص کی رائے دوسرے لوگوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ معتبر اور لائق اعتماد ہوتی ہے، شاہ شہید کے معاملہ میں ایسے قریبی افراد اور ہمہ وقت ان کے قول وعمل پر نظر رکھنے والے اصحاب کی رائے صاف بتارہی ہے کہ شاہ اسمٰعیل کی زندگی میں قول وعمل کی یکسانیت، دعوتِ دین اور اپنے ذاتی کردار میں ہمیشہ پوری پوری ہم آہنگی رہی کبھی کبھی عمل قول سے بڑھ تو گیا ہے، لیکن ایسا شاید کبھی نہیں ہوا کہ شاہ شہید کے عمل کو قول سے شرمندہ ہونا پڑا ہو۔

شاہ محمد اسمٰعیل نے اپنے لئے اس کٹھن اور دشوار گزار راستہ کا سفر طے کیا تھا جس پر چلنا اور ثابت قدم رہنا ہر ایک کا نصیب نہیں، شاہ شہید نے آسائشوں اور عزت ومنصب کے دنیاوی تمام طور طریقوں کو ترک کرکے احیاءِ دینِ متین کی پرعزم جدوجہد شروع فرمائی تھی، وہ اس کوشش میں کس قدر مخلص تھے، اور اس راہ میں خود کو قربان کرنے کے لئے کس درجہ تیار رہتے تھے، اس کا اندازہ

---

[1] منحی المومنین، مؤلفہ قاضی حسین، ساکن اچرا۔ ص۱۴۳ (مطبع جلوۂ نور، لاہور: ۱۲۸۳ھ)

ان کے معاصرین ورفقاء کو بھی آسان نہیں تھا، اعلاء کلمۃ اللہ اور دین کا پیام پہنچانے کیلئے شاہ شہید ایسے جرأتمندانہ اقدام بے خوف وخطر کر گزرتے تھے کہ جس کا ارادہ کرتے ہوئے اچھے اچھے حوصلہ مند افراد کا پتہ پانی ہوتا تھا اور ایسی ایسی جگہوں پر بے تکلف چلے جاتے اور خداوندی حکم کی منادی کرآتے تھے، جہاں قدم رکھنا بھی سَو الزامات کو دعوت دینا اور مورد طعن بننا تھا، ایسے ہی اک موقع پر جب شاہ شہید خداوندی حکم کی تبلیغ کی ایک مہم پر تشریف لے گئے تھے، شاہ محمد یعقوب شاہ شہید کے پیچھے پیچھے حفاظت کے خیال سے خاموشی سے چلے، شاہ شہید کہاں گئے تھے، اس پر شاہ یعقوب نے کیا کہا اور شاہ محمد اسمٰعیل نے کیا جواب دیا، یہ سب باتیں خود شاہ یعقوب نے نقل فرمائی ہیں، حاجی منیر خاں خانپوری نقل کرتے ہیں کہ شاہ محمد یعقوب فرماتے تھے کہ :-

"مولوی اسمٰعیل جیسا عالی ہمّت اور بلند حوصلہ اس خاندان (خاندان شاہ ولی اللہؒ) میں کوئی پیدا نہیں ہوا، ان کے وعظوں کی وجہ سے دلّی کے شہدے اور بدمعاش یہاں تک دشمن ہو گئے تھے کہ ان کے قتل کی فکر میں تھے، اس لئے ہم لوگ (شاہ محمد یعقوب وغیرہ اہلِ خاندان) ان کی بہت حفاظت کیا کرتے تھے۔"

شاہ محمد یعقوب کا یہ ارشاد کہ "شاہ اسمٰعیل جیسا عالی ہمت اس خاندان میں پیدا نہیں ہوا" محض عقیدت کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ شاہ محمد یعقوب کا تمام عمر مشاہدہ اور ایک بصیرت افروز تجربہ پر مبنی تھا، اس تجربے نے شاہ محمد یعقوب کو یہاں تک متأثر کیا کہ ان کو (بقول خود) تمام عمر شاہ محمد اسمٰعیل سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی جرأت نہیں ہوئی"۔

قصہ کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے شاہ محمد یعقوب کو غیر معمولی شرمندگی اور احساس ہوا تفصیل خود شاہ محمد یعقوب کے الفاظ میں قلم بند ہے، فرماتے ہیں کہ :-

"ایک مرتبہ وہ (شاہ محمد اسمٰعیل) عشاء کی نماز جامع مسجد میں پڑھ کر اُس دروازے میں کو چلدیئے جو قلعہ کی جانب ہے، میں نے لپک کر ان کو پکڑا اور پوچھا کہ کہاں جاتے ہو؟ میں اس وقت تمھیں تنہا نہ جانے دونگا، اگر تم کہیں جاؤ گے میں تمھارے ساتھ جاؤں گا، مولانا نے فرمایا،

میں ایک خاص ضرورت سے جارہا ہوں تم مجھے جانے دو اور میرے ساتھ نہ آؤ، میں نے اصرار کیا مگر وہ نہ مانے اور تنہا چلدیئے، میں بھی ذرا فاصلہ سے انکے پیچھے پیچھے ہولیا، خانم کے بازار میں ایک بڑی مالدار اور مشہور رنڈی کا مکان تھا، اور اس کا نام موتی تھا، مولانا اس (کے) مکان پر پہنچے اور آواز دی، تھوڑی دیر میں مکان سے ایک لڑکی نکلی اور پوچھا تم کون ہو اور کیا کام ہے؟ انھوں نے کہا میں فقیر ہوں، وہ لونڈی یہ سن کر چلی گئی اور جا کر کہدیا کہ ایک فقیر کھڑا ہے، رنڈی نے کچھ پیسے دیئے اور کہا کہ جا کر دیدے، وہ لڑکی پیسے لے کر آئی اور مولانا کو دینا چاہا، مولانا نے کہا میں ایک صدا کہا کرتا ہوں بغیر صدا کہے لینا میری عادت نہیں، تم اپنی بی بی سے کہو کہ میری صدا سن لے، اس نے جا کر کہدیا، رنڈی نے کہا اچھا بلالے، وہ بلا کر لے گئی، مولانا جا کر صحن میں رومال بچھا کر بیٹھ گئے اور آپ نے سورۂ وَالتِّیْن ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ تک تلاوت فرمائی، میں بھی وہاں پہنچ گیا اور جا کر مولانا کے پیچھے کھڑا ہو گیا، مولانا نے اس قدر بلیغ اور مؤثر تقریر فرمائی کہ گویا جنت دوزخ کا مشاہدہ کرا دیا۔

اس رنڈی کے یہاں بہت سی اور رنڈیاں بھی تھیں اور ان کے علاوہ اور لوگ بھی بہت تھے، اُن پر اس (تقریر) کا یہ اثر ہوا کہ سب لوگ چیخ چیخ کر رونے لگے اور کہرام مچ گیا اور انھوں نے ڈھولک ستار وغیرہ توڑنے شروع کر دیئے اور موتی اور اسکے علاوہ اور کئی رنڈیاں تائب ہو گئیں، اسکے بعد مولانا اسمٰعیل صاحب اٹھ کر چلدیئے میں بھی پیچھے چلدیا۔"

یہ پورا واقعہ اگرچہ شاہ محمد یعقوب کے روبرو گزرا تھا مگر شاہ یعقوب نے جو صرف حفاظت کے خیال سے محمد اسمٰعیل کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے، خود کو ظاہر نہیں کیا اور نہ اس درمیان کچھ کہا مگر جب واپسی کے وقت شاہ اسمٰعیل جامع مسجد پر پہنچے تو مولانا محمد یعقوب سامنے آئے اور شاہ شہید سے کہا کہ :-

"میاں اسمٰعیل! تمھارے دادا ایسے تھے اور تمھارے چچا ایسے تھے اور تم ایسے خاندان کے ہو جس کے سلامی بادشاہ رہے ہیں، مگر تم نے اپنے آپ کو بہت ذلیل کر لیا ہے، اتنی ذلت

ٹھیک نہیں ہے' اس پر مولانا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور حیرت سے میری طرف دیکھا اور کھڑے ہوگئے اور مجھ سے فرمایا کہ مولانا آپ نے یہ کیا فرمایا؟

اس کے بعد شاہ محمد اسمٰعیل نے جو کچھ ارشاد کیا، وہ شاہ محمد یعقوب کے اس سوال کا جواب تو ہے ہی خادمانِ دین و شریعت کیلئے ایک مہمیز ایک اصول اور عملی زندگی کیلئے نشانِ راہ بھی ہے کہ اللہ کی رضا اور خوشنودی کیلئے خود کو فنا اور قربان کر دینے والے کون ہوتے ہیں، کیسے ہوتے ہیں اور انکے کیا نظریات کیا اصول ہونے چاہئیں' اور وہ ذاتی عزت و ذلت کے جذبات سے کتنا بلند اور حقیر سے حقیر شخص، و غلیظ سے غلیظ جگہ پر کلمۂ حق اور دین کا پیام پہنچانے کے کس قدر حریص و آرزو مند ہوتے ہیں' شاہ شہید کے ان کلمات میں مضمر مذکورہ پیام کے ساتھ وہ بصیرت افروز جواب ملاحظہ ہو' شاہ محمد اسمٰعیل نے فرمایا:۔

(مولانا!) آپ اس کو میری ذلت سمجھتے ہیں! یہ تو کچھ بھی نہیں' میں تو اس روز سمجھوں گا کہ آج میری عزت ہوئی ہے جس روز دلّی کے شہدے میرا منہ کالا کر کے اور گدھے پر سوار کر کے مجھے چاندنی چوک میں نکالیں گے' اور میں کہتا ہوں گا: قال اللہ کذا و قال الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کذا۔

مولانا محمد یعقوب کہتے ہیں کہ:۔

"یہ سن کر میری یہ حالت ہوئی کہ میں مارے شرم کے پانی پانی ہوگیا اور زبان بند ہوگئی، اور اسکے بعد کبھی مجھے ان (شاہ محمد اسمٰعیل) سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی" [1]

ایمان و عزیمت سے بھرپور ایسا جواب اور خطرناک مقامات پر بے خوف و خطر پہنچکر احکام شریعت کی تعلیم و تلقین شاہ محمد اسمٰعیل کی زندگی کا پہلا واقعہ اور نادر معمول نہیں تھا بلکہ اس قسم کے واقعات

---

[1] یہ اور درج بالا اقتباسات ایک ہی روایت کے ہیں۔ ملاحظہ ہو: ارواحِ ثلٰثہ صفحہ ۶۷۔۶۹ (طبع تھانہ بھون بلا سنہ) اشاعت جدید۔

یہ واقعہ شاہ محمد یعقوبؒ کے حوالہ کے بغیر کچھ اضافات و جزوی تفصیلات کے ساتھ مولوی محمد جعفر تھانیسری نے بھی نقل کیا ہے۔ تواریخ عجیبہ موسوم بہ سوانح احمدی صفحہ ۱۲۵ (صوفی کمپنی' منڈی بہاء الدین۔ طبع دوم۔ بلا سنہ)

انکی مجاہدانہ زندگی کا ایک حصہ اور احیاء اسلام کی جدوجہد کا متواتر عمل تھے جو روز مرہ پیش آتے تھے، شاہ شہید اس واقعہ میں پیش آئے حالات سے نازک تر موقعوں پر بھی اسی قدر سرگرم و متحرک رہے، جس قدر اس وقت جب شاہ محمد یعقوب انکے پیچھے گئے تھے، وہ کوششیں اور واقعات سیکڑوں ہزاروں لوگوں کے لئے ذریعہ ہدایت و فلاح ہوئے اور اس واقعہ نے شاہ محمد یعقوب کے لئے نصیحت و بصیرت کے دفتر کھول دیئے اور یہ کہنے پر مجبور کیا کہ :-

"شاہ محمد اسمٰعیل جیسا عالی ہمت اور بلند حوصلہ اس خاندان میں کوئی پیدا نہیں ہوا"

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے گرانمایہ ارشادات

شاہ محمد یعقوب نیز خاندان ولی اللہی میں شاہ محمد اسمٰعیل کے معاصر و ہم عہد اصحاب کی متفقہ رائے اور قدیم و جدید تمام مورخین اور تذکرہ نگاروں کی جملہ تحریرات سے کہیں زیادہ وقیع وہ گرانمایہ ارشادات و کلمات ہیں جو سرخیل کاروانِ ولی اللہی حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے شاہ محمد اسمٰعیل کے متعلق ارشاد یا تحریر فرمائے ہیں، شاہ عبدالعزیزؒ کے علو شان اور مقام و مرتبہ سے معمولی واقف اشخاص بھی اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہیں کہ شاہ صاحب کے قلم فیض رقم سے تحریر ایک کلمۂ توثیق و تحسین ہزار کلمات اعتراف سے زیادہ قیمتی اور اُس عہد سے عصر حاضر تک یکساں قابل توقیر وہ عالی اور بلند ترین شہادت ہے جس سے بہتر اعترافِ کمال کی سند نہ اُس دور میں موجود و ممکن تھی نہ اس کے بعد سے آج تک کسی اور شہادت و سند کو یہ مقام و مرتبہ عطا ہوا۔

شاہ محمد اسمٰعیل کے متعلق شاہ عبدالعزیز کی زبانی اور تحریری کمال علم و صلاحیت اور کمال اعتماد کی دونوں طرح کی روایات اور شہادتیں منقول ہیں، ذیل میں صرف ایک ملفوظ اور ایک تحریر کا اقتباس درج ہے :

ایک مرتبہ حضرت شاہ عبدالعزیز کی مجلس میں کسی نے عرض کیا کہ آپ کی ذات بابرکات کو حق تعالیٰ نے جملہ علوم و فنون میں کامل اور وحید زماں فرمایا ہے لیکن آپ کے شاگردوں میں ایسا کوئی

نہیں ہے جو آپ کی طرح علوم و فنون کا جامع اور ہر موضوع پر فرد فرید ہو، حضرت شاہ صاحب نے یہ تبصرہ و تذکرہ سن کر ارشاد فرمایا کہ میرا علم و کمال موضوعات کی ترتیب سے مختلف شاگردوں میں تقسیم ہو گیا ہے، کسی کو حدیث کے فن اور متعلقات میں کمال نصیب ہوا، کوئی تفسیر کا ماہر ہے، کوئی ادب میں کامل ہے کسی کو اور علوم سے بہرۂ وافر ملا ہے، کوئی کسی فن میں کامل ہے کوئی کسی اور مبحث پر فخر اقران و امثال ہے، اور ان مضامین کے حوالہ سے اپنے منتخب بعض شاگردوں کے نام ذکر فرمائے کہ مولوی عبد الحیؒ علم تفسیر میں، مولوی رشید الدین دہلوی ادب اور تحریر و انشاء مضامین میں، مرزا حسن علی محدث حدیث و رجال میں میرے قائم مقام ہیں، شاہ محمد اسحٰق فقہ میں میری نمائندگی کرتے ہیں، اگر یہ تمام علماء ایک جگہ موجود ہوں تو گویا میں موجود ہوں، کسی حاضر باش نے عرض کیا کہ آپ نے شاہ محمد اسمٰعیل کے متعلق کچھ نہیں فرمایا ارشاد ہوا کہ :۔

"او را در ہیچ و کدامی علم خاص نمی کنم کسے کہ علم عالم شباب من دیدہ باشد البتہ داند کہ در ہر علم نمونہ آں مولوی اسمٰعیل اند"[1]	ان کو میں کسی ایک علم میں مہارت کے لئے خاص نہیں کرتا بلکہ جس شخص نے میری جوانی اور عالم شباب کے علم کا مشاہدہ کیا ہے، وہ یقیناً جانتا ہے کہ مولوی اسمٰعیل اس وقت، اُس وقت کے میری تمام علوم میں مہارت و کمال کا نمونہ ہیں۔

اس مجلس اور مذاکرہ کی تفصیل ملّا رمضانی (حضرت شاہ عبد العزیز کے مدرسہ سے ملحق مسجد کے مؤذن) یوں بیان کرتے ہیں :۔

"روزے مردم چند پیش حضرت مولانا ممدوح عرض نمودند کہ حق سبحانہ آنچہ	ایک دن چند افراد نے حضرت (شاہ عبد العزیز) کی خدمت میں عرض کیا کہ

[1] منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء۔ مولوی سید محمد جعفر نقوی بستوی نسخہ خطی صفحہ ۶۳ جلد اول (مخزونہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نقل نسخہ ٹونک)

علم و فضل بآنجناب عطا نمودہ حیرت	حق تعالیٰ نے جنابِ والا کو جو علم و فضل عطا
است کہ ہیچ کدام از تلامذہ آنجناب	فرمایا ہے تعجب ہے کہ آپ کے شاگردوں میں سے
کسے بایں مرتبہ نرسید۔	کوئی اس مرتبہ کو نہیں پہنچا۔
در جواب شاں فرمودند کہ ایں چنیں نیست	جواب میں ارشاد ہوا کہ یہ بات نہیں ہے
الحمد للہ کہ از شاگردان من ہر یکے یہ یک یک	بلکہ الحمد للہ! میرے شاگردوں میں سے ہر ایک میرے
فضائلِ من رسیدہ است مولوی عبدالحیٔ	ایک ایک کمال کا نمونہ ہے مولوی عبدالحیٔ
در علم تفسیر نمونۂ من و مولوی رشید الدین	علم تفسیر میں میری مثال ہیں، مولوی رشید الدین
خاں در تحریر جواب سائلاں و علم کلام	سوالات کے جوابات لکھنے اور علم کلام میں میری یاد
"یادگار علم من اند، و مرزا حسن علی در علم	تازہ کرتے ہیں مرزا حسن علی علم حدیث اور اسمائے
حدیث و یادداشت اسمائے رجال	رجال کے استحضار میں میرے قائم مقام ہیں اور
نشان علم من و مولوی محمد اسحٰق در علم	شاہ محمد اسحٰق فقہ میں میرے قدم بقدم ہیں
فقہ با من ہمراز۔ الحمد للہ اگر ہمہ ایں	اللہ کے فضل و کرم سے اگر یہ سب افراد ایک جگہ جمع
کساں یک جا شوند گویا من موجود ام"[۱]	ہوں تو (اس محفل میں) گویا میں خود موجود ہوں۔

اس کے بعد کسی نے گذارش کی کہ:۔

"در حق مولوی محمد اسمٰعیل ہیچ ارشاد نہ شد"[۲]	آپ نے مولوی محمد اسمٰعیل کے متعلق کچھ ارشاد نہیں فرمایا۔

اس کے جواب میں وہ کلمات فرمائے جو اوپر گزرے کہ مولوی اسمٰعیل ہر علم و فن میں میری جوانی کے تازہ علم کا نمونہ ہیں۔

---

۱ و ۲ منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء۔ مولوی سید محمد جعفر نقوی بسنوی نسخہ خطی ص ۶۲ جلد اول (مخزونہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نقل نسخۂ ٹونک)

مولانا مفتی شعیب اللہ خاں صاحب
ناظم مدرسہ مسیح العلوم، بنگلور

کیا عذابِ قبر کا عقیدہ "غیر اسلامی" تصوّر ہے

احادیثِ عذابِ قبر پر اعتراضات اور ان کے جوابات

(چوتھی قسط)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کی آواز کیسے سن لی؟

مؤلفِ شمعِ حقیقت رقم طراز ہیں کہ:-

"(حسب روایت حدیث) منکر نکیر اُسے (مُردہ کو) مارتے ہیں، مردہ چلّاتا ہے اس کی آواز کو مشرق و مغرب والے سنتے ہیں مگر انسان اور جن نہیں سنتے ہیں، سن لیں تو بے ہوش ہو جائیں، پھر روایت ہے کہ مغرب کے وقت رسول اکرم نے آواز سنی تو فرمایا یہودی پر عذاب کیا جا رہا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ معاذ اللہ رسول اکرم انسان تھے یا نہیں؟ اگر انسان تھے تو مردہ کی آواز کیسے سن لی جبکہ فرمایا ہے کہ انسان اور جن کے علاوہ ہر چیز مردے کی آواز سنتی ہے، یا تو حدیث غلط ہے یا معاذ اللہ رسول اکرم انسان نہ تھے۔

(شمع حقیقت ص ۳۲۱)

ہمیں دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ اعتراض بھی بالکل بچکانہ اور طفلانہ ہے کیا جناب مؤلف یہ نہیں جانتے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم انسان ہونے ہوئے بھی کچھ ایسی خصوصیات رکھتے تھے، جو دیگر عام انسانوں میں پائی نہیں جاتیں، جبریل امین اور دوسرے فرشتے اللہ کے نبی کو نظر آتے تھے اور ان کا کلام آپ سنتے تھے مگر اسی جگہ موجود حضرات صحابہ اور دوسرے انسان اس سے بالکل بے خبر ہوتے تھے، آخر وہ کیا بات تھی کہ اللہ کے نبی تو ایک چیز کو دیکھتے اور سنتے ہیں اور دوسرے انسان اس سے بے خبر ہیں؟ بس بات یہ ہے کہ نبی کو عام انسانوں کے حواس کے علاوہ ایک اور حاسّہ عطا ہوتا ہے جس سے وہ غیب کے بہت سے امور پر خدا کی طرف سے مطلع ہو جاتا ہے۔

تو جس طرح قرآن کے اس ارشاد کی بنا پر کہ اللہ کا نبی انسان اور بشر ہے، فرشتوں کو دیکھنے اور ان کی آوازوں کو سننے کی اللہ کے نبی سے نفی نہیں کی جا سکتی، اسی طرح اللہ کے نبی کے بشر اور انسان ہونے سے قبر کی آواز کے سننے کی بھی آپ سے نفی نہیں کی جا سکتی، رہا یہ کہ اللہ کے نبی نے خود ہی تو یہ فرمایا کہ انسان اور جن مردے کی آواز کو سن نہیں سکتے اور سن لیں تو بے ہوش ہو جائیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں اس سے عام انسان مراد ہے، اللہ کے نبی اس کے عموم میں داخل نہیں ہیں، اور اس پر دلیل وہ احادیث ہیں جن میں اللہ کے نبی نے بتایا ہے کہ میں اُن امور کو جانتا ہوں جن کو تم نہیں جانتے مثلاً بخاری نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ:

> "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر تم اُن چیزوں کو جان لو جو میں جانتا ہوں، تو تم زیادہ رؤو گے اور کم ہنسو گے، (مشکوٰۃ ص۴۵۶)

اور احمد، ترمذی اور ابن ماجہ تینوں حضرات نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ:-

> انی اریٰ مالا ترون واسمع مالا تسمعون۔ الخ (مشکوٰۃ ص۴۵۷)
>
> بلاشبہ میں ان چیزوں کو دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور ان چیزوں کو سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے۔"

ان احادیث سے صاف معلوم ہوا کہ اللہ کے نبی علیہ السلام کو خدا کی طرف سے وہ باتیں دکھائی اور سنائی جاتی ہیں جو عام انسان دیکھ اور سُن نہیں سکتے، اسی کے عموم میں قبر کی آوازوں کا سن لینا بھی ہے لہٰذا اس پر کسی قسم کا اشکال وارد نہیں ہوتا۔

ہاں البتہ اگر مؤلف و معترض حدیث کی حجیت کے منکر ہوں جیسا کہ بار بار اندازہ ہوتا ہے، تو مسئلہ دیگر ہے اگر ایسا ہے تو اس پر مستقل اصولی گفتگو کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ وہ پہلے اس بارے میں اپنے موقف کا اظہار کریں۔

پس اللہ کے نبی کا انسان ہونا بھی حق، اور آپ کا اس کے باوصف قبر کی آواز کا سن لینا بھی برحق اور حدیث بھی اپنی جگہ بلاشبہ صحیح ہے۔

جانور کیوں بے ہوش نہیں ہوتے؟

مؤلف آگے مزید فرماتے ہیں کہ :-

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ مردے کی آواز انسان سن لے تو بے ہوش ہو جائے، مگر دوسرے جانور سنتے ہیں نہ بے ہوش ہوتے ہیں نہ بھاگتے ہیں، اکثر قبرستانوں میں چوپائے چرتے ہیں اور پرندے بھی رہتے ہیں، مگر وہ مردوں کے چلانے سے نہیں ڈرتے۔ (شمع حقیقت ص۳۲)

یہ اعتراض مؤلف کے قصورِ فہم و فتورِ عقل پر دلائل میں ایک اور دلیل کا اضافہ ہے کیونکہ یہ بات ایک معمولی عقل و سمجھ والا بھی جانتا ہے کہ ہر وہ چیز جس سے انسان بے ہوش ہوتا، بھاگتا اور گھبراتا ہے کوئی ضروری نہیں کہ دیگر مخلوقات بھی اس سے اسی طرح متأثر ہوں، کیا یہ دن رات کا ہر انسان کا مشاہدہ نہیں ہے کہ ایک بہت بڑی بس (BUS) یا اور کوئی گاڑی فرّاٹے بھرتی گذرتی ہے تو انسان تو چونک پڑتا اور گھبرا جاتا ہے مگر گدھے اور بیل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، وہ اپنے میں آپ مگن رہتے ہیں، کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ جن سے انسان متأثر ہوتا ہے، جانوروں کا ان سے متأثر ہونا ضروری نہیں۔

پھر بعض اوقات مختلف لوگوں نے ایسے واقعات بھی دیکھے ہیں کہ قبروں کے پاس سے جانور

بھاگتے جاتے ہیں اور چیختے چلاتے بھاگ رہے ہیں، چنانچہ مسلم شریف میں ہے کہ نبی اکرم صلعم بنی نجار کے ایک باغ میں سے خچر پر سوار گذرے، اچانک آپؐ کا خچر بگڑا اور قریب تھا کہ وہ آپؐ کو گرادے، دیکھا تو وہاں قبریں تھیں۔ (مسلم ج ۲ ص۳۸۶)۔ علامہ ابن القیم نے لکھا ہے کہ:۔

"عبدالحق الاشبیلیؒ نے بیان کیا کہ فقیہ ابوالحکم بن برقان جو اہلِ علم و عمل میں سے تھے، انھوں نے مجھ سے بتایا کہ وہ اشبیلیہ کے قریب ایک گاؤں میں ایک مردہ کو دفن کر کے فارغ ہوئے اور ایک طرف بیٹھ کر باتیں کرتے رہے کہ اچانک ایک چوپایہ کو جو انکے قریب چر رہا تھا دیکھا کہ وہ ایک قبر کی طرف جلدی سے لپکا اور اپنے کان اس پر رکھ دیا جیسے سن رہا ہو، پھر بھاگ گیا، پھر قبر کی طرف آیا اور کان لگا کر سننے لگا پھر بھاگ گیا اور اسی طرح کرتا رہا، علامہ ابوالحکم فرماتے ہیں کہ اس کو دیکھ کر مجھے عذاب قبر یاد آگیا اور اللہ کے رسول کا یہ فرمانا یاد آگیا کہ عذاب قبر جانور سنتے ہیں۔ (کتاب الروح ص۵۳)

غرض یہ کہ اولاً تو جانوروں اور پرندوں کا انسان کی طرح متأثر ہونا ضروری نہیں، ثانیاً ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی جانوروں پر بھی اس کا اثر ہوا ہے، پس مؤلف کا یہ اعتراض بھی قابلِ التفات نہیں!

ہسپتال کے مردے اور عذاب قبر

مؤلف شمع حقیقت لکھتے ہیں کہ:۔

"ایک سوال یہ بھی ہے کہ ڈاکٹری کی تعلیم کے لئے جو مردے ہسپتال میں رکھے جاتے ہیں ان کو منکر و نکیر کیوں نہیں اٹھاتے اور وہ زندہ ہو کر جوابات کیوں نہیں دیتے؟ بخاری کی روایت کے بموجب مُردوں کو صبح و شام جنت و دوزخ دکھائی جاتی ہے کہ یہ تمہارا ٹھکانہ ہے تو ہسپتال کے مردے کس وقت دیکھتے ہیں؟"

(شمع حقیقت ص۳۲۱ تا ۳۲۲)

مؤلف کے اس اعتراض سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو چیز مشاہدہ میں نہ آئے وہ ناقابلِ تسلیم ہے، لہٰذا جب مردے اٹھتے ہوئے اور جوابات دیتے ہوئے ہم کو دکھائی نہیں دیتے اور دیدے پھاڑ کر جنت و دوزخ دیکھتے ہوئے محسوس نہیں ہوتے تو ان کا اٹھنا بیٹھنا، سوالات کے جوابات دینا اور جنت دوزخ کو دیکھنا سب غلط اور ناقابلِ اعتبار باتیں ہیں۔

مگر ظاہر ہے کہ اگر ہر چیز کے قابلِ تسلیم حقائق قبول ہونے کے لئے مشاہدہ کو معیار قرار دید یا جائے گا تو بے شمار حقائق کا انکار لازم آئے گا، جو کسی مومن سے نہیں ہو سکتا، اس لئے ہر چیز کے لئے مشاہدہ کو معیار بنانا خطرناک اور سنگین قسم کی غلطی ہے۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد اس کا تعلق اس ظاہری اور دنیوی عالم سے نہیں رہتا، بلکہ اس کا تعلق ایک اور عالم سے ہو جاتا ہے جس کو عالم برزخ (اور عرفِ عام میں عالمِ قبر) کہتے ہیں، اب جو کچھ اس پر گذرتا ہے وہ دنیوی عالم میں نہیں بلکہ اس دوسرے عالم میں ہوتا ہے، اور اس دوسرے عالم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے عام انسانوں سے مخفی رکھا ہوا ہے، لہٰذا اس پر اچھا یا برا جو کچھ گذرتا ہے، اس کا اس دنیا میں مشاہدہ عام طور پر نہیں ہوتا، مردہ کا جسم ہمارے سامنے ہوتا ہے اور اس کی روح کے ساتھ عذاب یا راحت کا معاملہ ہو رہا ہوتا ہے، مگر اس کے باوجود چونکہ یہ معاملہ عالم برزخ کا ہے اس لئے ہم کو محسوس و مشاہدہ نہیں ہوتا۔

اس کی ایک مثال تقریبِ فہم کے لئے یہ ہے کہ انسان سوتا ہے اور عالمِ یقظ (بیداری) سے عالمِ نوم (سونے کے عالم) کو پہنچ جاتا ہے، اور اس دوسرے عالم (سونے کے عالم) میں وہ خواب کے اندر کبھی اچھی اور دل خوش کن باتیں اور کبھی اذیت ناک و تکلیف دہ امور کا مشاہدہ کرتا ہے، اور اس عالم میں دوسروں سے سنتا، اور گفتگو کرتا ہے، کبھی دوڑتا، مارتا، کھاتا پیتا ہے، اور اسی کے پاس بیٹھے ہوئے افراد کو جو پوری طرح بیدار ہیں، اس دوسرے عالم کی کوئی خبر نہیں ہوتی، اور بسا اوقات اس کی بتائی ہوئی باتیں سچی ظاہر ہوتی ہیں، بلکہ اسکے رات میں دیکھے ہوئے مناظر کا اثر بھی اس کے جسم پر صاف نظر آتا ہے۔

اس مثال سے برزخ کے عالم اور دنیا کے عالم کا فرق اور اس عالم کی بہت سی باتوں کے مشاہدہ

میں نہ آنے کی بات قریب الفہم ہو جاتی ہے۔

حاصل یہ کہ مردہ ہمارے درمیان رہتے ہوئے بھی دوسرے عالم میں ہے جیسے سونے والا ہمارے درمیان میں ہوتے ہوئے بھی دوسرے عالم میں ہوتا ہے، اور جس طرح وہ بہت سی اچھی اور بری باتیں محسوس کرتا اور اٹھتا، بھاگتا، کھاتا پیتا ہے، اور اس کی ان حرکات کو قریب بیٹھے ہوئے لوگ محسوس نہیں کرتے اسی طرح عالمِ برزخ میں گذرنے والے حالات کا علم مردہ تو محسوس کرتا ہے، مگر اس عالم کے لوگ محسوس نہیں کر پاتے، اللہ نے دنیا میں اس مثال کو رکھ کر عالم برزخ پر ایمان و یقین کی راہ ہموار کر دی ہے اور اس طرح کے وسوسوں کا قلع قمع کر دیا ہے، ہاں جو سوءِ فہم کے شکار ہوں تو ان کی بات ہی دوسری ہے ؎

وکم من عائب قولاً صحیحاً وآفتہ من الفھم السقیم

کتنے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بالکل صحیح بات کو بھی نہیں سمجھ پاتے اور اسکی وجہ اصل میں ان لوگوں کی بیمار سمجھ ہوتی ہے

(۴) کیا قرآن عقیدۂ عذابِ قبر کی نفی کرتا ہے؟

صاحب "شمع حقیقت" نے اپنے مضمون کے آخر میں دعویٰ کیا ہے کہ:۔

"قرآن اس (عذاب قبر کے) عقیدے کی نفی کرتا ہے"۔ (شمع حقیقت ص۳۲)

پھر اس کے بعد اور ابتداءِ مضمون میں بھی قرآن کی چند آیات سے یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے کہ عذابِ قبر کوئی چیز نہیں، ہم یہاں مؤلف کے استدلال کے وزن اور ان کے پیش کردہ دلائل کا جائزہ لیں گے۔

کیا قبر میں زندگی ملتی ہے؟

مؤلف نے لکھا کہ:۔

"کافر اس پر یقین نہ رکھتے تھے کہ مرنے کے بعد انسان کو دوبارہ زندگی نصیب ہو گی وہ دریافت کرتے تھے کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"جس نے پہلے پیدا کیا تھا وہی دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے"۔
اس جواب سے واضح ہوگیا کہ انسان کو دو زندگیاں عطا کی گئی ہیں اور اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ قبر میں کوئی مردہ زندہ نہیں ہوتا، اگر قبر میں مردہ زندہ ہو، اس پر عذاب قبر ہوتا ہے یا قبر میں ثواب وراحت کا یقین کر لیا جائے تو قیامت کے دن زندہ کرنے کا وعدہ غلط ہو جائے گا۔ (شمع حقیقت ص ۳۱۹)

ہم نے مؤلف کی عبارت کو (دوسرے مواقع کی طرح اس جگہ بھی) بلا کم وکاست نقل کر دیا ہے۔ آخر غور تو کیجئے کہ کفار مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کو محال و ناممکن خیال کرتے ہوئے جب یہ سوال کرتے ہیں کہ ہماری وہمارے آباء واجداد کی گلی سڑی اور بوسیدہ ہڈیوں کو کون اور کیسے زندہ کرے گا؟ تو یہ جواب دیا جاتا ہے کہ:۔

وہی جس نے اور جیسے تم کو پہلے پیدا کیا تھا، مرنے اور گل سڑ جانے کے بعد بھی پیدا کرے گا۔

اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ قیامت میں انسانوں کو زندہ کیا جائے گا، اور زندگی خدا تعالیٰ اپنی قدرت سے عطا کرے گا، اس میں اس سے پہلے قبر میں زندہ کرنے کی نفی نہیں ہے اور نہ صرف دو زندگیوں کا کوئی ذکر اس آیت میں موجود ہے، یہ صرف مؤلف کی قوت فہم کی کرشمہ سازی ہے، جیسے کوئی کہے کہ رات میں یہ کام میں کروں گا، تو اس کا مطلب یہ نکالنا کہ دن میں یہ کام وہ نہیں کریگا، لغو ہے اسی طرح قیامت میں خدا انسان کو زندہ کریگا، کا مطلب یہ نکالنا کہ قبر میں زندہ نہ کرے گا، لغویات ہے۔

اور مؤلف نے "دوبارہ" کے لفظ سے جو دو زندگیاں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ قرآن کی اس آیت میں کسی لفظ کا بھی ترجمہ دوبارہ نہیں ہے، لہذا جو چیز قرآن میں نہ ہو اس کو لے کر کسی چیز کو ثابت کرنا بالکل غلط ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ کیا قبر میں بھی انسان کو زندہ کیا جاتا ہے؟ اس کا جواب ہم مؤلف کی پیش کردہ دوسری آیت اور ان کے استدلال کے جواب میں بتائیں گے۔

انسان کو کتنی زندگیاں ملتی ہیں؟

مؤلف صاحب آگے فرماتے ہیں کہ:۔

"آیات حج ۲۲ : ۷ اور مومنون ۲۳ : ۱۵، ۱۶ سے واضح ہے کہ انسان کو دو زندگیاں دی گئی ہیں، دنیا کی زندگی اور آخرت کی زندگی، پھر قبر کی زندگی کے کیا معنے؟ (شمع حقیقت ص۳۱۹)

افسوس کہ مؤلف نے جن آیات کا حوالہ دیا ہے ان کو پیش کر کے مذکورہ مطلب کن الفاظ سے کشید فرمایا ہے اس کی وضاحت نہیں پیش کی ہے، لہٰذا مؤلف کے بیان کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے ہمیں اولاً ان آیات کو پیش کرنا ہوگا، پھر ان سے استدلال پر نظر ڈالنی ہوگی۔

سورۂ حج کی جس آیت کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے :۔

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِى الْقُبُوْرِ

بلاشبہ قیامت آنے والی ہے اس میں شک نہیں اور بے شک اللہ قبر والوں کو اٹھائے گا۔

سورۂ مومنون کی جن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ یہ ہیں :۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ۔

پھر اس کے بعد تم مرنے والے ہو، اور پھر قیامت کے دن تم اٹھائے جاؤ گے۔

ان میں سے پہلی آیت میں قبر والوں کو اٹھانے اور دوسری آیت میں قیامت کے دن اٹھائے جانے کا ذکر ہے، دوسری آیت سے صرف یہ معلوم ہوا کہ قیامت کے دن سب لوگوں کو اٹھایا جائے گا، اس سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس سے قبل قبر میں زندگی نہ دی جائے گی جیسا کہ اس سے قبل ہم نے مؤلف کے اسی طرح کے ایک استدلال پر واضح کر دیا ہے، کیونکہ عدم ذکر سے ذکر عدم لازم نہیں آتا، اور پہلی آیت میں جو آیا ہے کہ قبر والوں کو اٹھایا جائے گا، مؤلف نے غالباً اس سے اس طرح استدلال کیا ہے کہ زندہ کرنے کا تعلق مُردوں سے ہی ہونا چاہیئے، جب اللہ تعالیٰ قبر والوں کو زندہ

کرنے کا ذکر کر رہے ہیں تو مطلب یہ ہوا کہ قبر والے مردہ ہیں، لہٰذا ثابت ہو گیا کہ قبر میں زندگی نہیں ملتی۔

ہماری عرض یہ ہے کہ یہ استدلال صحیح نہیں ہے، ایک تو اس وجہ سے کہ قرآن نے یہاں بعث کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس کے اصل معنے یا تو ارسال یعنی بھیجنے کے ہیں یا اَثارۃ الشی کے (یعنی کسی چیز کو اٹھانے اور اپنی جگہ سے حرکت دینے کے) ہیں۔ (قرطبی ج ۱ ص۴۰۲)

ارسال کے معنے میں اس کا استعمال قرآن نے کثرت کے ساتھ کیا ہے اور اٹھانے کے معنی میں بھی اس کا استعمال آیا ہے، جیسے اصحاب کہف جو سوئے ہوئے تھے ان کو جگانے اور اٹھانے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے، وکذٰلک بعثنٰھم (سورۂ کہف : ۱۹) پس زیر بحث آیت میں بھی یہی معنے مراد ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو قبروں سے اٹھائے گا۔ اس کے لئے مردہ ہونا کوئی ضروری نہیں، دوسرے اس وجہ سے کہ اس لفظ کو زندہ کرنے کے معنے میں بھی لیا جائے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قبر والوں کو کسی طرح کی بھی کوئی زندگی حاصل نہیں ہوتی، پس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ قبر کی زندگی کی نوعیت قیامت کے دن کی زندگی سے مختلف ہوگی، لہٰذا قبر والوں کو زندہ کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ قبر والوں کو قیامت والی زندگی دی جائے گی، جیسے سونے والے اور بیدار انسان کی زندگیوں میں فرق ہے کہ زندہ ہونے میں دونوں شریک ہیں، مگر دونوں کی زندگیوں میں فرق عظیم ہے کہ بیدار انسان خود چلتا پھرتا اور اپنے کام کرتا ہے، مگر سونے والا زندہ ہونے کے باوجود ان کاموں کی صلاحیت نہیں رکھتا، حتیٰ کہ اس کے ظاہری حواس مردہ کی مانند معطل ہوتے ہیں، اسی طرح قبر والوں کی زندگی اور آخرت کے دن کی زندگی میں فرق ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان قبر والوں کو آخرت کے دن والی زندگی دی جائے گی، جو ان کو قبر میں حاصل نہیں تھی، اور اس کا یہ مطلب لینا اس لئے ضروری ہوا کہ متعدد احادیث سے بلکہ خود قرآن سے اہلِ قبور کی ایک زندگی کا ثبوت ہوتا ہے۔

مثلاً شہداء کے متعلق ایک سے زائد مقامات پر تصریح قرآن میں موجود ہے کہ وہ زندہ ہیں خواہ اس زندگی کی نوعیت کچھ بھی ہو، اور خود مؤلف کو بھی اس کا اقرار ہے چنانچہ شمع حقیقت (ص۲۶۹)

میں مؤلف نے شہداء کی زندگی کا اعتراف کیا ہے' اب سوال یہ ہے کہ اہلِ قبور میں شہداء داخل ہیں یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ داخل ہیں اور اہلِ قبور کو قیامت کے دن زندہ کرنے کا ثبوت خود مؤلف اوپر پیش کر چکے تو اب سوائے اسکے اور کیا صورت ہے شہداء کی قبر کی زندگی کو بھی تسلیم کیا جائے اور ان کو قیامت میں زندہ کرنے کو بھی مانا جائے بس اتنا تاویلاً کہنا ہوگا کہ دونوں زندگیوں میں فرق ہے' اور ہم اہلِ سنت اسی کے قائل ہیں۔

نیز حضرت براء بن عازب کی ایک طویل حدیث میں اللہ کے نبی علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب مومن کی روح کو فرشتے لے کر خدا کے پاس جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں کہ اسکو زمین کی طرف لوٹا دو' اسی طرح کافر کی روح کے متعلق بھی فرمایا گیا ہے' پھر قبر کے احوال کا تذکرہ کیا ہے' اس کو امام احمد' ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور اس کے ابتدائی حصہ کو نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے' اور ابو عوانہ نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ (کتاب الروح لابن القیم ص۴۲) اس حدیث کو بعض لوگوں نے جیسے ابن حزمؒ نے ضعیف کہا ہے کیونکہ اس کا راوی منہال بن عمرو ضعیف ہے اور اس نے تنہا اس کو روایت کیا ہے' مگر حق یہ ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے' کیونکہ اولاً منہال راوی ضعیف نہیں ہے' ابن معین' عجلی' نسائی' ابن حبان' ابن القطان اور دارقطنی وغیرہ نے منہال کی توثیق' تصدیق و تعریف کی ہے' اور ان پر جو بڑی سے بڑی جرح کی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ ان کے گھر سے بعض لوگوں نے گانے کی آواز سنی تھی' مگر علماء نے بتایا ہے کہ گانے کے حدِّ حرمت کو نہ پہنچانے کی صورت میں ان پر جرح نہیں کی جا سکتی اور یہاں ان کا حدِ حرمت کو پہنچنا ثابت نہیں ہے (دیکھو تفصیل کے لئے تہذیب التہذیب ۱/۳۲۰) ثانیاً یہ روایت انہی پر موقوف نہیں ہے' بلکہ متعدد طرق سے حضرت براء بن عازب سے آئی ہے چنانچہ حضرت براء سے ایک تو زاذان نے روایت کیا ہے جن سے منہال نے روایت کیا ہے' دوسرے حضرت براء سے عدی بن ثابت' محمد بن عقبہ اور مجاہد نے بھی روایت کیا ہے' اس کو ابن القیم نے ذکر کر کے آخر میں فرمایا ہے کہ:-

"یہ حدیث ثابت، مشہور و مستفیض ہے جس کی حفاظِ حدیث کی ایک جماعت نے تصحیح کی ہے، اور ہم کسی امام کو ائمہ حدیث میں سے نہیں جانتے جس نے اس حدیث میں جرح کی ہو، بلکہ انھوں نے اس کو اپنی کتابوں میں روایت کیا اور اس کو قبول کیا اور عذاب قبر، راحت و ثواب قبر، منکر نکیر کے سوال و جواب اور قبض ارواح، اور خدا کے پاس روحوں کے پیش کرنے اور پھر روح کے قبر کی طرف لوٹ جانے کے بارے میں اس حدیث کو اصل دین قرار دیا ہے۔" (کتاب الروح ص۴۸)

الغرض قرآن اور حدیث بلکہ ایک حدیث نہیں، متعدد احادیث (جن کو ابن قیم نے کتاب الروح میں نقل کیا ہے) سے ثابت ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں بھی ایک قسم کی زندگی ملتی ہے، لہٰذا لامحالہ قبر والوں کو زندہ کرنے کا مطلب یہی ہے کہ قبر کی زندگی کے علاوہ دوسری زندگی عطا کی جائے گی، یہی تمام اہلِ سنت کا مذہب ہے، علامہ ابن قیم نے حضرت براء کی حدیث پیش کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ :۔

ذهب الى القول بموجب هذا الحديث جميع اهل السنة والحديث من سائر الطوائف۔

اس حدیث کے موافق قول کی طرف تمام اہل سنت و حدیث کی جماعتیں گئی ہیں۔

(کتاب الروح ص۴۳)

اس تفصیل سے ثابت ہو گیا کہ مؤلف کی پیش کردہ آیات سے ان کا مدّعا و مقصد حاصل نہیں ہوتا، بلکہ قرآن و حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ قبر میں بھی ایک خاص قسم کی زندگی ملتی ہے، پس اسی زندگی کی وجہ سے قبر کا عذاب یا راحت و ثواب مردوں کو محسوس ہوتا ہے۔

(جاری)

حضرت شیخ الحدیثؒ اور تبلیغی کام

ایک سوال اور اُس کا جواب

[مہاراشٹر کے مشہور شہر "امراؤتی" کے بعض مخلصین کی طرف سے حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ کی خدمت میں ایک سوالیہ مکتوب آیا تھا جس میں اہم اور بنیادی مسئلہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا نور اللہ مرقدہٗ سے متعلق تھا، مکتوب کا وہی حصہ اور حضرت مولانا نعمانی مدظلہ کی طرف سے اس کا جواب ذیل میں نذرِ ناظرین کرام کیا جارہا ہے ——————— (ادارہ)]

سوالیہ مکتوب:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بخدمت گرامی اقدس جناب مولانا محمد منظور نعمانی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

گذارش یہ ہے کہ ہم لوگ مہاراشٹر امراؤتی شہر کے باشندے ہیں، یہاں درپیش ایک اہم مسئلہ میں آپ سے رہنمائی چاہتے ہیں... یہاں عرصۂ دراز سے تبلیغ کا کام ہو رہا ہے اور بظاہر موجودہ دینی بیداری نیز مکاتب ومدارس کے قیام میں بہت بڑا حصہ تبلیغی جماعت کی کوششوں اور قربانیوں کا ہے، گذشتہ دنوں یہاں کے چند حضرات گجرات گئے واپسی پر انھوں نے سرگوشی کے انداز میں کچھ ہمارے نوجوانوں کو فرداً فرداً کہنا شروع کیا کہ اب تبلیغی جماعت میں شر غالب آچکا ہے

اور یہ کام فتنہ وضلالت بن چکا ہے، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ آخری دنوں میں تبلیغی جماعت اور اس کے ذمّہ داروں سے سخت ناراض ونالاں تھے اور ان کو ناپسند کرنے لگے تھے، اپنے آخری ایّام میں حضرت شیخ الحدیثؒ "تبلیغی جماعت کے بارے میں تحریر کرنا چاہتے تھے، اگر حضرت شیخ کو موقع ملتا تو ضرور تبلیغ کی ضلالت وگمرہی کے متعلق تحریر کر جاتے وغیرہ وغیرہ۔

ہم لوگوں کے نزدیک حضرت والا تبلیغی جماعت اور حضرت شیخ الحدیثؒ دونوں سے واقف اور قریبی نسبت رکھتے ہیں۔ اس لئے دریافت طلب امر یہ ہے کہ:۔

کیا واقعی تبلیغی جماعت میں خیر پر شر غالب آچکا ہے؟

کیا واقعی حضرت شیخ الحدیثؒ آخری عمر میں تبلیغ کو ضلالت سمجھنے تھے اور اسی وجہ سے تبلیغ سے گریزاں اور نالاں رہے، اور کیا حضرت شیخؒ تبلیغ کے بارے میں تحریر کرنا چاہتے تھے؟

آپ سے گذارش ہے کہ وضاحت اور تفصیل سے جواب مرحمت فرمائیں اور ہمارے شبہات کو دور فرمائیں۔ والسلام

منجانب:۔ حافظ محمد سلیمان امام مسجد اسلام گنج امراؤتی
اور محمد جمیل ورفقاء فاروقی اسٹورس امراؤتی

جواب:

باسمہ سبحانہٗ وتعالیٰ

برادرانِ دینی وایمانی جناب حافظ محمد سلیمان صاحب اور انکے رفقاء! وَفَّقَنَا اللّٰہُ وَاِیَّاکُمْ لِمَا یُحِبُّ وَیَرْضٰی

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

آپ حضرات کا مکتوب ملا، پڑھوا کر سنا، سخت حیرت ہوئی اور رنج وقلق بھی، اللہ تعالیٰ ہماری، آپ کی اور سب دینی بھائیوں کی ہر طرح کے فتنوں سے حفاظت فرمائے۔

آپ کے مکتوب کا حق تھا کہ بہت تفصیل سے اسکے ہر جز اور ہر سوال کا جواب لکھتا لیکن کبرسنی کے ضعف، ہائی بلڈ پریشر اور دوسرے مختلف امراض وعوارض کی وجہ سے میرا حال یہ ہے کہ

طویل مدت سے بستر ہی میری مسجد ہے، کچھ دن پہلے تک چھڑی کے سہارے اپنی ضروریات کے لئے چند قدم چل لیتا تھا، اب اس سے بھی معذور ہو گیا ہوں، اٹھنا بیٹھنا بھی دوسرے لوگوں کے سہارے ہوتا ہے، ایک کان بہت دنوں سے نہیں سنتا تھا، دوسرا کچھ سن لیتا تھا، ادھر چند روز سے وہ بھی نہیں سنتا، لیکن ابھی اللہ تعالیٰ کا یہ فضل ہے کہ آلہ کے ذریعہ اس کان سے کچھ سن لیتا ہوں، بولنا بھی بہت مشکل ہو گیا ہے، اس وجہ سے قرآن مجید کی تلاوت تک بھی صحیح طور سے نہیں ہو سکتی، اس لئے نماز کسی کا مقتدی بن کر ہی پڑھنی ہوتی ہے، ہاتھ میں رعشہ ہے، جس کی وجہ سے ایک سطر بھی خود نہیں لکھ سکتا (والحمد للہ علیٰ کل حال) اپنی اس حالت کی وجہ سے اس وقت صرف حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہٗ کے بارے میں لکھانے کا ارادہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ وہی لکھانے کی توفیق دے جو اس کے نزدیک حق و صواب ہے۔

سوچنے کی سب سے پہلی بات یہ ہے کہ حضرت شیخ الحدیث نوّر اللہ مرقدہٗ کا وصال یکم شعبان ۱۴۰۲ھ کو ہوا تھا، اب اس پر پورے دس سال گذر چکے ہیں، اس طویل مدّت میں اس عاجز نے کبھی حضرت نوّر اللہ مرقدہٗ کے بارے میں وہ بات نہیں سنی جو آپ نے لکھی ہے، اور جو یقیناً بے اصل اور بے بنیاد ہے۔

حضرت نوّر اللہ مرقدہٗ وفات سے صرف پانچ چھ مہینے پہلے آخری دفعہ اپنے دار الہجرت مدینہ منورہ سے تشریف لائے تھے، دہلی کے ہوائی اڈہ سے..... ہمیشہ کے معمول کے مطابق سیدھے تبلیغی کام کے مرکز نظام الدین تشریف لائے، چونکہ مرض غالب آچکا تھا، اور اس کی وجہ سے ضعف انتہائی درجہ ہو چکا تھا، اور اس وجہ سے جس آرام و راحت اور یکسوئی کی ضرورت تھی وہ مرکز میں ممکن نہیں تھا، اس لئے حضرت مولانا انعام الحسن صاحب دامت برکاتہم سے عقیدت و نیاز مندی کا خاص تعلق رکھنے والے حافظ کرامت اللہ صاحب کے مکان پر قیام تجویز ہوا، جو مرکز سے چند ہی قدم کے فاصلہ پر ہے، پھر جلدی ہی علاج کے لئے دہلی کے ایک خاص اسپتال میں داخل ہوئے، یہ عاجز زیارت و ملاقات کے لئے اسی زمانہ میں نظام الدین حاضر ہوا تو

پہلی ملاقات ہسپتال ہی میں ہوئی دیر تک حضرت کی خدمت میں حاضر رہا پھر اُسی دن شام کو حضرت اسپتال سے حافظ کرامت صاحب کے مکان ہی پر تشریف لے آئے، اس عاجز کا قیام بھی اسی کے ایک حصّہ میں تھا، حضرت نور اللہ مرقدہٗ کا پروگرام اگلے دن صبح نماز فجر کے بعد سہارنپور تشریف لیجانے کا تھا، فجر سے پہلے ہی یہ عاجز حضرت کی خدمت میں حاضر ہو گیا، نماز بھی حضرت کے ساتھ جماعت سے پڑھی حضرت کی معیت میں میری یہ آخری نماز تھی، نماز سے فارغ ہو کر حضرت اپنے خاص خدّام اور رفقاء کے ساتھ سہارنپور کیلئے روانہ ہو گئے ——— حضرت نور اللہ مرقدہٗ کا شفقت و عنایت اور سرپرستی کا جو تعلق اور روّیہ تبلیغی کام اور اسکے خاص ذمہ داروں کے ساتھ اس عاجز نے ہمیشہ دیکھا تھا اس میں ذرّہ برابر فرق محسوس نہیں ہوا۔

ممکن ہے آپ حضرات کے علم میں یہ بات نہ ہو کہ حضرت شیخ کے اکلوتے صاحبزادے و خلیفۂ مجاز حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب دام اللہ فیوضہم اور عزیز ترین داماد حضرت مولانا محمد عاقل صاحب زیدمجدہم صدر مدرس مظاہر علوم سہارنپور (جو حضرت شیخ کے علم حدیث میں تصنیفی کام کے وارث ہیں) یہ دونوں حضرات حضرت کے حادثۂ وفات سے بہت پہلے سے مدینہ منورہ میں حضرت کی خدمت میں مقیم اور ہمہ وقت حاضر رہتے تھے، یقین ہے کہ اگر تبلیغی کام کے بارے میں حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہٗ کا وہ خیال اور حال ہوتا جو آپکے لکھنے کے مطابق کچھ لوگ سرگوشیوں کے ذریعہ پھیلا رہے ہیں تو خاص طور سے یہ دونوں حضرات اس سے ضرور واقف اور باخبر ہوتے انکا رویہ اور عمل بھی اسکے مطابق ہوتا، نیز وہ ہم جیسے حضرت شیخ کے نیازمندوں اور عقیدتمندوں کو بھی اس سے ضرور باخبر کرتے لیکن یہ عاجز جانتا ہے کہ ان دونوں حضرات کا رویہ تبلیغی کام اور اسکے خاص ذمہ داروں کے ساتھ وہی ہے جو ہمیشہ سے تھا، تنہا یہی بات یہ سمجھنے کے لئے بالکل کافی ہے کہ حضرت شیخ کے بارے میں یہ وسوسہ اندازی محض افتراء ہے.....

آخر میں صرف ایک بات اور ذکر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں ——— اب سنہ تو یاد نہیں البتہ حضرتؒ کے آخری دورِ حیات ہی کا واقعہ ہے ——— یہ عاجز حاضر خدمت تھا، کسی تقریب سے تبلیغی کام کے بارے میں گفتگو فرما رہے تھے، اسی سلسلے میں ارشاد فرمایا کہ کسی دور میں دینی خدمت کے کسی سلسلے سے اللہ تعالیٰ کی خاص رضا و عنایت متعلق ہوتی ہے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسکو "تدلّی" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے میرا خیال ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی وہ رضا و عنایت اس تبلیغی کام سے متعلق ہے (باقی انشاء اللہ آیندہ)

تصحیح اغلاط شمارہ گذشتہ

صفحہ	۲	(فہرست مضامین) عنوان ۲۸		غلط: احادیث	صحیح: کیا
"	۱۱	سطر	۱۹	پھر انکے بعد مسلسل	انکے علاوہ تین صاحبزادیاں پیدا ہوئیں
"	۱۵	"	۱۹	خلاز	خلابار
"	۱۷	"	۳	آمد کے لئے چاند	آمد کو نئے چاند
"	۱۹	"	۱۵	ان قواعد کے مطابق	اس شب میں جس میں ولادت ہوئی
"	۲۰	"	۳	یہ حیثیت	یہ حقیقت
"	۲۰	"	۱۳	ڈاکٹر	ڈائریکٹر
"	۲۱	"	۱۹	دامدومدار	دارومدار
"	۲۲	"	۱۸	والشربوا	واشربو
"	۲۵	"	۱۵	الحیث	الحدیث
"	۲۶	"	۱۴	یہ کہنا نہ ہوگا	یہ کہنا غلط نہ ہوگا
"	۳۷			"کیا عذابِ قبر کا عقیدہ غیر اسلامی تصور ہے"	اس عنوان کا اضافہ کر لیا جائے۔

مختلف موضوعات پر اہم کتابیں

آپ بیتیاں

آپ بیتی حضرت شیخ الحدیث مکمل ۱۶/۵۰
آپ بیتی مولانا عبدالماجد دریابادی ۴۵/-
چند سوانحی تحریریں ۸/-
طوفان سے ساحل تک ۳۵/-
کاروانِ زندگی مکمل ۴ جلد ۱۵۰/-

آداب

آداب القرآن ۴/-
آداب المساجد ۶/-
آداب السلام ۴/-
آداب المعلمین ۶/-
آداب زندگی ۹/-
آداب معاشرت ۱۲/-
آداب الصالحین ۳۵/-

اسلامیات

اسلام دینِ محمدی کے بنیادی ارکان ۵/-
اسلام اور چھوت چھات ۲/-
اسلام کے چار رکن ۸/-
اسلام اور اشتراکیت ۹/۵۰
اسلام مکمل دین مستقل تہذیب ۳۰/-
اسلام اور عصری مسلمان ۷/-
اسلام کی تعلیم ۲/۵۰

انسان اور اس کا مستقبل ۱۰/-
تجارت اور اسلام ۴/-
تعلیمات اسلام مکمل سیٹ ۴۵/-
جزاء الاعمال ۵/-
دنیا کی حقیقت ۱۰/-
کیا اسلام ترقی کی راہیں رکاوٹ ہے ۲/۵۰
مذہب و تمدن ۱۵/-
مساجد اور اسلام ۷/-
مسلمان کیا کریں ۷/-
ہندوستان اور نظام قضا ۵/-

ایمان افروز واقعات و قصے

اچھے قصے ۳/۵۰
آخرت کے فکرمندوں کے ۵۰ قصے ۷/-
ارواح ثلثہ حکایات اولیاء ۳۰/-
حکایتوں کا گلدستہ ۱۸/-
حکایات صحابہ ۱۵/-
قصص الاولیاء ۷۵/-

تاریخ

تاریخ اسلام مکمل اکبر شاہ ۱۸۰/-
تاریخ مشائخ چشت ۳۰/-
تاریخ مظاہر علوم اول ۷۰/-
تاریخ الخلفاء اردو ۷۵/-
تاریخ دعوت و عزیمت مکمل ۲۶۵/-

تاریخ بیدنا جبین ۱۵/-
تاریخ الاحکام ۳۵/-
تاریخ اسلام مکمل (مولانا محمد میاں) ۲۱/-

تبلیغ

ایک تبلیغی جماعت کی کارگذاری ۵/۵۰
ایک اہم دینی دعوت ۸/-
تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب ۲/-
تبلیغ دین کیلئے ایک اہم اصول ۲/-
تبلیغی نصاب ایک مطالعہ کا جواب ۱۵/-
تحریک ایمان ۳/۵۰
چھ باتیں ۴/-
چھ باتیں مسنون دعائیں یکجا ۱۰/-
حضرت جی کی یادگار تقریریں ۱۵/-
کتب فضائل پر اشکالات کے جوابات ۲۲/-
فضائل اعمال اول (تبلیغی نصاب) ۵۰/-
" " دوم ۵۰/-

تجوید و قرأت

تسہیل التجوید ۷/-
جمال القرآن مکمل ۵/-
فوائد مکیہ مع معرفۃ الرسوم ۵/۵۰
معرفۃ التجوید ۲/-
معین التجوید ۳/-
نزہۃ القاری ۲/۵۰

تذکرے

پرانے چراغ مکمل ۲ حصے ۷۰/-
تحقیق و انصاف کی عدالت میں
ایک مصلح کا مقدمہ ۶/-
تذکرۃ الرشید ۱۲۵/-
تذکرۂ ائمۂ اربعہ ۳۳/-
تذکرہ شاہ طیب بنارسی ۴/۵۰
تذکرۃ المصنفین ۲۱/-
کاروانِ ایمان و عزیمت ۱۲/-
تذکرۃ الخلیل ۷۰/-
تذکرہ شاہ علم اللہ ۲۰/-
تذکرہ شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادی ۲۰/-

تصوف

اکابر کا سلوک و احسان ۱۰/-
تسہیل قصد السبیل ۷/-
خلاصہ تسہیل قصد السبیل ۵/-
شریعت و تصوف اول ۱۰/-
" " دوم ۱۴/-
کشف المحجوب ۵۵/-
محبوب العارفین ۱۲/-
محبت ۱۸/-
مقالات صوفیہ ۱۰/-

تفاسیر

تفسیر معارف القرآن (کلاں) ۹۲۰/-

تفسیر ابن کثیر عکسی مکمل ۴۷۰/-
تفسیر حقانی عکسی مکمل ۴۹۰/-
تفسیر کشف الرحمٰن مکمل ۱۵۰/-
تفسیر عثمانی ۹۵/-

تقاریر و خطبات

اصلاحی تقریریں ۷/-
امثال عبرت ۱۳/۵۰
پاجا سراغ زندگی ۲۲/-
خطبات حکیم الاسلام مکمل ۸ جلدیں ۴۱۵/-
مولانا محمد علی جوہر کی آخری تقریر ۳/-
نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں ۱۸/-
تحفۂ ہفشکل ۱۶/-
تحفۂ مشرق ۶/-
تحفۂ انسانیت ۱۸/-
تحفۂ کشمیر ۱۲/-
تحفۂ دین و دانش ۱۶/-
تصور آخرت ۱/۵۰

تقریر سکھانے والی کتابیں

آپ تقریر کیسے کریں مکمل ۲۳/-
آسان تقریریں مکمل غیر مجلد ۲۵/-
" " مجلد ۳۴/-
بے نظیر تقریریں ۱۳/-
تقریر کیسے کریں مکمل ۵ حصے ۵۱/-
تقریر کیجئے ۱۰/-
تقریر سیکھئے ۳۰/-

حج

اپنے گھر سے بیت اللہ تک ۱۵/-
تجلیات حرمین ۳/-
حج اور اس کی دعائیں ۲/۵۰
حج کی شرعی حیثیت ۳/-
حج و عمرہ ۲۲/۵۰
دیار حبیب ۲۵/-
نصف صدی قبل کا سفرنامہ حج ۲۰/-
نصائح حج ۳/-
زبدۃ المناسک ۷/-
طریقہ حج ۱۰/-
کاروان مدینہ ۲۲
معلم الحجاج ۲۵/-

حدیث

اصول حدیث ۱/۵۰
تدوین حدیث ۶۵/-
تقریر بخاری ۱۲۵/-
ریاض الصالحین عربی ۸۰/-
" اردو ۵۰/-
زاد سفر مکمل ۲ جلدیں ۴۰/-
چہل حدیث ۲/-
سنن نسائی عربی ۲۲۰/-
سنن نسائی مترجم ۲۹۰/-
سنن ابو داؤد شریف مترجم ۲۹۰/-
علوم الحدیث ۳۰/-
مسند امام ابی حنیفہ عربی ۲۵/-

حقوق

پڑوسی کے حقوق ۳/-
حقوق زوجین ۸/-
حقوق والدین ۷/-
میاں بیوی کے حقوق ۵/-
والدین کے حقوق ۸/-

دعائیں

پنج سورہ مترجم ۱۱/-
چہل حدیث مشتمل بر ادعیہ ۲/-
راہ امن ۱/-
مناجات مقبول اشرفی ۲۴/-
" " کریمی ۲۵/-
" " دریابادی ۱۳/-
دعائیں (علی میاں) ۴/-
صبح و شام کی دعائیں ۴/-
قرآن و حدیث کی دعائیں ۵/-
معمولات یومیہ ۲/۵۰
یٰسین شریف مترجم کلاں ۳/-
" " متوسط ۲/-
ہماری دعا قبول کیوں نہیں ہوتی ۱۲/-

رد شرک و بدعت

اصلاح المسلمین اول ۴/-
تقویۃ الایمان بحواشی مولانا علی میاں ۲۰/-
حضرت تھانوی اور اعلیٰ حضرت ۷/-
دین حق اور علماء ربانی
شرک و بدعت کے خلاف کیوں ۴/-
رضاخانی ترجمۂ تفسیر ایک نظر میں ۳/-
رضاخانیت کا تنقیدی جائزہ ۱۴/-
زلزلہ در زلزلہ ۱۵/-
عقائد علمائے اہل سنت ۲۲/-
فتاویٰ اعلیٰ حضرت ۲/۵۰
فیصلہ کن مباحثہ ۴/۵۰
فتح حقانی ۸/-
کفر و ایمان کی کسوٹی ۲/-
وہابی کی پہچان ۱/۵۰

رد شیعیت

آپ خود فیصلہ کریں کیا شیعہ مسلمان ہیں؟ ۲/-
اسلام اور شیعہ مذہب ۶/-
بدعات محرم و تعزیہ ۸/-
تعارف مذہب شیعہ ۲۵/-
تقیہ کی حقیقت ۲۰/-
ابوبکرؓ و علیؓ کے باہمی تعلقات ۳/۵۰
خمینیت عصر حاضر کا عظیم فتنہ ۱۵/-
شیعہ اور قرآن ۲۵/-
شیعوں کے ۱۱ اہم سوالات کے جوابات ۵/-
قاتلان حسین کی خانہ تلاشی ۸/-

رویت ہلال، شب براءت، رمضان سے متعلق کتابیں

اعتکاف ۳/-
تراویح کی ۲۰ رکعتیں ہیں یا آٹھ ۵/-
روزے کی شرعی حیثیت ۳/-
رویت ہلال ریڈیو ٹیلیفون کا شرعی حکم ۲/-
روزہ میں انجکشن و آپریشن کا شرعی حکم ۲/۵۰
شب براءت ۳/۵۰
شب براءت کی حقیقت ۶/-

سیرت النبیؐ

اصح السیر ۶۰/-
رحمت عالم ۱۰/-
رسالتمآب ۶۵/-
سیرت طیبہ ۳۰/-
سیرت النبی ابن ہشام مکمل ۴ جلد ۲۲۵/-
نسیم الحبیب ۱۲/-
مختصر سیرت نبویہ ۱۰/-
مقالات سیرت ۳۰/-
نبی رحمتؐ ۱۰۰/-
ولادت نبویؐ ۱۰/-
ہادی اعظم ۵/-

سیر و سوانح

اشرف السوانح مکمل ۴ جلدیں ۲۲۰/-
امام احمد بن حنبل ۷/-
امت کی مائیں ۱۲/-
حضرت اویس قرنی ۲/۵۰
حکیم الامت ۸۰/-
سیرت خلفائے راشدین ۱۵/-
سیرت سید احمد شہید مکمل ۲ جلدیں ۱۶۰/-
کرامات صحابہ ۸/-
سو بڑے آدمی ۱۸/-

عملیات و طب

المائدہ ۲/۵۰
پھولوں سے علاج ۸/-
حل مہمات ۲/-
سبزیوں سے علاج ۱۰/-
طب نبوی عکسی ۲۵/-
مستند طب نبوی ۲۰/-
گنجینۂ اسرار ۱۸/-
مجربات خاندان ولی اللہی ۳/۵۰
منزل عکسی خورد مترجم ۲/-
" کلاں ۴/-

عورتوں کیلئے بہترین کتابیں

انیس نسواں ۸/-
بہشتی زیور ۸۰/-
بنات اربعہ ۴۰/-
بہترین جہیز ۴/-
حسن معاشرت ۶/-
رسول اللہ کی صاحبزادیاں ۹/-
مسلمان بیوی ۹/-
مسلمان عورت کے فرائض ۴/-

فضائل

بارہ مہینوں کے فضائل ۲۵/-
فضائل تبلیغ ۶/-
فضائل تقویٰ ۴/۵۰
فضائل توبہ و استغفار ۴۰/-
فضائل درود و سلام ۱/۵۰
فضائل ذکر ۱۵/-
فضائل رمضان ۷/-
فضائل روزہ ۱/۵۰
فضائل صدقات ۴۰/-
فضائل نکاح ۴/۵۰
فضیلت گشت ۱/۵۰
فضائل نماز ۸/-

قرآن مجید و حمائلیں

قرآن مجید ۱۳ مترجم ۴۵/-
" " ۱۳ء " ۸۰/-
" " ۶۴ " ۷۰/-
" " ۵۵۵ " ۹۰/-
" " ۳۲۶ " ۶۸/-
حمائل " ۴۵ " پریس ۴۰/-
قرآن مجید مترجم ہندی ۶۵/-
" " " انگریزی ۸۰/-
قرآن مجید ۱۳ معریٰ ۶۰/-
" " ۱۲۶ " ۴۶/-
حمائل ۱۴۷ پلاسٹک ۱۶/-
" " پریس ۲۵/-
" ۳۴۷ پلاسٹک ۱۸/-
" پریس ۲۸/-

مسائل و احکام

احکام اسلام عقل کی نظر میں ۱۶/-
ارکان اسلام ۱۲/-
اسلام اور تصویر ۳/-
اسلامی قانون وراثت ۱۳/-
تعلیم الدین ۱۰/-
داڑھی کا فلسفہ ۲/-
داڑھی کی شرعی حیثیت ۱۲/-
رفیق سفر ۴/۵۰
زکوٰۃ کی اہمیت ۷/-
سپریم کورٹ کا فیصلہ ۱۰/-
ایک مجلس کی تین طلاقیں ۱۲/-
بینک انشورنس و سرکاری قرضے ۲۸/-
مسئلہ تقدیر ۴/۵۰
نان نفقہ کا مسئلہ ۱۲/-
نجات المسلمین ۳/۵۰

مکاتیب و ملفوظات

فیضان نسیم ۲۵/-
مکتوبات اکابر دیوبند ۲۰/-
مکتوبات امام ربانی مکمل ۱۹۰/-
مکاتیب رسول ۱۵/-
مکتوبات ماجدی اول ۴۰/-
احسن المواعظ ۲۵/-
اشرف المواعظ ۲۱/-
اقوال سلف ۴ حصے ۶۳/-
اکرم المواعظ ۲۲/-
مواعظ شیخ الاسلام اول ۱۳/-
مکتوبات شیخ مکمل ۴ جلدیں ۹۰/-

متفرقات

تمباکو زہر قاتل ۲۰/-
شکار ۱۵/-
علم ۸/-
گناہ کیا ہیں؟ ۱۰/-

حمیدی جنتری ایک مستند اور بے حد کارآمد جنتری ہر وقت ساتھ رکھنے کے لائق۔ ۲/-

ملنے کا پتہ:- **الفرقان بکڈپو۔ ۱۱۴/۳۱ نظیر آباد لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸**

مارچ ۱۹۹۲ء مطابق رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ

جلد ... ... ۶۰ شمارہ ۳

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سرپرست
حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

مدیر
خلیل الرحمٰن سجاد ندوی

قیمت :- ۵/۵۰

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :-
ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور

برطانیہ میں ترسیل زر کا پتہ :-

All Cheques and Postal Orders payable to,
R. RAHMAN *and send it to :*
Mr. R. RAHMAN
90-B, HANLEY ROAD LONDON N4 3DW

فہرست

صفحہ نمبر	مضامین نگار	فہرست مضامین	نمبر شمار
۳	مولانا عتیق الرحمٰن صاحب سنبھلی	نگاہ اولیں	۱
۸	حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ	روزہ۔ اس کی تاثیر اور آداب	۲
۱۲	مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی	تقویۃ الایمان اور شاہ محمد اسمٰعیلؒ کے خلاف برپا شورش تاریخ وحقیقت کے آئینہ میں (قسط ۷)	۳
۲۲	مولانا عتیق احمد بستوی	دولتِ عثمانیہ کے دورِ اصلاحات کا مختصر جائزہ	۴
۲۳	مولانا محمد شعیب اللہ خاں مفتاحی	کیا عذاب قبر کا عقیدہ غیر اسلامی تصور ہے۔ (پانچویں اور آخری قسط)	۵
۴۳	چودھری علی مبارک عثمانی	تأثرات۔ واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر	۶

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہوگئی ہے، براہِ کرم آئندہ کیلئے سالانہ چندہ فوراً ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا اطلاع مہینے کے آخر تک موصول نہ ہونے کی صورت میں اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی روانہ کیا جائے گا۔

ہمارا پتہ: منیجر ماہنامہ الفرقان نظیر آباد (۳۱۔ نیا گاؤں مغربی) لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸ (یو پی الہند)

محمد حسان نعمانی پرنٹر و پبلشر نے سینٹر آف میڈیا پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

نگاہِ اوّلیں

حالات کی تبدیلی کا صرف ایک راستہ!

راقم الحروف کو اپنی کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" کی تیاری کے دوران مطالعہ میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کی کتاب منہاج السُّنّہؒ کے ایک ایسے مضمون تک خدا کی توفیق سے رسائی ہوگئی جس سے نہ صرف کتاب کا خاتمہ بالخیر ہونے میں بے حد اطمینان بخش مدد ملی، بلکہ آج (بروز ۲۵ فروری) جب میں والد ماجد کے اس ارشاد پر کہ الفرقان کے نگاہ اولیں کیلئے کچھ لکھ دوں سوچنے لگا کہ کیا لکھوں؟ تو ذہن شیخ الاسلام علیہ الرحمہ کے اُس مضمون کے اُن اقتباسات کی طرف منتقل ہوگیا جو اپنی کتاب میں لئے گئے تھے، کیونکہ اس مضمون میں شیخ نے جس اصول شریعت کی روشنی میں حضرت حسینؓ کے اُس اقدام پر گفتگو کی ہے جس کا خاتمہ کربلا کے المیہ کی شکل میں ہوا وہ اصول آج کے ہندوستان کے ان حالات میں جنھوں نے ہم مسلمانوں کو بالکل ایک فیصلہ کن موڑ پر پہنچا دیا ہے، ہمارے لئے ایک قطعی رہنمائی اور مکمل روشنی اپنے اندر رکھتا ہے۔

"واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" کے آخری باب میں شیخ کا ارشاد بدیں الفاظ نقل کیا گیا تھا کہ:۔

"حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت انسانوں کی معاش و معاد (دنیوی اور اُخروی زندگی) کی صلاح و فلاح کیلئے ہوئی تھی، آپ نے ہر اُس بات کا حکم دیا جس میں صلاح (بھلائی) ہے، اور ہر اُس بات سے منع فرمایا جس میں فساد (بگاڑ اور برائی) ہے۔ پس ایسا کوئی کام اگر سامنے آتا ہے جس میں صلاح اور فساد دونوں پہلو پائے جاتے ہیں، تو اہل سنت

یہ دیکھتے ہیں کہ فساد کا پہلو غالب ہے یا صلاح کا؟ اور پھر جو پہلو غالب نظر آتا ہے اُس کے مطابق اُس کام پر حکم لگاتے ہیں، صلاح اور فلاح کا پہلو غالب ہے تو اُس کام کے کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، فساد اور خرابی کا پہلو غالب نظر آتا ہے تو اس کام کے ترک کو ترجیح دی جاتی ہے"

آگے فرماتے ہیں:-

"پس اب ایک یزید یا عبدالملک اور منصور جیسا کوئی شخص خلافت کے منصب پر فائز ہو جاتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس سے قتال کر کے کسی بہتر شخص کو اس کی جگہ لانے کی کوشش کی جائے؟ اہلِ سنّت اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں، کیونکہ ایسے فعل سے بہ نسبت بھلائی اور مصلحت کے بگاڑ اور فساد کے زیادہ امکانات ہیں، پوری تاریخ ہمیں بتا رہی ہے کہ کسی صاحبِ سلطنت و قوت شخص کے خلاف جب بھی خروج کیا گیا، بالعموم اُس کا خیر بہت معمولی اور شر بہت زبردست ہوا، مثلاً مدینے والوں نے یزید کے خلاف خروج کیا، ابن الاشعث نے عبدالملک کے خلاف عراق میں کیا، یا ابن المہلّب نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی، یا ابوسلم نے خراسان میں انہی بنو اُمیّہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا یا خلیفہ منصور کے خلاف مدینے اور بصرے سے بغاوت اُٹھی، اِن میں ہر جگہ ہزیمت اور بربادی کے سوا کچھ نہ ملا، اور ابوسلم خراسانی جیتا بھی تو کیا جیت اُسکی ہوئی؟ منصور کے ہاتھوں وہ خود بھی مارا گیا، اور جیت میں کسقدر آدمی اُس نے مروا دیئے کہ اللہ کی پناہ! ____ الغرض نہ دین ہی قائم کرسکے نہ دنیا ہی بچا سکے۔ فلا اقاموا دیناً ولا ابقوا دُنیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے کام کا حکم نہیں فرماتا جس میں نہ دین کی صلاح ہو نہ دنیا کی فلاح (اور ایسے کام اللہ کو پسند نہیں ہیں چاہے اُن کے کرنے والے کیسے ہی متقی اور اصحابِ جنّت کیوں نہ ہوں[1]"

مسلمانانِ ہند کو دستوری طور پر یہ اطمینان دلائے جانے کے باوجود کہ وہ آزاد ہندوستان میں مکمل اور مساوی حقوق والے شہری ہیں مسلسل جو تجربات اس اطمینان دہانی کے برعکس ہوئے ہیں، جن کے

[1] واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر صـ ۲۴۶-۲۴۵

بموجب عملاً وہ اپنے آپ کو دوسرے اور تیسرے درجے کا شہری پاتے رہے کہ جن کے جان ومال، عزت وآبرو اور مذہب وثقافت کو مساوی درجے کا تحفظ حاصل نہیں ہے۔ اور پھر اب بات اس سے بھی آگے بڑھ کر یہاں تک پہنچ گئی کہ جو قوتیں اُن کو ہندوستان میں برداشت کئے جانے کے لئے علانیہ شرط لگانا چاہتی تھیں کہ وہ ہندوستان میں ہندوییت کی بالاتری تسلیم کریں اور کم از کم اسکے تہذیبی رنگ میں اپنے آپ کو رنگ لیں مگر ایسا کر سکنے کی پوزیشن میں نہیں تھیں، وہ اگرچہ باضابطہ اب بھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں، مگر اتنی قوت اور اتنا سیاسی اور عوامی اثر و نفوذ انھوں نے گزشتہ چند سال میں حاصل کر لیا ہے کہ کوئی دوسری قوت انھیں لگام دینے کی پوزیشن میں نہیں رہ گئی ہے، اور اس بے لگامی کا موقع پاتے ہی انھوں نے جو تجربہ یہاں کے مسلمانوں کو کرایا ہے اُسے "اونٹ کی کمر پر آخری تنکہ" کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا، اور اس لئے ذرا بھی حیرت کی بات نہیں اگر یہ سننے میں آتا ہے کہ مسلم نوجوانوں کے ایک طبقے میں یہ انداز فکر مقبول ہو رہا ہے کہ ہندوستان میں اب مسلمانوں کو اپنے حقوق کی بحالی کے لئے اپنی قوتِ بازو کو آزمانے کے سوا اب کوئی راستہ نہیں رہ گیا ہے۔

گرم خون پر ظلم وستم کا یہ ردّعمل بالکل قدرتی بات ہے، ۱۹۶۱ء میں جب آزاد ہندوستان کا پہلا عظیم مسلم کش فساد مدھیہ پردیش کے شہر جبل پور میں ہوا جس کی تباہ کاریاں دیکھ کر وہاں کے وزیر اعلیٰ کیلاش ناتھ کاٹجو نے کہا تھا کہ جبل پور ایک شمشان بھون نظر آ رہا ہے، اور پنڈت نہرو نے فرمایا تھا کہ اُن کا سر دنیا کے سامنے شرم سے جُھک گیا ہے، اور پھر اس فسادی لہر نے یوپی کے بھی بعض شہر تاراج کئے، تو اُس وقت کے اِن حالات نے اِن سطروں کے لکھنے والے پر بھی یہ اثر کیا تھا کہ الفرقان کے ماہانہ دور پر قناعت ممکن نہ رہی اور ہفت روزہ "ندائے ملت" وجود میں آیا، جس کا انداز یہ تھا کہ پہلی اشاعت میں سرورق مجاہدین الجزائر کے کٹے ہوئے کچھ سر سجے تھے اور اندرونِ ورق حضرت جگر مرادآبادی مرحوم کی ایک غزل جلی قلم سے چھپی تھی جس کا سرآغاز یہ مطلع تھا ؎

یہ مصرع کاش نقشِ ہر در و دیوار ہو جائے
جسے جینا ہو مرنے کے لئے تیار ہو جائے

لیکن ایک بات کا "قدرتی" ہونا الگ ہے، اور صحیح اور مفید ہونا الگ، یہ دونوں باتیں بیک وقت جمع بھی ہو سکتی ہیں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بات قدرتی ہو مگر صحیح اور مفید نہ ہو، قوتِ بازو کا استعمال اگر فسادات کے موقع پر جان و مال کی حفاظت و مدافعت کیلئے ہو تو بالکل صحیح بالکل بجا بلکہ ایک فرض اور ایک ناگزیر عمل، لیکن اس کا استعمال اگر ایک مستقل محاذ آرائی کے لئے سوچا جائے جیسے کہ ہندوستان میں جگہ جگہ علاقائی مفادات کے علمبرداروں نے یہ راہِ عمل اپنائی ہے تو اس پر امام ابن تیمیہ کے اوپر دیئے گئے اقتباسات کی روشنی میں غور کرنے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ ہمارا یہ معاملہ صلاح و فساد کے امکانات کی رُو سے واضح طور پر اُسی زمرے میں آتا ہے جس زمرہ کی مثالوں کو سامنے رکھ کر امام نے گفتگو کی ہے ـــــ اور یہاں یہ بات بھی بھولنی نہیں چاہئے کہ امام ابن تیمیہ کسی گوشہ نشین اور عافیت پسند بزرگ کا نام نہیں ہے، یہ ایک صاحب سیف و قلم کا نام ہے جس کی پوری زندگی فرائض کی راہ میں مصائب و محن ہی کو دعوت دیتے گزری حتیٰ کہ وفات بھی جیل خانے میں ہوئی، اور جس نے اپنے وقت کے سلاطین کو تاتاریوں کے سیل بے پناہ کے مقابلے میں کھڑا کیا، اور نہ ہی یہ خیال کرنا صحیح ہوگا کہ امام کی یہ گفتگو تو شاید مسلمانوں کے آپس کے معاملات کی بابت ہے، کیونکہ اصل چیز مثالیں نہیں (جو کہ مسلمانوں کے باہمی معاملات ہی سے متعلق ہیں) بلکہ امکاناتِ صلاح و فساد کے موازنے کا اصول ہے جس کو کسی حد میں محدود نہیں کیا جا سکتا، جس عمل سے بھی مسلمانوں کے حق میں فساد اور بگاڑ اور حالات کے بد سے بدتر ہونے کا مساوی امکان بھی پایا جاتا ہو شریعت اسلامی اس کی اجازت نہیں دے گی۔

ہندوستان کے حالات کسی بھی ہوشمند مسلمان کو اسکی اجازت نہیں دیتے کہ وہ ان حالات کی تبدیلی کیلئے کوئی اور کسی قسم کا بھی کردار ادا نہ کرے، مگر مسلمان جیسی صاحبِ دعوت اُمّت کے لئے خاتم النبیین اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت کیلئے یہ بات کسی طرح زیبا نہیں دکھائی دیتی کہ وہ یہاں کے حالات کو صرف اپنے مصائب اور مسائل کے پہلو (ANGLE) سے دیکھے، یہاں

صرف مسلمان ہی مظلوم نہیں ہیں، اور کتنے ہی طبقے یہاں مظلوموں کے ہیں، جن کے لئے ہمارے دل میں درد ہونا چاہئے، اور اپنے مسائل و مصائب کے ساتھ اُن کے مسائل و مصائب کیلئے بھی ایک حصہ ہماری فکر میں نکلنا چاہئے، اور عرفی معنیٰ میں مظلوم طبقے ہی نہیں یہ پورا ملک ہماری دردمندی اور فکرمندی کا مستحق ہے، ذرا نظر ڈالئے، کونسی کل اس وقت ہمارے ملک کی سیدھی ہے؟ سر سے پاؤں تک "تن ہمہ داغ داغ شد" کا مصداق ہے، کیا اس کا کوئی تقاضہ ہم سے بحیثیت مسلمان، بحیثیت انسان اور بحیثیت باشندۂ ہندوستان نہیں ہے؟ کیا ہمارے اوپر اس ملک کا حق نہیں ہے؟ اور بحیثیت مسلمان، بحیثیت انسان فرض نہیں ہے کہ ہم اسکی بگڑی ہوئی حالت کو سنوارنے کی کوشش کریں؟

ایک ایسے فرد کی حیثیت سے جس کی عمر کا سب سے قیمتی حصہ مسلمانانِ ہند کے مسائل اور مصائب کی فکر ہی میں صرف ہوا، بغیر کسی ادّعا کے یہ کہنا اور ریکارڈ پر لے آنا اپنا فرض معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل اور مصائب کے حل کا کوئی راستہ اسکے سوا نہیں ہے کہ وہ اپنے مخصوص مسائل کی ضروری دیکھ بھال اور اپنی تعمیر والے کاموں کی سرانجامی کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو اور اپنے ساتھ ساتھ بلا تفریق پورے ملک کو انسانیت اور انسانی صفات کے اس معیار پر لانے کی صدق دلانہ کوشش کریں جو آج کی مہذب دنیا کا متفق علیہ اور مسلّم ہے۔

ماحول اور حالات کی ناموافقت میں سب سے بڑا ہاتھ ایک خاص عنصر کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈے اور اُن کی تصویر خراب سے خراب تر کرنے کا ہے، اس پروپیگنڈے کا توڑ مسلمانوں کو لٹریچر سے نہیں اپنے عمل سے کرنا ہوگا، اور پھر وہ دیکھیں گے کہ کتنی تبدیلی یہاں کے حالات میں ہوتی ہے، اور اُن کا عمل توڑ کرنے کے لئے نہیں، اپنا وہ فرض ادا کرنے کے لئے ہوگا جو اُن کے ذمّے اس ملک کا قرض ہے۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

روزہ
اس کی تاثیر اور آداب

روزہ

نماز اور زکوٰۃ کے بعد تیسرا اعلیٰ رکن "روزہ" ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں رُوحانیت اور ملکوتیت کا جو حصہ رکھا ہے، روزہ اس کو ترقی دینے کا اور نفس کی تطہیر اور تزکیہ کا خاص ذریعہ ہے، اور قناعت اور صبر و تقویٰ جیسی ملکوتی صفات کے نشو و نما میں روزہ کو خاص دخل ہے ــــــ علاوہ اِس کے روزہ میں انسان پیٹ کے اور شہوتِ نفس کے خالص مادی اور بہیمی تقاضوں سے بے تعلق ہو کر ملاءِ اعلیٰ سے اور عالمِ ملکوت سے خاص ربط اور مناسبت پیدا کر لیتا ہے ــــــ لیکن نماز اور زکوٰۃ کی طرح روزہ سے بھی یہ مقاصد جب ہی حاصل ہو سکتے ہیں جب کہ وہ عبادت والی فکر کے ساتھ رکھا جائے، اور اسکے آداب کا پورا لحاظ رکھا جائے، اور اُن تمام باتوں سے پرہیز کیا جائے جو ان مقاصد کے منافی ہیں، جن میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ ہر قسم کے معاصی سے بچا جائے، خاص کر تمام بُری باتوں سے مُنھ کی اور زبان کی حفاظت کی جائے، اگر ایسا نہیں کیا گیا، تو روزہ سے یہ رُوحانی نتائج ہرگز حاصل نہیں ہوں گے، حدیث شریف میں ہے:-

مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ [1]

---

[1] رواہ البخاری وابوداؤد والترمذی عن ابی ہریرہ وکذا فی جمع الفوائد۔ ۱۲

یعنی جو شخص روزہ میں بھی جھوٹ بولنا اور غلط اور دھوکہ فریب کے کام کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی کوئی حاجت نہیں ہے کہ وہ کھانا پینا چھوڑ کر صرف بھوکا پیاسا رہے۔

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے :-

رُبَّ صَائِمٍ حَظُّہٗ مِنْ صِیَامِہِ الْجُوْعُ وَالْعَطَشُ[1]

یعنی بہت سے روزہ رکھنے والے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اُن کو اُن کے روزہ سے سوائے بھوکا اور پیاسا رہنے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

بہرحال نماز اور زکوٰۃ کی طرح روزہ میں بھی اس کی ضرورت ہے کہ فکر اور اہتمام سے ایسے روزے رکھے جائیں جن سے ہماری روحوں کو پاکیزگی حاصل ہو، اور ہم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔

روزہ کی برکات حاصل کرنے کی شرطیں اور تدبیریں

اس کے لئے ایک شرط تو یہی ہے کہ ہر قسم کے معاصی سے اور خاص طور سے منھ اور زبان سے تعلق رکھنے والے گناہوں سے، بلکہ مکروہات سے بھی پورا پرہیز کیا جائے، حتیٰ کہ حدیث شریف میں ہے کہ، چیخ کے بھی نہ بولا جائے ـــ اور اس کے برعکس نیکیوں کی مقدار روزہ کے ایام میں بڑھا دی جائے، خاصکر منھ اور زبان سے تعلق رکھنے والی نیکیوں کی، مثلاً تلاوت اور ذکر کی کثرت کی جائے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ روزہ کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کا، اور اس کے حکم اور امر کا زیادہ سے زیادہ استحضار رکھا جائے یعنی بار بار اس کا مراقبہ اور دھیان کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ حاضر ناظر ہیں، اور میں نے اُن کے حکم سے اور اُن کے لئے کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے، اور وہ میرے اس حال کو دیکھ رہے ہیں، خاصکر جب بھوک یا پیاس کا احساس ہو تو دل ســے کہا جائے کہ اگرچہ کھانا اور پانی حاضر اور موجود ہے، لیکن اللہ کے حکم کی وجہ سے اور اللہ کو راضی کرنے کے لئے تجھے بھوکا اور پیاسا ہی رہنا ہے، میرا مالک و معبود آج تیری اسی بھوک اور پیاس سے

---

[1] رواہ الطبرانی فی الکبیر عن ابن عمرؓ (جمع الفوائد) - ۱۲

خوش ہے، اور آج کی یہ بھوک پیاس انشاء اللہ تجھے آخرت کی سخت ترین بھوک پیاس سے بچانے والی ہے۔

افطار اور سحر میں کم کھانا بھی روزہ کو نورانی بنانے والی چیز ہے، اور بسیار خوری سے روزہ میں ظلمت اور کدورت پیدا ہوتی ہے، اور اس کی تاثیر جاتی رہتی ہے۔

نفلی روزوں کے بارے میں اُسوۂ نبوی اور ہمارا طرزِ عمل

روزہ کا بیان ختم کرنے سے پہلے نفلی روزوں کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ہے:-

نماز کے باب میں تو ہمارا یہ حال ہے کہ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو صرف فرض رکعتوں پر قناعت کرتا ہو اور سنن و نوافل نہ پڑھتا ہو، بلکہ اگر کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار کرے تو اُسے بُری نگاہوں سے دیکھا جائے گا اور اُس کے متعلق اچھا خیال قائم نہیں کیا جائے گا لیکن روزہ کے باب میں قریب قریب ہم سب کا طرزِ عمل یہی ہے کہ بس رمضان کے روزے سال میں ایک دفعہ رکھ لیتے ہیں ——— بہت کسی نے ہمت کی تو عرفہ کا، یوم عاشوراء کا، اور شب برات کا ایک ایک روزہ رکھ لیا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح فرض نمازوں کے علاوہ نفل نمازیں پڑھتے تھے اور دوسروں کو اس کی ترغیب دیتے تھے، اسی طرح آپ رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ نفلی روزے بھی کثرت سے رکھتے تھے، اور ان کی بھی امت کو ترغیب دیتے تھے ——— ہر مہینے ایام بیض کے یعنی تیرھویں، چودھویں، اور پندرھویں تاریخوں کے ۳ روزے تو آپ قریب قریب ہمیشہ ہی رکھتے تھے ——— اس کے علاوہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دوشنبہ اور پنجشنبہ کو آپ کا اکثر روزہ ہوتا تھا ——— ہمیں اپنے عمل سے حضورؐ کی اس سنّت کو بھی زندہ کرنا چاہئے ——— روزہ تو بڑی برکت والی اور روح کو بہت پاک اور نورانی بنانے والی چیز ہے ——— روزے کے انوار و برکات سے پورے گیارہ مہینے محروم رہنا بڑے خسارے کی بات ہے۔

نفلی روزے نہ رکھنے کا اثر ہمارے رمضان کے روزوں پر

بلکہ میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ گیارہ مہینہ مسلسل روزے نہ رکھنے کی وجہ سے ہمارے رمضان کے روزے بھی گھٹیا ہوتے ہیں، اگر ہر مہینے کچھ روزوں کا معمول رہے تو روزہ کی کیفیات اور اُس کے انوار سے ایک خاص مناسبت قائم رہے اور پھر رمضان آنے پر ہماری حالت کچھ اور ہی ہوا کرے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ یوں تو آپ ہر مہینے کچھ روزے رکھتے تھے لیکن خصوصیت سے شعبان میں بہت روزے رکھتے تھے، بلکہ کبھی کبھی قریباً پورے مہینہ کے روزے رکھتے تھے، میرے خیال میں اس کی ایک حکمت یہ بھی تھی کہ روزہ کی حقیقت سے، اور اس کے انوار سے طبیعت مبارک کی مناسبت اور زیادہ بڑھ جائے۔ واللہ اعلم۔

بہرحال نفل نمازوں کی طرح ہمیں نفلی روزوں سے بھی شوق پیدا کرنا چاہئے، اور ان کی عادت ڈالنی چاہئے ——— اللہ تعالیٰ توفیق دے کم ازکم ہر مہینے ۱۳، ۱۴، ۱۵ کا روزہ رکھ لیا کریں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول بھی یہی تھا، اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ:۔

"ہر مہینے میں تین روزے، اور ہر سال پورے رمضان کے روزے رکھنا اجر و ثواب کے لحاظ سے ایسا ہے جیسا کہ کوئی ہمیشہ بارہ مہینے روزے رکھے[1]" (ماخوذ از "دین و شریعت")

---

[1] نفل روزوں کے بارے میں ایک طویل روایت حضرت ابو قتادہؓ سے صاحبِ جمع الفوائد نے مسلم، ابوداؤد اور نسائی کے حوالہ سے نقل کی ہے، یہ اُسی کا ایک ٹکڑا ہے۔ ۱۲

مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی

تقویۃ الایمان اور شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ

کے خلاف برپا شورش

تاریخ و حقیقت کے آئینہ میں

(قسط ۷)

باب اوّل (۴)

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا ایک اور ارشاد گرامی

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا جو ارشاد اوپر نقل ہوا ہے وہ کسی وقتی تأثر پر مبنی نہیں تھا بلکہ شاہ صاحبؒ کا بہت جانچا پرکھا فیصلۂ غیر متزلزل رائے اور قولِ محکم تھا جس میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ قوت و استقامت پیدا ہوتی گئی، اور شاہ عبدالعزیزؒ بلا تردد ارشاد و تحریر فرمانے لگے کہ:

"ایشاں در علم تفسیر و حدیث و فقہ و اصول و منطق وغیرہ از فقیر کمتر نیستند"

اگر میرا فرمایا ہوا مستند اور امت کے عوام و خواص کے لئے ہر پہلو سے معتبر اور لائق اعتماد ہے، تو ان دونوں (شاہ محمد اسمٰعیلؒ و شاہ عبدالحیؒ) کی تقریر و تحریر بھی، اسی قدر مستند اور دین و شریعت کی کسوٹی پر کسی ہوئی ہے اور اس میں کسی طرح کی کوئی ملاوٹ اور کھوٹ نہیں ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی اس تحریر کے ذریعہ شاہ محمد اسمٰعیلؒ اور شاہ عبدالحیؒ کی پُرزور

ایسی تحسین وتوثیق فرمائی ہے اوران کے علم وتفقہ کو اس درجہ اعتماد واعتبار بخشا ہے کہ کسی بڑے کی زبان یا قلم سے اپنے خورد یا شاگرد کے لئے اس سے بہتر الفاظ معدوم نہیں تو کمیاب ضرور ہیں، اس تحریر کا ایک ایک لفظ تحریک سید احمد شہیدؒ اور تعلیمات ومؤلفات شاہ محمد اسمٰعیل پر شاہ عبدالعزیزؒ کے انشراح کی علامت اور اس بحث پر ان کے موقف وخیالات کا آئینہ ہے۔

شاہ عبدالعزیزؒ کی یہ تحریر اس وقت لکھی گئی تھی، جب تحریک سید احمد شہید کا پیام اور تعلیمات ونظریات شاہ اسمٰعیل کی خوشبو پورے ملک کو معطر کئے ہوئے تھی، اور ملک کے اس کونہ سے اس کونہ تک ان کا چرچا وتذکرہ عام تھا، اگر اس تحریک کا کوئی پہلو اور شاہ اسمٰعیل کی دعوتِ توحید واتباع سنت کا کوئی عنوان شاہ عبدالعزیزؒ کی نظر میں غیر مفید یا ناپسند ہوتا تو وہ یقیناً بلا تأمل اس کا اظہار کرتے اور ان حضرات کو ایسا گرانمایہ پروانۂ خوشنودی ہرگز عطا نہ فرماتے، جو ان حضرات کی ایک ایک تحریر اور قول وعمل پر شاہ عبدالعزیزؒ کے غیر معمولی اعتماد کا ترجمان ہے۔

شاہ عبدالعزیزؒ اپنی اس تحریر میں یہ بھی لکھ رہے ہیں کہ حق تعالیٰ نے ان دونوں کو جو کمالات اور مراتب عالیہ عطا فرمائے ہیں وہ ہر اک کا نصیب نہیں مجھ سے اس کا شایانِ شان شکر بھی ادا نہیں ہوسکتا اور اس سے بھی بڑھ کر ایک بڑی، بہت بڑی بات یہ رقم فرمادی ہے کہ: ان دونوں کے لئے دعا کرنا نجات اخروی کا سبب ہے یعنی وہ دونوں اللہ کے ایسے مقبول وبرگزیدہ بندے ہیں کہ انکے لئے دعا خود حضور الٰہی میں پسند ہے اور اس دعا کی وجہ سے (امید ہے کہ) خود دعا کرنے والے اشخاص کے ساتھ رحمت ومغفرت کا معاملہ فرمایا جائے گا، فجزاہ اللہ عنا وعن الاسلام والمسلمین احسن الجزاء وخیر الجزاء ورحمہ اللہ رحمۃ الابرار الصالحین۔

ویرحم اللہ عبدا قال آمینا

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے اس مکتوب والاشان "یا فرمان واجب الاذعان" کے تحریر کی تقریب یہ ہوئی تھی کہ لکھنؤ اور اس کے اطراف کے چند علماء نے دریا کے سفر، راستہ کی مشکلات اور زندہ وسلامت واپس نہ آنے کے موہوم اندیشے کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں پر فریضۂ حج کے

ساقط و کالعدم ہونے کی مہم چلائی ہوئی تھی، ان تحریرات کی وجہ سے بہت سے مسلمان جن پر حج فرض تھا اور اس مقدس فریضہ کو سرانجام دینا چاہتے تھے، حج کی سعادت و برکات سے محروم چلے آرہے تھے، تحریک سید احمد شہیدؒ کے علماء کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے اس غلط خیال کی برملا تردید کی، اہلِ استطاعت پر حج فرض ہونے اور اس کی بلاتاخیر ادائیگی کی ضرورت و اہمیت پر مفصل فتوے لکھے اور دلائل کے اس کی حقیقت کو واضح فرمایا حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ایک متوسل نے دونوں قسم کی تحریریں مسئلہ کی صحیح تحقیق اور محاکمہ کے لئے شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں ارسال کیں، شاہ صاحب نے شاہ محمد اسمٰعیل اور مولانا عبدالحیؒ کے لکھے ہوئے جوابات کی پُرزور تائید فرمائی۔ اور لکھ دیا کہ یہی جوابات دین کی ترازو پر پورے اترتے ہیں، شریعت اور اصول فقہ کے مطابق ہیں، دوسرے لوگوں کی تحریریں جس میں حج کی فرضیت ساقط ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے لکھنے والوں کا کیا حال ہے، تحریر فرماتے ہیں کہ یہ اہلِ فتویٰ:۔

بجز دو چہار فتاوائے معروفہ کہ سند آنہا پیش واقفان ایں فن ظاہر و باہر نہ دیدہ اند عرض کہ از ادراک کتب دینیہ معتبرہ کہ مدار دین متین برآں بہرۂ وافی نمی دارند و از تحصیل علم فقہ و اصول ذخیرۂ وافی نیندوختہ اند، و محض صرف اوقات در تحصیل منطق نمودہ اند و درستی آنہم بواسطہ نافذانِ فنِ مذکور محال و مشکل است۔

دریں صورت سند اقوال قبیحہ شان ساقط از پایۂ اعتبار تصور تواں کرد،

(پہلے جواب کے مضامین سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ) ان صاحبان نے دوچار معروف (عام مروج) مجموعۂ کتب فتاویٰ کے علاوہ جس کی علمی حیثیت اس فن کے واقفین پر آشکارا ہے (یعنی بہت کمزور ہے) کچھ نہیں دیکھا (پڑھا) ہے، اور یہ لوگ دین کی معتبر کتابوں پر جن پر دین کا مدار ہے، مہارت و دسترس نہیں رکھتے، انھوں نے علم فقہ اور اصول (شریعت) کی تعلیم اور واقفیت کا زیادہ اہتمام نہیں کیا ہے، اور اپنا وقت صرف منطق پڑھنے میں خرچ کیا ہے اور اس کی

وپراحکام آنہا عمل نمودن سراسر ضلالت وبطالت پیمودن است' ازیں عقائد شنیعہ حق سبحانہ تعالیٰ جمیع مومنین رلمامون ومحفوظ دارد وتوفیق طاعت خود روزی کند۔

درستی بھی ماہرین فن کے روبرو مشکل اوراعتراضات کا سبب ہے۔
اس صورت میں ان کے کمزور اور بے حقیقت (گھٹیا) اقوال کو پائیۂ اعتبار سے ساقط سمجھنا چاہیئے، نیزان کے لکھے (اور بتائے) ہوئے پرعمل کرنا سراسر گمراہی اور باطل کے راستہ پرچلنا ہے' ان بُرے عقائد سے حق تعالیٰ شانہ سب مسلمانوں کو محفوظ اوراپنی پناہ میں رکھے' اوراپنی اطاعت کی توفیق عطافرمائے۔

یہ اقتباس اور اوپرجو مختصر کلمات گزرے ہیں سب شاہ عبدالعزیزؒ کے اسی گرامی نامے سے ماخوذ ہیں' یہ والانامہ دہلی سے روانہ ہوا تھا، اوراس وقت کے معمول کے مطابق اس کے لفافہ پر پتہ اس طرح تحریر ہے :۔

"انشاءاللہ تعالیٰ۔ لفافہ ہٰذا دربلدہ لکھنؤ، درسرائے عالی خاں رسیدہ بمطالعہ سامی منشی (خیرالدینؒ)[1] صاحب' مجمع محاسن ومناقب سلمہ اللہ تعالیٰ درآید"[2]

---

[1] منشی خیرالدین حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے خاص متوسلین اورمکتوب الیہ اصحاب میں تھے۔ان کا خاندان منشی امین الدین سے تعلق تھا۔منشی امین الدینؒ بنگال کے خاندان شیوخ کے چشم وچراغ نہایت ذہین وزیرک اوراقبال مند نوجوان تھے' سید صاحب کی تشریف بری کلکتہ سے دس بارہ سال پہلے کمپنی کے وکیل تھے' کمپنی کی پوری عملداری (خلیج بنگال سے دریائے ستلج تک) کے مقدمات سرکاری میں وہی پیروکار تھے" مزید معلومات کے لئے سیرت سید احمد شہیدؒ ص۳۱۲ ج ۱ (لکھنؤ: ۱۳۹۶ھ)

(باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

چونکہ خود حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے دینی فقہی آثار تحریک سید احمد شہید اور شاہ محمد اسمٰعیل کی تعلیمات و تالیفات کے ضمن میں اس خط کی خاص اہمیت ہے اسلئے یہ اپنے زمانۂ تحریر سے عصر حاضر تک مختلف ماٰخذ میں متواتر درج ہوا ہے کہیں مکمل کہیں ناتمام، درج ذیل نقل کیا جا سکتا ہے کہ اس خط کا مکمل ترین متن ہے جس کی صحت و ترتیب اور بعض جزوی ترمیمات و اضافات کے لئے اس مکتوب کی قدیم ترین دستیاب خطی نقل سے بھی استفادہ کیا گیا ہے[۲] خط یہ ہے :-

---

(باقی حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) اگرچہ کوئی شہادت میسر نہیں مگر قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ منشی نعیم الدین کے حقیقی اور منشی امین الدین کے رشتے کے بھائی تھے، حضرت شاہ عبدالعزیز کے ایک گرامی نامہ سے یہ اطلاع ملتی ہے کہ منشی امین الدین لاولد تھے اس لئے انھوں نے منشی نعیم الدین کو اپنا وارث اور جانشین مقرر کر دیا تھا۔

سفر حج پر روانگی کے وقت حضرت سید صاحب کلکتہ میں منشی امین الدین کی خریدی ہوئی کوٹھی اور باغ میں اترے تھے وہیں قیام فرمایا تھا، ان کی سید صاحبؒ سے سفر حج سے پہلے سے خط و کتابت تھی۔

منشی امین الدین نعیم الدین اور خیر الدین تینوں کی حضرت شاہ عبدالعزیز سے قریبی روابط اور مراسلت رہتی تھی، تینوں کا معمول تھا کہ ہر اہم معاملہ میں شاہ صاحبؒ سے رجوع کرتے تھے، اور جواب پاتے تھے، حضرت شاہ صاحب کے نام تینوں کے مراسلات و جوابات (مجموعہ مرتبہ کریم اللہ بن خلیل ڈار میں) محفوظ ہیں، منشی نعیم الدین جو پہلے سے شاہ عبدالعزیز سے بیعت تھے کلکتہ میں سید احمد شہیدؒ سے بھی بیعت ہو گئے بعد میں شاہ صاحب کو اس کی اطلاع دی تو شاہ صاحب نے تحریر فرمایا کہ :-

"و آں صاحب کہ با سید احمد صاحب بیعت نمودہ اند و توجہ گرفتہ اند اصلاً محل تردد نیست کہ سید صاحب نزد فقیر ہم صاحب این منصب و واقف ایں مشرب اند و بارہا با فقیر نشست و برخاست کردہ اند و بیعت ہم نمودہ اند، بیعت ایشاں گویا مکرر بیعت با فقیر است" (مجموعہ مذکور ص ۴۹)

[۲] نقل مجموعہ تحریرات مکتوبات فتاوی خانوادۂ ولی اللہی مرتبہ خلیل اللہ کریم اللہ ڈار کشمیری (ابتدا تالیف ۱۲۴۰ھ) میں شامل ہے ص ۲۷۴-۲۷۵ (فوٹو اسٹیٹ ملوکہ راقم سطور) پتہ کی عبارت میں حافظ عزیز الدین مراد آبادی نے یہ الفاظ بھی درج کئے ہیں: "منشی نعیم الدین صاحب برادر منشی خیر الدین صاحب" (اکمل البیان ص ۸۰۲)

منشی صاحب عالی مراتب مجمع محاسن
ومناقب سلمہ اللہ تعالیٰ۔

از فقیر عبدالعزیز بعد ابلاغ سلام مسنون
ودعوات خیر مقرون مکشوف خاطر دوستی
ذخائر باد رقیمۂ کریمہ ایشاں دو دو قطعہ
استفتا در مقدمہ استفسار فرضیت
حج بر باشندگان ہندوستان واختلاف
نمودن بعض کساں کہ اوشاں بر عدم
فرضیت حج بر ہندوستانیاں قائل اند،
مضمون سوالات واحد وجوابات
جداگانہ۔

یکے دستخطی دانایان غریب ساکنان
نواحے وجوار خط شریف دوئمی مہری
شیخ الاسلام مولوی عبدالحی صاحب بہ
تصحیح حجۃ الاسلام مولوی محمد اسمٰعیل صاحب
زادہما اللہ علما وفضلا وکمالاً۔
وصول فرصت شمول نمودہ وبر مضامین
مندرجہ آنہا اطلاع گردید۔

محاسن ومناقب کے جامع عالی مرتبہ منشی
صاحب! اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے۔

فقیر عبدالعزیز کی جانب سے سلام مسنون
پہنچے اور دعائے خیر کے بعد محبت ومراسم کے
جذبات سے پُر آپ کی طبیعت پر واضح ہو کہ
آپ کا نامۂ کرامت نشاں دو عدد فتوؤں کے
ساتھ پہنچا، جس میں ہندوستان کے رہنے والوں
پر حج کے فرض ہونے اور اس حکم سے بعض اشخاص
کے اختلاف کا ذکر ہے، جو ہندوستانیوں پر حج
فرض نہ ہونے کے قائل اور معترف ہیں، دونوں
سوالات کا مضمون ایک ہے لیکن جوابات
الگ الگ (نقطۂ نظر) کے ترجمان ہیں۔

ایک جواب پر کسی گمنام عالم کے دستخط ہیں
جو خطہ شریف (؟) کے قرب وجوار کے رہنے
والے ہیں، دوسرے (جواب) پر مہر شیخ الاسلام
مولانا عبدالحی صاحب کی ہے اور اس (جواب)
کی تصحیح وتائید حجۃ الاسلام مولانا محمد اسمٰعیل نے
کی ہے، اللہ تعالیٰ ان دونوں کے علم اور فضل و
کمال میں اضافہ فرمائے، یہ دونوں جوابات
فرحت بخش گرامی نامے کے ساتھ ملے اور
ان کے مضامین پر اطلاع ہوئی۔

ومضمون جواب ثانی نوشتۂ تاج المفسرین وفخر المحدثین سرآمد علمائے محققین مولوبین موصوفین مطابق وموافق احادیث قویہ وکتب اصول معتبرہ فقہ است، چنانچہ مقابل مہر ودستخط شاں تصحیحاً مہر خود نیز ثبت کردہ شد، ملاحظہ باید فرمود تاکہ اطمینان کلی خواہد گردید۔

وفرستادن استفتائے مذکور نزد فقیر در صورت بودن مہر ودستخط برخورداران ممدوحین احتیاج نداشت چراکہ ایشاں در علم تفسیر وحدیث وفقہ واصول ومنطق وغیرہم از فقیر کمتر نیستند ودستخط شاں گویا مہر ودستخط فقیر است۔

وعنایت باری عز اسمہ کہ شامل حال مولوبین موصوفین است، شکر ایں نعمت عظمیٰ ادا کردن نمی توانم، حق جل وعلا، زیادہ تر ازیں بمراتب علیا فائز گرداند، وبرائے اشخاص مبین اصل شریعت، جمیع مومنا را ہمیں دعا بجناب الٰہی خواستن

اور دوسرا جواب جو تاج المفسرین اور فخر المحدثین اور علمائے عہد میں ممتاز و سربلند محققین موصوفین (شاہ عبدالحیؒ وشاہ محمد اسمٰعیل) کا لکھا ہوا ہے، یہ صحیح وقوی احادیث اصول اور فقہ کی بنیادی معتبر کتابوں کے مطابق ہے، اس لئے ان دونوں کے دستخط اور مہر کے برابر میں تصدیق (واعتماد) کیلئے میں نے اپنی مہر بھی ثبت کردی ہے، ملاحظہ فرمائیں تاکہ پوری طرح اطمینان ہوجائے۔

ان دونوں لائق تعریف عزیزوں (مولانا شاہ عبدالحیؒ وشاہ محمد اسمٰعیل) کی مہر اور دستخط کے بعد اس فتوے کو میرے پاس بھیجنے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی، کیونکہ (یہ دونوں) علم تفسیر وحدیث فقہ واصول منطق معقولات وغیرہ میں مجھ سے کم نہیں ہیں، انکے مہر اور دستخط گویا میری مہر اور دستخط ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی جو عنایت (وکرم) ان دونوں کے شامل حال ہے، مجھ سے اس عظیم ترین نعمت کا (جیسا ہونا چاہیئے) شکر بھی ادا نہیں ہوسکتا، حق جل مجدہ ان دونوں کو

موجب نجات اخروی است۔

مخلص من! مولوین ممدوحین
را یکے از علمائے ربانی تصور نہ اشکالے
کہ افتتاح آں محال باشد رو برو بے
ایشاں پیش خواہند کرد، انشاء اللہ
تعالیٰ ہمہ شکوک و غلیان طبیعت دفع
خواہد گردید۔

عنایت فرمائے من! اگرچہ ایں چنیں
کلمات را بظاہر تعریف و توصیف
خود تصور تواں برد لاکن اظہار
امر حق ہم بر واقفاں واجب
والزم است لہذا چشم پوشی
از حق مناسب نداشتم۔

وہر دو استفتاء بہ لفِ رقیمہ ہذا
برسند، از رسید س مطلع باید فرمود،
ایں وقت بسبب ضعف طبیعت
بہمیں قدر اکتفا گردید۔ والاجمال
عندکم مغن عن التفصیل
واللہ یقول الحق ویھدی
السبیل والسلام علیکم
وبارک اللہ فی معاشکم

اس سے (بھی) بلند تر مقام پر فائز فرمائے
اور انکو تمام لوگوں کیلئے دین و شریعت سے آگاہ
کرنیوالا بنائے، تمام مسلمانوں کو انکے حق میں یہی
دعا کرنی چاہیئے (اور یہ دعا کرنا خود دعا
کرنے والوں کیلئے) آخرت میں نجات کا
ذریعہ اور سبب ہوگی۔

میرے مخلص! مذکورہ (دونوں) علماء
کو، علماء ربانیین میں سمجھ کر ہر وہ شبہ اور
اعتراض جس کا حل قریب قریب ناممکن ہو
انکے سامنے پیش کرنا چاہئیں انشاء اللہ تعالیٰ
تمام اعتراضات و شبہات دور ہو جائیں گے۔

میرے عنایت فرما! اگرچہ اس قسم کے
(الفاظ و) کلمات کو بظاہر اپنی تعریف و
مدح سرائی خیال کیا جا سکتا ہے لیکن حق کا
ظاہر کرنا واقف لوگوں پر ضروری اور
واجب ہے اس لئے سچائی سے چشم پوشی
میں نے مناسب نہیں سمجھی۔

اور دونوں سوالات اس خط کے
ساتھ منسلک پہنچیں گے انکی رسید سے مطلع فرمانا
چاہیئے، اس وقت طبیعت کی کمزوری کی وجہ
سے اسی پر اکتفا کیا گیا، آپ کیلئے اجمال تفصیل کا

ومعادکم۔
مکرر آں کہ انتظار باید کشید کہ
اشتہارمان معلوم در عرصہ قریب
فتوائے معافی صوم وصلوٰۃ برائے
ہندوستانیاں خواہند نوشت
بدلیل ایں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم
در ہند برائے معافی زکوٰۃ بدرجۂ
اولیٰ فقط۔[1]

محتاج نہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور ہدایت
کی راہ دکھاتا ہے۔ والسلام علیکم!
اللہ تعالیٰ آپ کی معاش و معاد میں برکت فرمائے۔
مکرر یہ ہے کہ انتظار کرنا چاہئے کہ
یہ لوگ (جنھوں نے حج کے ساقط ہونے کا
فتویٰ دیا ہے) جلد ہی ہندوستانیوں کیلئے
نماز اور روزہ کی معافی کا حکم نامہ لکھیں گے
دلیل یہ ہوگی کہ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ
علیہ وسلم ہندوستان میں تشریف فرما نہیں
ہوئے یہی دلیل زکوٰۃ کی معافی کے لئے
اور زیادہ استعمال ہوگی۔ فقط

---

[1] یہ خط جیسا کہ گزرا متعدد مآخذ میں نقل ہوا ہے، یہاں بنیادی طور پر اسکی اساس مندرجہ مجموعہ تحریرات و فتاویٰ خانوادۂ ولی اللّٰہی مرتبہ کریم اللہ بن خلیل اللہ ڈار (ابتداء ترتیب ۱۲۴۰ھ) پر ہے، مخطوطہ ص ۴۷۴-۴۷۵ مطبوعہ مآخذ میں سیرت سید احمد شہیدؒ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی مدظلہ، ص ۲۴۹-۲۵۱ ج ۱ (طبع ششم لکھنؤ: ۱۳۹۷ھ) نیز اکمل البیان حافظ عزیز الدین حسن مراد آبادی ص ۸۷۹-۸۸۰ (لاہور: ۱۳۸۴ھ) سے بطور خاص استفادہ ہوا ہے۔

یہ خط سید احمد شہید کے آخری سفر لکھنؤ یا آغاز سفر حج (اواخر ۱۲۳۷ھ) کے وقت تحریر فرمایا گیا تھا، اسکی اصل جس پر حضرت شاہ عبد العزیزؒ کی مہر ثبت تھی ۱۳۰۹ھ تک مولانا تراب علی لکھنوی کے پاس موجود تھا، مولانا امیر حسن (سہسوانی) نے وہیں دیکھا تھا، حافظ عزیز الدین نے جستجو کی تو انکو اسکی متعدد (نئی پرانی) نقلیں دستیاب ہوئیں وہ لکھتے ہیں:-

"اس خط کی نقل دیوان شمس الدین صاحب دیوان ریاست جبل پور کی بیاض میں موجود ہے اور وہاں سے بواسطہ مولوی کریم بخش صاحب ساکن جوہری بازار جے پور (باقی اگلے صفحہ پر)

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی محولہ بالا تحریر میں شاہ محمد اسمٰعیل (اور انکے ممتاز ترین رفیق کا مولانا شاہ عبدالحیٔ) کے فضل و کمال، رسوخ فی العلم، شان تفقہ اور دین و شریعت کی صحیح صحیح ترجمانی کا ایسے بلند اور وقیع الفاظ میں ذکر آیا ہے وہ ان حضرات کی علمی دینی خدمات کے اعتراف اور خانوادۂ حضرت شاہ ولی اللہؒ میں ان کے مقام و مرتبہ کی تعیین کے لئے گویا حرف آخر ہے۔

(جاری)

(باقی حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) جناب مولوی امیر احمد صاحب مرحوم سہسوانی کے پاس پہنچا، اور یہی خط بے کم و کاست منشی امجد صاحب مہتمم محکمہ مناصب واقع ریاست بھوپال کے پاس بھی موجود ملا، اور بعض روسائے بریلی کی بیاض میں بھی اس خط کی نقل ملی، مولانا امیر حسن مرحوم نقل کرتے تھے کہ یہ اصل خط مولانا تراب علی لکھنوی کے پاس موجود تھا، ہم نے بچشم خود دیکھا تھا، واللہ تعالیٰ اعلم، (رسالہ ہدایت ص۶۳) مولانا مرزا حفیظ اللہ بیگ مراد آبادی، مطبوعہ مطبع احتشامیہ مراد آباد محرم الحرام ۱۳۰۹ھ مطابق اگست ۱۸۹۱ء اکمل البیان ص۸۸۲-۸۸۳

مولانا عتیق احمد بستوی
استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

دولتِ عثمانیہ کے دورِ اصلاحات کا مختصر جائزہ

(۲) فوجی اصلاحات

سلیم ثالث کی اصلاحات کا بڑا حصہ فوج سے متعلق تھا، سلطان سلیم نے دولتِ عثمانیہ کے زوال و اضمحلال کے اسباب کا جائزہ لینے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی، جو ملک کے ممتاز شہریوں، فوجی افسروں، علماء اور بعض فرانسیسی ماہرین پر مشتمل تھی۔ طویل غور و خوض، بحث و مباحثہ کے بعد کمیٹی کے ارکان نے "لائحہ" کے نام سے اپنی رپورٹ تیار کی، جس میں فوجی اصلاحات کی اہمیت و ضرورت پر خاص طور سے زور دیا۔

۱۷۹۶ء میں فرانس کا سفیر جنرل دوبائے استنبول آیا، سلطان کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے وہ جدید ترین توپیں، چند ماہر توپچی اور انجینیر بھی لایا تھا، تاکہ عثمانی توپچی ان کی مدد سے یورپ کے جدید حربی اصولوں سے واقف ہو جائیں۔ اور توپ ڈھالنے والے کارخانوں اور سلاح خانوں میں ضروری اصلاحات کریں، سلیم ثالث نے اس گرانقدر تحفہ کی پوری قدر دانی کی۔ اسلحہ سازی کو ترقی دینے کے لئے اس نے معدنیات کی تلاش اور کھدائی پر پوری توجہ صرف کی، چنانچہ مشرقی اناطولیہ میں لوہے اور تانبے وغیرہ کی متعدد کانیں

دریافت ہوئیں جس سے اسلحہ سازی کو بڑی ترقی ہوئی اور ملک بڑی حد تک خود کفیل ہو گیا۔

سابقہ جنگوں کے تجربات کی بنا پر سلطان سلیم ثالث کو فوجی نظام میں زبردست تبدیلیوں کی ضرورت محسوس ہوئی اس لئے اس نے یورپ کے جدید جنگی اصولوں کی روشنی میں ازسرنو فوجوں کو مرتب کرنا چاہا، روس سے جنگ کے دوران ایک ترکی النسل شخص عثمانیوں کے ہاتھ گرفتار ہوا، جو روس کی فوج میں ترقی کرتے کرتے لفٹننٹ کے عہدہ تک پہونچ گیا تھا، اس کا نام عمر آغا تھا، روسی فوج میں وہ یورپ کے طریقۂ جنگ کے مطابق اعلیٰ تربیت حاصل کر چکا تھا، اس نے گرفتار ہونے کے بعد صدرِ اعظم یوسف پاشا سے عثمانی فوجیوں کا ایک دستہ یورپین طرز پر تیار کرنے کی اجازت چاہی، صدرِ اعظم نے بخوشی اس کو اجازت دی اور اس کی ہر طرح ہمت افزائی کی، چنانچہ عمر آغا نے بہت جلد ایک مختصر دستہ یورپین طریقہ سے مسلح کر کے تیار کر لیا، جنگ سے واپسی کے بعد یوسف پاشا کے ساتھ عمر آغا اور اس کا دستہ بھی قسطنطنیہ آیا، یوسف پاشا نے قسطنطنیہ کے قریب ایک گاؤں میں ان کے لئے چھاؤنی بنوادی جہاں وہ لوگ فوجی مشقیں کیا کرتے تھے ایک روز سلیم نے جا کر خود اس دستہ کا معائنہ کیا اور انکی فوجی مشقوں کو بہت قریب سے دیکھا تو اسے عثمانی فوجوں میں اس دستہ کی برتری صاف محسوس ہوئی اور اس نے نہ صرف عمر آغا اور اس کی جدید فوج کی غیر معمولی ہمت افزائی کی بلکہ دیوان میں یہ تجویز پیش کی کہ ینی چری میں بھی یہ فوجی نظام جاری کیا جائے مختلف اسباب و محرکات کی بناء پر ینی چری نے جدید نظام قبول کرنے سے انکار کر دیا اور بغاوت کر ڈالی، سلیم کو مجبوراً ینی چری پر نظامِ جدید کا نفاذ ملتوی کرنا پڑا لیکن عمر آغا کا دستہ حسبِ سابق باقی رکھا گیا، نپولین کے مصر و شام پر حملہ کے وقت عمر آغا کے دستہ نے غیر معمولی شجاعت اور فوجی برتری کا مظاہرہ کیا، بالآخر نپولین کو عکہ کا محاصرہ ختم کر دینا پڑا، جو اس کی شکست کا پیش خیمہ ثابت ہوا، عکہ کے محاصرہ میں جدید فوج نے جس تنظیم اور دلیری کا ثبوت دیا اس کے بعد پورے ملک پر جدید فوجی نظام کی برتری واضح ہو گئی، اسکے بالمقابل جنگ ابو قیر میں ینی چری نے بے مثال شجاعت کا

مظاہرہ کرنے کے باوجود جس بدنظمی اور بے تدبیری کا ثبوت دیا تھا اس کے بعد اعیانِ سلطنت کی نگاہوں میں قدیم فوج کی بقا کا کوئی جواز نہیں تھا، بہرحال نپولین کی ناکامی اور مصر سے واپسی کے بعد سلیم ثالث نے فوجی اصلاحات کا کام از سرِ نو شروع کیا، بعض پاشاؤں نے بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ اس مہم میں اس کا ساتھ دیا، ۱۸۰۵ء میں اس نے فرمان جاری کر دیا کہ ینی چری اور مملکت کی دوسری فوجوں میں سے بہترین نوجوان منتخب کر کے نظامِ جدید میں داخل کئے جائیں، اس فرمان کی اطلاع ملتے ہی ینی چری نے اعلانیہ بغاوت کر دی، نظامِ جدید کے جو دستے ان کی بغاوت فرو کرنے کے لئے روانہ کئے گئے۔ ان کو شکست دے ڈالی اور پورے ملک میں شورش برپا کر ڈالی، بالآخر سلیم ثالث کو اپنا یہ فرمان واپس لینا پڑا اور تمام فوجی اصلاحات موقوف کر دینی پڑیں، باغیوں کے مطالبہ سے چند ممتاز عہدہ دار جو اصلاحات کے حامی تھے برطرف کر دیئے گئے، باغیوں کو اس سے بھی اطمینان نہیں ہوا، اور انھوں نے بالآخر سلطان کو معزول کر کے دم لیا۔

بحریہ کی اصلاح پر سلیم ثالث نے پوری توجہ کی کوچک حسین کو ۱۷۹۲ء میں بحریہ کا امیر مقرر کیا اس نے عثمانی بیڑہ اور سلاح خانہ کی نئی تنظیم کی، غیر ملکی یورپین انجینیروں کی مدد سے زبردست عثمانی بیڑہ تیار کیا، اور بہت سے نئے جنگی جہاز بنوائے، شمالی افریقہ کے ساحلوں سے ماہر تجربہ کار جہازراں بلا کر عثمانی بحریہ میں ملازم رکھے، ایک جدید بحری مدرسہ قائم کیا جس سے عثمانی بحریہ کے لئے بہترین افسر اور کامیاب انجینیر تیار ہونے لگے، فنِ استحکامات سے متعلق یورپین مصنفین کی کتابوں کے ترکی زبان میں ترجمے کرائے غرضیکہ سلیم ثالث نے فوج میں ہمہ جہتی اصلاح کی بھرپور کوشش کی اگرچہ داخلی و خارجی موانع کی وجہ سے یہ کوشش زیادہ بارآور ثابت نہیں ہوئی۔

(۳) تعلیمی اصلاحات

سلطان سلیم ثالث نے کچھ تعلیمی اور معاشرتی اصلاحات بھی جاری کیں اس نے رعایا کے ہر طبقہ میں تعلیم پھیلانے کی کوشش کی، پوری سلطنت میں مدرسے قائم کئے یونانیوں نے اس کے

علم پروری کے شوق سے بڑا فائدہ اٹھایا اس کی سرپرستی میں قدیم مدرسوں کو مستحکم کرنے کے علاوہ اہلِ یونان نے بہت سے نئے مدرسے قائم کئے جہاں وہ اپنے بچوں اور نوجوانوں کو دولتِ عثمانیہ کے خلاف انقلاب اور بغاوت کی تربیت دیا کرتے تھے، ان حالات کے معلوم ہونے کے باوجود سلیم نے یونانی مدارس اور مطابع کو بند نہیں کیا بلکہ قسطنطنیہ میں ایک سرکاری مطبع قائم کرکے یونانی پادریوں کے ذریعہ اس فتنہ کا سدِباب کرنا چاہا، اسی کے دور میں دولتِ عثمانیہ میں ورق سازی کی صنعت بھی شروع ہوئی اور سلطان کے حکم سے کاغذ خانہ کے نام سے ورق سازی کا کارخانہ قائم ہوا اور کاغذ کے سلسلے میں ملک خود کفیل ہوگیا جس سے کتابوں کی طباعت اور نشرواشاعت میں تیزی آئی ملک کے بڑے بڑے شہروں میں علمی اور تصنیفی سرگرمیاں محسوس ہونے لگیں سلیم ثالث سے پہلے دولت عثمانیہ کے تمام آفسوں اور محکموں میں قمری تاریخ کا چلن تھا، قمری مہینوں کے حساب سے تنخواہیں تقسیم ہوتی تھیں سلیم ثالث نے پہلی بار حکومت کے بہت سے محکموں میں شمسی حساب کو رواج دیا، اسے فوج میں یورپین لباس رائج کرنے پر بڑا اصرار تھا، اپنے طور پر وہ فرانسیسی تہذیب و ثقافت کا گرویدہ تھا، فرانس وغیرہ کے جدید مفکرین کے افکار و نظریات اور فلسفوں کا اس نے مطالعہ کیا تھا، اور ان سے خاصا متأثر تھا۔

اصلاحات کا تیسرا دور

جمادی الاولیٰ ۱۲۲۳ھ جولائی ۱۸۰۸ء میں مصطفیٰ بیرقدار اور اصلاحات حامی عنصر کی کوششوں سے سلطان محمود ثانی زینت آرائے تخت خلافت ہوا، اس نے برسرِ اقتدار آتے ہی بڑی تیزی کے ساتھ سلطان سلیم ثالث مرحوم کے مجوزہ اصلاحی خاکوں میں رنگ بھرنا شروع کیا اور اصلاحی منصوبوں کو بروئے کار لانے میں اپنی بہترین توانائی صرف کردی، محمود ثانی کی فوجی اصلاحات کی روداد سنانے سے پہلے دوسرے میدانوں میں اس کی جاری کردہ اصلاحات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

سلطان محمود ثانی کی مختلف اصلاحات

نظامِ جاگیرداری ختم کرنے کے سلسلے میں وہ سلیم ثالث کی پالیسی پر عمل پیرا رہا، تیمار اور

زعامت کی جاگیریں یا تو ضبط کرلی گئیں یا صرف جاگیرداروں کی مدتِ حیات تک کے لئے چھوڑ دی گئیں اور جاگیروں کی ساری آمدنی سرکاری خزانہ کی طرف منتقل کردی گئی، مرکز کی کمزوری اور حالات کی ابتری سے فائدہ اٹھاکر جو پاشا اور دَرہ بے خودسر ہوگئے تھے محمود ثانی نے انکی سرکوبی ضروری سمجھی اور تمام صوبوں کو عملاً مرکز کے زیرِ اقتدار لانے کی بھرپور کوششیں کیں، حاکم یانینا علی پاشا وہابیانِ حجاز، والیٔ مصر محمد علی پاشا اور متعدد عثمانی پاشاؤں کے خلاف فوجی کارروائیوں سے محمود ثانی کا واحد مقصد یہ تھا کہ دولتِ عثمانیہ سے علیحدگی پسند عناصر کا قلع قمع کرکے ملک کے اتحاد و سالمیت کو باقی رکھا جائے، محمود ثانی نے پاشاؤں کے ہاتھ سے سزائے موت کا اختیار بھی چھین لیا، اور قانون بنا دیا کہ ایسے مجرمین پر قاضی عسکر کی عدالت میں مقدمہ قائم کیا جائے مجرموں کو صفائی دینے کا پورا موقعہ دیا جائے، پوری عدالتی کاروائی کے بعد اگر قاضی عسکر سزائے موت کا فیصلہ سنائے تو مجرم سلطان کی عدالت میں اپیل کرسکتا ہے، اسی طرح حکام کو عدالتی کاروائی کے بغیر رعایا کا مال وجائیداد ضبط کرلینے سے روک دیا گیا، بہت سے ٹیکس معاف کردیئے گئے، جزیہ کی تشخیص اور وصولی کا کام عمال سے لیکر ایک مجلس کے سپرد کردیا، جس کے ارکان قاضی، صوبہ کا گورنر اور اعیان مقرر کئے گئے۔

سلطان نے محسوس کیا کہ سرکاری ملازمین خصوصاً قصر سلطانی کے ملازمین ضرورت سے بہت زیادہ ہیں اور ان میں ایک بڑی تعداد ناکاروں کی ہے جو فرائض منصبی کی انجام دہی سے قاصر ہیں تو ایک طرف اس نے زائد ملازمین کو برخاست کردیا دوسری طرف ناکارہ ملازمین کو ہٹا کر انکی جگہ باصلاحیت اور دیانتدار ملازمین مقرر کئے، اس اقدام سے حکومت کی کارکردگی میں اضافہ ہوا اور اخراجات میں نمایاں کمی ہوئی ملک کے لئے باصلاحیت، دیانتدار، کارگزار ملازمین تیار کرنے کیلئے محمود ثانی نے دو مدرسے قائم کرکے انھیں مسجد سلطان سلیمان اور مسجد سلطان احمد کے ساتھ ملحق کردیا، ان دو مدرسوں میں صرف مسلم طلبہ کا داخلہ ہوتا تھا انکے علاوہ تیسرا مستقل مدرسہ قائم کیا جس میں مسلم وغیر مسلم سب کا داخلہ ہوتا تھا اب تک دولتِ عثمانیہ میں ڈاک کا کوئی باقاعدہ نظام نہیں تھا، کچھ لوگ اپنے طور پر معاوضہ لیکر خطوط رسانی کا کام انجام دیتے تھے، سرکاری خطوط بھی انھیں کے ذریعہ بھیجے جاتے بعض فتنہ انگیز واقعات کے بعد

تحقیقات کرنے سے سلطان کو معلوم ہوا کہ کچھ لوگ مقرر ہیں جو روزانہ سلطان کی سرگرمیوں، بات چیت اور سلطانی فرامین کی رپورٹ تیار کر کے کہیں بھیجا کرتے تھے، اسلئے اس نے نظامِ ڈاک قائم کیا تاکہ سرکاری فرامین اور خطوط پوری رازداری اور حفاظت کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ سکیں، رفتہ رفتہ نظامِ ڈاک کا دائرہ پھیلتا گیا اور رعایا کے خطوط رسانی کا کام بھی اس نے اپنے ذمہ لے لیا۔

حفظانِ صحت اور علم طب پر بھی سلطان نے خاص توجہ کی، شفاخانے قائم کئے، وبائی امراض کے مریضوں کیلئے الگ اسپتال تیار کروائے جہاں دوسروں کو جانے کی اجازت نہیں تھی، اسکے اسی دور میں قسطنطنیہ میں پہلا میڈیکل کالج (مدرسۃ الطب) قائم ہوا جس میں لندن اور پیرس کے کالجوں کی طرح سرجری کی بھی تعلیم دی جاتی تھی، چار جرمنی ڈاکٹروں نے اس کالج کی تنظیم و تعلیم میں پوری دلچسپی لی، اور کالج کو پروان چڑھایا، دوسرے کالجوں اور مدرسوں میں حفظانِ صحت اور بنیادی طبی معلومات کا موضوع شامل کیا گیا، استنبول میں ایک طبی کتب خانہ قائم کیا گیا، جس میں جدید ترین طبی کتابیں موجود رہتی تھیں۔

محمود ثانی کے دور میں تجارت کو بڑا فروغ ہوا، محمود ثانی سے پہلے دولتِ عثمانیہ کی بیرونی تجارت کا زیادہ تر انحصار فرانس پر تھا، اس نے تجارت سے فرانس کی اجارہ داری ختم کر کے برطانیہ اسٹریا، جرمنی، بلجیم وغیرہ سے براہ راست تجارت کا دروازہ کھولا، استنبول کے ساحل پر ہر وقت برطانیہ، فرانس، اسٹریا، روس کے تجارتی جہاز نظر آنے لگے یورپین ممالک سے چاندی کی مصنوعات، اونی کپڑے، لوہا اور مختلف دھاتیں، اسلحہ، دھاگے دولتِ عثمانیہ کیلئے آتے اور انجیر، کشمش، روئی ریشم، اون، افیون وغیرہ یورپ کے لئے برآمد کیا جاتا، دولتِ عثمانیہ کی بیرونی تجارت پر ارمن یہود اور یونانیوں کا قبضہ تھا، یونانی انقلاب و بغاوت کے بعد یونانیوں کی پوزیشن کمزور ہوگئی محمود ثانی نے کوشش کی کہ بیرونی تجارت سے ان غیر مسلم قوموں کی اجارہ داری ختم کر کے مسلمان ترکوں کو اس میدان میں آگے بڑھائے لیکن اس میں سلطان کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی، تجارت کو فروغ دینے کیلئے سلطان نے پورے ملک خصوصاً ریاست ہائے بلقان میں بیشمار سڑکیں اور پل بنوائے۔

تعلیمی اصلاحات

محمود ثانی تعلیم کا زبردست حامی تھا اس نے باشندگانِ ملک میں تعلیم عام کرنے اور معیارِ تعلیم بلند کرنے کیلئے ملک کے تمام حصوں میں ابتدائی اور ثانوی مدارس قائم کئے، مدارس ابتدائیہ میں ترکی حروف شناسی، ناظرہ قرآن، مبادی عربیت کی تعلیم ہوتی تھی اور مدارس رشدیہ (ثانویہ) میں دینی مضامین کے علاوہ ریاضی، تاریخ، جغرافیہ کی۔ بڑی مساجد سے ملحق مدارس قائم کر رکھے تھے، مدرسہ بحریہ، مدرسہ طب، مدرسہ زراعت، مدرسہ ہندسہ، مدرسہ مدفعیہ میں داخلہ کی تیاری کرانے کیلئے جابجا اعدادیہ مدارس قائم کئے گئے، مدرسہ طب کا مدرسہ اعدادیہ غلطہ سرائے ہی میں مدرسہ طب کے ساتھ ملحق تھا، سنہ ۱۲۵۰ھ بمطابق ۱۸۳۴ء میں "نظام جدید" افواج کیلئے چار میڈیکل کالج (مدارس طبیہ) قائم کئے جانے کا حکم ہوا، سلطان محمود ثانی کی سرپرستی میں یونانیوں، آرمینیوں، بلغاریوں، کیتھولک عیسائیوں نے اپنے قدیم مدارس کو خوب ترقی دی اور بہت سے نئے مدرسے قائم کئے، اعلیٰ تعلیم اور ڈگریاں حاصل کرنے کیلئے ہر سال بڑی تعداد میں نوجوان لندن اور پیرس بھیجے جاتے، سلطان نے اپنے سفیر متعینہ پیرس احمد پاشا کو لکھا کہ ان نوجوانوں کی پوری سرپرستی کرو اور انکے بارے میں رپورٹیں بھیجتے رہو، سلطان کی علم پروری اور معارف نوازی سے صرف استنبول میں چالیس پبلک لائبریریاں ہوگئیں، وزراء و امراء ان کتب خانوں کیلئے جدید کتب و مطبوعات مہیا کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی کوشش کرتے ان عام کتب خانوں کے علاوہ بعض علوم و فنون کے مستقل کتب خانے تھے، مثلاً مکتبۃ البحریہ، مکتبہ طب۔

فوجی اصلاحات

سلطان محمود ثانی نے سب سے زیادہ تہلکہ انگیز اقدامات فوجی اصلاحات کیلئے کئے، اصلاحات حامی عنصر ہی نے سلطان مصطفیٰ رابع کو معزول کرکے اسے تخت نشین کیا تھا، اسلئے اسکی تخت نشینی کے فوراً بعد اصلاحات کی گرم بازاری شروع ہوگئی، سلطان نے مصطفیٰ بیرقدار کو صدارت عظمیٰ کا

منصب بلند تفویض کیا، کیونکہ سلطان کی تخت نشینی میں سب سے اہم کردار اسی کا تھا۔ فوجی اصلاحات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ "ینی چری" فوج تھی، اصلاحات کی متعدد کوششیں انکی شوریدہ سری قدامت پسندی، روایت پرستی کی وجہ سے ناکام ہو چکی تھیں، مصطفےٰ بیرقدار نے علماء وزراء اور اعیانِ مملکت، افسرانِ فوج کی میٹنگ طلب کرکے فوجی اصلاحات کی ضرورت واہمیت پر زور دیا اور سلطان کی طرف سے اصلاحات کا ایک خاکہ پیش کیا، جس میں "ینی چری" کو یورپ کے جدید فنونِ حرب کے مطابق تربیت دینے اور جدید ترین اسلحہ کے استعمال کے علاوہ ان قوانین کے احیاء کی بھی کوشش کی تھی، جو دورِ اول میں ینی چری میں نافذ تھے اور امتدادِ زمانہ سے متروک ہو چکے تھے مثلاً ینی چری کے تمام سپاہی اپنی بارکوں میں رہائش اختیار کریں، باہر رہنے والوں کی ملازمت ختم کی جائے حاضرین نے بیرقدار کی تجاویز سے اتفاق کیا، مفتی اعظم نے انکے حق میں فتویٰ دیدیا، ینی چری نے بھی خاموشی میں مصلحت سمجھی کیونکہ اس وقت نظامِ جدید (جدید فوج) کی بھاری تعداد اور اصلاحات حامی فوجیں قسطنطنیہ میں موجود تھیں لیکن اندر ہی اندر ینی چری میں بغاوت کی کھچڑی پک رہی تھی، وہ لوگ بغاوت کیلئے کسی مناسب موقع کے منتظر تھے، بہت جلد انھیں موقع ہاتھ آگیا، رمضان ۱۲۲۳ھ نومبر ۱۸۰۸ء میں جب بیرقدار کی حامی فوجیں بغاوت فرو کرنے کیلئے دارالسلطنت کے باہر گئی ہوئی تھیں، اچانک "ینی چری" نے علم بغاوت بلند کر دیا، اور مصطفےٰ بیرقدار صدر اعظم کو قتل کرکے دم لیا، "نظامِ جدید" اور ینی چری میں دو روز تک خونریز جنگ ہوتی رہی لیکن توپچیوں کے ینی چری سے مل جانے کی وجہ سے بالآخر ینی چری کو فتح ہوئی، انھوں نے محمود ثانی کی خلافت تو مجبوراً تسلیم کرلی، مگر اس سے پہلے اپنے تمام مطالبات سلطان سے منظور کروائے ایک فرمان جاری کرکے تمام جدید اصلاحات منسوخ کر دی گئیں، حالات کی نزاکت سے مجبور ہو کر محمود ثانی کو انکے آگے جھکنا پڑا۔

ینی چری فوج کا خاتمہ

اس حادثہ کے بعد اصلاحات کا عمل رک گیا لیکن محمود ثانی نے طے کرلیا کہ مناسب موقع آتے ہی

ینی چری کا بالکلیہ استیصال کردیا جائے اور اصلاحات کی راہ میں حائل اس زبردست چٹان کو پاش پاش کردیا جائے ایک طویل عرصہ کے بعد سلطان کو اس کا موقع ملا ۱۸۲۱ء سے ۱۸۲۶ء تک یونان کے مختلف حصوں میں خصوصاً موریا میں بغاوت کے شعلے بھڑکتے رہے، ینی چری فوج پوری کوشش کے باوجود بغاوت پر قابو نہ پاسکی مجبوراً سلطان محمود نے والیٔ مصر محمد علی پاشا کو مدد کے لئے طلب کیا مصری فوجوں نے جو یورپ کے جدید اصول حرب کے مطابق ٹریننگ حاصل کرچکی تھیں، ابراہیم پاشا کی سرکردگی میں بہت قلیل مدت میں باغیوں کے حوصلے پست کردیئے اور موریا وغیرہ میں امن وسکون بحال کردیا، اس سے ملک کے تمام طبقوں پر یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ عثمانی افواج میں جدید فوجی اصلاحات جاری کرنے کی شدید ترضرورت ہے، اور ینی چری کی زبردست تنظیم اور غیر معمولی شجاعت الی قصہ پارینہ بن چکی ہے' ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے محمود ثانی نے اصلاحات کا آوازہ بہت زور وقوت سے بلند کیا، علماء، اعیانِ دولت، افسران فوج کی میٹنگ بلا کر جدید حالات کی روشنی میں فوجی اصلاحات کا مفصل خاکہ پیش کیا گیا، سبنے اس سے اتفاق کیا، مفتی اعظم نے اسکی تصویب کی اور مخالفت کرنے والوں کو قابلِ سزا گردانا، اصلاحات کے حق میں فضا ہموار کرنے کیلئے تمام وسائل اختیار کئے گئے، سلطان کو یقین تھا کہ ینی چری فوج دیر سویر ان اصلاحات کے خلاف بغاوت ضرور کرے گی اس لئے اس نے اصلاحات کا اعلان کرنے سے پہلے حالات سے نمٹنے کیلئے تمام ضروری انتظامات کرلئے تھے، توپچیوں کی تعداد چودہ ہزار کرلی تھی، اور اپنے ایک انتہائی معتمد شخص کو اس کا افسر اعلیٰ مقرر کیا، ینی چری کا آغا ایک ایسے شخص کو مقرر کیا، جو اسکے احکام کی تعمیل کیلئے ہمتن تیار تھا، اصلاحات حامی افواج کو قسطنطنیہ سے بالکل قریب متعین کیا، تاکہ ضرورت پڑنے پر انھیں فوراً بلایا جاسکے تمام احتیاطی تدابیر اپنانے کے بعد اصلاحات پر عملدرآمد شروع ہوا حسب توقع جون ۱۸۲۶ء ذیقعدہ ۱۲۴۱ھ میں ینی چری نے بغاوت کا بگل بجادیا اور لوٹ مار شروع کردی، محمود حالات کا مقابلہ کرنے کیلئے پورے طور پر تیار تھا، اس نے باغیوں کے مقابلہ میں علم نبوی بلند کرکے تمام مسلمانوں کو حمایت کیلئے بلایا، علم نبوی دیکھکر تمام مسلمان (علماء طلباء عام باشندے) پروانہ وار اسکے گرد جمع ہوگئے،

توپچیوں کو گولہ باری کا حکم دیا گیا، نظامِ جدید کی فوجیں بھی پہونچ گئیں ینی چری نے بے مثال بہادری سے مقابلہ کیا، ان کا ایک ایک فرد مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا، تھوڑے دنوں میں پورے ملک میں ینی چری کا استیصال کر دیا گیا، اور یہ بے مثال فوج صفحۂ ہستی سے نابود ہوگئی جس کے ساتھ دولتِ عثمانیہ کی سطوت وعظمت وابستہ تھی، اور جس نے یورپ کے ناقابلِ تسخیر علاقوں کو اپنی شمشیرِ خارا شگاف سے تسخیر کیا تھا۔

ینی چری کے خاتمہ کے اثرات

ینی چری کی اصلاح یا ان کا استیصال دولتِ عثمانیہ کی ایک بنیادی ضرورت تھی، محمود ثانی ان کی اصلاح سے مایوس تھا، اس لئے اس نے استیصال کا راستہ اپنایا لیکن یہ اسکی بڑی بنیادی اور سنگین غلطی تھی کہ اس نے متبادل فوجی قوت مہیا کئے بغیر اس عظیم فوجی قوت کو نیست ونابود کر دیا جس سے دولتِ عثمانیہ کی صدیوں کی شاندار تاریخ وابستہ تھی، اور ہزاروں کمزوریوں کے باوجود اب بھی اسکی سطوت وشجاعت کا نقش کسی حد تک پڑوسی ملکوں پر قائم تھا، حالانکہ سلطان محمود ثانی کو بخوبی معلوم تھا کہ ہمارے دشمن ہر وقت ہماری تاک میں لگے ہوئے ہیں، اور چوکھی حملہ کرنے کیلئے مناسب موقع کے منتظر ہیں، دولتِ عثمانیہ کو محمود ثانی کی اس سنگین غلطی کا خمیازہ بہت جلد بھگتنا پڑا، ینی چری کے استیصال کے بعد سلطان محمود ثانی نے بڑی برق رفتاری کے ساتھ نئی فوج کی تشکیل اور تربیت شروع کی، نئی فوج کی تعداد بڑھا کر (۴۵۰۰۰) ہزار کر لی، اس کا پروگرام ڈھائی لاکھ فوج مہیا کرنے کا تھا، اگر اس کو ۵-۱۰ سال کا وقفۂ امن مل جاتا تو امید تھی کہ زبردست فوجی قوت فراہم کر لیتا، لیکن دولتِ عثمانیہ کا روایتی دشمن روس موقع کا منتظر تھا، اس نے محسوس کیا کہ ینی چری کے استیصال کے بعد دولتِ عثمانیہ فوجی قوت سے بالکل عاری ہو چکا ہے، اسلئے اس نے کمزور دشمن کو تیاری کا موقع دیئے بغیر اگست ۱۸۲۶ء میں دولتِ عثمانیہ کے سامنے اپنے مطالبات پیش کئے اور انھیں تسلیم نہ کرنے کی صورت میں حملہ کی دھمکی دی، سلطان محمود کو مجبوراً ذلت آمیز

"معاہدۂ آق کرمان" پر دستخط کرنے پڑے اکتوبر ۱۸۲۷ء میں دولِ ثلاثہ (برطانیہ، فرانس، روس) کی سازش اور ملی بھگت سے واقعۂ نوارینو پیش آیا، جس نے دولتِ عثمانیہ کی بحری قوت فنا کر کے رکھدی ۱۸۲۸ء میں روس سے جنگ چھڑ گئی، روسی فوجیں بڑی تیزی کے ساتھ دولتِ عثمانیہ کے علاقوں پر قبضہ کرتی ہوئی ادرنہ تک پہونچ گئیں، استنبول کو خطرہ میں دیکھ کر انتہائی ذلت آمیز شرطوں پر سلطان محمود نے روس سے صلح کر لی اپریل ۱۸۲۹ء میں صلحنامہ ادرنہ پر فریقین کے دستخط ہو گئے ایک مدت سے فرانس کی حریصانہ نگاہیں الجزائر پر گڑی ہوئی تھیں، اس نے دولتِ عثمانیہ کی کمزوری اور خستگی دیکھ کر الجزائر پر قبضہ کیلئے یہی وقت مناسب سمجھا چنانچہ جولائی ۱۸۳۰ء میں فرانس نے الجزائر پر قبضہ کر لیا اور عثمانی حکومت زبانی احتجاج کے علاوہ کچھ نہ کر سکی، دولتِ عثمانیہ کو سب سے بڑی ذلت اس وقت ہوئی جب ۱۸۳۲ء میں والیٔ مصر محمد علی پاشا نے بغاوت کر دی، اور اسکی فوجیں قبضہ کرتی ہوئی کوتاہیہ اور بروصہ تک پہونچ گئیں عثمانی فوجیں مصری فوج کا سیلاب روکنے میں ناکام رہیں تو دولت عثمانیہ کی تاریخ میں پہلی بار یہ رسوا کن حادثہ پیش آیا کہ دولتِ عثمانیہ کو اپنے ایک والی کے خلاف روایتی دشمن روس سے مدد لینی پڑی، جس سے عثمانیوں کو از حد نفرت تھی خلیفۃ المسلمین کی حفاظت کیلئے روسی جنگی جہاز باسفورس میں لنگر انداز ہوئے خلیفۃ المسلمین کی روس سے مدد و درخواست کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا اس نے دولتِ عثمانیہ کے غیور و خوددار باشندوں کو جھنجھوڑ کر رکھدیا، عثمانی باشندے ایسی اصلاحات کیلئے کسی قیمت پر تیار نہ تھے جس کے نتیجہ میں انھیں روس کا احسان مند اور غاشیہ بردار ہونا پڑے وہ ایسے سلطان کے ہاتھ کسی اصلاح کیلئے تیار نہ تھے جس کے دور میں یہ رسوا کن حادثہ پیش آیا مبصرین اس نقطہ پر تقریباً متفق ہیں کہ یہ سب حادثے ینی چری کے استیصال کے عواقب تھے[1]

---

[1] حرکۃ الاصلاح العثمانی ص ۲۴۲ تا ۲۴۴ المسألۃ الشرقیۃ ص ۵۸ مذاکرات السلطان عبدالحمید الثانی (مقدمہ)

مولانا مفتی شعیب اللہ خاں صاحب
ناظم مدرسہ مسیح العلوم بنگلور

کیا عذابِ قبر کا عقیدہ "غیر اسلامی" تصور ہے

قرآن اور عذابِ قبر

(پانچویں اور آخری قسط)

کیا مُردے سنتے ہیں؟

مؤلف نے اپنے مضمون کے آخری حصے میں عذابِ قبر کی نفی پر قرآن سے استدلال کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے یہ آیت پیش کی ہے۔

وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ۔ (فاطر: ۲۲)

جو قبروں میں ہیں تم ان کو سنا نہیں سکتے۔

پھر اس سے یہ نتیجہ خود ہی اخذ کیا ہے کہ:۔

"جب قبر میں مردہ سن نہیں سکتا تو اس پر عذابِ قبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"۔

(شمع حقیقت ص۳۲۲)

میں کہتا ہوں کہ شاید ایسے ہی موقعہ کے لئے کہا گیا ہے "مارے گھٹنا پھوٹے آنکھ" حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر بدیہی امور بھی کس طرح لوگوں کے لئے نظری بن جاتے ہیں، غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتے ہیں کہ تم قبر والوں کو سنا نہیں سکتے، مؤلف کے بقول اس کا مطلب یہ ہوا کہ مردے ہماری بات سن نہیں سکتے، مگر یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ وہ فرشتوں کا کلام بھی نہیں سن سکتے، اور اگر یہ بھی

ثابت ہوگیا تو یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ ان کے اور مشاعر و حواس بھی باطل ہو چکے اور ان کو کسی بھی قسم کی حِس نہیں ہے، جب تک مؤلف یہ ثابت نہ کر دیں گے، اس وقت تک اس آیت سے ان کو استدلال کرنے کا حق نہیں ہو سکتا۔

اور یہ سب بھی اس صورت پر ہے کہ ہم مؤلف کی یہ بات تسلیم کر لیں کہ اس آیت سے مُردوں کے سننے کی نفی ہوتی ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جمہور علماء کے نزدیک آیت کا یہ مطلب نہیں ہے، بلکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ:۔

• اہلِ قبور کو آپ اس طرح نہیں سنا سکتے جس سے وہ نفع حاصل کر سکیں۔

(ابن قیم، الروح ص۴۵)

اس سے معلوم ہوا کہ علی الاطلاق مردوں کے سننے کی نفی نہیں کی گئی ہے بلکہ وہ سننا جس سے نفع حاصل ہو اس کی نفی کی گئی ہے، اب رہی یہ بات کہ مُردوں کے سننے پر کوئی دلیل ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ ہاں، اس پر متعدد احادیث دلالت کرتی ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:۔

۱۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: بندہ جب اپنی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے، اور اس کے ساتھی واپس ہونے لگتے ہیں تو وہ ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے۔ الخ (بخاری، الجنائز۔ ومسلم ۳۸۶/۲)

۲۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ اہلِ بدر کفار کی نعشوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاب فرمایا کہ اے فلاں اے فلاں کیا تم نے وہ پالیا جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا (یعنی عذاب)؟ اس پر حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ یہ تو مر گئے یہ کیسے سنیں گے، آپ نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم میری باتوں کو ان سے زیادہ نہیں سن سکتے مگر یہ کہ وہ لوگ جواب نہیں دے سکتے۔ (بخاری، کتاب المغازی، مسلم ۳۸۷/۲)

۳۔ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان (صحابہ) کو قبرستان کی طرف جانے کی صورت میں تعلیم دیتے تھے کہ (یوں کہو) السلام علیکم اھل الدیار

من المومنین والمسلمین وانا انشاء اللہ بکم للاحقون نسال اللہ لنا ولکم العافیۃ۔

(مسلم، مشکوٰۃ ص۱۵۴)

ان میں سے پہلی دو روایتوں سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ مردے سنتے ہیں اور تیسری روایت سے پتہ چلتا ہے کہ مردوں کو بصیغۂ خطاب سلام کرنا چاہیئے اور ظاہر ہے کہ جب وہ سنتے ہیں تبھی تو یہ صیغہ استعمال کرنے کا حکم ہے ورنہ یہ خطاب مع الجماد ہوگا جس کی تعلیم اسلام نہیں دے سکتا پھر بعض روایات میں آیا ہے کہ :۔

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً (یعنی رسول اللہ صلعم سے) روایت کیا کہ جو آدمی بھی اپنے مسلمان بھائی کی قبر کے پاس سے گذرتا ہے جس کو دنیا میں یہ پہچانتا تھا اور اس پر سلام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر اس کی روح[1] کو لوٹاتا ہے حتیٰ کہ وہ سلام کا جواب دیتا ہے، ابن عبد البر نے اس کو صحیح کہا ہے (احکام القرآن مفتی محمد شفیع ص ۱۷۴/۳)

پس معلوم ہوا کہ مردہ سنتا ہے اسلئے ہم قرآن مجید کی آیت کا وہ مطلب نہیں لیتے جو مؤلف نے لیا ہے اور اگر وہ مطلب بھی لیا جائے تب بھی جیسا کہ عرض کر چکا ہوں عذاب قبر کی نفی پر اس سے استدلال غلط ہے۔

---

[1] اس جملہ سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جب قبر کے پاس جا کر کوئی سلام کرتا ہے تو اس قبر کے مردے کو زندہ کیا جاتا ہے، حالانکہ اوپر گذر چکا کہ مرنے کے بعد جب فرشتے روح کو لیکر اللہ کے پاس جاتے ہیں تو اسی وقت زمین کی طرف روح کو لوٹانے کا حکم دیدیا جاتا ہے پس دونوں روایات میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے، میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ صحیح احادیث کے مطابق روح تو مرنے کے فوراً بعد ہی لوٹا دی جاتی ہے اور اس مردے کو ایک قسم کی زندگی ملتی ہے مگر جیسا کہ اوپر بھی عرض کیا گیا یہ ایک خاص قسم کی زندگی ہے، جیسے سونے والے کی زندگی ہوتی ہے کہ زندگی کے باوصف وہ معطل الحواس ہوتا ہے اسی طرح قبر کا مردہ زندہ ہونے کے باوجود اور راحت و کلفت کے احساس کے باوصف، سننے بولنے کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے، ہاں جب اللہ چاہتے ہیں تو اسکے کانوں اور زبان کو بھی یہ صلاحیت دیدیتے ہیں بس اسی کو یہاں حدیث میں بتایا گیا ہے کہ اسکی روح یعنی کانوں اور زبان کی روح لوٹا دیتے ہیں، جیسا قرآن نے سونے والے کے حواس کو واپس کرنے کا ذکر روح واپس کرنے سے کیا ہے (دیکھو سورۂ زمر ۴۲) واللہ اعلم۔

تحریفِ قرآن کا ایک نادر نمونہ

مُردوں کے نہ سننے اور اس کے نتیجے میں عذاب قبر کے نہ ہونے پر مؤلف نے ایک اور آیت سے بھی دلیل لی ہے، وہ یہ ہے:۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ۔ (الاحقاف: ۵)

اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارتا ہے جو اس کو جواب نہیں دے سکتے قیامت تک اور وہ ان کی دعا سے غافل ہیں۔

مؤلف نے اس سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ اس آیت میں مُردوں کو غافل اور جواب نہ دینے والے بتایا ہے سو معلوم ہوا کہ مردے سنتے نہیں اور جب سنتے نہیں تو ان پر عذاب کا سوال ہی نہیں۔ یہ استدلال بھی نہایت عامیانہ اور سطحی استدلال ہے۔

اولاً اس لئے کہ مُردوں کے ہماری بات نہ سننے اور جواب نہ دے سکنے سے ان کے تمام حواس کا باطل و معطل ہونا ثابت نہیں ہوتا، لہٰذا اس سے عذاب قبر نہ ہونے پر استدلال غلط ہے، جیسا کہ سطور بالا میں بھی عرض کیا جا چکا ہے۔

ثانیاً اس لئے کہ آیت کریمہ میں جن کے بارے میں "غافل ہونے" اور "جواب نہ دے سکنے" کی بات کہی گئی ہے اس سے مراد مردے نہیں بلکہ بُت اور معبودان باطل ہیں، اور مقصد آیت کا یہ بتانا ہے کہ جو لوگ خدا کو چھوڑ کر من گھڑت خداؤں کی پوجا کرتے اور ان سے دعا کرتے ہیں وہ سب سے بڑے گمراہ لوگ ہیں، اور یہ بُت یا یہ معبودان باطل ان کو جواب تو کیا دیتے، ان کی چیخ و پکار کی انھیں خبر تک نہیں ہوتی، الغرض اس آیت کے مضمون کا زیر بحث مسئلہ سے دور کا بھی تعلق نہیں، بہرحال اس آیت سے عذاب قبر کی نفی پر استدلال نہایت غلط اور قرآن مجید کی غلط تشریح کا ایک نمونہ ہے۔

ایک اور استدلال

مؤلف نے لکھا ہے کہ :-

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

اسی مٹی سے ہم نے تمھیں پیدا کیا، اسی میں ملا دیں گے اور پھر اسی سے تمھیں اٹھائیں گے۔

(طٰہٰ : ۵۵)

اس سے واضح ہوا کہ مردے کا مٹی میں مل کر مٹی ہو جانا درست ہے تاکہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے اپنی قدرت سے پھر اٹھائے اگر مردہ قبر میں زندہ رہے (جیسا کہ عقیدہ ہے) تو وہ اس دوسری زندگی سے محروم ہو جائے گا جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔ (شمع حقیقت ص۳۲)

مؤلف کا مقصد یہ ہے کہ مرنے کے بعد کسی بھی قسم کی زندگی مرنے والے کو حاصل نہیں ہوتی اور جب زندگی نہیں تو عذاب و ثواب، کلفت و راحت اس کو کیسے حاصل ہو سکتی ہے، لہٰذا قبر کے عذاب و ثواب کا عقیدہ غلط ہے اور قبر کی زندگی کی نفی ثابت کرنے کے لئے مؤلف نے سورۂ طٰہٰ کی مذکورہ بالا آیت کا سہارا لینے کی کوشش کی ہے، آیئے دیکھیں کہ ان کی یہ کوشش کس حد تک کامیاب ہے؟

آیت کا حاصل صرف یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کیا ہے اور پھر اسی مٹی میں اس کو لوٹا دیں گے اور اسی مٹی سے اس کو قیامت کے دن اٹھائیں گے، ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے یہ کس طرح ثابت ہو گیا کہ مٹی میں اس کو لوٹانے کے بعد کسی قسم کی زندگی نہیں ملتی۔؟

حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی آیت کا حوالہ دے کر فرشتوں سے فرمائیں گے کہ اس کی (بندے کی) روح کو زمین میں لوٹا دو، کیونکہ ہم نے اس کو جس طرح مٹی سے پیدا کیا ہے، اسی طرح ہم اسی سے اس کو اٹھائیں گے (یہ حدیث براء بن عازب اوپر گذر چکی ہے اس سے

معلوم ہوتا ہے کہ روح کو بھی اسی مٹی سے جسم کے ساتھ اٹھایا جائے گا، پس ایک طرف وہ حدیث رسول ہے جس میں اسی آیت کے حوالہ سے بتایا گیا ہے کہ مردے کی روح کو بھی زمین میں واپس کر دیا جاتا ہے، اور دوسری طرف مؤلف شمع حقیقت کا یہ دعویٰ ہے کہ اسی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین میں مردے کے دفن ہونے کے بعد کسی قسم زندگی اسے نہیں ملتی، اب آپ خود فیصلہ فرمالیں آیت قرآنی کا کون سا مطلب معتبر ہوگا وہ جو حدیث رسول سے معلوم ہو، یا وہ جو جناب مؤلف شمع حقیقت پر منکشف ہوا ہو۔

ایک ضروری انتباہ

یہاں ایک ضروری بات کا عرض کرنا مناسب ہے، وہ یہ کہ انسان کے مٹی میں مل جانے، گل اور سڑ جانے سے، اس کا عالمِ برزخ میں معدوم اور بالکلیہ مردہ ہونا ثابت نہیں ہوتا، اور نہ یہ لازم آتا ہے، جیسے بہت سارے انسانوں کو جانور کھا جاتے ہیں، اور بعض جل کر خاک ہو جاتے ہیں، مگر اس کے باوجود۔ اہلِ سنت کا اجماع ہے کہ ان کو برزخی وجود اور برزخی زندگی حاصل ہوتی ہے۔

علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ:۔

> یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ عذابِ قبر دراصل عذابِ برزخ ہے، لہٰذا ہر وہ شخص جو مرگیا، اور وہ عذاب کا مستحق ہے، اس کو عذاب کا حصہ ضرور ملے گا، خواہ وہ قبر میں ہو یا نہ ہو، پس اگر اس کو درندوں نے کھا لیا یا اس کو جلا دیا گیا جس سے وہ راکھ ہو گیا، اور اسکو ہوا میں اڑا دیا گیا یا اس کو سُولی دیدی گئی یا وہ سمندر میں غرق ہو گیا تو ان سب صورتوں میں اسکی روح اور بدن کو عذاب ہوگا جیسا کہ قبور میں ہوتا ہے۔ (کتاب الروح ص۵۸)

رہی یہ بات کہ جب مردے کے اجزاء مٹی میں منتشر ہو گئے یا مثلاً جانور کے اجزاءِ بدن میں مل کر اس کا جز ہو گئے تو اس کی طرف روح کیسے لوٹے گی اور عذاب کس طرح ہوگا۔؟

اس کے جواب سے قبل یہ ذہن میں رہے کہ احادیث صحیحہ روح کے بدن کی طرف لوٹنے پر نہایت صراحت و وضاحت سے دلالت کرتی ہیں، اس لئے ان کو تسلیم کرنا ہوگا، رہی اس کی عقلی

اولاً ایک مومن کے لئے احادیث صحیحہ عقل سے زیادہ اطمینان کا باعث ہوتی ہیں اس لئے اسکی ضرورت نہیں، پھر بحمدہ تعالیٰ اس کی توجیہ عقلاً بھی لی جا سکتی ہے۔

وہ یہ کہ ٹرانسسٹر (TRANSISTER) کو ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں خاص خاص مقامات سے نشر ہونے والے پروگرام کسی بھی جگہ سے سنے جا سکتے ہیں، جبکہ وہ خاص نمبر جو اس مقام کے اسٹیشن کے لئے موضوع ہے، لگا دیا گیا ہو اور یہ دن رات کا مشاہدہ ہے کہ بلا کسی کمی زیادتی اور کسی بھی طرح کے فرق کے ہر جگہ سے وہ پروگرام سنا جا سکتا ہے۔

اس مثال میں غور کیجئے کہ ٹرانسسٹر کی ہزاروں کی تعداد جو مختلف لوگوں کے پاس ہے وہ منتشر ہے، اور بلا کسی ظاہری واسطہ کے صرف نمبر ملانے سے ان ہزاروں منتشر آلات میں وہی بات سنائی دیتی ہے، جو خاص اسٹیشن سے نشر ہوتی ہے، بالکل اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسان کے منتشر اعضاء کو منتشر رکھتے ہوئے بھی روح سے ہمکنار کر سکتا ہے، اور وہ ایک ہی روح تمام منتشر اعضاء میں زندگی کی ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتی ہے جس سے وہ منتشر اعضاء راحت یا تکلیف محسوس کرتے ہیں، جیسے ایک اسٹیشن سے نشر ہونے والے نشریہ کو ہم تمام منتشر ٹرانسسٹروں میں محسوس کرتے ہیں، جو انسان اس حیرت انگیز صنعت پر قادر ہو اس کا خالق کیا اس سے محروم ہوگا؟ اور کیا انسان کے منتشر اعضاء میں روح ڈال کر عذاب و ثواب دینے سے عاجز ہوگا؟

علامہ ابن القیم نے اس کو فرمایا کہ :۔

> جن مردوں کے اجزاء منتشر و متفرق ہو گئے ہوں، اس ذات پر جو ہر شی پر قدرت رکھتی ہے، مشکل نہیں ہے کہ ان متفرق اجزاء سے روح کا اتصال پیدا کر دے، اگرچہ کہ ان میں دوری ہو۔ (خلاصہ کتاب الروح ص۲۲)

پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان متفرق و منتشر اجزاء کو جمع کر دے، اور اس سے ہم واقف نہ ہوں اور ہم یہ سمجھ رہے ہوں کہ یہ گل گیا سڑ گیا جل گیا، کیونکہ ہماری نظروں سے چلے جانے کے بعد وہ عالم برزخ کو پہنچ گیا، وہاں کے حالات و کوائف ہم سے پوشیدہ رکھے گئے ہیں، الغرض ان باتوں میں نہ کوئی ایسی بات

ہے جو عقل کے خلاف ہے اور نہ ایسی جو خدا کی قدرت سے بعید ہو۔

لہٰذا ہم کو ان باتوں پر جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں، ایمان رکھنا ضروری ہے اور سمجھ لینا چاہیے کہ عقل کے پیچھے پڑ کر ایمان کا خطرہ مول لینا بڑا مہنگا ہے۔

حساب سے پہلے سزا کیا بے انصافی ہے؟

مؤلفِ شمعِ حقیقت نے مختلف جگہ اپنے مضمون میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ قیامت میں حساب وکتاب سے پہلے سزا یا جزا غیر اسلامی تصور اور خلافِ انصاف ہے۔

چنانچہ ایک جگہ لکھا ہے کہ:۔

یہ اللہ کے انصاف سے بعید ہے کہ قبر میں بغیر حساب وکتاب کے عذاب دے۔

ایک جگہ لکھا ہے کہ:۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مردوں کو اٹھائے گا، میدانِ حشر میں جمع کرے گا اور حساب لے گا، پھر فیصلہ ہوگا کہ جنّتی ہے یا دوزخی۔ (شمعِ حقیقت ص ۳۱۹)

مؤلف نے اپنے اس خیال ونظریے پر کوئی دلیل نہیں پیش کی ہے، میں کہتا ہوں کہ بلاشبہ قرآن میں ہے کہ قیامت کے دن حساب ہوگا، مگر اس سے پہلے سزا یا جزا نہ ہوگی، اس دعویٰ پر قرآن میں کوئی دلیل نہ ملے گی، بلکہ متعدد آیات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ قیامت سے قبل بھی انسان کو سزا یا جزا دی جاتی ہے، چند آیات ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ وَمَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ۔ (شوریٰ: ۳۰)

اور جو تم کو مصیبت پہنچی وہ تمہارے ہاتھوں کے کئے کا بدلہ ہے اور وہ (اللہ) بہت سے معاف کر دیتا ہے۔

۲۔ (ترجمہ) خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد ظاہر ہو گیا، تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے بعض اعمال کا مزہ ان کو چکھائے، تاکہ وہ باز آجائیں۔ (روم: ۴۱)

۳۔ ایک قوم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

"ان سے پہلے لوگوں نے بھی تکذیب کی روش اختیار کی سو ان پر عذاب اس طرح آیا کہ انکو خیال بھی نہ تھا پس اللہ تعالیٰ نے انکو دنیوی زندگی ہی میں رسوائی کا عذاب چکھا دیا، اور آخرت کا عذاب اور بھی بڑا ہے، کاش یہ لوگ جان لیتے۔ (زمر: ۲۵-۲۶)

۴۔ ایک جگہ کے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"اللہ تعالیٰ ایک بستی والوں کی حالت بیان کرتے ہیں کہ وہ امن و اطمینان میں تھے انکے کھانے پینے کی چیزیں بڑی فراغت سے ہر طرف سے انکے پاس پہنچا کرتی تھیں، سو ان لوگوں نے خدا کی نعمتوں کی ناشکری کی اس پر اللہ تعالیٰ نے بھوک (قحط) اور خوف کا مزہ چکھایا (نحل: ۱۱۲)

۵۔ قوم عاد کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارشاد ہے:

"ہم نے ان پر ایک تند و تیز ہوا ان دنوں میں بھیجی جو منحوس تھے تاکہ انکو اس دنیوی زندگی میں رسوائی کا عذاب چکھا دیں اور آخرت کا عذاب اور زیادہ رسوائی کا سبب ہے" (حٰم سجدہ: ۱۶)

نمونہ کیلئے چند آیات پیش کی گئیں جن میں صفائی کے ساتھ مذکور ہے کہ دنیا میں بھی انسان کو اسکے کرتوتوں اور بداعمالیوں کا بدلہ اور اسکی سزا دی جاتی ہے، اس سلسلے میں قرآن مجید میں مذکور متعدد قوموں (قوم عاد، ثمود، اصحاب ایکہ، اصحاب الرس، قوم فرعون) کے احوال پڑھ کر دیکھ لیں، معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں سب کو کیسی کیسی سزائیں دی گئی ہیں۔

کیا مؤلف کے نزدیک خدا نے یہ سب کچھ جو کیا وہ ظلم و ستم اور ناانصافی ہے؟ یا یہ کہ مؤلف روشن خیال کے نزدیک یہ آیات بھی من گھڑت افسانے ہیں؟

الغرض مؤلف کا یہ خیال کہ حساب سے پہلے سزا ناانصافی ہوگی لہٰذا عذاب قبر کا عقیدہ صحیح نہیں بالکل سطحی خیال ہے جس پر کوئی دلیل یا حدیث سے نہیں دی جاسکتی، بلکہ اس خیال کے برخلاف قرآن و حدیث کے ہزاروں نصوص موجود ہیں۔

جب دنیا میں سزا دی جاسکتی ہے تو قبر میں سزا دینا ناانصافی کیوں ہے؟ جبکہ دنیا تو دارالعمل ہے اور قبر آخرت کی پہلی منزل ہونے کی وجہ سے دارالجزاء ہے، دارالعمل میں سزا و جزا ناانصافی نہیں تو دارالجزاء میں ناانصافی کیسے ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے اسلامی عقائد کا ٹھیک سے مطالعہ کئے بغیر انتہائی سطحی خیالات کی بنیاد پر یہ سب کچھ لکھ مارا ہے۔

کاش کہ وہ ایسا نہ کرتے!

مؤلف شمع حقیقت کو ایک مشورہ

آخر میں نہایت دردمندی وخیرخواہی سے مؤلف شمع حقیقت قاضی محمد علی صاحب کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں، اور اس کا راقم سطور کو اس لئے زیادہ حق ہے کہ قاضی صاحب سے اُسکے تین چار سال سے تعلقات ہیں، قاضی صاحب بنگلور آتے ہیں تو احقر کے پاس ہی مدرسہ سبیل العلوم میں قیام کرتے ہیں، اور راحت محسوس فرماتے ہیں، اس تعلق کا حق ہے کہ میں ان سے چھوٹا ہونے کے باوجود ایک نیک مشورہ انکی خدمت میں پیش کروں۔

وہ یہ کہ کسی بھی مسئلہ پر غور وفکر کرنے کیلئے پہلے اپنے دماغ کو خالی اور صاف کرلیں اور پھر اس سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو پورے اطمینان سے ملاحظہ فرمائیں، نیز اس سے متعلقہ قرآن وحدیث کے دلائل پر پوری بصیرت حاصل کریں، اور یہ اچھی طرح ذہن میں رکھیں کہ قرآن کی تفسیر وتفہیم، تشریح وتوضیح حدیث رسول وآثار صحابہ سے زیادہ معتبر کسی اور کی ہو نہیں سکتی، لہذا ان سے ہٹ کر قرآن فہمی کی کوشش دین کے خلاف تو ہے ہی عقل وعلم سے بھی اسکی تائید نہیں ہوتی۔ مؤلف محترم کو چاہئے کہ وہ از سرِ نو اسلامی عقائد واحکام کا مطالعہ کریں، اور محض صرف اپنی عقل پر حد سے زیادہ اعتماد سے پرہیز کریں۔

حرفِ آخر اور دعا

امید ہے کہ اوپر کی تفصیلات وتوضیحات سے عام قارئین کیلئے واضح ہو گیا ہوگا کہ عذابِ قبر کا عقیدہ، غیر اسلامی نہیں ہے، بلکہ یہ قرآن وحدیث اور اجماع اُمت سے قطعی طور پر ثابت ہے، اور اہم ترین اسلامی عقیدہ ہے، اور اس کا انکار کرنے والا گمراہ وبددین ہے، نیز اس سلسلے کی احادیث متواترۃ المعنی ہیں جو قطعیت کا فائدہ دیتی ہیں، اور ان پر قرآن سے متعارض ہونے یا عقل وبداہت کے خلاف ہونے کا الزام بے بنیاد اور معترضین کی کم فہمی یا کج فہمی کا نتیجہ ہے، اسکے سوا کچھ نہیں۔

آخر میں اللہ سے دعاگو ہوں کہ وہ اس تحریر کو نافع ومفید خلائق بنائے اور میرے لئے عذاب قبر اور عذاب نار سے نجات کا ذریعہ وسبب بنائے۔ آمین ثم آمین

تأثرات

از جناب چودھری علی مبارک عثمانی*

واقعۂ کربلا اور اُس کا پس منظر

کسی بھی اہم واقعہ پر قلم اُٹھانے سے پہلے یہ دیکھنا بیحد ضروری ہوتا ہے کہ واقعہ کا پس منظر اور حالات کا انداز کیا رہا ہے، مگر یہ تاریخ کی بوالعجبی ہے کہ ابتدا میں واقعات جس طرح جمع کیے جاتے تھے، اس میں تحقیق و تفحص سے زیادہ زور اس بات پر دیا جاتا تھا کہ واقعہ کے متعلق جسقدر معلومات فراہم ہو سکیں وہ یکجا کر دیئے جائیں، اس لئے اسلامی تاریخ کا جو سرمایہ ہمارے ہاتھ آیا ہے، اس میں تحالفیں کی آمیزش بھی خوب خوب آگئی ہے، اور تشکیک پھیلانے کا پورا کام کر گئی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں یہودیوں کی دشمنی اور ساز شیں اور منافقین کی ریشہ دوانیاں کوئی پوشیدہ بات یا راز سربستہ تو نہیں ہیں، احد اور احزاب کی جنگیں سب منافقوں اور یہودیوں ہی کی سازشوں نے برپا کی تھیں، آپ کے بعد صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے دورِ حکومت میں بھی مدعیانِ نبوت کی کا زبانہ مساعی پھر مجوسیوں اور رومیوں کی یورش نے پے در پے ایسی صورتیں پیدا کیں کہ شجرِ اسلام کی آبیاری کے لئے فدائیانِ اسلام کو بار بار خونِ دل نذر کرنا پڑا مگر اسلام دشمنی اور حق و صداقت سے روگردانی کی جو فضا دشمنانِ اسلام نے پیدا کی تھی وہ برابر پروان چڑھتی چلی آرہی ہے، حضرت عثمانؓ کے آخری دور میں عبداللہ بن سبا یہودی نے جس طرح اظہار اسلام کیا اور دوستی کے پردے میں اسلام کی جس دشمنی کی تخم ریزی کی تھی اسی کے نتیجہ میں حضرت عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت کا واقعہ پیش آیا، بلکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا پورا دورِ حکومت بھی اسی کی بدولت انتشار کا

* رئیس سترکھ ضلع بارہ بنکی۔

نذر ہوگیا، اور بالآخر آپ کی شہادت پر ختم ہوا، پس غور تو انھیں عوامل پر کیا جانا ضروری ہے، جن کی بدولت وہ دین برحق جو مختصر سی مدت میں پوری دنیا پر چھا گیا وہ تاریخ کی بھول بھلیوں میں کس طرح الجھا دیا گیا، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے علامہ شبلی نعمانیؒ اور انکے شاگرد رشید علامہ سید سلیمان ندویؒ کو جنھوں نے سیرۃ النبیؐ لکھ کر تاریخ کی تمام پیچیدگیوں کو دور کیا اور اسلام و پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایک واضح اور حقیقی تصویر دنیا کے سامنے پیش کر دی۔ روایات کی تحقیق میں ایک مثالی کردار ادا کیا بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ہندوستان میں روایات کی صحت و تحقیق سب سے پہلے علامہ شبلیؒ ہی نے کی اور اُن کی جانچ کا ایسا معیار قائم کیا کہ واقعات کے حقیقی خد و خال واضح طور پر سامنے آئے۔

کسی عام واقعہ کو لکھنا تو اہل قلم کے لئے بہت آسان ہے مگر "واقعہ کربلا" پر کچھ بھی لکھنا بیحد مشکل اور نزاکت کا حامل ہے، کیونکہ یہ ایک انتہائی نازک مسئلہ ہے، ایسی صورت حال کے ماتحت ذرا آنکھ کھول کر دیکھئے تو واقعہ کربلا سے متعلق اگرچہ اتنا زیادہ لٹریچر ملے گا کہ شاید ہی کسی ایک واقعہ کے متعلق اتنا بڑا سرمایۂ ادب موجود ہو مگر جہاں تک معیار کا سوال ہے تو اس معاملہ میں زیادہ تر جذباتیت ہی نظر آئیگی حتیٰ کہ جلیل القدر اصحاب رسولؐ کی بھی تنقیص سے لوگ باز نہ رہ سکے۔ شیعہ حضرات کا تو پوچھنا ہی کیا انھوں نے تو اپنے "معصومین" کو بھی اپنے قلم جفا پیشہ سے مجروح کئے بغیر نہ چھوڑا تو اور اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کیا؟ وہ چند کو چھوڑ کر کسی کو بھی مسلمان ہی کب ماننے پر تیار ہیں اور جن چند بزرگوں کو اصحاب رسولؐ تسلیم کرتے ہیں وہ بھی چونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ تھے اس لئے مجبوری ہے، ورنہ سبائی تحریک کی پختگی تو اسی میں ہے کہ اصل حقیقت کو جھٹلایا جائے اور مصنوعی روایات ایجاد کر کے حق کو مشکوک بنایا جائے۔

اس پس منظر میں ہم مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب کی تازہ تصنیف "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" دیکھتے ہیں تو اسے اپنے موضوع پر بہترین کتاب پاتے ہیں، جس میں حدود شناسی اور معیاری تحقیق کے ساتھ واقعات کی چھان بین کی گئی ہے، یہ واقعہ درحقیقت سبائی تحریک کا نقطۂ عروج ہے کہ حضرت حسینؓ

کو پہلے دعوت تشریف آوری دی پھر آمادۂ قتال ہوگئے اور جب مراد پوری ہوگئی تو صفِ ماتم بچھادی ایسی صورتِ حال میں واقعہ کی تہ تک پہونچنا محققین ہی کا کام ہے، اس میدان میں حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کی خدمات گرانقدر اور بے مثال ہیں مگر مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے ایک انوکھے انداز سے اس واقعہ پر لکھا ہے جس میں تہذیب، شرافت، بے نفسی اور سب سے بڑھ کر سیدنا حضرت حسین رض کے وقار و جلالتِ شان کا ہر لحظہ نگہداری ہے، پوری کتاب میں کہیں بھی جذباتیت سے مغلوب ہو کر کچھ نہیں لکھا گیا ہے بلکہ کوشش کی گئی ہے کہ قاری کا ذہن از خود حقائق کو سمجھے میرے علم کی حد تک واقعۂ کربلا پر ایسی کوئی کتاب ابتک نہیں لکھی گئی جس میں اس درجہ سلامت روی اور حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہو، اس اعتدال و توازن کے ساتھ اس واقعہ کو ابتک نہیں لکھا گیا تھا، بلکہ اس سلسلہ کی تمام تحریریں کم و بیش افراط یا تفریط کا شکار رہی ہیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی "خلافت و ملوکیت" حضرت عمرو بن العاص رض حضرت امیر معاویہ رض اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رض وغیرہ کی شان میں گستاخیوں سے نیز حضرت عثمان رض کی شان میں ناروا الب کنائیوں سے بھری ہوئی کتاب ہے جسے ایران نے لاکھوں کی تعداد میں چھاپ کر تقسیم کیا ہے۔

محمود عباسی کی "خلافتِ معاویہ رض و یزید" بھی حد درجہ غیر معتدل کتاب ہے جس میں گستاخانہ حد تک سیدنا حضرت حسین رض کو اقتدار کا طالب ثابت کیا ہے جیسا کہ "خلافت و ملوکیت" میں مولانا مودودی صاحب نے حضرت امیر معاویہ رض کو الزام لگایا ہے، ان کتابوں کے علاوہ بہت سی کتابیں انھیں موضوعات پر لکھی گئی ہیں جن کے مصنفین نے محض اپنے کو غیر جانبدار ثابت کرنے کے لئے اصحاب رسول ص کی شان میں گستاخیاں تک روا رکھی ہیں، ایسی کوئی بات بحمداللہ "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" میں نہیں پائی جاتی، بلکہ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ تاثر ملتا ہے کہ مسلمان کو ہر حال میں اصحابِ رسول ص کی عظمت پیش نظر رکھنی ہوگی اور سبائیت کی تلبیس سے با خبر رہنا ہوگا۔

میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ ایک عام کلمہ گو مسلمان کا تاثر ہے، میں عالم نہیں ہوں اور اس کا اظہار اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ اردو والے طبقہ جب اپنے آپ کو عالم کے بہروپ میں

پیش کرتا ہے تو ایسے فتنے دین کی راہ اٹھتے ہیں جن کا حل علماء حق پرست بھی تلاش کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" انگریزی، عربی، فارسی اور ہندی زبانوں میں بھی جلد منتقل ہو جائے اور اس کی اشاعت زیادہ سے زیادہ ہو سکے تاکہ جویائے حق کو اس سلسلہ کی جاہلانہ رسوم بطیب خاطر ترک کرکے حق سے وابستگی میسر آسکے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے اس کتاب کو عوام و خواص کے لئے نافع بنا دے اور مصنف کو بہترین جزائے خیر عطا فرمائے۔

اقبال سہیل مرحوم کے دو شعر مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کو نذر ہیں ؎

انکار خلافت تو ہے ابلیس کا شیوہ — ہم پیروی دشمن آدم نہیں کرتے
رولیں وہ جو قائل ہیں ممات شہداء کے — ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے



الفرقان کی ملکیت و دیگر تفصیلات کے متعلق اعلان
(مطابق فارم ۴ دیکھئے قاعدہ ۸)

مقام اشاعت۔ لکھنؤ — وقفۂ اشاعت

پرنٹر و پبلشر کا نام و پتہ:۔ محمد حسان نعمانی۔ ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ

قومیت — ہندوستانی

ایڈیٹر کا نام و پتہ:۔ خلیل الرحمن سجاد ندوی، ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ

قومیت — ہندوستانی

ملکیت — محمد حسان نعمانی و خلیل الرحمن سجاد ندوی

میں محمد حسان نعمانی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین میں بالکل صحیح ہیں۔ دستخط محمد حسان نعمانی

سالانہ چندہ ماہنامہ الفرقان

	عام خریداری	اعزازی	لائف ممبری
ہندوستان	۔/۶۰ روپئے	۔/۱۲۰ روپئے	۔/۱۲۰۰ روپئے
پاکستان	۔/۱۲۰ روپئے	۔/۲۴۰ روپئے	۔/۲۴۰۰ روپئے
دیگر ممالک ذریعہ ہوائی ڈاک	۔/۲۵ ڈالر	۔/۵۰ ڈالر	۔/۵۰۰ ڈالر
〃 〃 بحری ڈاک	۔/۱۵ ڈالر	۔/۳۰ ڈالر	۔/۳۰۰ ڈالر

ایجنسی ماہنامہ الفرقان

۱۔ کم ازکم ۵ کاپیوں پر ایجنسی دی جاتی ہے۔

۲۔ ایجنسی کے آغاز پر ۔/۷ روپیہ فی کاپی کے حساب سے زرضمانت جمع کرنا لازمی ہے۔

۳۔ دس عدد تک کی ایجنسی کو پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جاتے ہیں ___ اور ایک ماہ کے بل کی ادائیگی کے بعد ہی دوسرے ماہ کا شمارہ بھیجا جاتا ہے۔

۴۔ دس سے زیادہ کاپیاں وی پی سے ہی بھیجی جاتی ہیں۔

۵۔ اخراجات بہرصورت بذمہ ادارہ ہوتے ہیں۔

۶۔ **شرح کمیشن**

۵ تا ۹ کاپی پر ۱۵٪ ۱۰ تا ۲۴ پر ۲۵٪

۲۵ یا زائد کاپی پر ۳۳٪ فی صد کمیشن دیا جائے گا۔

۷۔ ایجنسیوں کا بل فی شمارہ کی قیمت سے بنایا جاتا ہے

نرخنامہ اشتہارات

پورا صفحہ	۔/۹۰۰ روپئے
نصف صفحہ	۔/۵۰۰ 〃
چوتھائی صفحہ	۔/۳۰۰ 〃
ٹائیٹل کا اندرونی صفحہ	۔/۱۰۰۰ 〃
ٹائیٹل کا آخری صفحہ	۔/۱۲۰۰ 〃

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ:۔ ماہنامہ الفرقان ۱۱۴/۳۱ نظیر آباد لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

اپریل ۱۹۹۲ء مطابق شوال ۱۴۱۲ھ

جلد ... ۶۰ ... شمارہ ... ۴ ...

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سرپرست: حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

مدیر: خلیل الرحمٰن سجاد ندوی

قیمت:- ۵/۵۰

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:-

ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور

برطانیہ میں ترسیل زر کا پتہ:-

All Cheques and Postal Orders payable to,

R. RAHMAN and send it to :

Mr. R. RAHMAN

90-B, HANLEY ROAD LONDON N4 3DW

فہرست

صفحہ نمبر	مضامین نگار	مضامین	نمبر شمار
۳	مولانا عتیق الرحمٰن صاحب سنبھلی	نگاہ اولیں	۱
۸	امام ابن تیمیہؒ	حضرت معاویہؓ	۲
۲۰	مولانا عتیق احمد بستوی	دولتِ عثمانیہ کے دورِ اصلاحات کا مختصر جائزہ	۳
۳۳	مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی	برطانیہ کی مسلم پارلیمنٹ	۴
۴۰		یادِ رفتگاں	۵
۴۷		الفرقان کی ڈاک	۶

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو گئی ہے براہِ کرم آئندہ کیلئے سالانہ چندہ فوراً ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا اطلاع مہینے کے آخر تک موصول نہ ہونے کی صورت میں اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی روانہ کیا جائے گا۔

ہمارا پتہ:۔ منیجر ماہنامہ الفرقان نظیر آباد (۳۱۔ نیا گاؤں مغربی) لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸ (یو پی الہند)

محمد حسان نعمانی پرنٹر و پبلشر نے سینٹر آف میڈیا پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

نگاہِ اوّلیں

ظلمت کدے کی روشنی!

آزادی سے پہلے جب ہندوستان انگریزوں کے زیرِ حکومت تھا، اور آزادی کی تحریک چل رہی تھی، تب حکمراں طبقے کے بعض انگریز کہتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ آزادی اور خودمختاری کے قابل نہیں ہیں۔ قدرتی طور سے یہ بات ہمیں بہت بری لگتی تھی، مگر آزادی کے بعد جو صورت بنی اور روز بروز صاف سے صاف تر ہوتی چلی جا رہی ہے وہ تو یہی کہتی ہے کہ جیسے انگریز ٹھیک ہی کہتا تھا، زندگی کے جس میدان پر نظر ڈالئے آزاد قوموں کی اخلاقیات کے بجائے ایک بے مہار قوم کی اخلاقیات کا منظر سامنے آتا ہے۔

سب سے بڑی ذمہ داری کی جگہ اہلِ سیاست نے سنبھالی تھی، مگر ایک پیڑھی کے بعد اُنکے یہاں اپنی جگہ کو سنبھالے رکھنا ہی سب سے بڑی ذمہ داری (یا سب سے بڑی "اخلاقی قدر") بن گئی، اور ایک جمہوری نظامِ سیاست میں یہاں بالغ حق رائے دہی کا راج ہو وہاں اِس سے بڑھ کر پورے نظامِ زندگی کیلئے تباہ کن کوئی دوسری لت نہیں ہو سکتی، کہ اربابِ سیاست اپنے ذاتی یا گروہی مفادات کیلئے عوامی ووٹ کو طرح طرح کی شاطرانہ چالوں سے آلۂ کار بنائیں؛ اسکے نتیجے میں ملک کے پورے معاشرے میں اصول اور اخلاقیات کے بجائے اغراض پرستی اور مفاد پرستی کی رَو دَوڑ جاتی ہے۔ تعلیمی ادارے کسی بھی معاشرے کا سب سے اہم اور مقدس شعبہ ہیں،

[illegible]

چھوت سے یہ بھی اصول پسندی، بلند نظری، ضبطِ نفس اور اخلاقی طہارت کی تعلیم گاہیں ہونیکے بجائے ہر شر و فساد کی آماجگاہیں ہونے کا جو منظر ہمارے ملک میں پیش کر رہے ہیں، اس کے بعد زندگی کے کسی بھی شعبے میں کسی خیر و عافیت اور خوشنمائی کا سوال ہی باقی نہیں رہتا، معاشرے کے ہر میدان میں ہر قیمت پہ مفاد اور ہر قیمت پر اعزاز پرستی کی وہ دوڑ لگی ہے کہ تمام اخلاقی قدریں اسکے پاؤں تلے کچلی چلی جارہی ہیں۔

جس کسی کو بھی تھوڑا بہت حوصلہ میسّر ہے اور کسی درجے میں بھی حالات اُسے مُساعد نظر آتے ہیں، وہ ہر قیمت پر بڑا بننا چاہتا ہے، چاہے اعزاز و منصب کے اعتبار سے بڑا یا مال و دولت کے اعتبار سے بڑا!! اور یہ حرص اور ریس اسکی اخلاقی حس کو کمزور سے کمزور تر کرتی چلی جاتی ہے، حتیٰ کہ وہ اب اپنی مطلوبہ معراج پر پہنچکر بڑا آدمی بن چکا ہوتا ہے، تو اخلاقی طور سے دیوالیہ بھی ہوچکا ہوتا ہے۔ اسکے پاس اخلاق کا صرف وہ ذخیرہ باقی رہ جاتا ہے جو مفید مطلب ہو، جب یہ ملک کا ایک عام رُخ اور (TREND) ہو جائے گا، تو پھر ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی ہی جائے گی۔ اور اگر سچی اخلاقیات سے کم از کم ہر شعبۂ زندگی کی ناگزیر پیشہ ورانہ (PROFESSIONAL) اخلاقیات سے بے اعتنائی کا یہی عالم ہمارے ملک میں جاری رہا جو اس وقت ایک عام چلن بن گیا ہے تو پھر ملک کو اس سے بھی بُرے دن خدانخواستہ دیکھنے ہوں گے جن پر وہ آکھڑا ہوا ہے یعنی اقتصادی دیوالیہ پن کے نتیجے میں کھلے عام امریکہ کے اشاروں پر رقص کرنے کے وہ دن جن کا ایک سال پہلے تک بھی کوئی تصور شاید کسی کے ذہن میں نہیں تھا۔ یہ دن صرف ہماری اخلاقی ابتری نے دکھائے ہیں جس میں ذاتی اور گروہی مفاد یا جذبات سے برتر کوئی چیز نگاہ میں نہیں رہ جاتی، اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی وہ مثال صادق آجاتی ہے کہ کسی سمندری جہاز کے نچلے درجے کے مسافر پانی حاصل کرنے کیلئے عرشے پر جانے کی تکلیف اٹھانے کی بجائے جہاز کی تہ میں سوراخ کرکے پانی حاصل کرنے لگیں — ظاہر ہے کہ اس جہاز کو ڈوبنے سے کون بچائے گا؟

— • —

دین اور مذہب وہ چیز ہوا کرتے تھے جو انسان کو ظاہری اور مادی فائدوں سے آگے دیکھنے کی، بلکہ بہت سے ایسے فائدوں میں چھپا ہوا نقصان دیکھ لینے کی صلاحیت عطا کر دیتے اور اسکے مطابق طرزِ عمل کی ہمت بھی بخش دیتے تھے، مگر ہمیں ہندوستان میں یہ بھی دیکھنا تھا کہ مذہب کے نمائندوں اور رکھوالوں پر بھی سیاسی بازی گروں کی بلند اقبالی کا جادو... چل جائے یہاں تک کہ وہ اُن کی شعبدہ بازیوں کو کسی فکر و تشویش کی نظر سے دیکھنے کے بجائے اپنی سرگرم اور پر جوش حمایت سے انھیں سرفراز کرنے لگیں، اور ایک دوسرے مذہب کے ساتھ کھلی بے انصافی کی جو لے اہلِ سیاست کے ایک گروہ نے خالص سیاسی مفاد کیلئے اٹھائی تھی اُسے وہ اپنے مذہب کی خدمت اور عین حق گرداننے لگیں ـــــ ہمارا یہ اشارہ بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے جھگڑے کی طرف ہے لیکن سراسر ایک ہندوستانی کی حیثیت سے نہ کہ کسی مسلمان کی حیثیت سے۔ اور اس حیثیت سے غور کرتے ہوئے بھی کسی ایماندار آدمی کیلئے ممکن نہیں ہے کہ وہ رام جنم بھومی اور رام مندر کے عنوان سے مسجد کے خلاف چلائی گئی جارحانہ تحریک میں کوئی سچائی اور کوئی معقولیت پا سکے، چنانچہ ایسے ہندوؤں کی بھی اب گنتی نہیں ہے، جو بلا توقف کہہ رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں کہ یہ تمام تر ایک سیاسی کھیل ہے جس میں ہندو عوام کے مذہبی جذبات کو آلۂ کار بنا لیا گیا ہے۔

اے کاش کہ ملک میں جو دوسرا بڑا مذہبی گروہ مسلمانوں کا ــــ یعنی ہمارا ــــ ہے کم از کم اُسی کے نمائندوں کی طرف اُمید کی نظر سے دیکھا جا سکتا کہ اخلاقی بحران کی اس سنگینی میں وہ کم از کم مسلمانوں ہی کیلئے بلند فکری، بلند نظری اور اعلیٰ ظرفی کا عملی نمونہ پیش کرتے رہیں گے۔ مگر کیسے کہا جائے کہ اِدھر بھی ضرورت بھر کی روشنی نہیں ہے، روح کی وہ پاکیزگی بہت محدود افراد میں رہ گئی ہے جو گھٹیا باتیں قبول کرنے سے انکار کرتی ہے جسے ترفع اور بڑا بننے کی کوششوں کے بجائے پیچھے رہنے اور تواضع اختیار کرنے ہی میں بڑائی نظر آتی ہے جسے قناعت سب سے بڑی دولت دکھائی دیتی ہے، اور جاہ و مال کیلئے مسابقت کا خیال بھی

گزرنا اُسے ایک گناہ سے کم نہیں محسوس ہوتا۔ جو اپنے بھائیوں کی عزت میں اپنی عزت اور ان کی ذلت میں اپنی ذلت دیکھتی ہے، وہ بھائی سے زخم کھا لینے کو تیار ہو سکتی ہے مگر اُسے زخم لگانے کو نہیں سوچ سکتی۔ اُسکی سوچ کے پیمانے ہی اس دنیا کے رواجی پیمانوں سے جدا ہوتے ہیں ؎

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

جب جب اس مضمون کی طرف ذہن چلتا ہے، قرآن پاک کی وہ مقدس آیت ذہن میں گھوم جاتی ہے جس میں ارشاد ہوا ہے :-

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِيْ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ٥ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ٥

(الاعراف - ۱۷۶-۱۷۵)

اور (اے پیغمبر) ان کو اُس کا قصہ سناؤ جسے ہم نے اپنی آیتیں عطا کیں، پھر وہ اُن سے نکل بھاگا، اور شیطان اُس کے پیچھے لگ گیا۔ پس وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں کے ذریعے بلندی عطا کر دیتے، لیکن وہ تو زمین ہی کی طرف جھکا اور اپنے نفس کا پیرو کار بن گیا، پس اسکی مثال کتے جیسی ہے کہ تم اسے دھتکارو تب بھی زبان نکالے رہتا ہے اور یا اُسے چھوڑ دو تب بھی زبان نکالے رہتا ہے، یہ مثال ہے اس قوم کی جس نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تو ان کی سرگزشت (اپنے مخاطبین کو) سناؤ تاکہ وہ غور کریں۔

قرآن کی یہ آیاتِ پاک اُن تمام لوگوں کیلئے بہترین وعظ، بہترین آگاہی اور بہتر یاد دہانی ہیں، جنھیں علم دین حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے علم دین آدمی کی سطح بلند کرنے اور اسے اُوپر اُٹھانے کیلئے ہے، جس سے وہ اپنے رب کیلئے خوشنودی کا سامان کرے اپنے بنی نوع کیلئے روشنی بن جائے، یہ شرف حاصل کرنے کے بعد بھی آدمی اُن نفسانی تقاضو اور میلانات کے دباؤ میں رہے، جن کی تعمیل انسان کو زمین کی سطح سے ملا دیتی اور ایک گھٹیا سطح کا انسان بنا دیتی ہے تو بے شک اس سے بڑا بے شعور کوئی نہیں، اُس سے بڑا ناشکرا کو نہیں!ــــ

ربّ ذوالجلال اپنے دین کے نمائندوں کو ہمت بخشے کہ وہ اپنی ملت ہی کے نہیں پورے ملک کے ظلمت کدے کی روشنی بن جائیں۔

ایک غلطی

گزشتہ ماہ کے اداریے کی آخری سطروں میں کتابت کی غلطی اور پروف ریڈنگ کمزوری سے ایک لفظ مُنتصر چھپ گیا ہے۔ جبکہ صحیح لفظ مُختصر تھا۔ براہ کرم اسکو درست فرمالیجئے۔ ایک صاحب نے اس غلطی پر ایسی سنگین غلط فہمی کا اظہار کیا کہ یہ تصحیح ضروری ہو

ایڈیٹر

ایک ضروری اطلاع

بعض وجوہ سے یہ طے کیا گیا ہے کہ الفرقان کا آئندہ شمارہ مئی وجون کا مشترکہ ہوگا۔ جو انشاء اللہ مئی کے اواخر میں روانہ کیا جائے گا۔ ایجنسیاں اور قارئین کرام نوٹ فر

ادارہ

از افادات شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ

فتاویٰ ——— جلد ۳۵

حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن عاص جیسے صحابہؓ اور مسلکِ اہلسنّت

امام ابن تیمیہؒ سے ایسے شخص کے متعلق دریافت کیا گیا جو صحابیٔ رسول حضرت معاویہؓ پر لعنت بھیجتا ہو، نیز ان سے "اذا اقتتل خلیفتان فاحدھما ملعون" (جب دو خلفاء ایک دوسرے سے لڑنے لگیں تو ان میں سے ایک ضرور ملعون ہوگا) کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ کیا یہ اللہ کے رسولؐ کا فرمودہ ہے؟ ان سوالات کے جواب میں ابن تیمیہؒ نے لکھا: جس شخص نے حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ، حضرت عمروؓ بن العاص یا ان جیسے کسی اور صحابی پر یا اُن سے اوپر کے طبقہ والے صحابہ مثلاً حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ بن ابی طالب حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ پر یا ان کے علاوہ کسی بھی صحابی پر لعنت بھیجی تو وہ تمام ائمہ کے نزدیک سخت سزا کا مستحق ہے، ہاں علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ اسکی یہ جسارت گردن زدنی ہے یا اس کو سزائے موت سے کم درجہ کی کوئی اور سخت سزا دی جائے؟ (اس مسئلہ پر ہم کسی اور مقام پر تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں)۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے یہ ارشادِ نبوی نقل کیا گیا ہے:-

لَا تَسُبُّوْا اَصْحَابِیْ فَوَالَّذِیْ نَفْسُ	میرے صحابہ کو بُرا بھلا مت کہنا کیوں کہ
مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَوْ اَنْفَقَ اَحَدُکُمْ	اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان
مِثْلَ اُحُدٍ ذَھَبًا مَا بَلَغَ اَمَدَ ھُمْ	ہے تم میں سے کوئی اگر اُحد پہاڑ کے برابر
وَلَا نَصِیْفَہٗ۔	سونا بھی اللہ کی راہ میں خرچ کر دے تو
	اس کا وہ درجہ نہ ہوگا۔ جو ان کے ایک
	بلکہ آدھے مد (سیر) (غلہ) خرچ کرنے کا ہوگا۔

(اس حدیث میں تو بُرا بھلا کہنے کی ممانعت اور حرمت بیان کی گئی ہے) رہا لعنت کا معاملہ تو یہ تو اور زیادہ سنگین شے ہے، صحیح سند سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بھی ثابت ہے کہ لعن المؤمن کقتلہ، (مسلمان پر لعنت بھیجنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے اسکو (ناحق) قتل کر دینا)

رسول اللہؐ کے صحابہ مومنوں میں سب سے بہتر اور بلند تر درجہ کے لوگ تھے، ارشاد نبوی ہے:۔

خیر القرون القرنُ الّذی	سب سے بہتر وہ پیڑھی (جماعت) ہے
بُعِثتُ فیہ، ثم الّذین یلونھم	جس کی طرف میں مبعوث ہوا ہوں پھر
ثم الذین یلونھم۔	ان کے بعد والے اور ان کے بعد والے۔

صحابیت کا یہ شرف اور یہ فضیلت ہر اس شخص کو حاصل ہو جاتی ہے جس کی حالت ایمان میں اللہ کے رسولؐ پر نظر پڑ گئی، بلکہ صحابیت کا یہ مقام اسی "نظر" کے بقدر ہوگا.......

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ صحابہ میں سے جس جس کو جتنی مصاحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میسر آئی اسی کے بقدر ان میں باہم فرق مراتب قائم ہوا۔

مثال کے طور پر ایک مرتبہ حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف اور حضرت خالدؓ بن ولید کے مابین کچھ تلخ کلامی ہو گئی تھی تو اس وقت آپؐ نے حضرت خالدؓ سے فرمایا تھا! یا خالد! لا تسبوا أصحابی (اے خالد! میرے صحابہ کو کبھی برا بھلا مت کہنا!) یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ صحابی تو حضرت خالد بھی تھے مگر وہ فتح حدیبیہ کے بعد اسلام لانے اور شرف صحابیت پانے والوں میں تھے

جبکہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سابقین اولین میں سے تھے، (اسی سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کے درمیان فرقِ مراتب اسی شرفِ صحابیت کی مقدار سے مقرر ہوتا ہے اگرچہ نفسِ صحابیت کی فضیلت میں سب ہی برابر ہیں۔)

حضرت معاویہ حضرت عمرو بن العاصؓ اور ان کے جیسے دوسرے تمام صحابہ (سچے اور مخلص) مومن تھے، امت کے سلف میں سے کسی نے ان پر نفاق کا الزام نہیں لگا۔ بلکہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ حضرت عمرو بن العاص جب اسلام لائے تھے اور بیعت کرتے وقت انھوں نے یہ شرط لگائی تھی کہ میرے سارے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں تو آپؐ نے فرمایا تھا، "قبول اسلام خود ہی پچھلے سارے گناہوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے" ظاہر ہے کہ گزشتہ گناہوں کو معاف کروانے والا اسلام اخلاص اور صدق دل سے لایا ہوا اسلام ہی ہو سکتا ہے۔ منافقوں والا اسلام نہیں۔!!

ایک بات قابلِ غور یہ بھی ہے کہ حضرت عمرو بن العاص اور دیگر ان جیسے صحابہ کا شمار اُن مہاجرین میں ہوتا ہے جو حدیبیہ کے بعد ہجرت کرکے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور یہ بات طے شدہ ہے کہ مہاجرین میں سے کوئی منافق نہیں تھا، نفاق مدینہ ہی کے رہنے والے کچھ لوگوں میں تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ مدینہ کے عوام و خواص کی بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا تو باقی ماندہ لوگوں کے لئے اسکے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا کہ وہ دکھاوے ہی کے لئے سہی اپنے کو مسلمان ظاہر کریں، جہاں تک مکہ مکرمہ کا تعلق ہے وہاں صورت حال اسکے برعکس تھی، وہاں کفر کا راج تھا، عوام سے لے کر خواص تک اکثر و بیشتر لوگ اسلام کے دشمن اور مسلمانوں سے بغض و عداوت رکھتے تھے، وہاں اسلام کا اظہار بس وہی کر سکتا تھا، جو دل سے ایمان لایا ہو، اس لئے کہ مکہ کے معاشرہ میں اسلام لانے کا سیدھا مطلب یہ تھا کہ وہ شخص اب معاشرتی بائیکاٹ بلکہ (آخری درجہ کی) تکلیفیں برداشت کرنے کے لئے تیار ہے حالانکہ منافق کے اسلام کا مقصد صرف دنیوی منافع

حاصل کرنا ہوتا ہے۔

الغرض مہاجرین میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس پر کسی نے نفاق کا الزام لگایا ہو، وہ سب کے سب حقیقی مومن تھے اور ان کے ایمان کی متعدد شہادتیں موجود ہیں، اور (یہ حدیث پہلے ہی گذر چکی ہے کہ) کسی مومن پر لعنت بھیجنا اسی کو قتل کرنے کے مرادف ہے۔

حضرت معاویہ ابن ابی سفیان اور اسی طرح کے دوسرے وہ صحابہ جو فتح مکہ کے بعد اسلام لائے (اور جن کو اسلامی تاریخ کی اصطلاح میں "طُلَقاء" کہا جاتا ہے) جیسے عکرمہ بن ابی جہل، حرث بن ہشام، سہیل بن عمرو، صفوان ابن امیہ اور ابو سفیان بن حرث بن عبد المطلب ان تمام لوگوں کے بارے میں پوری امت مسلمہ کا اتفاق ہے کہ ان کو اچھی اسلامی زندگی نصیب ہوئی، اور ان میں سے کسی پر بعد کے دور میں بھی کسی نفاق کی تہمت نہیں لگائی، ان میں سے حضرت معاویہ کو تو ایک اعزاز یہ بھی حاصل ہے کہ ان کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا خاص کاتب بنایا اور ان کو یہ دعا دی "اے اللہ اس کو لکھنا سکھا، حساب کا علم عطا کر اور اپنے عذاب سے محفوظ رکھ۔ اللهم علمه الكتاب والحساب، وقه العذاب۔

حضرت معاویہ کے بھائی یزیدؓ بن ابی سفیانؓ ان سے بھی زیادہ فضیلتوں کے حامل تھے، حضرت ابو بکرؓ نے شام کو فتح کرنے والے ایک لشکر کا انھیں امیر بھی بنایا تھا، اور عین روانگی کے وقت ان کو ہدایات دی تھیں۔ اس انداز سے کہ یزیدؓ سوار تھے اور حضرت ابو بکرؓ پیادہ پا جب حضرت یزیدؓ نے عرض کیا کہ اے خلیفۂ رسول یا تو آپ بھی سوار ہو جائیں یا پھر میں اتر جاؤں، تو حضرت ابو بکر نے جواب دیا تھا، نہ میں سواری پر بیٹھوں گا، اور نہ تم اترو گے، مجھے اللہ کے راستہ میں چند قدم چلنے کا ثواب لینا ہے ....

پھر جب حضرت عمرؓ کے عہد میں حضرت یزیدؓ کا انتقال ہو گیا، تو انھوں نے حضرت معاویہؓ کو گورنر نامزد کیا۔ حضرت عمرؓ کا کسی شخص کو گورنری کے عہدہ کے لئے موزوں اور لائق اعتماد سمجھنا [illegible] کے صاحب ایمان اور قابل اعتماد ہونے [illegible]

تہائی صاحبِ فراست، ایک نظر میں پرکھ لینے والے اور حق کو سب سے زیادہ پہچاننے والے اور اسے قائم رکھنے کی سب سے زیادہ سعی کرنے والے تھے، یہاں تک کہ حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ عمرؓ کی زبان پر سکینت (صداقت) بولا کرتی ہے۔ (أنّ السکینۃ تنطق علی لسان عمر) ارشادِ نبوی بھی ہے۔ ان اللہ ضرب الحق علی لسان عمر وقلبہ اللہ تعالیٰ نے عمر کے زبان و دل پر حق کی چھاپ رکھی ہے، بلکہ آپؐ نے تو یہاں تک فرمادیا کہ" اگر مجھے نبوت نہ ملتی تو عمر کو ملتی" حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد حضرت عمر کو جب بھی یہ کہتے سنا کہ میرا خیال یہ ہے ..... یا میرا گمان یہ ہے ..... تو ہمیشہ بعد میں یہی نکلا کہ ان کا گمان صحیح تھا، (بہرحال یہ تمام قرائن اس بات کے ہیں کہ حضرت عمرؓ کسی منافق کو مسلمانوں کا نگہبان اور ولی الامر نہیں بنا سکتے تھے) اور واقعہ بھی یہی ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ نے کسی بھی منافق کو مسلمانوں کا حاکم نہیں بنایا، انھوں نے تو اپنے رشتہ داروں تک کو حکومتی عہدے دینے سے احتیاط برتی اللہ کے دین کے سلسلہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی انھوں نے کبھی پرواہ نہ کی اس سلسلہ میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب فتنۂ ارتداد اٹھا اور مرتدوں کو بزورِ شمشیر اسلام کی طرف واپس لایا گیا تو مرگز خلافت کی طرف سے ان لوگوں پر اسلحہ لیکر چلنے اور گھوڑے پر سوار ہوتے پر اسوقت تک کے لئے پابندی عائد کردی گئی جب تک کہ ان کے اسلام کی سچائی بالکل ظاہر نہ ہوجائے' ان لوگوں کے بارے میں ہے، حضرت عمرؓ نے عراق کے امیر حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو ہدایت دی تھی کہ ان میں سے کسی کو کوئی ذمہ داری نہ دینا، اور نہ جنگی معاملات میں انؔ سے مشورہ لینا، حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے اس طرز عمل کی روشنی میں یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ اگر حضرت عمرو بن العاص اور معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما اور انکے جیسے دیگر صحابہ کے بارے میں انھیں نفاق کا شبہ بھی ہوتا تو وہ انھیں ہرگز عہدے نہ دیتے، حضرت عمرو بن العاص کو تو خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ ذات السلاسل میں لشکر کا قائد

لے ان لوگوں میں طلیحہ اسدی، اقرع بن حابس، عیینہ بن حصن، اشعث بن قیس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بنایا تھا، (اور یہ بھی ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے لشکر کا سربراہ کبھی کسی منافق کو نہیں بنایا۔

اسی طرح خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہؓ کے والد حضرت ابوسفیانؓ رضی اللہ عنہما کو نجران کا گورنر مقرر کیا تھا، وہ حضورؐ کی وفات تک نجران میں آپؐ کی نیابت کے فرائض انجام دیتے رہے، اور اہلِ اسلام اس پر متفق ہیں کہ حضرت معاویہ کا اسلام اپنے والد کے اسلام سے بھی اعلیٰ درجہ کا تھا۔

یہ تمام لوگ کیسے منافق ہو سکتے ہیں (اور کیسے یہ ہو سکتا ہے کہ وہ دل سے ایمان نہ لائے ہوں، محض مجبوراً اسلام ظاہر کر رہے ہوں) جب کہ اللہ کے رسولؐ ان کو اسلام اور مسلمانوں (کی نگرانی) کے سلسلہ میں لائقِ اعتماد سمجھ رہے ہیں؟؟!!

حضرت معاویہؓ وحضرت عمرو بن العاصؓ اور دوسرے صحابہ کرام کے درمیان مشاجرات واختلافات رہے ہیں لیکن کسی نے ان پر رسول اللہؐ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرنے کا الزام نہیں لگایا نہ انکے حامیوں نے نہ مخالفوں نے۔ صحابہ اور علماءِ تابعین اس پر متفق ہیں کہ یہ حضراتؓ اللہ کے رسولؐ سے روایت کرنے میں صدق گو اور لائقِ اعتبار ہیں، جب کہ منافق کی روایت قبول کرنے کا سوال ہی نہیں وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا ٹھہراتا ہے (معاذ اللہ) اور ان تک جھوٹی باتیں منسوب کرتا ہے۔

اب جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ لوگ سچے مومن اور اللہ و رسول کے محب وفرمانبردار بندے تھے، تو جوان پر لعنت ملامت کرے وہ اللہ و رسول کا نافرمان ہے صحیح بخاری میں ایک قصہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص بار بار شراب پی لیتا، اور بار بار حضورؐ کے پاس سزا کے لئے لایا جاتا ایک مرتبہ ایک صاحب کی زبان سے اس کے بارے میں نکل گیا!! اللہ اس پر لعنت کرے عجیب آدمی ہے کتنی بار اس کو سزا مل چکی ہے مانتا ہی نہیں! یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں نہیں!

لعنت مت بھیجو۔ یہ شخص اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہے......

حالانکہ اللہ کے رسولؐ نے خود ہی شراب پینے والے، اس کے بنانے والے، بنوانے والے، پلانے والے، لانے والے اور اسکی قیمت کھانے والے گویا شراب سے کسی درجہ کا تعلق رکھنے والے پر لعنت بھیجی ہے، اور پھر خود آپؐ ہی نے اس خاص شخص پر متعین طور پر لعنت بھیجنے سے منع بھی فرمایا۔ اس ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ لعنت وعید کے قسم کی چیز ہے لہذا اس کا عمومی حکم ہی لگایا جا سکتا ہے۔ متعین طور پر کسی مسلمان پر لعنت بھیجنا اسلئے غلط ہے کہ ممکن ہے کہ اس نے توبہ کر لی ہو، یا اس کی نیکیوں ہی نے اسکی برائیوں کو مٹا دیا ہو، یا آفات و مصائب کفارۂ سیئات بن گئی ہوں، یا کسی مقبول شفاعت کی وجہ سے اسے معاف کر دیا جائے، اور یہ سب بھی اس شخص کے بارے میں ہے جس کا جرم ثابت ہو۔

تمام اہل سنت و جماعت اور سارے ائمۂ کرام ... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ قرابت یا سابقین کرام کسی کے متعلق عصمت کا عقیدہ نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک ان سے غلطیوں کا صدور ممکن ہے لیکن وہ یہ امید رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ توبہ یا ان کی نیکیوں کی برکت سے انھیں معاف فرمائے گا۔

والذی جاء بالصدق وصدق بہ اولئک ھم المتقون لھم ما یشاؤن عند ربھم ذلک جزاء المحسنین۔ لیکفر اللہ عنھم اسوأ الذی عملوا ویجزیھم اجرھم باحسن الذی کانوا یعملون۔

(زمر ۳۳-۳۵)

اور جو لوگ سچی بات لے کر آئے اور (خود بھی) اس کو سچ جانا، تو یہ لوگ پرہیزگار ہیں، (اُن کا فیصلہ یہ ہوگا کہ) وہ جو کچھ چاہیں گے ان کے لئے اُن کے پروردگار کے پاس سب کچھ ہے یہ صلہ ہے نیک کاروں کا، تاکہ اللہ تعالیٰ اُن سے اُن کے برے عملوں کو دور کر دے اور انکے نیک کاموں کے عوض اُن کو اُن کا ثواب دے۔

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے :۔

حَتّٰى إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهٗ وَبَلَغَ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِيْ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَأَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ إِنِّيْ تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْ أَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ط

(احقاف ـ ۱۵ ـ ۱۶)

یہاں تک کہ جب وہ اپنی جوانی کو پہنچ جاتا ہے اور چالیس برس کو پہنچتا ہے تو کہتا ہے اے میرے پروردگار مجھ کو اس پر مداومت دیجئے کہ میں آپ کی ان نعمتوں کا شکر کیا کروں جو آپ نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطاء فرمائی ہیں اور میں نیک کام کروں جس سے آپ خوش ہوں، اور میری اولاد میں بھی میرے لئے صلاحیت پیدا کر دیجئے میں آپ کی جناب میں توبہ کرتا ہوں، اور میں فرمانبردار ہوں، یہ وہ لوگ ہیں کہ ہم انکے اچھے کاموں کو قبول کرلیں گے اور اُن کے گناہوں سے درگذر کریں گے اس طور پر کہ یہ اہلِ جنت میں سے ہوں گے۔

علماء کے نزدیک صرف انبیاء ہی معصوم ہیں، صدیقین، شہداء اور اللہ کے دوسرے نیک بندے معصوم نہیں، انھوں نے رائے اپنے اجتہاد سے قائم کی اس میں ان سے کہیں کہیں غلطیاں بھی ہوئیں، ان کے صحیح اجتہاد پر انھیں دوہرا اجر ملے گا اور جہاں ان سے غلطی ہوئی وہاں انھیں اپنے اجتہاد کا ثواب ملے گا اور ان کی غلطی معاف کر دی جائیگی۔

بہت سے گمراہ فرقوں کی گمراہی یہیں سے شروع ہوتی ہے جب وہ غلطی اور گناہ کو ہم رشتہ اور لازم ملزوم قرار دیتے ہیں، اسی الجھن کا شکار ہو کر بعض فرقے بزرگوں اور صالحین کی عصمت کے

قائل ہو جاتے ہیں۔ اور بعض ان کی بے ادبی و بے توقیری کی غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور ان پر الزام لگانے لگتے ہیں کہ انھوں نے دیدہ و دانستہ فلاں موقع پر غلط روش اختیار کی، مگر جو لوگ "علم و ایمان" رکھتے ہیں، وہ نہ ان کو معصوم کہتے ہیں اور نہ گناہ گار ٹھہراتے ہیں۔

یہی وہ جگہ ہے جہاں سے بہت سے گمراہ فرقے وجود میں آئے، چنانچہ کچھ لوگوں نے سلف صالح پر سب و شتم اور لعنت و ملامت کا راستہ اختیار کیا، اس لئے کہ ان کی ناقص عقل نے یہ سمجھا کہ انھوں نے گناہ کئے تھے اور گناہ کرنے والا مستحق لعنت ہوتا ہے۔ یہ جماعت سلف کرام کو فاسق فاجر بلکہ کافر سمجھتی ہے۔ خوارج اسی گمراہی کی مثال ہیں جنھوں نے حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ اور ان دونوں کے مصاحبین کی تکفیر کی اور ان پر لعنت اور سب و شتم کیا۔ نیز ان سے جنگ کرنے کو جائز سمجھا۔ ان خوارج کے متعلق ہی اللہ کے رسولؐ نے فرمایا تھا کہ "تم لوگ اپنی نمازوں کو ان کی نمازوں کے مقابلہ میں اور اپنے روزوں کو ان کے روزوں کے مقابلہ میں اور اپنی قراءت قرآن کو ان کی قرأت کے مقابلہ میں حقیر اور کمتر درجے کا سمجھوگے، لیکن وہ قرآن پڑھیں گے تو وہ انکے گلوں سے آگے نہیں جائے گا (یعنی ان کے دلوں پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا) وہ اسلام سے ایسے ہی نکل جائیں گے جیسے کمان سے تیر.......

صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا کہ میرے اس بیٹے کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرائیگا، چنانچہ حضرت حسنؓ ہی کے ذریعہ حضرت علیؓ کے اور حضرت معاویہؓ کے حامیوں کے درمیان صلح ہوئی تھی —— یہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ وہ جنگیں جن کے دروازہ کو حضرت حسنؓ نے بند کیا اگر وہ پسندیدہ ہوتیں یا ان کا درجہ کفر و اسلام کے معرکوں کا ہوتا تو حضرت حسنؓ کا یہ فعل فرض سے روگردانی یا کم از کم اللہ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ طرز عمل سے انحراف قرار دیا جاتا (قابل تعریف عمل ہرگز نہ ہوتا) حالانکہ مذکورہ حدیث صراحت کے ساتھ

یہ بات تبلاتی ہے کہ انکا یہ اقدام بہت قابل ستائش اور اللہ اور اسکے رسول کے نزدیک پسندیدہ تھا۔

ایک اور صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی گود میں ایک طرف حضرت حسن کو بٹھاتے اور دوسری طرف حضرت اُسامہ بن زید کو اور پھر یوں دعا گو ہوتے "اللھم انی احبھما واحب من یحبھما" (اے اللہ مجھے اِن دونوں سے بھی محبت ہے اور جو ان دونوں سے محبت رکھے اس سے بھی محبت ہے) یاد رہے کہ حضرت حسن کی طرح حضرت اسامہ بن زید بھی اسی طرز عمل کے دلدادہ تھے جو حضرت حسن نے اختیار کیا تھا، اور جسکے بارے میں آنحضرت نے پہلے ہی تعریف کے ساتھ خبر دے دی تھی اور اسکے برعکس دوسرے طرزِ عمل کو ناپسند کرتے تھے۔

ایک اور بات اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ جنگِ صفین کے مقتول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک خوارج کی طرح نہیں تھے، خوارج سے جنگ کا حکم خود آپؐ نے دیا تھا۔ اور صفین کے فریق سے صلح کے بارے میں صاف صاف اپنی پسندیدگی و مسرت کا اظہار فرمایا تھا، اسی لئے تمام صحابہ خوارج سے جنگ پر متفق تھے، حضرت علیؓ بھی ان سے جنگ کے فیصلہ پر مطمئن اور مسرور تھے، اور اس سلسلے میں حضرت علیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ہدایت بھی نقل فرماتے تھے۔

اس کے برخلاف صحابہ سے قتال کے بارے میں حضرت علیؓ نے نہ تو کسی نبوی ہدایت کا حوالہ دیا اور نہ خود اس پر کسی خوشی کا اظہار کیا، بلکہ اسکے برعکس جو چیز ان سے ظاہر ہوئی وہ رنج و افسوس تھا اور یہ تمنا کہ کاش کہ یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔ نیز انھوں نے صراحۃً دونوں گروہوں کو کفر و نفاق سے بری قرار دیا، اور دونوں طرف کے مقتولین کے لئے دعائے رحمت و مغفرت کو جائز رکھا ——

اس طرح کے اور بھی بہت سے ایسے دلائل ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علی اور دیگر صحابہ اس پر متفق تھے کہ دونوں گروہ سچے مومن ہیں۔

قرآن کریم بھی شاہد ہے کہ مسلمان اگر آپس میں خدانخواستہ جنگ کرنے لگیں تو اسکی وجہ سے دائرہ اسلام و ایمان سے خارج نہیں ہوں گے۔ اللہ کا فرمان ہے:۔

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ [illegible]

اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ

(حجرات - ۹ - ۱۰)

لڑ پڑیں تو انکے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے، پھر اگر رجوع ہو جائے تو ان دونوں کے درمیان .... عدل کے ساتھ صلح کرا دو، اور انصاف کا خیال رکھو بے شک اللہ تعالیٰ انصاف والوں کو پسند کرتا ہے، مسلمان تو سب بھائی ہیں، سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو۔

مذکورہ آیت میں اللہ نے مسلمانوں کے دونوں برسر پیکار گروہوں کو مومن قرار دیا ہے اور یہ بہت واضح دلیل ہے۔

۲- جہاں تک "اذا اقتتل خلیفتان فاحدهما ملعون" والی مذکورہ حدیث کا تعلق ہے، تو یہ موضوع اور من گھڑت ہے، کسی بھی محدث نے اس کو روایت نہیں کیا ہے اور نہ ہی یہ حدیث کے کسی معتبر مجموعہ میں ہے اور یہ بھی دھیان میں رکھنا چاہئے کہ حضرت معاویہؓ نے نہ خلافت کا دعویٰ کیا تھا اور نہ ہی انھوں نے حضرت علیؓ سے جنگ کرنے وقت خلافت کی بیعت لی تھی، نہ انھوں نے خلیفہ یا مستحق خلافت کی حیثیت سے جنگ کی تھی، یہ بات سب ہی کو معلوم تھی، اور حضرت معاویہؓ سے بھی جب کوئی دریافت کرتا تو وہ یہی جواب دیتے، اور وہ خود اور ان کے ساتھی بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ حضرت علی اور ان کے ساتھیوں سے از خود جنگ چھیڑیں۔

مگر حضرت علیؓ نے جب یہ سمجھا کہ حضرت معاویہؓ پر حضرت علی کی اطاعت اور بیعت واجب ہے کیونکہ مسلمانوں کا ایک ہی خلیفہ ہو سکتا ہے، اور چونکہ وہ آپکی بیعت و اطاعت سے انکار کر کے اس واجب کی ادائیگی سے انکار کر رہے ہیں، اور [illegible] طاقت [illegible] ہیں تو انھوں نے ان سے جنگ کا فیصلہ کیا تاکہ وہ لوگ اپنی ذمہ داری

ادا کریں اور مسلمانوں کا یہ تفرقہ ختم ہو۔

دوسری طرف حضرت معاویہؓ کا خیال یہ تھا کہ ان پر ابھی بیعت واجب نہیں ہے، اور اگر اس بنا پر ان سے جنگ کی جائے گی تو وہ مظلوم ہونگے، ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ بات تو سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ ناحق قتل کئے گئے تھے اور ان کے قاتلین حضرت علی کے کیمپ میں موجود ہیں، بلکہ وہی لوگ وہاں چھائے ہوئے ہیں اور وہاں انھیں خاصی طاقت حاصل ہے (ان کا کہنا تھا کہ) اگر ہم حضرت علیؓ سے ابھی بیعت کرلیں گے تو وہ (قاتلین عثمانؓ) ہم کو بھی اپنی ظالمانہ حرکتوں کا نشانہ بنائیں گے، اور حضرت علیؓ جس طرح ان سے حضرت عثمانؓ کو نہیں بچا سکے ہم کو بھی نہیں بچا سکیں گے۔ بیعت تو ایسے خلیفہ کی واجب ہوتی ہے جو انصاف دلا سکے اور ہمارے ساتھ انصاف کرسکے۔

علاوہ ازیں دونوں طرف کچھ ایسے بے وقوف اور جاہل لوگ بھی تھے جو حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کے سلسلے میں بے بنیاد سخت بدگمانیاں رکھتے تھے، حضرت علیؓ کے بارے میں ایک طبقہ کا جھوٹا گمان یہ تھا کہ حضرت عثمان کے قتل کی سازش کے پیچھے انہی کا ذہن کارفرما ہے حالانکہ حضرت علیؓ قسم کھا کھا کر اس اندوہناک حادثہ سے اپنی براءت کا اظہار کرتے تھے۔ (اور حضرت علی کی بات تو بغیر قسم کے بھی سچی ہی مانی جانی چاہئے تھی۔)

اور بڑی عجیب بات یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے حامی اور مخالف دونوں طرح کے لوگ اس طرح کی باتیں ان کے بارے میں پھیلا رہے تھے، مخالفین تو دراصل حضرت علیؓ کو مطعون کرنے کے لئے ایسا کرتے تھے اور حامیوں کا مقصد حضرت عثمانؓ کے بارے میں یہ تأثر دینا تھا کہ وہ واجب القتل تھے (معاذ اللہ) اور اسی لئے حضرت علی نے ان کو قتل کرا دیا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ (فتین قسم کے لوگوں کو چھوڑکر) دونوں طرف کے لوگ اس بات پر متفق تھے کہ حضرت معاویہؓ اپنے سارے فضائل اور صلاحیتوں کے باوجود حضرت علیؓ کے ہم [illegible]

مولانا عتیق احمد بستوی
استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

دولتِ عثمانیہ کے دورِ اصلاحات کا مختصر جائزہ

(تیسری و آخری قسط)

اصلاحات کا چوتھا دور

اصلاحات کے سلسلے میں سلطان محمود ثانی کی حسرت ناک ناکامی اور موت کے بعد ۱۲۵۵ھ ۱۸۳۹ء میں ان کے بڑے لڑکے عبدالمجید خاں نے زمامِ مملکت سنبھالی، دولِ عظمیٰ نے محمد علی پاشا کی نئی ابھرتی ہوئی قوت کو اپنے مفاد کے خلاف دیکھ کر دولتِ عثمانیہ اور محمد علی پاشا کی جنگ میں مداخلت کی اور محمد علی پاشا کو مجبور کیا کہ شام اور دوسرے مفتوحہ علاقوں سے اپنا قبضہ ختم کرکے مصر ہی کی حکمرانی پر قناعت کرے محمد علی پاشا سے صلح ہونے کے بعد سلطان عبدالمجید کو بارہ سال کا طویل وقفۂ امن میسر آیا اس مدت میں انھوں نے محمود ثانی کے شروع کردہ اصلاحی تحریک کو آگے بڑھایا۔

سلطان عبدالمجید کی اصلاحات کا تذکرہ کرنے سے پہلے ایک نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے، سلطان سلیم ثالث کے دور سے پہلے دولتِ عثمانیہ کی خارجہ پالیسی میں فرانس کو کلیدی حیثیت حاصل تھی، نپولین کے مصر پر حملہ کے بعد فرانس اور دولت عثمانیہ کے باہمی تعلقات میں بگاڑ شروع ہوا، سلیم ثالث اور محمود ثالث کے دور میں برطانیہ نے دولتِ عثمانیہ سے تعلقات بڑھانے کی کامیاب کوشش کی، عبدالمجید کا دور آتے آتے دولتِ عثمانیہ کی سیاست میں اس نے کلیدی حیثیت

حاصل کرلی اور برطانیہ کو دولتِ عثمانیہ کا سب سے قریبی دوست تصور کیا جانے لگا اس تبدیلی کا تذکرہ اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ دولتِ عثمانیہ کی تحریک اصلاحات پر اس تبدیلی کا بڑا گہرا اثر پڑا۔

سلطان عبدالمجید نے رشید پاشا کو صدارتِ عظمیٰ کا منصب تفویض کیا جو لندن میں دولتِ عثمانیہ کے سفیر تھے، رشید پاشا مغربی افکار و نظریات، فکر و فلسفہ، تہذیب و ثقافت سے متاثر بلکہ مسحور تھے، قیام لندن کے زمانے میں انھوں نے جمہوریت، پارلیمانی نظام اور مغربی تہذیب کا قریب سے مطالعہ کیا تھا اور اس کی چمک دمک سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ انھیں یورپ کی کامل تقلید ہی میں دولتِ عثمانیہ کی نجات نظر آئی[1]، سلطان محمود کی زیادہ تر اصلاحات فوج اور علومِ جدیدہ سے متعلق تھیں اس نے ملک کے دستور و آئین میں کوئی دور رس تبدیلی نہیں کی لیکن نوجوان سلطان عبدالمجید نے تخت سلطنت پر آتے ہی رشید پاشا اور دول عظمیٰ کے دباؤ سے وہ اقدام کر ڈالا جس نے دولتِ عثمانیہ کو سیکولر حکومت کے راستہ پر ڈال دیا، تخت نشینی کے صرف چار ماہ بعد شعبان ۱۲۵۵ھ میں سلطان نے ایک جدید فرمان جاری کیا جو تاریخ میں "خط شریف گلخانہ" کے نام سے مشہور ہے، اس فرمان میں دولتِ عثمانیہ کے تمام باشندوں کو بلا امتیاز قوم و مذہب جان، مال، آبرو کے کامل تحفظ کی ضمانت دی گئی، محاصل کی تعیین اور وصولی نیز فوج کی بھرتی اور مدّتِ ملازمت کے سلسلے میں بنیادی تبدیلیوں کا وعدہ کیا گیا اس کے کچھ ہی دنوں بعد "خط شریف گلخانہ" کی روشنی میں سلطان نے ایک اہم دستور کا اعلان کیا جس میں خط شریف گلخانہ کے دفعات کی توثیق کی گئی اور عیسائی رعایا کے لئے بے شمار حقوق و سہولتوں کا اعلان کیا گیا، مثلاً بطریق کے بارے میں حقوق و اختیارات میں اضافہ کیا گیا، ہر شخص کو کامل مذہبی آزادی دی گئی یعنی کسی کو مذہب کے بارے میں نہ مجبور کیا جائے گا نہ ستایا جائے گا، لہٰذا اگر نعوذ باللہ کوئی مسلمان مرتد ہو جائے تو اس قانون کی بنا پر اسے مرتد کی سزا نہیں دی جا سکتی[2]، تجارت، دیوانی، فوجداری کے تمام مقدمات جن میں

---

[1] علی حسون، الدولۃ العثمانیہ ص ۱۵۰، ۱۵۱ حرب عبدالحمید۔ مقدمہ مذکرات السلطان عبدالحمید ص ۳ [2] ایضاً ص ۱۶۱

ایک فریق مسلمان دوسرا فریق عیسائی ہو اسلامی عدالت میں پیش کئے جانے کے بجائے مخلوط عدالتوں میں پیش کئے جائیں گے، مسلم وغیر مسلم تمام رعایا پر یکساں محاصل عائد کئے جائیں گے اور تمام مذاہب کے لوگوں کو فوج میں بھرتی کیا جائیگا لیکن غیر مسلم اگر چاہے نقد رقم پیش کرکے فوجی خدمت سے کنارہ کش ہوسکتا ہے سلطان عبدالمجید کے دور سے پہلے سلطنت کے تمام شعبوں میں خالص اسلامی قوانین نافذ تھے، اور عدلیہ کا پورا نظام شریعتِ اسلامی کے ماتحت تھا مگر اس کا دور ختم ہونے ہوتے عدلیہ سے شریعتِ اسلامی کی بالادستی تقریباً ختم ہوگئی صرف اسلام کے عائلی قوانین (مسلم پرسنل لا) باقی رہے اسلامی تعزیرات کی جگہ فرانس کے انداز کا ضابطۂ تعزیرات جاری کیا اور مغربی انداز کا قانونِ فوجداری قانونِ تجارت نافذ کیا عدلیہ کی طرح تعلیم کا نظام بھی دین اور اہلِ دین کے اقتدار سے خارج کردیا گیا، اب تک دولتِ عثمانیہ کا تعلیمی نظام علماء کی نگرانی میں چلتا تھا، سلطان نے آزاد محکمۂ تعلیم قائم کرکے تعلیم کا انتظام اور نگرانی اسی کے سپرد کردی، دینی مدارس ومکاتب کو بھی محکمۂ تعلیم کے ماتحت کردیا،[1] اسی کے دور میں تعلیم حاصل کرنے کیلئے بڑے پیمانے پر نوجوانوں کو یورپ کی تعلیم گاہوں میں بھیجا جانے لگا وہ نوجوان یورپ کی سائنسی اور صنعتی، حربی ترقیات کا گہرا مطالعہ کرنے سے زیادہ مغربی فکر وفلسفہ، تہذیب وثقافت سے مسحور ومرعوب ہوکر لوٹنے لگے اور انھیں دولتِ عثمانیہ میں مروج ومقبول بنانے کیلئے جدوجہد کرنے لگے، سلطان عبدالمجید[2] نے جو قوانین نافذ کئے، ان سے زیادہ تر عیسائی رعایا کو فائدہ پہونچا غیر ملکی باشندوں کو بھی دولتِ عثمانیہ میں جائیدادیں خریدنے اور بڑھانے کا حق مل گیا، اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عیسائیوں نے ہر جگہ خصوصاً شام ولبنان میں اپنی حیثیت بہت مضبوط کرلی، دوسرے ممالک کے بے شمار سرمایہ دار عیسائی بیروت ولبنان میں آکر آباد ہوگئے اور وہاں بڑی بڑی جائیدادیں بنالیں، مختلف ممالک کی عیسائی مشنریوں نے پورے شام میں بے شمار دعوتی، تعلیمی مراکز کا جال بچھا دیا، اِنہی مراکز سے پورے عالمِ عرب میں ملحدانہ افکار ونظریات، مغربی تہذیب وثقافت کی نشر واشاعت

---

[1] ڈاکٹر محمد عزیز۔ دولتِ عثمانیہ ج ۲ ص ۸۲ تا ۹۱ علی حسون الدولۃ العثمانیہ ص ۱۵۰-۱۵۱-۱۶۱

[2] علی حسون۔ الدولۃ العثمانیہ ص ۱۴۹

اور ترویج کی گئی اور بہت جلد لبنان کا علاقہ عالمِ اسلام کے لئے گلے کی ہڈی ثابت ہوا جس کو نہ اگلنا آسان ہے نہ نگلنا۔

دولتِ عثمانیہ کی تاریخ میں سلطان عبدالمجید کے وقت سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے' جسے "دورِ تنظیمات" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، تنظیمات کے ذریعہ سلطنت کے انتظامی ڈھانچہ میں بنیادی تبدیلی ظہور پذیر ہوئی دورِ تنظیمات سے پہلے مملکت کے نظم و نسق میں دیوان سلطانی کو کلیدی حیثیت حاصل تھی، جسے ہم سلطان کی مجلس شوریٰ کہہ سکتے ہیں، اس وقت اختیارات سلطان کے ہاتھ میں ہوتے تھے اور شیخ الاسلام اس کا مشیرِ خاص ہوتا تھا، اس کے مشورہ کے بغیر خصوصی دینی معاملات میں کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا تھا' دیوانِ سلطانی سلطان کے احکام کو نافذ کرنے والی اور نظم و نسق میں سلطان کی مدد کرنے والی باڈی تھی، غرضیکہ سلطان کے بعد سب سے زیادہ اختیار اور مقام شیخ الاسلام اور علماء کا تھا، دورِ تنظیمات آنے کے بعد باب عالی کو کلیدی حیثیت حاصل ہو گئی، باب عالی کو مجلسِ وزراء کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں پہلے جو اختیارات سلطان کے ہاتھ میں مرکوز تھے' اب سلطان اور وزراء میں تقسیم ہو گئے، شیخ الاسلام کا اثر اقتدار وزراء سے کم ہو گیا اور رفتہ رفتہ ان کی حیثیت ایک عضوِ معطل کی ہو گئی۔[1]

اصلاحات کی ناکامی کے اسباب

آگے بڑھنے سے پہلے آیئے ہم سلطان عبدالمجید کے دور تک کی اصلاحات پر تحقیقی اور تنقیدی نظر ڈالتے چلیں، اس بات کا گہرائی سے جائزہ لیں کہ ان سلاطین کی اصلاحی کوششیں پورے طور پر بار آور اور نتیجہ خیز کیوں نہ ہو سکیں، نیز ملک کا بڑا طبقہ ان اصلاحات سے غیر مطمئن کیوں رہا حالانکہ اصلاحات کی ضرورت کا احساس شدت سے ہر طبقہ میں موجود تھا۔

بلاشبہ اصلاحات کی ناکامی کی بڑی ذمہ داری ینی چری فوج کے سر آتی ہے جس نے ہر دور میں

---

[1] حرب عبدالحمید۔ مقدمہ مذکرات السلطان عبدالحمید الثانی ص۳۔۴

اصلاحات کی مخالفت کی اور تمام اچھائیوں اور برائیوں سمیت قدیم فوجی نظام باقی رکھنے پر اصرار کیا، اس میں ایک طبقہ وہ تھا جس کے مفادات پر جدید فوجی نظام جاری ہونے سے ضرب پڑتی تھی اور اکثریت ان لوگوں کی تھی جو جہالت اور مذہب کے غلط تصور کی بنا پر یورپ سے درآمد کی ہوئی ہر چیز اور ہر نظام کو ناجائز و حرام سمجھتے تھے اسی کے ساتھ ساتھ ینی چری میں کچھ گمراہ، تخریب پسند، اسلام دشمن عناصر اسی غرض سے شامل ہو گئے تھے تاکہ فوج میں انتشار پیدا کریں اور مفید اصلاحات جاری نہ ہونے دیں، مورخین لکھتے ہیں کہ سلسلہ بکتاشیہ جس کا ینی چری میں بہت اثر تھا، اس کے بانی حاجی بکتاش ولی اگرچہ سلسلۂ نقشبندیہ کے متبع سنت بزرگ تھے، لیکن بعد میں ان کے متبعین میں شیعی عقائد وافکار راہ پاگئے تھے بـ۱۲۲۶ھ (۱۲-۱۸۱۱ء) میں زادہ آفندی شاہ ایران کے یہاں باب عالی کے سفیر تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ سلسلہ بکتاشیہ کا ایک شخص میرے پاس آیا اور اس نے بیان کیا کہ "میں استنبول سے آرہا ہوں میرے ینی چری فوج سے گہرے روابط ہیں سلطان سلیم ثالث کے خلاف ینی چری سے انقلاب برپا کروانے میں میرا بڑا حصہ رہا ہے، مصطفیٰ بیرقدار پر حملہ کرنے والوں کی میں نے قیادت کی ہے" زادہ آفندی نے استنبول واپس آنے کے بعد مفتی اعظم سے یہ واقعہ بیان کیا تو انھوں نے فرمایا کہ واقعۃً شیعی عقائد وافکار ینی چری میں پھیل رہے ہیں سلطان کے حکم سے ینی چری کے بارکوں کی تلاشی لی گئی تو ایک درویش پکڑا گیا جو شیعیت کی تبلیغ و دعوت میں مصروف تھا اسے فوراً ایران روانہ کر دیا گیا۔[1]

مصلحین کے طریقۂ کار کا جائزہ

مذکورہ بالا حقائق کے باوجود مصلحین اور اصلاح پسند طبقہ کو بھی نتائج کی ذمہ داری سے بری نہیں کیا جا سکتا، دولتِ عثمانیہ میں اصلاحات جاری کرتے ہوئے چند حقائق کو ہر لمحہ پیش نظر رکھنا ضروری تھا،

۱۔ دولتِ عثمانیہ کا خمیر بالکل اسلامی تھا۔ اسلامی بنیادوں پر اور اسلامی جوش و جذبہ کے ساتھ

---

[1] حرکۃ الاصلاح العثمانی ص۱۴۳

اس سلطنت کی تعمیر وتشکیل ہوئی تھی عثمانی قوم اور عثمانی فوج اسلام کی شیدائی اور اسلام کی فدائی تھی اپنے کو نہ صرف مسلمان بلکہ اسلام کی علمبردار سمجھتی تھی خالص اسلامی رشتہ ہی کی بنا پر مختلف نسلوں اور ملکوں کے مسلمان اتحاد و یگانگت کے ساتھ اس عظیم امپائر کا نظام چلا رہے تھے، اور ایک تسبیح کے دانے بنے ہوئے تھے، دولتِ عثمانیہ کے مسلمان مذہب کے بارے میں بڑے غیور اور حساس تھے، وہ کسی قیمت پر ایسی اصلاحات پر راضی نہ تھے جو ان کے خیال میں اسلام کی تعلیمات سے متصادم ہوں۔

۲۔ دولتِ عثمانیہ کو یورپ کے فکر و فلسفہ، تہذیب و ثقافت، قانون و اخلاق کی ضرورت نہیں تھی، قرآن و حدیث اور اسلامیات کا خزانہ ان ذخیروں سے اتنا مالا مال تھا کہ کسی اور طرف نگاہ اٹھانے کی بھی ضرورت نہیں تھی، یورپ سے حاصل کرنے کی چیز صرف علوم صنعت و حرفت، سائنس اور فنون حرب تھے، دولتِ عثمانیہ میں ان اصلاحات جاری کرنے والوں کے لئے ضروری تھا کہ اصلاحات کو صرف مذکورہ میدانوں تک محدود رکھتے اور یورپین تہذیب و ثقافت، فکر و فلسفہ اور طرزِ حکومت سے مرعوب و متأثر ہو کر انھیں اپنانے کی کوشش نہ کرتے۔

۳۔ عثمانیوں کو یورپ اور اہل یورپ سے شدید نفرت تھی، یہ نفرت چند روز کی پیداوار نہیں تھی، بلکہ صدیوں کی خونریز جنگوں اور معرکہ آرائیوں کا نتیجہ تھی، وہ لوگ یورپ سے درآمد کی ہوئی ہر چیز کو شک و نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس لئے اصلاحات جاری کرنے والوں کی ذمہ داری بہت اہم اور نازک تھی، ان کے لئے ضروری تھا کہ تدریجاً اصلاحات جاری کرتے اور کوئی اصلاحی قدم اٹھانے سے پہلے اس کے متوقع اثرات اور ردّ عمل، مضرت و منفعت کا ٹھنڈے دل و دماغ سے جائزہ لیتے جس طرح ڈاکٹر اپنے نحیف و لاغر مریض کو قوت کی اتنی ہی دوا دیتا ہے جس کا وہ تحمل کر سکتا ہو اسی طرح مصلحین کے لئے ضروری تھا کہ کوئی اصلاح جاری کرنے سے پہلے بڑے پیمانے پر اس کے لئے فضا ہموار کرتے اور عوام و خواص پر اثر انداز ہونے والے طبقات کے ذریعہ اس کے لئے ذہن سازی کرتے۔

دورِ اصلاحات کا غیر جانبداری سے جائزہ لینے کے بعد ہمیں اس بات کا تو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اصلاحات جاری کرنے والے سلاطین نیک نیت اور مخلص تھے، ملک و قوم کا مفاد ہی سمجھ کر اصلاحات

جاری کر رہے تھے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مذکورہ بالا تینوں حقائق کو وہ برابر مدّ نظر نہیں رکھ سکے چنانچہ ایک طرف ان مصلحین نے چند ایسے اقدامات کئے جو اسلامی تعلیمات سے متصادم تھے اور دولتِ عثمانیہ کے خالص مذہبی معاشرہ کے لئے ان کا تحمل ناممکن تھا مثلاً سلطان محمود ثانی نے ایسے سکّے رائج کئے جن پر ایک طرف سلطان کی تصویر کندہ ہوتی تھی[1]، اسی طرح اس نے حکم دیا کہ فوجی چھاؤنیوں میں اس کی تصویریں رکھی جائیں اور فوجی ان تصویروں کو سلامی دیا کریں[2]، اس دور میں جبکہ دینی حلقوں میں بھی تصویریں مروّج ہوگئی ہیں ہم اس ردِّ عمل اور ہیجان کا اندازہ نہیں لگا سکتے، جو اس طرح کے اقدامات سے اُس زمانہ میں برپا ہوا ہوگا، سلطان عبد المجید نے دولتِ عثمانیہ میں یورپین طرز کے نظامِ سلطنت کی تخم ریزی کی، بہت سے اسلامی قوانین منسوخ کرکے ان کی جگہ مغربی قوانین جاری کئے مرتدین کی سزا ختم کرائی، دوسری طرف ان سلاطین نے اصلاحات کا دائرہ ضرورت سے زیادہ وسیع کیا انھوں نے یورپ سے فنونِ حرب سائنس اور ٹکنالوجی حاصل کرنے پر اکتفا کرنے کے بجائے مغربی فکر و فلسفہ، تہذیب و ثقافت کے بہت سے غیر ضروری اجزاء قبول کرنے پر عثمانی فوج اور قوم کو مجبور کرنا چاہا مثلاً فوج میں یورپین لباس جاری کرنے پر ان سلاطین کو بڑا اصرار تھا اور یہی اصرار اکثر ویشنر فوج کی بغاوت کا سبب بنا، سلطان سلیم ثالث کے خلاف آخری بغاوت جو اس کی معزولی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، اسی بنا پر برپا ہوئی کہ اس نے فوج کے ایک حصہ کو جو ینگ چری کہلاتے تھے حکم دیا کہ یہ لوگ "نظامِ جدید" کی فوجوں کا لباس اختیار کرلیں[3]، علی حسون سلطان محمود ثانی کی اصلاحات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "انھوں نے بعض ایسے اقدامات کئے جن سے ان کے احساس کمتری اور داخلی شکست خوردگی کا اندازہ ہوتا ہے، حکم جاری کیا کہ عمامہ کی جگہ ترکی ٹوپی استعمال کی جائے تمام افواج کے لئے یورپین لباس لازم کر دیا[4]، عجب حادثہ ہے کہ لباس کا مسئلہ عثمانیوں کے لئے ہمیشہ دردِ سر بنا رہا قوم کو یورپین لباس سے جسقدر نفرت تھی حکام کو اسے اپنانے پر اسی قدر

---

[1] حرکۃ الاصلاح العثمانی ص ۲۵۷ [2] ایضاً ص ۲۰۵ [3] دولتِ عثمانیہ ج ۱ ص ۴۸۲-۴۸۳

[4] تاریخ الدولۃ العثمانیہ ص ۱۲۶

اصرار تھا۔ زوالِ خلافت کے بعد کمال اتاترک نے بھی مغربی لباس جاری کرنے کے لئے ترکوں پر بے پناہ مظالم کئے۔ سلطان محمود ثانی بسا اوقات خالص یورپین[1] لباس میں نمودار ہوتا جسے عموماً عثمانی بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے ایک یورپین مؤرخ لکھتا ہے محمود ثانی کی اصلاحی تحریک کے نتیجہ میں عثمانی معاشرہ میں کوئی بنیادی اور دور رس تبدیلی پیدا نہیں ہوئی اصلاحات بہت سطحی رہیں ہاں ان کے نتیجے میں عثمانی قوم کا دینی جذبہ و شعور ضرور مجروح ہوا اسی لئے اصلاحات کے خلاف شدید ردِ عمل ظاہر ہوا[2]۔

اصلاحات برپا کرنے میں جو عنصر پیش پیش تھا اس کا طرزِ عمل بھی عثمانیوں کو اصلاحات سے متنفر کرنے کا بڑا سبب تھا مثلاً مصطفیٰ بیرقدار کے بارے میں مورخین لکھتے ہیں" محمود ثانی کی تخت نشینی کے بعد مصطفیٰ بیرقدار نے صدارت عظمیٰ کا منصب سنبھالا اور بڑی محنت اور سختی سے اصلاحات شروع کردیں اس کے طرزِ عمل میں فاتحانہ غرور و تکبر نمایاں تھا اسے اترا ہٹ تھی کہ میں نے دنیا کا رخ بدل دیا ہے' اپنے قریبی دوستوں کے ساتھ اس کا برتاؤ ٹھیک نہیں تھا انھیں بھی اس نے محض اپنا آلۂ کار بنایا، اسی لئے اس کے خلاف جذبات برانگیختہ ہوئے اس کے احباب برسرِعام گفتگو کرنے لگے کہ بیرقدار سرکش و ظالم ہے جسے دین و اخلاق کسی چیز کا پاس و لحاظ نہیں یہ تو قباقچی کے لوگوں سے بھی خطرناک اور بدتر ہے[3]۔

اصلاحات میں سلطان سلیم کی ناکامی اور ان کی معزولی و قتل کی تفصیل لکھنے کے بعد احمد رفیق قباقچی مصطفیٰ میں لکھتے ہیں" اس حالت اور نتیجہ کی ذمہ داری صرف اصلاحات مخالف عناصر پر نہیں آتی ہے بلکہ اصلاح پسند عنصر بھی بڑی حد تک اس کا ذمہ دار ہے کیونکہ ان لوگوں نے صدیوں سے جاری نظام اور تہذیب و ثقافت کو انتہائی عجلت اور سختی سے ختم کرنا چاہا، ان لوگوں کو اپنی جدید تعلیم اور تجربہ پر ضرورت سے زیادہ غرور تھا، متکبر نوجوانوں کے قبضہ میں حکومت کے اہم عہدے آجانے سے قدیم عہدہ داروں اور کارکنوں میں اشتعال پیدا ہوا اصلاحات جاری کرنے والے

---

[1] حرکۃ الاصلاح العثمانی ص ۱۳۲، ۲۷۲　[2] ایضاً ص ۲۵۶-۲۵۷　[3] ایضاً ص ۱۲۹، ۱۳۰

اپنی ناتجربہ کاری اور عوام کے افکار و عقائد سے لاپرواہی برتنے کی وجہ سے دولتِ عثمانیہ کے لئے بڑا خطرہ ثابت ہوئے، اصلاح پسندوں کی ایک بڑی تعداد دولت سمیٹنے اور محلات تعمیر کرنے میں منہمک تھی، عیش و طرب، تعیّش، رقص و سرور وغیرہ میں بھی یہ لوگ بدنام تھے ـــــ اصلاحات کے حامی اور مخالف دو گروہ بن جانے کی وجہ سے نئی انتظامی خامیاں پیدا ہو گئیں چنانچہ حکومت کے اہم راز غیر ملکی اخبارات میں شائع ہونے تھے، چنانچہ ایک بار "طوب قبو سرائے" میں ایک انتہائی خفیہ میٹنگ ہوئی جس میں شرکت کی دعوت قائم مقام صدرِ اعظم کو بھی نہیں دی گئی لیکن چند روز کے بعد اس میٹنگ کی پوری کارروائی ایک فرانسیسی اخبار میں آ گئی ہے[1]

کیا علماء تحریک اصلاح کے مخالف تھے

مغربی مؤرخین تحریک اصلاح کی ناکامی کا بڑا سبب طبقۂ علما کو قرار دیتے ہیں کہ علماء نے جمود اور تنگ نظری کا ثبوت دیا، اور دورِ جدید کے حالات و ضروریات سے آنکھیں بند کر کے ہر اصلاح کی مخالفت کی لیکن حقیقت پسندانہ مطالعہ کے بعد یہ الزام بڑی حد تک بے بنیاد ثابت ہوتا ہے، دولتِ عثمانیہ کے علماء کو پورا احساس تھا کہ یورپ سے جدید حربی فنون، سائنس اور صنعتی علوم حاصل کرنا دولتِ عثمانیہ کی ناگزیر ضرورت ہے، اور انہی میدانوں میں پیچھے رہ جانے کی وجہ سے دولتِ عثمانیہ کو شکست پر شکست ہو رہی ہے اس لئے جب بھی اس سلسلہ میں کوئی تحریک اٹھی تو علماء نے اس کی تائید کی، شیخ الاسلام نے اس کے موافق فتویٰ صادر کیا لیکن چونکہ اصلاحات کا عمل غیر ملکی عیسائیوں اور دین سے ناواقف مسلمان افسران کے ذریعہ انجام پا رہا تھا، اس لئے اصلاحات کے خاکہ میں دانستہ یا نادانستہ ایسے اجزاء شامل ہو جاتے جو مذہبی اعتبار سے قابلِ اعتراض ہوتے اس کے نتیجے میں بے چینی پھیلتی اور علماء بھی اصلاحات کے غیر اسلامی اجزاء پر نکیر کرتے عثمانی علماء نے اصلاحات کی مخالفت اسی طرح کی جس طرح ہندوستان کے علماء نے سر سید احمد کی تحریک کی

---

[1] حرکۃ الاصلاح العثمانی ص ۱۱

مخالفت کی، ہندوستانی علماء قطعاً انگریزی زبان، سائنس اور صنعتی علوم کی تعلیم کے مخالف نہیں تھے بلکہ سرسید احمد نے علی گڑھ تحریک میں یورپین تہذیب و ثقافت، فکر و فلسفہ اپنانے کی دعوت اور قرآن کی من مانی تاویل و تحریف کا جو دروازہ کھول رکھا تھا جس کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ نوجوان اسلام کے مسلمہ عقائد سے منحرف ہو کر الحاد و زندقہ کی گود میں جا رہے تھے، صرف اس کی وجہ سے علماء نے علی گڑھ تحریک کی مخالفت کی تھی، اسی طرح عثمانی علماء آنکھیں بند کر کے ہر اصلاح کی مخالفت نہیں کر رہے تھے، انھوں نے تو مفید اور ضروری اصلاحات کے حق میں فتوے دیئے اصلاحات کے حق میں فضا ہموار کی لیکن اصلاحات میں شامل غیر اسلامی اجزاء پر نکیر کرنا ان کا فرض تھا جسے انھوں نے انجام دیا۔

عثمانی علماء کے جمود و بے خبری کی مثال میں مغربی مؤرخین نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ استنبول میں جب پہلا مطبع قائم ہوا تو اس سے پہلے علماء میں اس مسئلہ میں کافی بحث و مباحثہ ہوا اور کافی غور و خوض کے بعد شیخ الاسلام نے تصحیح اور جودتِ طباعت کی شرط کے ساتھ غیر مذہبی کتابوں کی طباعت کی اجازت دی اور کچھ عرصہ بعد جب مطبع پر اعتماد ہو گیا تو دینی کتابوں کی اشاعت کی اجازت دی، حالانکہ اس واقعہ سے علماء کا جمود اور تنگ نظری نہیں بلکہ ان کی دور اندیشی اور بیدار مغزی کا ثبوت ملتا ہے جو حضرات فقہ اسلامی کی تشکیل اور جدید مسائل پر شرعی بحث و مسائل کے انداز سے ناواقف ہیں انھیں اس بات پر حیرت ضرور ہوتی ہے کہ علماء نے پہلے بہت سی چیزوں کو ممنوع قرار دیا پھر بعد میں ان کے جواز کا فتویٰ دیا حالانکہ یہ نہ حیرت کی بات ہے نہ ملامت کی، بسا اوقات نئے مسائل کی پوری حقیقت علماء کے سامنے نہیں آتی یا ان مسائل کے بارے میں ماہرین میں خود اختلاف ہوتا ہے، یا جدید پیش آمدہ مسئلہ تھوڑی تھوڑی مدت کے فرق سے نئی نئی شکلیں اختیار کرتا رہتا ہے، اس لئے علماء کو فتوے میں تبدیلی کرنی پڑتی ہے، شروع میں جب علماء کو مطابع کا تجربہ نہیں تھا تو انھوں نے اس اندیشہ سے دینی کتابوں کی طباعت سے روکا کہ کہیں بدباطن اور اسلام دشمن افراد

[illegible]

ثابت ہوا اور ان کی تصحیح اور جودتِ طباعت پر اعتماد ہوگیا تو علماء نے دینی کتابوں کی نشرو اشاعت میں اس جدید ایجاد سے فائدہ اٹھانے میں کوئی دریغ نہیں کی۔

ایک حقیقت کا اعتراف

یہ بحث ختم کرنے سے پہلے اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ عثمانی علماء نے اگرچہ جائز اصلاحات کی مخالفت نہیں کی لیکن انھوں نے اصلاحات کی تحریک میں قائدانہ کردار بھی ادا نہیں کیا، اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جب عالمِ اسلام پر علوم عقلیہ، منطق، فلسفہ، طبعیات، ریاضیات نے یلغار کی تو متکلمین اسلام نے ان جدید علوم میں مجتہدانہ مقام پیدا کیا اور قرآن و سنت اور عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر بتایا کہ ان علوم و فنون کے کون سے اجزاء اسلام سے متصادم ہیں، جن سے احتراز ضروری ہے اور کون اجزاء قابلِ اخذ و استفادہ ہیں علماء کی ذمہ داری تھی کہ اٹھارہویں، انیسویں صدی کے آزمائشی دور میں بھی اپنا قائدانہ کردار ادا کرتے اور یورپ کے جدید علوم و فنون کے قلب و جگر میں اتر کر اسلامی کسوٹی پر انھیں پرکھتے اور ان کے اسلامی و غیر اسلامی اجزاء کی نشاندہی کرتے مختلف اسباب کی بنا پر جن کی تفصیل نازک بھی ہے اور دشوار بھی، علماء یہ کام نہیں کرسکے اصلاحات کی منصوبہ سازی اور تنفیذ ان کے ہاتھوں میں آگئی جنھیں اسلام سے زیادہ واقفیت تھی نہ دلچسپی علماء دور سے ان اصلاحات کا مشاہدہ کرتے اور کبھی نکیر کرتے۔

آخری بات

دولتِ عثمانیہ کی تاریخ کے دورِ زوال کے مطالعہ کرتے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے ارباب اقتدار اور دانشور یورپ کی تیز رفتار ترقی اور برق رفتار فتوحات سے حیران اور مبہوت ہو کر رہ گئے تھے وہ لوگ ٹھنڈے دل و دماغ اور حقیقت پسندانہ مطالعہ کی روشنی میں یہ تجزیہ نہ کرسکے کہ

[illegible]

اورکیا چھوڑنے کی؟ وہ لوگ مغربی علوم وفنون سے زیادہ مغربی تہذیب وثقافت، فکروفلسفہ سے مرعوب اور مسحور تھے، اور یورپ کی ترقیات میں اس کی تہذیب وثقافت، فکروفلسفہ کو بنیادی حیثیت دیا کرتے تھے ایسا اکثر ہوتا ہے کہ مغلوب اور مفتوح قومیں فاتح اقوام کی کامیابی کے حقیقی اسباب کا تعین نہیں کر پاتیں اور ان کی تہذیب وثقافت، معاشرت اپنا کر کامیاب و کامران بننے کی کوشش کرتی ہیں۔

دولتِ عثمانیہ سے جو طلباء اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپین جامعات میں بھیجے جاتے چونکہ ان کی دینی تعلیم بہت ناقص ہوتی تھی اور اسلام کی حقیقت وحقانیت سے ناواقف اور اسلامی تہذیب وثقافت سے تقریباً بیگانہ ہوتے تھے اس لئے یورپ جاکر وہ بہ آسانی یورپین نظریات وافکار، تہذیب و تمدن کے شکار ہو جاتے ان کا بیشتر وقت علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل کے بجائے دوسری دلچسپیوں اور ثقافتی پروگراموں میں گذرتا اور چند سال کے بعد یورپ سے اس حال میں لوٹتے کہ اسلام کے مسلمات پر ان عقیدہ متزلزل ہوتا وہ لوگ ہر مشرقی چیز کو شک ونفرت کی نگاہ سے اور ہر مغربی چیز کو عقیدت ومرعوبیت سے دیکھتے وہ لوگ مغربی تہذیب وثقافت کے پرجوش مبلغ اور داعی اور یورپین طرزِ حکمرانی، افکار ونظریات کے پرستار ہوتے، تمام شعبہ ہائے زندگی میں یورپ کی اندھی تقلید ان کا شیوہ ہوتا، انورالجندی لکھتے ہیں:۔

> "اسمتھ ٹوینی وغیرہ نے لکھا ہے کہ سلطان محمود ثانی کا نظریہ یہ تھا کہ" یورپ کو یورپ ہی کے ہتھیاروں سے شکست دی جا سکتی ہے" لیکن سلطان محمود ثانی اور ان مؤرخین کی نگاہوں سے یہ حقیقت اوجھل ہوگئی کہ یورپ کا ہتھیار حاصل کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ نوجوانوں کے عقل ودل کی اسلامی بنیادوں پر تعمیر کی جاتی، انھیں جہادِ اسلامی اور دفاع اسلامی کی صحیح روح پھونکی جاتی لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ جو نوجوان یورپین اسلحہ کی ٹریننگ کے لئے یورپ بھیجے گئے وہ خود اعتمادی اور غیرتِ ایمانی کے [illegible]

اور دولتِ عثمانیہ کو صفحۂ ہستی سے نیست ونابود کرنے کے لئے اہلِ مغرب کیا سازشیں کررہے ہیں یورپ میں اسلام کے خلاف صدیوں سے صلیبی روح کارفرما تھی اور اسلام دشمنی کا جذبہ پورے شباب پر تھا اسی زمانہ میں ترقی پسند عثمانی نوجوان جدید فنونِ جنگ اور آلاتِ حرب کی تعلیم اور ٹریننگ کیلئے بالکل نہتے ہوکر یورپ حاضر ہوئے، نہ ان کے پاس ایمان محکم، عقیدۂ راسخہ کا کارگر ہتھیار تھا، نہ قومی حمیّت وغیرت کا جس سے وہ مغربی سامراج، اور بین الاقوامی صیہونی تحریک کا لقمۂ تر بننے سے محفوظ رہتے عثمانی نوجوان اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھے کہ یورپ چار صدیوں سے زائد عرصہ تک ان سے لرزاں وترساں رہا اور اب خود وہ لوگ جدید اسلحہ اور عسکری ٹکنالوجی حاصل کرنے یورپ حاضر ہوئے ہیں تو یورپ اپنے فوجی اور صنعتی راز ان پر کیسے منکشف کرسکتا ہے یورپ نے تو دولتِ عثمانیہ ہی کو شکست دینے کے لئے ان میدانوں میں حیرت انگیز ترقی کی تو اب وہ کیسے پسند کرے گا کہ عثمانیوں کو جدید فوجی اور صنعتی علوم سکھا کر انھیں مدِمقابل بنالے اور انھیں خودکفیل کردے[1]؟

---

[1] انور الجندی ــــ مقدمۃ العلوم والمناہج ۔ ج ۲ صـ۴۴

باقی صـ۴٦ کا

سادگی وبےنفسی جیسے اوصاف بھی بھرپور پائے تھے۔ رمضان المبارک کی چھبیسویں شب میں عالمِ آخرت کی طرف منتقل ہوئے، اور ۲۵ رمضان کو بعد ظہر سپردِ خاک کئے گئے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً ــــ دل چاہتا ہے کہ ان کی زندگی کا بھی کچھ تفصیلی تذکرہ الفرقان کے صفحات میں آئے، دعا ہے کہ جلد ہی یہ بھی ممکن ہوسکے، قارئین کرام سے ان سب حضرات کے لئے دعاؤں کے اہتمام کی درخواست ہے ــــــــــ (مدیر)

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

برطانیہ کی
"مُسلم پارلیمنٹ"

امسال ۴ جنوری کو لندن میں، اُس برطانوی پارلیمنٹ کے بخیر و عافیت موجود ہوتے ہوئے جو مادرِ پارلیمان (MOTHER OF PARLIAMENTS) کہلاتی ہے ایک نئی پارلیمنٹ کا افتتاح ہوا جس کا نام "مسلم پارلیمنٹ" بتایا گیا ہے اور بی بی سی لندن نے اپنے ان نشریوں میں جو ہندوستان کے اندر سُنے جاتے ہیں، اس پارلیمنٹ کی افتتاحی کارروائیوں کا اتنا متواتر تذکرہ اور ان پر تبصرہ کیا کہ ہندوستان کے دورانِ قیام گزشتہ دو ماہ (جنوری، فروری) میں جہاں کہیں آنا جانا اور رہنا ہوا، لوگوں نے اِس پارلیمنٹ اور اس کے بانی مبانی ڈاکٹر کلیم صدیقی کے بارے میں ضرور پوچھا۔ حتیٰ کہ خیال ہونے لگا کہ ایک لندن باسی (LONDON-BASED) کی حیثیت سے اس بارے میں اپنی معلومات، خیالات اور تأثرات کا کچھ تفصیل سے اظہار شاید ایک مفید کام ہوگا۔ ذیل کی یہ سطریں اسی خیال کے ماتحت تحریر میں لائی جا رہی ہیں۔

برطانیہ کی ۵ ½ کروڑ آبادی میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد زیادہ سے زیادہ بیس۲۰ لاکھ ہے، اور اس تعداد کا بیشتر حصہ گزشتہ تیس۳۰ پینتیس۳۵ سال کے اندر ہندوستان، پاکستان اور دوسرے ایشیائی، افریقی ممالک سے وہاں پہنچا ہے۔ یہ "آٹے میں نمک" جیسی نسبت رکھنے والے نو وارد بیرونی عناصر — اور وہ بھی مسلمان — قلب لندن میں ایک "پارلیمنٹ" کے نام سے کوئی چیز بنائیں

اور برطانوی ذرائع نشر و اشاعت اسے ایک فراخدلانہ اور غیر جانبدارانہ قسم کی پبلسٹی سے نوازیں تو ایک غیر معمولی درجے کا سادہ لوح ہی کوئی ہو سکتا ہے جو بدیہی طور پر اس دال میں کچھ کالا نہ محسوس کرے۔

اور وہ "کالا" یہ ہے کہ اس پارلیمنٹ کی تخلیق بھی دراصل اسی برٹش میڈیا کی رہین منت ہے جس نے اُسے حیرت انگیز قسم کی پبلسٹی سے نوازا ہے' اتنا تو خود ڈاکٹر صدیقی کا اپنا بیان ریکارڈ پر موجود ہے کہ وہ جو ادارہ قائم کر رہے تھے اُس کا نام "کاؤنسل آف برٹش مسلمز" تجویز کیا گیا تھا، اُسے "مسلم پارلیمنٹ" کا نام میڈیا نے دیا ہے۔ جسے انھوں نے شکریے کے ساتھ قبول کر لیا۔ اسکے علاوہ میڈیا کا جو حصہ اس کی تخلیق میں ہے اسکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے ستمبر ۱۹۸۸ء میں سلمان رشدی کا ناول "شیطانی آیات" لندن کے ایک بڑے پبلشر نے شائع کیا تو بعض اسباب سے اُسکے خلاف سب سے پہلا مسلم ردّ عمل ہندوستان سے ہوا، اور اسکی بازگشت نے برطانیہ کے مسلم حلقوں میں فوراً ہی ایک حرکت پیدا کر دی' جو برطانوی حکومت کی سرد مہری اور پبلشر کے نامناسب رویّے کی بنا پر شدّت پکڑتی گئی حتیٰ کہ ۱۴ جنوری ۱۹۸۹ء کو بھاری مسلم آبادی کے شہر بریڈفورڈ میں وہاں کی مساجد کونسل کے زیر اہتمام اس شیطانی کتاب کو سرِ عام جلا کر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا گیا، اور ۲۸ جنوری کو لندن کی اسلامک ڈیفنس کونسل کے زیر اہتمام ملک بھر سے جمع ہونے والے ۲۵۔۳۰ ہزار آدمیوں نے لندن کے مشہور ہائڈ پارک کارنر سے پبلشر پینگوئن کے آفس تک ایک مثالی قسم کا طویل مارچ کر کے اپنا احتجاجی میمورنڈم دیا۔

ڈاکٹر کلیم صدیقی اور اُن کی سرکردگی میں کام کرتے والا مسلم انسٹی ٹیوٹ (لندن) جو ایرانی انقلاب کے بعد سے ایران پسند سرگرمیوں کا ایک سرگرم مرکز ہے' اور ایک پندرہ روزہ اخبار بھی اس سلسلے میں نکالتا ہے' اکتوبر، نومبر، دسمبر اور جنوری' یعنی پورے چار ماہ کے عرصے میں اس تمام قضیے سے پورے طور پر یکسو اور بے تعلق رہے' حالانکہ اس دوران میں وہ وقت بھی آیا کہ بریڈفورڈ کی کتاب سوزی پر برطانوی میڈیا چل اُٹھا اور مسلمانوں کے خلاف آسمان سر پر اُٹھا لیا' شاید

اس کا راز یہ ہو کہ ایران بھی اس وقت تک بے تعلق چل رہا تھا جیسا کہ بیشتر مسلم ممالک کا حال تھا۔ لیکن اُدھر ایک دن (۱۴ر فروری کو) ایران کی خاموشی ایک دھماکہ خیز انداز میں (یعنی آیت اللہ خمینی صاحب کے ایک "امامی" فرمان سے) ٹوٹی، جس میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا تھا کہ اس کتاب کے مصنّف اور ناشر کو قتل کر ڈالیں، اور اِدھر کلیم صاحب اور اُن کے اخبار اور انسٹی ٹیوٹ کی خاموشی بھی اسی کے ساتھ ٹوٹ گئی۔

برٹش میڈیا جو کتاب سوزی کے واقعہ پر چراغ پا ہو رہا تھا، دیکھنے والوں نے بڑی حیرت سے دیکھا کہ ڈاکٹر کلیم صاحب خمینی صاحب کے فرمانِ قتل کی حمایت میں شمشیر برہنہ ہو کر اس میڈیا کے سامنے آئے تو اُن کے ساتھ اس کا معاملہ وہ نہیں تھا جو کتاب سوزی کا جرم کرنے والوں بلکہ خود خمینی صاحب کے ساتھ تھا۔ رُشدی سے یکجہتی کا وہ پُرجوش اظہار کرتے ہوئے جو پوری مغربی میڈیا برادری کر رہی تھی، یہ برٹش میڈیا مسٹر صدیقی کو بھی بھرپور مواقع فراہم کر رہا تھا کہ رُشدی کے لئے خمینی صاحب کے فرمانِ قتل کی پُرزور حمایت کر کے مسلمانوں کی واہ واہ لوٹیں اور ہیرو بنیں۔ وہی اخبارات جو خمینی صاحب سے بیحد خفا تھے کلیم صاحب کے پورے پورے صفحے کے انٹرویو اُن کی آدھے آدھے صفحے کی پُرکشش تصویروں کے ساتھ چھاپ رہے تھے، اور مختلف بہانوں سے وقتاً فوقتاً چھاپتے رہے۔

فروری ۷۹ء سے (جب کہ خمینی صاحب ایران میں انقلاب لائے) فروری ۸۹ء تک (جبکہ خمینی صاحب نے رشدی کے لئے قتل کا فرمان جاری کیا) ڈاکٹر صدیقی ایرانی انقلاب کے پیغام کی توسیع و اشاعت میں جو کچھ بھی سرگرمیاں کرتے رہے ۔ اور بڑے استقلال و انہماک سے کرتے رہے ۔۔ ان سب میں برطانیہ کے اندر اُن کی جولانیوں کا رقبہ مسلم انسٹی ٹیوٹ کی عمارت سے لندن یونیورسٹی کے لوگن ہال تک محدود رہا، جہاں وہ اپنے سیمینار اور جلسے کیا کرتے تھے۔ اور جس کا انسٹی ٹیوٹ سے فاصلہ بس کوئی دو سو گز ہوگا۔ مگر برطانوی میڈیا کی نوازش نے انھیں دو سال کے اندر اس حیثیت پر پہنچا دیا کہ مسلمانوں کی ایک تعداد کی نگاہ میں وہ ہیرو بن جائیں، اور

کُل برطانیہ اُن کی جولانگاہ بنے، اور بس یہیں سے "مسلم پارلیمنٹ" کی تخلیق ہوتی ہے۔

برٹش میڈیا کے علاوہ ایک اور مقامی عنصر کی معاونت کا بھی اس پارلیمنٹ کی تخلیق میں قابلِ ذکر حصّہ ہے، اور وہ عنصر ہے ہمارے بریلوی المسلک علماء اور پیرانِ طریقت کا۔

برطانیہ میں رشدی کی کتاب پر جو لوگ فوراً ہی حرکت میں آئے اور پھر ایک عمومی حرکت کے لئے کوشاں ہوئے وہ اتفاق سے وہ لوگ تھے جو بریلوی علماء کی زبان میں "وہابی" کہلاتے ہیں۔ قدرتی بات ہے کہ جو آگے بڑھے گا وہی قائد بھی بن جائے گا، الحمدللہ کہ مسلم عوام نے اس معاملے میں کسی تفریق کے خیال کو راہ نہ دی، جس شہر میں جس آدمی نے آواز لگائی لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو گئے، مگر افسوس کہ بریلوی علماء اور پیرانِ طریقت کا طبقہ اس صورت حال سے خوش نہ رہا، اور (بعض مستثنیات کے ساتھ) عموماً کچھ دور دور رہنے کی ہی پالیسی ان حضرات نے اپنائی جو ایسے موقعوں پر عام طور سے تجربے میں آتی رہی ہے، ایسی حالت میں جو کلیم صاحب کا سکوت ٹوٹا اور ایرانی فرمان کی حمایت میں وہ تمام تر ایرانی آداب و انداز کے ساتھ بایں طور میدان میں آئے کہ جو لوگ پہلے دن سے اس میدان میں کھڑے تھے، اور اتفاق سے اُن میں کوئی ایسا نہ تھا جو ایران نوازی کے سلسلے میں بھی منسلک ہو اُن کو انھوں نے سعودی ایجنٹ ہونے کی گالی دی، اور اِن دور کھڑے علماء و مشائخ کی طرف اعانت طلبی کا ہاتھ بڑھایا، تو اِن حضرات کے لئے اس سے زیادہ خوش آئند بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ ان کو "وہابیوں" سے جُدا ہی نہیں بلکہ سعودیوں کو گالی دینے والا بھی اسٹیج مل گیا، مسلم پارلیمنٹ کی تخلیق میں برٹش میڈیا کے ساتھ ان حضرات کی معاونت کا بھی یقیناً بڑا حصّہ ہے۔

ان دو گروہوں کے تعاون سے برطانوی مسلمانوں کی زمین کا جو حصّہ ڈاکٹر کلیم صاحب کیلئے ہموار ہوا اُسکو انھوں نے ایک سیاسی گروہ کی شکل میں منظّم کرنے کا فیصلہ کر کے "مسلم مینی فیسٹو" (یا مسلم منشور) کے نام سے ایک لائحہ عمل تیار کیا۔ اسکے بنیاد پر اپنے حلقۂ اثر کے شہروں میں مسلم مینی فیسٹو گروپ" بنائے، اِن گروپس سے اس لائحہ عمل کی بنیاد پر تمائندے مانگے، جن کا مجموعہ

"مسلم پارلیمنٹ" کہلایا۔ اس بنا پر یہ منتخب لوگوں کی مجلس تو ضرور ہے، مگر بس ایک محدود حلقے کے لوگوں کی، اور اس محدودیت کے ذمہ دار خود کلیم صاحب ہیں، ورنہ وہ اگر ایران کی خاص "انقلابی" زبان اور اسکے خصوصی آداب اپنے انسٹی ٹیوٹ ہی میں چھوڑ کر مسلم مسائل کے میدان میں آئے ہوتے تو یقیناً آج اُن کے ساتھ مسلمانانِ برطانیہ کا ایک وسیع تر حلقہ ہوتا۔

برطانوی مسلمان ایک اچھے لیڈر کے ضرورتمند ہیں، خاصکر رُشدی قضیے کے بعد سے انکی ضرورت زیادہ ہی بڑھ گئی ہے، اور متعدد افراد اور گروہ ہیں جو اس ضرورت کو پورا کرنیکے لئے کوشاں ہیں، ایک لیڈر کو جن خصوصیات کا حامل ہونیکی ضرورت ہے، اِن خصوصیات کے اعتبار سے اگر ان سب امیدواروں کو جانچا جائے تو کم از کم راقم الحروف کی نظر میں سب سے زیادہ پوائنٹ لینے کے حقدار ڈاکٹر کلیم صدیقی نکلیں گے، لیکن اس بدقسمتی کو کیا کیا جائے کہ انھیں مسلم قیادت کیلئے ایرانی ادائیں اس درجہ پسند آگئی ہیں کہ وہ ایران کی سرزمین اور برطانوی سرزمین کا فرق بھی اس معاملے میں محسوس نہیں کرسکتے، حالانکہ ایران کی نئی قیادت اب خود ایران میں اِن ریڈیکل اداؤں کا باب بند دیکھنا چاہتی ہے، اور ادائیں ہی نہیں پسند آگئیں، بلکہ ایرانی ریڈیکلزم کی متابعت کا ایسا قلادہ انھوں نے اپنی گردن میں ڈال رکھا ہے کہ اسکے ٹیون (TUNE) کے بغیر وہ کوئی رقص نہیں کرسکتے اور اس کے ٹیون پر ہر رقص کے لئے آمادہ ہوسکتے ہیں۔ برطانیہ کے مسلم مسائل رُشدی کے قضیے سے پہلے بھی تھے، جن سے کبھی کلیم صاحب نے سروکار نہ رکھا، اور خود رُشدی کا قضیہ عین کلیم صاحب کی ناک کے نیچے ساڑھے چار ماہ سے چل رہا تھا، مگر اس میں بھی جب تک تہران سے سگنل نہ ہوا اُن کو اور اُن کے انسٹی ٹیوٹ کو خبر تک نہ ہوئی، اور جب سگنل ہوگیا، تو قتل و قتال تک کو بھی آمادہ ہوگئے۔

اسکے علاوہ ایک ایسی قیادت کی خطرناکی کا کیا اندازہ ٹھہرایا جاسکتا ہے جس کی نظر اپنے عمل کا رُخ اور انداز متعین کرنے کے لئے برٹش میڈیا کی توجہ اور ہلے توجہی پر رہتی ہو، اپنی متشاورتی کانفرنس "کلیم" کا "کانفرنس آف برٹش مسلمز" کا مجوزہ نام چھوڑ کر "مسلم پارلیمنٹ" کا عنوان اختیار

کرنے کے سلسلے میں کلیم صاحب خود اقرار کر چکے ہیں کہ جب ہماری مجوّزہ کونسل کو میڈیا نے پارلیمنٹ کا نام دینا شروع کیا تو ہمیں اندازہ ہوا کہ اس نام کے ساتھ ہماری کارروائیوں کا زیادہ نوٹس لیا جائے گا، اس لئے یہ نام ہم نے قبول کرلیا ـــــ برٹش قوم اور برٹش میڈیا کو دن رات خالص "خمینی" اسٹائل میں اسلام دشمن اور مسلم دشمن گرداننا، مگر پبلسٹی فیور (FAVOUR) حاصل کرنے کیلئے اس کی پسند کا پوز دینا۔ کم از کم برطانیہ میں تو ایک مسلم قیادت کیلئے اس سے بڑھ کر خطرناک کمزوری مشکل ہی سے کوئی دوسری ہو سکتی ہے؟

ڈاکٹر کلیم صدیقی میں اگر یہ تین کمزوریاں نہ ہوتیں، جن کا اوپر ذکر کیا گیا، تو برطانوی مسلمانوں کے جس حلقے نے بھی انھیں اپنا لیڈر مانا تھا اُس کو واقعی ایک اچھا لیڈر پانے کے لئے مبارکباد دی جا سکتی تھی ـــ لیکن اگر یہ نہیں دی جا سکتی تو اس میں قصور ڈاکٹر صاحب کا نہیں اپنی مسلمان قوم کا ہے۔ قوم اگر مسلم مسائل میں ڈاکٹر صاحب کی سرپرستی اور رہنمائی قبول کرنے سے پہلے اس ضروری سوال کا بھی کوئی اطمینان بخش جواب اُن سے لینے کی ضرورت نہیں سمجھتی کہ دوسرے مسائل تو درکنار رُشدی کے جیسے قیامت خیز مسئلے میں بھی آپ اس وقت تک برطانوی مسلمانوں سے کیوں کر بے تعلق رہ سکے جب تک ایران سے سگنل نہ مل گیا؟ تو ظاہر ہے کہ اُسے ڈاکٹر صاحب سے زیادہ اچھے لیڈر کی بازیافت ہو بھی نہیں سکتی۔

اور یہ ڈاکٹر صاحب کی سرپرستی کا قصہ تو پھر بھی ایک چھوٹا قصہ ہے۔ ہمارا حال تو جذباتی معاملات میں فہم و فکر کے تقاضوں سے بے اعتنائی میں اس درجے کو پہنچا ہوا ہے کہ افغانستان میں جہاد کا علم بلند ہوا اور اس کا مقصد کمیونسٹ حکومت کو ہٹا کر ایک خالص اسلامی حکومت کا قیام ٹھیرا۔ مگر جب اس جہادِ اسلامی کو امریکہ نے اپنے ایک مقصد (روس کی روسیاہی) کے لئے استعمال کرنے اور اس کے بعد مجاہدین کا مقصد ہرگز پورا نہ ہونے دینے کا منصوبہ باندھ کر اِن مجاہدین کی طرف "دامے، درمے، قدمے، سخنے" مددگاری اور سرپرستی کا ہاتھ بڑھایا جن کے اپنے وسائل روس سے نبرد آزما ہونے کے ہرگز نہ تھے، تو جوشِ جہاد میں مجاہدین کے تمام

گروپوں میں سے کسی ایک گروپ کی بابت بھی تو سننے میں نہ آیا کہ اُسے اسلامی حکومت کے لئے جہاد اور امریکہ کی سرپرستی میں کوئی تضاد نظر آیا ہو! ہاں اب جب اس تضاد نے اپنے طبعی نتائج بھی سامنے لاکر رکھدیئے تو ہمیں کچھ سمجھ تو آئی، مگر افسوس کہ اب بھی ملامت کا نشانہ اپنے بجائے امریکہ ہے ـــــ ظاہر ہے کہ امریکہ کی سرپرستی قبول کرنے کے مقابلے میں کلیم صدیقی صاحب کی سرپرستی قبول کرنے کا معاملہ یقیناً بہت چھوٹا ہے، اور کم از کم برطانیہ کے اُن مسلمانوں کو اِس پر اعتراض نہ ہونا چاہیئے جو اُس سرپرستی پر راضی رہے اور آخر تک اچھے نتائج کی امید لگائے رہے۔

خدا ہماری مدد فرمائے اور ٹھنڈی سمجھ سے نوازے۔ آمین

باقی صـ۱۹ کا

حضرت معاویہؓ کے خلیفہ بننے کا کوئی جواز نہیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت علی کا علم و تقویٰ، ان کا زہد و ورع، اور ان کی شجاعت و مردانگی، معروف و مسلّم چیز تھی، سبھی لوگ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی طرح حضرت علیؓ کے بھی معترف تھے۔ نیز حضرت عمرؓ کے نامزد کئے ہوئے اہلِ شوریٰ میں سے (کہ جن کو حضرت عمرؓ نے اپنے بعد خلافت کا اہل قرار دیا تھا۔)

سوائے حضرت علیؓ اور حضرت سعدؓ کے کوئی باقی نہیں رہا تھا، اور حضرت سعدؓ پہلے ہی یکسو ہو چکے تھے، لہٰذا حضرت عثمانؓ کے بعد خلافت کے حقدار بلاشبہ حضرت علیؓ ہی تھے، لیکن سارا فساد اصل میں حضرت عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت کی وجہ سے ہوا، جس کے نتیجہ میں اہلِ علم و ایمان کے مقابلہ میں ظلم و زیادتی والے طاقتور ہو گئے، اور ایسا انتشار ہوا کہ جن کی اطاعت زیادہ کی جانی چاہیئے تھی، وہ ماننے والوں کے لئے ترس گئے، اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اجتماعیت و اتحاد پر بہت زور دیا ہے، اور انتشار و تفرقہ سے منع فرمایا ہے اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ: اجتماعیت میں اگر کوئی نقصان بھی نظر آئے تو اُس "فائدہ" پر قابل ترجیح سمجھا ہوگا جو اختلافات کی صورت میں متوقع ہو۔

یادرفتگاں

از مولانا ماجد مسعود شمیم
مدرسہ صولتیہ، مکہ مکرمہ

مولانا عبدالملک مرادآبادی مہاجر مدنی
رحمۃ اللہ علیہ

[مولانا عبدالملک مرادآبادی مہاجر مدنی گزشتہ صدی کی متبرک یادگار تھے، گوناگوں اوصاف وکمالات کے حامل سنجیدگی ومتانت اور سادگی ومسکنت کا نمونہ، اہل علم وفضل کے قدرداں، چھوٹوں پر شفیق ومہربان۔

ایک سال پہلے (رمضان ۱۴۱۱ھ میں) انھوں نے عالم آخرت کی طرف کوچ کیا تھا، الفرقان کے ذمّے ان کا ذکرِ خیر قرض تھا کہ اس الفرقان اور صاحبِ الفرقان (حضرت مولانا نعمانی مدظلہ) سے بڑا تعلق خاطر تھا۔

مدیر الفرقان شکر گذار ہے مولانا ماجد مسعود شمیم نائب مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کا کہ انھوں نے مولانا عبدالملک صاحبؒ پر اپنے مضمون کی اشاعت کے لئے الفرقان کا انتخاب کیا، اور اس طرح اس قرض کی ادائیگی میں معاون ہے۔ ہاں! اس کا افسوس ہے کہ فاضل مضمون نگار کے والد ماجد اور ہم بہت لوگوں کے محترم جناب مولانا مسعود شمیم صاحب جنھیں خود اس مضمون کی اشاعت سے بہت دلچسپی تھی، خود ماہ شعبان (فروری) میں اچانک اللہ کو پیارے ہو گئے۔ کیا خبر تھی کہ الفرقان کے جس شمارہ میں یہ مضمون چھپے گا اسی میں خود انکی وفات حسرت آیات کی خبر بھی چھپے گی یہی ہے۔ کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام ——— مدیر]

خطاط زادہ مولانا محمد عبدالملک فرزند مولوی محمد عبدالقیوم خاں مرادآبادی مہاجر مدنی جامعی کی پیدائش شہر مرادآباد میں اکتوبر ۱۹۱۲ء میں ہوئی، ابتدائی تعلیم شہر بجنور میں حاصل کی۔ اساتذہ میں مولانا قاضی عدیل عباسی، مولانا امین احسن اصلاحی اور ملک نصر اللہ خاں عزیز کا شمار ہے۔ خوشنویسی اور خطاطی کی تکمیل سب سے پہلے اپنے والد بزرگوار اور جناب منشی علی حسن جونپوری اور جناب منشی محمد قاسم لدھیانوی سے ۱۹۲۵ء میں کی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے بی اے پاس کیا۔

خصوصی استفادہ ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر سید عابد حسین، ڈاکٹر سعید انصاری اور منشی علی محمد خاں فرخ آبادی وغیرہ جیسے حضرات سے کرتے رہے، ۱۹۳۳ء میں سیرت پاک کی عالمگیریت کے مضمون پر آل انڈیا تحریری مقابلہ میں اول انعام مدراس سے حاصل کیا۔ پھر ۱۹۳۴ء میں "مسلمانوں کا زوال اور اس کا علاج" موضوع پر آل انڈیا تحریری مقابلہ میں حیدرآباد سے اول انعام حاصل کیا ۱۹۳۳ء میں اپنی پہلی تصنیف "خطبۂ صدارت بزم اردو جامعہ ملیہ دہلی" شائع کی ۱۹۳۱ء میں جامعہ ملیہ میں تبلیغی کام کے لئے اکابر مرکز نظام الدین نے مولانا کو منتخب کیا، ملازمت کے میدان میں ۱۹۳۸ء میں قدم رکھا تو ڈپٹی ڈائرکٹر ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ دہلی کے عہدہ پر ۱۹۴۶ء تک فائز رہے، ۱۹۳۹ء میں تحریک ہجرت ثانیہ کی امارت مولانا کے حصہ میں آئی ۱۹۴۶ء میں اخبار زمزم لاہور کی ادارت بھی ملی۔

میرے والد محترم مولانا محمد مسعود شمیم صاحب فرماتے ہیں کہ جب عالمگیر جنگ کے ہنگامی زمانہ ۱۹۴۰ء میں حضرت مولانا محمد سلیم صاحبؒ نے قرولباغ دہلی میں دارالعلوم حرم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کا دفتر قائم کیا تو وہیں برابر میں فیض روڈ پر بالکل قریب حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کا مشہور زمانہ ادارہ "دارالمصنفین" بھی قائم تھا، جہاں سے نہایت وقیع اور اہم کتابوں کی اشاعت کے ساتھ رسالہ "برہان" بھی نکلتا تھا۔ مولوی عبدالملک کے والد مولوی عبدالقیوم خاں صاحبؒ ندوۃ المصنفین میں کاتب اور خطاط تھے، بیحد نازک مزاج پاکیزہ اور خوش رقم خطاطی فرماتے، نہایت خاموش معصوم شکل و صورت نورانی چہرہ اور مودب انداز رکھتے تھے، کارکنان ندوۃ المصنفین جس میں مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحبؒ کے علاوہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مرحوم قابل ذکر ہیں، مولوی عبدالقیوم صاحبؒ کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے، ان کو ادارہ کا خادم یا محض کاتب ہی نہیں بلکہ اپنا ایک رفیق عزیز اور محترم ساتھی تصور کرتے تھے، اسی زمانہ میں مرکز نظام الدین دہلی سے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی سرگرمیوں اور تبلیغی کام کی وسعت و پھیلاؤ کے ضمن میں قرولباغ کی دلکش و خوبصورت

مسجد میں جماعتیں آنے لگیں تو مولوی عبدالملک صاحب بھی نہایت سرگرمی کے ساتھ تبلیغی کام سے منسلک ہو چکے تھے اور اس عظیم بابرکت جدوجہد میں اپنے کو لگا چکے تھے۔

اپنے والد کے تعلق، مساجد میں تبلیغی اجتماعات، مولانا محمد سلیم صاحبؒ کی شخصیت مدرسہ صولتیہ کے دفتر کی اہمیت وہمہ گیری اور اپنے علمی و دینی مزاج وطبیعت کی بنا پر مولانا عبدالملک صاحب بھی کثرت سے مدرسہ کے دفتر میں آنے جانے لگے، اس وقت مولانا موصوف تیس ۳۰ سال سے کم عمر کے جوان رعنا تھے، دفتر مدرسہ میں چونکہ بلاد عربیہ واسلامیہ کے عربی جرائد ورسائل اور خاص طور پر مصر کے عربی اخبارات پابندی سے آتے تھے اس لئے مولانا عبدالملک بھی کثرت سے وہاں تشریف لانے لگے طبیعت میں چونکہ علم کی پیاس اور تحقیق وجستجو کا مادہ تھا، خود صاحب علم تھے اور بزرگوں کے زیر سایہ دینی وعلمی خدمات میں لگے بھی رہتے تھے اس لئے بہت غور وفکر سے کئی کئی گھنٹہ عربی اخبارات و رسائل کے مطالعہ میں وقت گذارتے، عربی سے اردو میں ترجمہ کا شوق پیدا ہوا تو پھر باقاعدہ حضرت مولانا محمد سلیم کے شاگرد ہو گئے، منتخب مضامین کے عربی سے اردو میں ترجمہ کرکے مولانا مرحوم سے اصلاح لیتے، ان کے تراجم اور عربی سے اردو میں منتقل شدہ مضامین، رسالہ ندائے حرم، برہان، رسالہ جامعہ اور پیام تعلیم وغیرہ میں شائع ہوتے۔

عالمی جنگ ختم ہوتے ہی برصغیر میں کانگریس ومسلم لیگ کا ٹکراؤ، پاکستان کا مطالبہ، بہار و کلکتہ میں مسلمانوں کا قتل عام مسلمانوں کو تباہ وبرباد اور ختم کرنے کے لئے انگریزوں کی پیدا کردہ صورتحال، مسلمان اداروں کی تباہی وبربادی اور نہ معلوم کیا کیا دیکھنے اور سننے کو ملا تو مولانا عبدالملک صاحب دل برداشتہ ہو کر ہجرت کی نیت سے حجاز مقدس آئے اور مکہ مکرمہ کی سکونت اختیار کی مدرسہ صولتیہ اور اس کی مسجد میں تقریباً تیس ۳۰ سال تک تبلیغی مرکز قائم رہا اس لئے تمام تبلیغی احباب کی رہائش وسکونت اور قیام وطعام مدرسہ کی عمارتوں اور متعلقہ مکانات میں رہا، چوں کہ مولانا عبدالملک صاحب کو بہت عرصہ قبل سے ایک خاص تعلق حضرت مولانا محمد سلیم سے تھا اس لئے یہاں کے قیام سے وہ تعلق اور زیادہ مستحکم ہوا، جو وقت بھی ملتا، مدرسہ کے

کتب خانہ میں گذارتے' ان کی تمام تصانیف جو انھوں نے قیام حرم کے زمانہ میں مکمل کی ہیں مدرسہ کا کتب خانہ اس کا مرجع و ماخذ رہا، مولانا محمد سلیم صاحبؒ کی وفات پر مولانا عبدالملک نے دو طویل تعزیتی مضامین صدق میں شائع فرمائے تھے، مکہ مکرمہ میں تبلیغی کام سے وابستگی مزید بڑھ گئی، اندرون و بیرون حجاز متعدد تبلیغی اسفار کئے، ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۳ء تک برما، ملایا، انڈونیشیا، تھائی لینڈ، سیلون اور حضرموت کے اسفار اسی سلسلہ میں ہوئے، مکہ مکرمہ کے بعد مدینہ منورہ کا قصد فرمایا اور وہاں تا وفات مقیم رہے اور انہی سرگرمیوں میں اپنے کو لگائے رکھا۔

مدینہ منورہ کی اکثر تعلیمی ثقافتی ادبی تبلیغی سرگرمیوں میں پیش پیش رہے' وہاں اردو ادب وشعر کے ارتقا کے سلسلہ میں اہل اردو نے "حلقہ ثقافیہ اردو" کا ۱۹۶۲ء میں اجرا کیا جس کے مولانا اہم رکن تھے، ۱۳۸۵ھ میں سید احمد مدنی شاعر نے "بزم اردو" کا سلسلہ قائم کیا جس کے مولانا اول فرد تھے اور بزم کی نگرانی پر ۱۹۶۶ء میں فائز ہوئے، ۱۹۶۹ء میں "مولانا محمد علی اکیڈمی" قائم کی۔ مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت نے آپ پر بہت اثر ڈالا اور اُن کے خیالات وافکار سے کافی متأثر تھے، مولانا محمد علی کی معیت اور خدمت بھی حاصل رہی۔ اس فہرست رفاقت و خدمت میں حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی' مولانا شوکت علی اور مولانا سید محمود احمد مدنی سرفہرست ہیں۔ مولانا محمد سلیم صاحبؒ کی سفارش اور انتخاب پر جناب یوسف سیٹھی وغیرہ حضرات نے مدینہ منورہ کی جماعت تحفیظ القرآن الکریم الخیریہ الاہلیہ کے مدارس و مکاتب کی جماعت عاملہ میں مولانا عبدالملک کو داخل کیا، ۱۹۶۲ء میں نگران و مراقب مقرر ہوئے اور تدریس قرآن شریف میں کافی وقت گذارا۔ اور مدینہ پاک میں مدارس و مکاتب قرآنیہ کے ذمہ دار رہے۔

شرف بیعت وارادت مولانا ابوسعید احمد خاں کندیاں اور حضرت شاہ عبدالسلام ڈھاکہ والوں سے رہا، اردو فارسی عربی پر کافی عبور تھا۔ تبلیغی اجتماعات اور جلسوں میں عربی اور اردو کی تقریریں بڑی منجھی اور مدلل ہوا کرتی تھیں، افہام وتفہیم کے انداز میں رُک رُک کر گفتگو فرماتے تھے، نہایت متواضع اور خوش اخلاق' عابد زاہد متقی شخصیت تھے، علماء سے رابطہ، اہل علم کی مجالس میں حاضری، اور اساتذہ شعروادب سے تعلق آپ کا خاص مشغلہ تھا۔ ہند اور پاکستان کے خاص خاص اخبارات وجرائد کو اپنے منتخب مقالات

سے نوازتے جن میں سرفہرست "سچ" اور "صدق" اور "صدق جدید" ہیں۔ خط بہت عمدہ تھا اور خوشنویسی میں ممتاز تھے، آپ کے پاس ذخیرۂ کتب تھا جس میں اکثر حصہ مولانا محمد علی جوہر مرحوم سے متعلق تھا، زندگی میں دو شادیاں کیں اور تمام بچیوں کو قرآن کریم کا حفظ کرایا۔

آخر عمر میں حضرت شیخ الحدیث کی کتب فضائل خاص طور پر فضائل صدقات اور حضرت مولانا علی میاں اور حضرت مولانا منظور نعمانی کی تصانیف زیر مطالعہ رہتیں۔ آخرالذکر دونوں بزرگوں سے بہت ہی گہرے تعلق و محبت کا اظہار فرماتے اور ان کے علمی مقام اور ہندوستان کے موجودہ حالات میں ان دونوں حضرات کے وجود کو بے حد سراہتے۔

عمر کے آخری حصہ میں متعدد عوارض جسمانی لاحق ہوئے کبھی صحت ہوتی تو پھر بیمار ہو جاتے، ۲۷ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ بروز جمعہ زیردستی ہسپتال سے گھر واپس آگئے غسل کیا اور نئے کپڑے تبدیل کر کے لیٹے تو ابدی نیند سو گئے، مبارک ساعت، مبارک دن، مبارک ماہ اور مبارک شہر کی سعادتیں حاصل ہوئیں، حرم نبوی میں نماز جنازہ ہوئی اور جنۃ البقیع میں ابدی آرامگاہ میسر آئی تقریباً اسی سال عمر پائی۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

مولانا کی سب سے آخری تصنیف "حجاز و ماورائے حجاز۔ جزیرۃ العرب کا ایک تفصیلی سفرنامہ" حصہ اول کے مقدمہ کی تاریخ، صفر ۱۳۹۹ھ ہے۔ اس کا موضوع حج کی کہانیوں کے ذریعہ تاریخ، جغرافیہ ثقافت کی تعلیم ہے جس کے لئے انداز کو سادہ اور زبان کو آسان رکھنے کی کوشش کی ہے' مولانا تحریر فرماتے ہیں "اس سلسلہ میں یہ میری آخری شاید نہ ہو مگر تازہ ترین تحریر ہے"۔۔ اسکے بعد کوئی تصنیف منظر عام پر نہیں آئی۔

مدرسہ صولتیہ کی سالانہ روئیداد "زبانِ حال" بابت ۱۴۰۵ھ کے صفحہ ۵ پر مندرجۂ ذیل مضمون حضرت مولانا محمد مسعود شمیم کے قلم سے ملاحظہ ہو:۔

"عطیۂ کتب" مدینہ منورہ میں جناب الحاج مولانا عبدالملک صاحب مرادآبادی ثم مدنی طبقۂ خواص اور اہل علم کی معروف شخصیت ہیں، دیارِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں قیام کی

سعادت کے ساتھ وہاں کے مدارس قرآن کے نگراں بھی ہیں متعدد دینی و علمی تصانیف آپ کے قلم سے نکل چکی ہیں جو ندرت موضوع کی بنا پر اپنی جگہ منفرد ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر کی ذات سے بیحد قلبی ارتباط اور تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے متعلق وسیع و عمیق مطالعہ و تحقیق کے مالک ہیں مولانا عبدالماجد دریابادی علیہ الرحمۃ کے اخبار "صدق" لکھنؤ میں اکثر و بیشتر آپ کے وقیع اور پُر از معلومات مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ چونکہ چشم بد دور رہبر صاحب علم و قلم کے پاس کتابوں کا ایک معتد بہ ذخیرہ ہونا لازمی ہے اسلئے مولانا موصوف بھی اس وبال دوش ہیں با حسن وجوہ دبے ہوئے تھے۔ مدرسہ صولتیہ سے مولانا موصوف کو جو قلبی تعلق ہمیشہ رہا اس کی بنا پر اور دیار نبوی میں زندگی کے تقریباً چالیس سال گذارنے کے بعد مولانا موصوف نے اپنی صائب رائے اور قلبی داعیہ کی بنا پر اپنی تقریباً دو سو اردو کتابوں اور رسائل و مجلات کا نہایت بیش قدر ذخیرہ دارالعلوم حرم صولتیہ کے کتب خانہ کو عطا فرمایا۔ یہ کتابیں زیادہ تر مولانا محمد علی جوہر سے متعلق ہیں اور مولانا عبدالملک صاحب کے خاص زاویۂ فکر کی ترجمان ہیں۔ اسلئے انکو علیحدہ مستقل الماریوں میں محفوظ کیا گیا ہے مولانا عبدالملک صاحب عام رسمی شکریہ سے زیادہ اہل مدرسہ اور اہلِ علم کی دعاؤں کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر اپنی زندگی کے اس علمی سرمایہ کو متلاشیانِ معرفت کیلئے محفوظ کردیا۔ دعا ہے کہ رب العالمین اس ایثار کو مولانا موصوف کیلئے صدقۂ جاریہ فرمائے اور اہلِ علم کا اس سے استفادہ مولانا کے لئے صدقۂ جاریہ ثابت ہو۔" آمین ———

یہ مضمون ۱۴۰۵ھ کا لکھا ہوا ہے جس کے چھ سال بعد مولانا عبدالملک صاحب انتقال کر گئے، مولانا سے متعلق یہ معلومات میں نے خود اُن سے حاصل کی تھیں اور میرے مشاہدہ میں جو حالات آئے وہ مرتب کر کے پیش کر دیئے۔ اس سلسلہ کی ایک خاص قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ہند و پاک کے تقریباً تمام اہلِ علم و فضل سے مولانا کے مراسم و تعلقات اور ان کے ساتھ سلسلہ مکاتبت تھا۔ مولانا افتخار فریدی صاحب کے پاس مراد آباد میں مولانا مرحوم کے تقریباً ایک سو مکاتیب و خطوط علمی و دینی و اسلامی

وتبلیغی مضامین وموضوعات پر موجود ہیں جن کا مولانا فریدی صاحب اشاعت کا داعیہ رکھتے ہیں۔ خدا کرے کہ مردے از غیب بروں آید وکارے کند، یہ نادر علمی ذخیرہ کسی طرح اشاعت پذیر ہو کر منظر عام پر آجائے جو علمی ودینی لٹریچر میں ایک وقیع واہم اضافہ ہوگا ــــ مولانا افتخار فریدی صاحب اسکے لئے بڑا درد اور داعیہ رکھتے ہیں ــــ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ

الفرقان کے اکثر قارئین کو محدث کبیر استاذ العلماء حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ کے حادثۂ انتقال کی اطلاع مل چکی ہوگی حضرت مولانا اعظمی عصر حاضر کے علماء حدیث میں نہایت بلند مقام رکھتے تھے، عالم اسلام میں انکو امام حدیث اور کبیر المحدثین کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے، والد ماجد (حضرت مولانا نعمانی مدظلہٗ نے) جنھیں اُن سے شرف تلمذ بھی حاصل ہے انکے بارے میں کچھ لکھوایا ہے، جو انشاء اللہ آئندہ شمارہ میں پیش کیا جائے گا سر دست تو اس حادثہ کی اطلاع اور دعائے مغفرت ورحمت کی استدعا ہی کرنی ہے ــ کہ صالحین کیلئے دعاؤں کا اہتمام خود اپنے لئے نفع مند ہوتا ہے۔

مولانا مسعود شمیم مکیؒ

الفرقان کے اکثر قارئین مکہ مکرمہ کے مشہور مدرسہ صولتیہ کے مہتمم، مولانا مسعود شمیم مکیؒ سے واقف ہونگے، برصغیر کا دینی وعلمی حلقہ تو بخوبی متعارف ہے۔ ۲۶ شعبان ۱۴۱۲ھ ۲۹ فروری ۱۹۹۲ء کا دن گذار کر کے مکہ مکرمہ میں اپنے مکان میں رات کے آرام کیلئے بستر پر دراز ہوئے، اور صبح جو جگانے کی کوشش کی گئی تو پتہ چلا کہ وہ تو ابدی نیند سو چکے ہیں اللھم اغفرلہ وارحمہ۔ الفرقان اور حسّا الفرقان ہی نہیں برصغیر اور یہاں کے بیشتر علمی دینی اداروں اور اہل علم وفضل سے انکے تعلق کا حق ہے کہ ان کا تفصیلی تذکرہ الفرقان میں شائع ہو، خدا کرے کہ جلد ہم یہ فرض ادا کر سکیں ــــ انکے صاحبزادگان واہل تعلق سے راقم الحروف تعزیت کے ساتھ یہ درخواست بھی کرتا ہے کہ مولانا مرحوم کے تذکرہ کیلئے الفرقان کے صفحات حاضر ہیں۔

مولانا عبد الاوّل فاروقیؒ

امام اہلسنت حضرت مولانا عبد الشکور فاروقیؒ کے نام نامی سے ہند وپاک کا کون پڑھا لکھا مسلمان ناواقف ہوگا، مولانا عبد الاول فاروقیؒ آپکے پوتے تھے، اور انکے علم کے وارث، تقویٰ، پاکیازی اور

الفرقان کی ڈاک

مکرمی و محترمی ایڈیٹر صاحب

سلام مسنون۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا.....

شیخ المشائخ قطب دوراں حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا میں بھانجہ اور داماد ہوں بچپن سے جب سے شعور جاگا ہے میں انکی صحبتوں میں بیٹھا ہوں اور جوتیاں سیدھی کرنے کا شرف مجھے حاصل رہا ہے۔ اُن دنوں کی بات ہے جب حضرت کا قیام پھولپور میں رہا کرتا تھا میں برابر انکے یہاں الفرقان کا رسالہ دیکھا کرتا تھا اور اپنے شعور کے مطابق پڑھنے کا بھی اتفاق رہا کرتا تھا۔ اور میں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ حضرت اپنے قرب و جوار کے تمام معتقدین و مریدین کے نام الفرقان جاری کرا دیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ ایک دینی خدمت ہے، اور حضرت مولانا منظور نعمانی صاحب دامت برکاتہم سے انکے ذاتی تعلقات خلوص و محبت کے روابط ہیں۔

الہ آباد میں محترم ڈاکٹر ابرار احمد صاحب کے یہاں جب قیام رہا تو دو تین سال قبل انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ "حبیب میاں" تم الفرقان کی ممبری کیلئے لوگوں کو متوجہ کرو، لہذا میں نے گیارہ افراد جس میں ایک یہ ناچیز بھی شامل ہے، کا چندہ اکٹھا کرکے حضرت رح کو سپرد کر دیا انھوں نے حضرت مولانا منظور نعمانی صاحب دامت برکاتہم کے نام ایک خط لکھ کر میرے صاحبزادے ڈاکٹر اختر حبیب سلمہ کے ذریعہ بھیجا حضرت مولانا بہت خوش ہوئے اور بہت دعائیں دیں۔ اور وہ رسالہ جاری ہو گئے میرے پاس برابر پہونچ رہے ہیں۔

انتقال کے قبل صبح انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ بیٹا ایک مرتبہ تم اور کوشش کرو کہ الفرقان زیادہ سے زیادہ لوگ منگانے پر آمادہ ہو جائیں۔

انکی زندگی ہی میں بہت لوگوں نے مجھ سے وعدہ کر لیا۔ مگر میں انکی آخری کوشش و خواہش میں زیادہ کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔ صرف دو آدمیوں کی رقم چیک پیش کر رہا ہوں نیز میں نے پونا، بمبئی، الہ آباد، رائے بریلی وغیرہ جہاں جہاں میرے اور حضرت رح کے تعلقات ہیں میں نے لوگوں سے وعدے لئے ہیں انشاء اللہ کوشش کر کے زیادہ سے زیادہ ممبر بنانے کی سعی کروں گا۔ اللہ مدد فرمائے۔

حضرت مولانا منظور نعمانی صاحب سے مجھے بچپن ہی سے تعلق رہا ہے۔ آنکی خدمت میں دست بستہ سلام

اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حضرت کو تا دیر قائم رکھے اور تشنگانِ دین و ایمان انکی ایمان افروز تصنیفات سے استفادہ کرتے رہیں۔

میں نے حضرت مولانا شاہ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک "نذرانہ عقیدت" کے عنوان سے چند اشعار لکھے تھے وہ پیش خدمت ہے۔ حضرت والا اسے بیحد پسند فرماتے تھے اور دو شعر کے لئے بیحد پسندیدگی کا اظہار فرمایا کرتے تھے، مگر اس میں کا ایک شعر ایسا ہے کہ فرماتے تھے اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل پر یہ منکشف کرا دیا ہے اور کھول دیا ہے کہ میری زندگی بچپن سے ابتک کیسے گذر رہی ہے۔ میں کس عالم میں رہتا ہوں کسی کو اس کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ فرماتے تھے کہ میں انگاروں پر لوٹتا ہوں۔ بےچین رہتا ہوں کوئی ایسا لمحہ نہیں ہوتا کہ میں عالم اسلام کیلئے اور بیت المقدس کے لئے دعا نہ کرتا ہوں۔ لوگ آرام کی نیند سوتے ہیں۔ اور کم سے کم اتنا تو کریں کہ دعا ہی کر لیا کریں۔

نذرانۂ عقیدت

ساقی تری نظروں نے وہ جام پلائے ہیں — بھٹکے ہوئے دیوانے بھی ہوش میں آئے ہیں
قربت میں تری ہم نے جو لطف اٹھائے ہیں — ابتک انھیں یادوں کو سینے سے لگائے ہیں
پاکیزہ تبسم کے موتی جو لٹائے ہیں — ہم نے وہ عقیدت سے دامن میں اٹھائے ہیں
کردار کی عظمت سے گفتار کے جادو سے — دشمن کو بھی وہ اپنا گرویدہ بنائے ہیں
*جو دل پہ گذرتی ہے دنیا اسے کیا جانے — غم اپنا تبسم کے پردے میں چھپائے ہیں
ظلماتِ شبِ غم کا شکوہ وہ نہیں کرتے — جو دل میں محبت کے فانوس جلائے ہیں

ہم اُن کی توجہ کے قابل تو نہیں رہبر
نذرانۂ دل لے کر ہم شوق سے آئے ہیں

حبیب رہبر پرتاپگڈھی
بیت الحبیب۔ کریلی اسکیم الٰہ آباد

*۔ اسی شعر کے متعلق فرماتے تھے کہ میری زندگی کا یہی حال رہا ہے اور میں تنہائی میں اس شعر کو پڑھ کر روتا ہوں۔ اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو میں تم کو اس کی قیمت ایک لاکھ روپیہ دیتا۔

جلد ۶۰ | مئی، جون ۱۹۹۲ء مطابق ذی قعدہ، ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ | شمارہ ۵-۶

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

خصوصی اشاعت

سرپرست
حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

مدیر
خلیل الرحمن سجاد ندوی

سالانہ چندہ برائے ہندوستان
عام -/۶۰
اعزازی -/۱۲۰
لائف ممبری -/۲۰۰۰

پاکستان و بیرونی ممالک کے حضرات صفحہ ۱۴۸ ملاحظہ فرمائیں

فی شمارے کی قیمت
۱۵ روپے

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے آپ کی خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی روانہ کیا جائے گا۔ منیجر

دفتر ماہنامہ الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی نظیر آباد لکھنؤ

فہرست مضامین

صفحہ	مضامین نگار	مضامین	نمبر شمار
۳	مدیر	نگاہِ اوّلین	۱-
۱۳	مولانا عتیق الرحمن سنبھلی	مجھے ہے حکم اذاں لاالٰہ الا اللہ...	۲-
۲۹	مولانا عبداللہ عبّاس ندوی	ضمیمہ ۱ "واقعۂ کربلا..." پر تبصرہ	۳-
۳۹	مولانا عتیق الرحمن سنبھلی	ضمیمہ ۲ مکتوب بنام مولانا عبداللہ عباس ندوی..	۴-
۴۲		ضمیمہ ۳ مراسلہ بنام ایڈیٹر صاحب تعمیر حیات	۵-
۴۶	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	ضمیمہ ۴ ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں کا صحابۂ کرام کے بارے میں مسلک و عقیدہ	۶-
۵۰	مولانا عتیق الرحمن سنبھلی	زاغوں کے تصرف میں عقابوں کا نشیمن..	۷-
۱۰۴	ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی	واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر ایک تبصرہ کا تجزیہ	۸-
۱۲۰	مولانا مفتی عبدالقدوس رومی مولانا منظور احمد صاحب جناب علی مبارک عثمانی	الفرقان کی ڈاک	۹-

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:- ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور

برطانیہ میں ترسیل زر کا پتہ:- Mr. R. RAHMAN

90-B, HANLEY ROAD LONDON N4 3DW

محمد حسّان نعمانی پرنٹر پبلشر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی نظیر آباد لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

برادرِ معظم مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے اپنی کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" کے مقدمے میں مومن کی ذمہ داری کے زیرِ عنوان لکھا تھا:

"یزید سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں اور اگر ہے تو پہلے حضرت حسین سے ہے۔ حضرت معاویہ سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں، اور اگر ہے تو پہلے حضرت علی سے ہے۔ مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی ذاتِ اقدس کی طرف یہ تمام رشتہ داریاں لوٹتی ہیں ان کی مبارک تعلیم نے ہمارا رشتہ سب سے پہلے حق اور صداقت کے ساتھ قائم کر دیا ہے، باقی تمام رشتہ داریوں کا درجہ اس کے بعد رکھا ہے۔"

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ	اے ایمان والو مضبوط کھڑے ہو انصاف
بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى	کے ساتھ گواہ بن کر اللہ کے۔ اگرچہ گواہی
اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ	تمھارے اپنے خلاف ہو، یا تمھارے
(سورۂ نساء۔ آیت۔ ۱۳۵)	والدین اور رشتہ داروں کے خلاف ہو۔
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ	اے ایمان والو کھڑے ہو مضبوط اللہ
لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ	کے لیے انصاف کے گواہ بن کر۔ اور کسی

شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعۡدِلُوۡا ــ قوم کی دشمنی تمھیں بے انصافی پر آمادہ
اِعۡدِلُوۡا هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی ــ نہ کرے انصاف ہی کرو کہ یہ قرینِ تقوی ہے۔

اسلام کی اس واضح اور صریح تعلیم کو دھیان میں رکھتے ہوئے ہمیں تو اس کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ یزید کے لیے اور حضرت حسین کے لیے ہمارے پاس الگ الگ ترازو اور الگ الگ باٹ ہوں۔

العین تدمع والقلب یحزن ــ آنکھوں میں نم ہے اور دل میں غم، مگر
ولا نقول الا ما یرضی بہ ربنا ــ زبان سے بس وہی کہیں گے جو ہمارے رب کو پسند ہے۔

جس وقت یہ سطریں لکھی گئی تھیں اس وقت کسے خبر تھی کہ بہت جلد قدرت کی طرف سے ایک میزان نصب ہونے والی ہے جس پر مذکورہ بالا تحریر کی روشنی میں ہم لوگوں کے اندرونی حال کی برسرِ عام جانچ ہو گی اور مومن کے معیار اور اس کی ذمہ داری کے بارے میں ہمارے اپنے "قال" کے آئینہ ہی میں ہمارے اپنے "حال" کو، یعنی ہمارے اپنے معیار کو، ہمارے احساسِ ذمہ داری اور حق و صداقت کے ساتھ ہمارے رشتے کو برسرِ عام ناپا جائے گا؟ ـــ اُس وقت کسے خبر تھی کہ اس آزمائش سے کامیاب گزرنے کے لئے ہمیں عنقریب اپنے خلاف اور ان لوگوں کے خلاف جو کم از کم ہم لوگوں کی نگاہ میں نسبی نہ سہی علمی و معنوی طور پر ہی سہی "والدین اور اقربین" کا درجہ رکھتے ہیں، برسرِ عام گواہی دینی پڑے گی اور آنکھوں میں نم اور دل میں غم کے ساتھ وہ کہنا پڑے گا جو کم از کم ہمارے علم و فہم کے مطابق ہمارے رب کو پسند ہے اور جس سے گریز اُسے ناپسند ہو گا۔

اب آئیے اس اجمال کی کچھ تفصیل سُن لیجئے۔

۶، ۷، مارچ کی بات ہے یہ سننے میں آیا کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے ترجمان پندرہ روزہ "تعمیرِ حیات" میں ادارہ الفرقان کی تازہ پیش کش واقعۂ کربلا پر تبصرہ کے ضمن میں صحابہ کرام کے پورے ایک اہم گروہ کے بارے میں نہایت گستاخانہ خیالات ظاہر کیے گئے ہیں۔

جن صاحب نے راقم السطور کو اس کی خبر دی، انھوں نے تبصرہ کے اس حصہ کے بارے میں

اپنا یہ تاثر بھی نقل کیا کہ "کوئی شیعہ بھی اس سے زیادہ گندہ تبرّا صحابہ پر کیا کرے گا؟"

ایک ندوی ہونے کے ناطے میرے ذہن نے اُن صاحب کی اس روایت کو مبالغہ ہی پر محمول کیا تھا اور اگلے دن جب تعمیر حیات کا وہ شمارہ ملا تو اسی امید کے ساتھ پڑھنے کے لیے ہاتھ میں لیا کہ یہ روایت غلط ہی ثابت ہوگی، لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا، وہ روایت بالکل صحیح اور اُن صاحب کا تاثر بالکل درست نکلا۔ واقعی تبصرہ ایسے ہفوات و شطحات پر مشتمل تھا کہ الامان الحفیظ! اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا کہ اور نہ کسی طرح یہ باور کرنے پر دل آمادہ تھا کہ اصحابِ رسول کے ایک پورے گروہ کے بارے میں یہ جملے واقعی ندوے کے معتمد تعلیم جناب مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی صاحب کے قلم سے نکلے ہیں اور ندوے ہی کے ترجمان تعمیر حیات میں ایک ایسے کالم میں چھپے ہیں جس میں اخبار اور ادارے ہی کا موقف شائع ہوتا ہے۔[1] (یاد رہے کہ مولانا عبداللہ عباس صاحب کا یہ مضمون کتاب پر تعمیر حیات کے تبصرہ کے طور پر شائع ہوا تھا اور کسی اخبار یا رسالہ میں کسی کتاب پر تبصرہ کو تبصرہ نگار کی ذاتی رائے نہیں بلکہ اس اخبار یا رسالہ کا سرکاری موقف سمجھا جاتا ہے۔ اِلّا یہ کہ اُس میں اِس کے خلاف کوئی صراحت موجود ہو۔) راقم الحروف کو ایک ندوی ہونے کے ناطے یہ سوچ کر مزید خفت محسوس ہو رہی تھی کہ ندوے کے دینی و علمی مزاج معیار کے بارے میں یوں ہی عام شہرت مستند دینی و علمی حلقوں میں جیسی کچھ ہے اُسے بتانے کی ضرورت نہیں۔ اب اس تبصرہ سے اس شہرتِ عام کی جیسی توثیق ہوگی، وہ بھی بالکل ظاہر ہے۔ خاص کر اس بنا پر کہ یہ تبصرہ ندوے کے کسی عام مدرس یا فاضل کا لکھا ہوا نہیں بلکہ ندوے کے نظام تعلیم و تربیت کے ذمہ دارِ اعلیٰ کا لکھا ہوا ہے، جس کے حوالے قوم نے اپنے ہزاروں نوجوان اُن کی سیرت سازی کے لیے کیے ہوئے ہیں! بہر حال شروع شروع میں تو طبیعت پر رنج والم اور خفت و ندامت جیسی کیفیات چھائی رہیں اور اس کے بعد اس سوچ کا مرحلہ شروع ہوا کہ کیا کیا جائے؟

---

[1] بہتر ہوگا کہ ناظرینِ الفرقان آگے بڑھنے سے پہلے اسی مقام پر وہ پورا تبصرہ پڑھ لیں۔ ناظرین کی سہولت کے پیش نظر وہ تبصرہ بعینہٖ اسی شمارے میں شائع کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ ۱ صفحہ ۲۹

کتاب پر تبصرہ جس عجلت سے کیا گیا تھا اُس سے اور تبصرہ کے انداز سے تبصرہ نگار کے دل و دماغ کی جو کیفیت صاف ظاہر ہو رہی تھی، اللہ کا شکر ہے اور والد ماجد۔ اطال اللہ بقاءہ کے سایہ کی برکت کہ ہم لوگ اس کے ردِ عمل میں اُس قسم کی کسی کیفیت میں مبتلا نہیں ہوئے۔ اور مشورہ و غور و فکر کے بعد یہی طے پایا کہ اس کی بھرپور کوشش کی جائے کہ اس غلطی کا مناسب استدراک ارباب ندوہ ہی کی طرف سے ہو جائے اور کسی اور کو اس سلسلہ میں ایک لفظ بھی نہ بولنا پڑے، نیز یہ کہ کوشش کے علاوہ اس کے لئے دعاؤں کا زیادہ سے زیادہ اہتمام بھی کیا جائے۔ آئندہ صفحات میں آپ اِن کوششوں کی تفصیلات اور اُن کی ناکامی کی عبرتناک والمناک داستان پڑھیں گے۔ مختصراً یہاں اتنا سن لیجئے کہ اس سلسلہ میں دو خط تو خود بھائی صاحب (مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی) نے لکھے۔ ایک مولانا عبداللہ عباس صاحب کے نام اور دوسرا ایڈیٹر تعمیر حیات کے نام، اور دو خط والد ماجد مدظلہ نے حضرت مولانا علی میاں کے نام لکھے۔ بھائی صاحب کے خطوط "تعمیر حیات" میں اشاعت تو در کنار، جواب کے قابل بھی نہیں سمجھے گئے[1] والد ماجد مدظلہ کے خطوط کے جواب میں مولانائے مخدوم و محترم کی طرف سے جو خطوط موصول ہوئے اور ان کا جو ردِ عمل (RESPONSE) ہوا اس کی پوری تفصیل آئندہ صفحات میں آپ پڑھ ہی لیں گے۔ ہم اس بارے میں اپنا تاثر ابھی ظاہر نہ کریں تو بہتر ہے۔ صرف اتنا عرض کر دیں کہ ہم ابھی تک اس صدمہ (SHOCK) سے نکل نہیں پائے ہیں جو اس تجربہ سے ہمیں پہنچا ہے۔ اسے ہماری ناتجربہ کاری پر محمول کر لیجئے یا بھولے پن اور سادہ لوحی پر کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہمارے حضرت مولانا علی میاں توہین صحابہ بلکہ تکفیر صحابہ جیسے سنگین موضوع پر اس قدر بے اعتنائی اور بے نیازی کا رویہ برتیں گے کہ اُن کے ایک محبّ محترم و مخدوم اور دیرینہ رفیق و صدیق کے بار بار توجہ دلانے کے باوجود اُن کی زبان سے ایک جملہ بھی اس بارے میں سننے کو ہمارے کان ترس جائیں گے!! اور پھر

---

[1] یہ مضمون کتابت کے لئے بھیجا جا چکا تھا کہ آج ۵ مئی کو بھائی صاحب کو مولانا عبداللہ عباس صاحب کا جواب ملا ہے۔

اگر توجہ دلانے میں اُن کے وہ محب مخدوم و محترم تنہا ہوتے تو کم از کم ان لوگوں کے لئے جو ان کے مزاج سے زیادہ قریبی واقفیت نہیں رکھتے یہ گمان کرنے کی گنجائش تھی کہ تبصرہ کے بارے میں ان کے شدتِ احساس کا اصل سبب اُن کے بیٹے کی تصنیف کی توہین بنی ہوگی نہ کہ توہین صحابہ، مگر ہم یہ گمان کیسے کر لیتے کیونکہ ہمارا مشاہدہ تو یہ رہا کہ جس نے بھی تبصرہ پڑھا اس نے یہی تاثر لیا کہ اس میں صحابہ کرام کے ایک پورے اور اہم گروہ پر کھلا ہوا تبرّا کیا گیا ہے۔ ایسے متعدد لوگوں نے حضرت مولانا علی میاں کو اپنے تاثرات سے باخبر بھی کیا، (ان میں سے کئی حضرات نے از خود ہی اپنے خطوط کی نقلیں ادارہ الفرقان کو بھی بھیجیں جن میں سے دو تین خطوط آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ بھی فرمائیں گے) مگر ان سب کوششوں کا جو نتیجہ نکلا، وہ ہم لوگوں کے لیے کس قدر مایوس کن، اور ہمیں کیسی آزمائش میں ڈال دینے والا ثابت ہوا، سمجھ میں نہیں آرہا کہ ہم کن الفاظ میں بیان کریں کہ بات پوری ادا بھی ہو جائے اور بزرگوں کی شان میں کوئی ناروا گستاخی اور بے ادبی کا گناہ بھی ہم سے سرزد نہ ہونے پائے ___ کتنی آسان سی بات تھی چند سطروں پر مشتمل ایک بیان حضرت مولانا مدظلہ کا آجاتا کہ مولوی عبداللہ عباس صاحب کے مضمون میں صحابہ کرام کے ایک گروہ کے بارے میں جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں وہ غلط اور بے بنیاد ہیں۔ ہم اُن سے اظہار برأت کرتے ہیں ___ یا حضرت مولانا مدظلہ اپنے شاگرد مولانا عبداللہ عباس صاحب سے فرما دیتے کہ فوری طور پر اپنے تبصرہ کے اُس حصہ سے اپنی برأت اور معذرت خواہی پر مشتمل بیان دو۔ مگر ہوا کیا؟ صرف یہ کہ اُس مضمون کے اثر کو زائل کرنے کے لئے پہلے تو تعمیر حیات (۲۵ مارچ) میں حضرت مولانا مدظلہ نے اپنا ایک پرانا مضمون شائع کرایا جس میں مجموعی طور پر صحابہ کرام کے مرتبہ و مقام اور اُن کی شکل و وجود میں اعجاز نبوت پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ یہ مضمون پرانا تھا اور اس کا بڑا حصہ ایک کتاب کے مقدمے کے طور پر لکھا گیا تھا۔ اور اس قسم کے کسی تمہیدی نوٹ سے بھی خالی تھا جس سے اس کی دوبارہ اشاعت کی علت اور مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی والے مضمون کے سیاق سباق کی طرف اشارہ ہی ہو جاتا۔ پھر جب مختلف لوگوں کے ردعمل سے حضرت مولانا مدظلہ کو احساس ہوا کہ مسئلہ کو ٹال دینے کی یہ تدبیر کارگر نہیں ہوئی تو ایک دوسرا تازہ مضمون سپرد قلم فرمایا۔

جس کا عنوان تھا:

"ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں کا صحابہ کرام کے بارے میں مسلک و عقیدہ
صحابہ کرام کے تعارف اور ان کی سیر و سوانح کے سلسلے میں ندوۃ العلماء کے
سرپرستوں اور فضلاء کا امتیاز اور کارنامہ۔"

اس مضمون کی تمہید میں مولانا عبد اللہ عباس صاحب کے مضمون کے حوالے سے حضرت مولانا مدظلہ نے تحریر فرمایا۔

"مضمون میں حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے بارے میں بعض ایسے خیالات اور
تاریخی تجزیہ و تبصرہ آیا ہے جس سے ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں کے بارے میں
کچھ غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، اس لئے ندوۃ العلماء کے بانیوں، ذمہ داروں اور
کارکنوں کے بارے میں وضاحت کی ضرورت سمجھی گئی ہے، جو پیش نظر ہے۔"

آئندہ صفحات میں آپ یہ پورا مضمون خود پڑھیں گے اور پھر آپ خود ہی فیصلہ کر سکیں گے کہ کیا اس مضمون سے وہ ضرورت پوری ہوئی جس کی طرف ان کے بے شمار خیر خواہوں نے انھیں توجہ دلائی تھی اور اس کے جس حقیقت کے واضح تر اظہار پر مشتمل ہونے کی بات خود حضرت مولانا نے والد ماجد مدظلہ کے نام اپنے مکتوب میں فرمائی تھی، وہ "حقیقتِ منتظر" کیا وہی تھی جس کے حضرت مولانا کی طرف سے واضح تر اظہار کا انتظار کیا جا رہا تھا یا وہ کوئی اور حقیقت تھی جس کے اظہار کی سوائے خود حضرت مولانا کے کسی اور کو شاید ہی کوئی ضرورت محسوس ہوئی ہو، یعنی یہ کہ ندوۃ العلماء اور اس کے بانیوں اور ذمہ داروں کا وہی عقیدہ و مسلک ہے جو عام اہل سنت کا ہے ... اور یہ کہ صحابہ کرام کے تعارف اور ان کی سیر و سوانح کے سلسلہ میں ندوۃ العلماء نے بہت قابل قدر کام کیا ہے ...."

الفاظ کے درجۂ حرارت کا فلسفہ ہم نے حضرت مولانا مدظلہ ہی سے سنا تھا، اسی کی روشنی میں ان دونوں مضمونوں، یعنی مولانا عبد اللہ عباس صاحب اور حضرت مولانا مدظلہ کے مضمونوں کا درجۂ حرارت ناپا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نکلے گا ـــ یہ دونوں مضمون آپ الفرقان کے اسی شمارہ میں پڑھیں گے لہذا ان کے اقتباسات یہاں پیش کرنا بے ضرورت ہوگا۔ تاہم چند جملے تو سنتے ہی چلئے مولانا عبد اللہ صاحب فرماتے ہیں:

اسلام کے پورے طور پر فاتح ہو جانے کے بعد جب مقاومت کی تمام راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ اس عرصۂ مختصر میں اس گروہ کی طرف سے کسی واضح دشمنی کا ثبوت تاریخ میں نہیں ملتا ہے مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں میں شکست کا غم و غصہ آج تک موجود ہے۔ اسی طرح اس گروہ میں بدلے کے انتقام کا جذبہ سینہ کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت نے البتہ اسلام کی طرف سے ان کے عناد کو ختم کیا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اُن کا دل صاف نہیں ہوا۔ احمد امین نے فجر الاسلام اور اس کے مقدمہ میں طٰہٰ حسین نے اس کی نشان دہی کی ہے۔"

اب ذرا ان جملوں کے درجۂ حرارت کو ناپئے! اور پھر حضرت مولانا مدظلہٗ کے قلم سے نکلے ہوئے اُن جملوں کا درجۂ حرارت دیکھئے جو ابھی ہم نے نقل کئے ہیں۔ بلکہ احتیاطاً اُس پورے مضمون کا ہی درجۂ حرارت ناپ لیجئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ کیا کسی بھی پیمانے سے، اِس کو اُس کا "تریاق" یا "بدرقہ" قرار دیا جا سکتا ہے؟؟

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولانا مدظلہٗ کے اس مضمون اور اس کے بین السطور کو پڑھ کر جیسا شدید جھٹکا ہم لوگوں کو۔ جو ان کی جوتیوں میں جگہ مل جانے کو بھی باعث شرف سمجھتے رہے ہیں۔ لگا، وہ اس صدمہ سے کہیں زیادہ شدید تھا جو مولانا عبداللہ عباس صاحب کے خیالات جان کر ہمیں پہنچا تھا۔

ذہنی صدمے (SHOCK) کی اس کیفیت کی گرفت ہماری عقلوں پر جب کچھ ڈھیلی پڑی تو ایک سوال بڑی شدت سے ہم لوگوں کے ذہنوں میں ابھرا کہ آخر، صحابہ کرام کے ایک مخصوص گروہ کے بارے میں ایسے ناروا خیالات کے متعلق حضرت مولانا مدظلہٗ کی طرف سے ایسا ٹھنڈا ردِعمل کیوں ظاہر ہوا ہے، کیوں ایسا ہے کہ جس مضمون میں کھل کر صحابہ کرام کے ایک پورے گروہ کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس کا دل کبھی صاف نہیں ہوا، یہاں تک آپؐ کی وفات کے بعد بھی (پورے زمانۂ خلافت راشدہ میں) ان کے دل کی۔ معاذ اللہ یہی کیفیت رہی..... اُس کے بارے میں ان کے دل پر وہ چوٹ کیوں نہیں لگی جو بالکل عامی مسلمانوں کے دل پر لگی ہے اور اُس گروہ صحابہ کے دفاع میں ان کا وہ زورِ قلم کہاں چلا گیا جس پر اچھے اچھے اہلِ قلم

عش عش کر اٹھتے ہیں ـــــ ؟؟؟

اِن سوالوں کے جواب کی تلاش میں ایک طویل علمی سفر کرنا پڑا اور پھر ان کا جو جواب حضرت مولانا کی بے شمار نئی و پرانی تحریروں اور تقریروں کے از سرِ نو جائزہ سے ہمیں دریافت ہوا، اُس کی طرف آپ بھائی صاحب کے مضمون میں اشارہ پڑھیں گے۔ یہاں اس کے بارے میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اس تازہ دریافت نے ہم لوگوں کو حیرت و استعجاب کی منزل سے تو نکال دیا، البتہ سنی معاشرہ کے مختلف شعبوں، مثلاً مطالعۂ تاریخ طرزِ فکر، عقائد اور تصورِ دین کو شیعیت کے نہایت دور رس اور گہرے اور بسا اوقات مخفی اثرات سے پاک کرنے کے اس کام کو مستقل مزاجی کے ساتھ جاری رکھنے کی شدید ترین ضرورت کا سگنل بھی دے دیا جو ادارۂ الفرقان نے بنام خدا چھیڑ رکھا ہے اور جس سلسلہ کی تازہ ترین کاوش واقعۂ کربلا نامی کتاب کی شکل میں ظاہر ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی اہمیت کے ساتھ نوٹ کرنے کی ہے کہ اس کتاب کے بالکل شروع میں والد ماجد حضرت مولانا نعمانی مدظلہٗ نے سنی معاشرہ پر شیعیت کے اثرات کا تذکرہ اپنے گھر سے بلکہ اپنی ذات سے ہی چھیڑا تھا۔ انھوں نے اپنے مختصر سے ابتدائیہ میں اپنے مخصوص بے تکلف انداز میں اپنے گھرانے، اور خود اپنے ذہن پر شیعہ مذہب اور شیعی پروپگینڈے کے اثرات صاف صاف بیان کئے تھے اور اس سلسلہ میں کسی توجیہ، کسی تاویل کا سہارا لینے کے بجائے اپنے عام معمول کے مطابق صاف صاف اعتراف کا راستہ اختیار کیا تھا۔

پھر بھائی صاحب نے اپنے مقدمہ میں (ص۲۲ پر) "سنی معاشرے پر شیعیت کے اثرات" کی جب بات چھیڑی تو وہاں بھی مثال کے طور پر سب سے پہلے والد ماجد کے اسی بیان اور اعتراف کا حوالہ دینا انھوں نے مناسب سمجھا لہذا گزارش ہے کہ آئندہ صفحات میں جو لوگ ندوۃ العلماء کے کچھ ذمہ داروں اور کارکنوں کے بعض خیالات کا تجزیہ پڑھیں کہ ان میں شیعیت کی روح بولتی ہوئی نظر آرہی ہے ــــ وہ یاد رکھیں کہ اس تجزیہ کا آغاز خود اپنے ہی شیعیت زدہ افکار و خیالات کے حوالے اور اپنے ہی گھر میں رائج شیعی رسوم کے تذکرے سے کیا گیا تھا۔ فالحمد للہ الذی ھدانا لھذا

اور آخر میں ایک وضاحت اور....

یہ اشاعت، سابقہ پروگرام کے بغیر ایک خاص اشاعت بن گئی ہے چنانچہ اس میں کوئی اور مضمون شامل نہیں ہے۔ جب کہ بعض مضامین کی کتابت بھی کرالی گئی تھی۔ نگاہ اولیں کے صفحات میں ملکی وبین الاقوامی سطح پر ملتِ اسلامیہ کو درپیش موجودہ مسائل کے بارے میں کچھ لکھنے کا ارادہ تھا، خاص کر افغانستان کے بارے میں مگر پھر ارادہ بدل دینا پڑا۔ کیونکہ اس سے زیادہ اہمیت اور فوری توجہ کی چیز سامنے آگئی۔ اس لئے کہ :

"سیاسی طاقتیں، وقتی انقلابات، حکومتوں کا قیام وزوال موجیں ہیں جو آتی اور گزرجاتی ہیں، دریا اگر صحیح رُخ پر بہہ رہا ہے اور آب جاری ہے تو کوئی خطرہ نہیں، لیکن اگر عقیدہ میں فساد آگیا تو گویا دریا نے اپنا رُخ بدل دیا اور اس میں آبِ صافی کے بجائے گندلا اور ناصاف پانی بہنے لگا، اس لئے فساد عقیدہ اور زیغ وضلال کے ساتھ کوئی دعوت وتحریک... کسی معاشرہ کی جزئی اصلاح یا کسی فساد وخرابی کو دور کرنے کا دعویٰ یا عذر قبول نہیں کیا جاسکتا، یہ وہ حقیقت ہے جو اپنے اپنے دور کے علماء، خادمانِ دین اور محافظین شریعت وسنت کو اس دشوار اور بعض اوقات ناخوشگوار فرض ادا کرنے پر مجبور کرتی رہی ہے" [1]

اور اس لیے کہ ہمارا ایمان ہے کہ :

"یہ دین (جو مسلمانوں کی ساری کمزوریوں کے باوجود) اپنی اصلی شکل میں اس وقت تک موجود رہے اسی "عقیدہ" کے معاملہ میں صلابت

---

[1] یہ اقتباس والد ماجد کی مشہور زمانہ کتاب ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت" پر حضرت مولانا علی میاں کے مقدمہ سے ماخوذ ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۱۵

واستقامت اور حمیت وغیرت کا رہین منت ہے، دین کے شارحین ومحافظین نے اس سلسلہ میں کسی باجبروت طاقت ... کے سامنے سپر نہیں ڈالی اور اس کے کسی غلط عقیدہ اور دعوے پر سکوت جائز نہیں سمجھا، چہ جائیکہ مسلمانوں کے دنیاوی منافع اور اختلاف وتفریق سے بچنے کی لالچ میں قبول کر لیتے یا ہمنوائی کرتے ....."[1]

دعا ہے کہ الفرقان کی اس اشاعت میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ مومن کے لئے مطلوبہ معیار کے بارے میں اور حق وصداقت کے ساتھ اپنے رشتوں کو ہر دوسرے رشتے پر مقدم رکھنے کے سلسلہ میں قرآنی ہدایات کے مطابق ہو اور ہر طرح کے زیغ وضلال سے اور ہر قسم کے افراط وتفریط سے اللہ تعالیٰ ہماری اور تمام مسلمانوں کی حفاظت فرمائے

سجاد نعمانی
۲۱ر مئی ۱۹۹۲ء

[1] ایضاً ص ۱۴

اسوۂ سلیمانی

"غزوۂ بدر کی روایتوں کی تنقید کے سلسلے میں ایک مقام پر اس نافہم ہیچمدان کے خطاکار قلم سے حضرت کعب بن مالک صحابی کی روایت پر نامناسب تنقید لکھی گئی تھی جس سے ایک گونہ ایک جلیل القدر صحابی کی شان میں سوءظن کا پہلو پیدا ہوتا تھا، جس پر مجھے شرمندگی ہے

اور اب میں اپنی اس غلطی ونادانی کو مان کر اس عبارت کو قلم زد کر کے صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی براءت کرتا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ سے عفو کا خواستگار ہوں۔

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش
عذر بہ درگاہ خدا آورد

(سیرۃ النبی جلد اول - دیباچہ طبع چہارم) از خامۂ عنبر شمامہ سید سلیمان ندوی

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مجھے ہے حکم اذاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

اسی سال (۱۹۹۲ء) کے شروع میں شائع ہونے والی اپنی کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" کے مقدمے میں اس قسم کی کتاب کی ضرورت پر کلام کرتے ہوئے لکھا گیا تھا اور اسی پہ مقدمہ ختم ہوتا تھا کہ :-

"ہمیں پورا احساس، بلکہ تجربہ ہے ... کہ ایسے معاملات میں جن کا تعلق نازک قسم کے جذبات سے جُڑ گیا ہو ایک صدیوں اور نسلوں سے جمے ہوئے تاثر اور تصوّر کو چھیڑنا ایک پُرخطر کام ہے۔ مزید یہ اس لئے بھی ایک دشوار کام ہے کہ خود اپنے جذبات کی دنیا بھی اس "ایمانداری" کے ہاتھوں جگہ جگہ آزمائش میں پڑتی ہے۔ اس لئے کہ اب تک کا عمومی تصوّر کچھ نہ کچھ ہم سبھی کو ورثے میں ملا ہے۔ مگر یہ معاملہ جیسا کہ اوپر بھی گزر چکا ہے' ان معاملات میں سے ہے جنھوں نے ہمارے دینی زاویۂ نظر کو مجموعی طور سے بہت متأثر کیا ہے' یہ ان معاملات میں سے ہے جن معاملات نے ہمارے اندر ایمانداری اور غیر جانبداری کے شعور کو مدھم کیا ہے' جن معاملات نے انصاف پسندی کی بے لاگ اسلامی روح کو بے جان کر دیا ہے' اور حقیقت بینی اور حقیقت پسندی جو اسلام کی سب سے بڑی دین تھی اُس سے اُمّت کو بحیثیت مجموعی محروم کیا ہے' اُمّت کا ہر حلقہ (خاص طور سے ہر دینی حلقہ) جو آج اپنے آپ کو معیارِ حق بنائے ہوئے ہے اور اس طرح حق سب سے زیادہ مشتبہ اور متنازعہ چیز بن گئی ہے' یہ ایسے ہی

معاملات کا رفتہ رفتہ اثر ہے جن میں انصاف اور حقیقت پسندی جیسے اوّلین اسلامی اور انسانی تقاضوں کو دوسرے تیسرے اور چوتھے درجے کے تقاضوں سے مغلوب ہو کر قربان کر دیا جا رہا ہے۔ ہمارے اندر نئے نئے حلقوں کی پیدائش، پرانے حلقوں کے باہمی بُعد میں اضافہ اور ان میں سے ہر ایک کے اندر انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے نئی باہمی تقسیمیں، یہ سب عذاب اسی انصاف پسندی، حقیقت پسندی اور حقیقت بینی کے فقدان کا ہے، اس عذاب سے اُمّت کے نکلنے کی کوئی صورت اس کے بغیر نہیں ہے کہ جہاں جہاں سے اس فساد کی ابتداء ہوتی نظر آتی ہے، وہاں وہاں سے اصلاح کے کام کی ہمّت کی جائے۔

پیش نظر کتاب اصلاً تو والد ماجد مدظلہ کے ایماء کی تعمیل ہے، مگر جس خاص شکل میں اور جس انداز پر یہ تیار ہوئی ہے وہ میرے انہی مذکورہ بالا احساسات کا نتیجہ ہے، برسہا برس سے بڑی شدّت کے ساتھ احساس ہے کہ ہمارے یہاں حقیقت پسندی اور انصاف پسندی جس پر تمام دینی اور دنیوی سعادتوں کا مدار ہے ایک عنقا صفت شئ ہو گئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سعادت بھی ہمارے یہاں عنقا ہو گئی ہے عافیت کی خیر، خدا جانے ہم پر وہاں کا حال وہیں جا کے کھلے گا، دنیا کی ہر سعادت سے، بحیثیت قوم و ملّت محرومی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے جو قوم بھی حقیقت بینی اور حقیقت پسندی کا دروازہ اپنے اوپر بند کرے گی اور مزعومات کو عقائد بنالے گی وہ لازماً پسماندگی اور محرومی ہی کو اپنا مقدّر بنائے گی۔ اللہ رب العزّت سے دعا ہے کہ اپنا یہ حال بدلے۔ اور یہ کتاب اس تبدیلیٔ حال میں مددگار ہو، وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

اس نوعیت کی کتاب کے سلسلے میں اگر کسی کو یہ بتایا جائے کہ اس پر کوئی عالمانہ، سنجیدہ اور متوازن نقد و نظر پیش کرنے کے بجائے محض ایک معاندانہ غیظ و غضب اور معاصرانہ تحقیر و تذلیل بلکہ ایک مخالفانہ پروپیگنڈائی ٹیکنک کا نشانہ اسے ہماری اپنی ایک ایسی مرکزی اسلامی تعلیم گاہ

کی طرف سے بنایا گیا ہے جس کی ہم سبھی عزت کرتے ہیں اور بقول اس کے موجودہ ذمہ داروں کے، اسکے وجود سے "اسلامی فکر و شعور، بحث و نظر اور علمی بصیرت اور دوربینی کا ایک دلآویز و درخشاں باب تحریر" ہوا ہے، تو کیا یہ آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات ہو گی؟ —— اور پھر اگر یہ بھی علم میں آئے کہ اس کتاب کے ساتھ یہ سلوک (اسکو "عالمانہ طرز بیان" کی حامل کتاب مانتے ہوئے بھی) تعلیم گاہ کے کسی غیر ذمہ دار یا نسبتہً کم مرتبہ ہاتھ سے نہیں ہوا ہے، بلکہ تعلیم گاہ کے معتمد تعلیم جیسے اُس اہم منصب پر فائز ہاتھ سے ہوا ہے جس منصب پر کبھی ملک کے مانے ہوئے اہل علم و نظر رونق افروز رہ چکے ہیں، تو کیا اس خبر پر یقین لانا اور بھی مشکل نہ ہو جائے گا؟ —— لیکن یہ دنیا عجائبات اور محیّر العقول باتوں کے سلسلے میں کب بخیل رہی ہے؟ عقلیں حیران ہوا کرتی ہیں اور آدمی مان لینے پر پھر بھی مجبور۔ اس لئے کہ واقعہ واقعہ!

ہماری اس تعلیم گاہ اور دانشکدے کا نام ہے دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) اور اسکے موجودہ معتمد تعلیم ہیں جناب مولانا عبداللہ عباس ندوی، مولانا ندوی نے ندوۃ العلماء کے ترجمان پندرہ روزہ "تعمیر حیات" کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کا فریضہ انجام دیتے ہوئے جو ایک طویل و عریض مضمون معاصر تعمیر حیات ۱۰ر مارچ ۹۲ئہ کی اشاعت میں تحریر فرمایا ہے اُس کا حال صرف وہی نہیں ہے جس کا اندازہ اوپر کی سطروں سے کیا گیا ہو گا۔ اور جو ندوۃ العلماء کی شہرت کے پیش نظر بجائے خود انتہائی تعجب کے لائق ہے۔ بلکہ اِس معاندانہ رنگ کے غیظ و غضب اور تحقیر و تذلیل کے ساتھ ساتھ جس کا نشانہ کتاب اور اُس کا مصنّف ہے اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ایک پورے گروہ کو بھی اس تبصرے میں تقریباً خارج از اسلام کر دیا گیا ہے جو فتح مکّہ تک اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مدّ مقابل رہا تھا اور اس فتح کے بعد یا اس کے دوران میں ہی اسلام میں داخلے پر راضی ہو سکا تھا تبصرہ نگار معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء کا کہنا ہے کہ :-

"کربلا کا واقعہ بنو امیہ اور بنو ہاشم کی دیرینہ عداوتوں کا ایک منطقی نتیجہ (QONSEQUENCE)

تھا۔ وہ عداوتیں جو ظہورِ اسلام کے بعد بہت طاقتور شکل میں اُبھر کر سامنے آئیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ سالہ عرصۂ نبوت میں ۱۲ سال تک بلکہ ساڑھے ۱۲ سال تک تشدّد وتدّد سے قائم رہیں، غزوۂ بدر میں مسلمان فوج کی کامرانی نے جس طبقے کو سب سے زیادہ برافروختہ کیا اسکے سربراہ ابوسفیان تھے۔ اسی طرح غزوۂ اُحد میں اُن کا اور اُن کی اہلیہ جگرخوار حمزہ ہند کا کردار یہ سب وہ باتیں ہیں جن میں مؤرخین کا کوئی اختلاف نہیں۔ فتح مکہ کے بعد یہ گروہ اسلام لایا (یا بقول سید قطب شہیدؒ کے استسلام کیا) مگر اس استسلام[1] کے بعد اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہوگئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے، اپنی انانیت کو بھول گئے عقلاً محال بات ہے......"

اسلام کے پورے طور پر فاتح ہوجانے کے بعد جب مقاومت کی تمام راہیں مسدود ہوگئیں تھیں، اس عرصۂ مختصر میں اس گروہ کی طرف سے کسی واضح دشمنی کا ثبوت تاریخ میں نہیں ملتا، مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں میں شکست کا غم وغصہ آج تک موجود ہے اسی طرح اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینہ کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا......"

سچ یہ ہے کہ نفس کتاب کے بارے میں جو کچھ اس تبصرے میں لکھا گیا یا "سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ جیسی" جس جذباتی کیفیت کا مظاہرہ اس کے مصنف کے حق میں کیا گیا، جسے جاننے کے لئے قارئین کو پورا تبصرہ حرف بہ حرف پڑھنے کا موقع آئندہ صفحات میں دیا جائے گا[2]، وہ اگرچہ خود بھی ندوہ کی شہرت اور اسکی معروف روایات کی روشنی میں اور پھر ندوہ اور اس کے خورد وکلاں سے ہمارے چالیس پینتالیس سالہ ایسے تعلقات کی روشنی میں جن کی بدولت ہم لوگوں کے کم ایسے جاننے والے ہیں جو ہمیں "یک جان دو قالب" کی نظر سے نہیں دیکھتے، ہماری حیرت اور استعجاب ہی نہیں بلکہ رنج والم کے لئے بہت کافی ہونا چاہئے تھا لیکن اس تبصرے کا

---

[1] یعنی سپر اندازی [2] اسکے لئے ملاحظہ ہو ضمیمہ ۱ (ص۲۹)

یہ عنصر جس کی نمائندگی اوپر کا اقتباس کرتا ہے، اور جو تبصرے کے ۳/۴ حصہ کو گھیرے ہوئے ہے، جس میں شیعیت کی روح ہی نہیں، اسکی تبرائی زبان بھی علی الاعلان بولتی ہوئی مل رہی ہے، اس پر اپنی حیرت اپنے استعجاب اپنے رنج اور الم کے اظہار کیلئے تو ہم الفاظ ہی نہیں پاتے۔

ندوۃ العلماء کے تعلیمی نظام کا معتمد صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں ایسے ناگفتہ بہ خیالات اپنے دل دماغ ہی میں نہیں رکھتا بلکہ ندوے کے ترجمان کے صفحات میں دل کھول کر اُن کا بیان بھی کر سکتا ہے۔ اور اس ترجمان کا ایڈیٹر اور اسکے معاونین کا عملہ جسکی نظر سے تعمیر حیات میں شائع ہونے والا ہر مضمون طباعت کے مرحلے سے پہلے یقیناً کسی نہ کسی مرحلے میں گزرتا ہوگا، اس شیعیت پرور مضمون کو اسی طرح طباعت کے مرحلے تک پہنچ جانے دیتے ہیں! وہ ندوہ جس کی نظامت پر آج حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی فائز ہیں جن کے دور میں ندوے کو ایک نیا اعتبار ہند و پاک کے مستند دینی حلقوں میں حاصل ہوا ہے، اور جن کی نظامت عملاً اختیار کُل کا مفہوم رکھتی ہے، اُس ندوے میں آج وہ ہو رہا ہے جو کبھی اسکے نسبتہً گئے گزرے دور میں بھی نہ ہوا تھا؟

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟

راقم الحروف کیلئے اس بات کا تصور بھی ممکن نہ تھا کہ حضرت مولانا کے زیر نظامت ندوے کے بارے میں کسی بھی مسئلے پر اپنے ایسے خیالات اور احساسات کا اظہار جیسے کہ یہاں ظاہر کئے جا رہے ہیں برسرِ عام کیا جائے۔ لیکن اسے بد قسمتی کے سوا کیا کہا جائے کہ اس جسارت سے بچنے کی جو واحد شکل تھی کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب خود اس معاملے میں مداخلت فرمائیں اسکے لئے جو بہتر سے بہتر کوشش اپنے نزدیک ہو سکتی تھی وہ اختیار کی گئی۔ اور پھر اسکے نتیجے کا پورے صبر و ضبط کے ساتھ انتظار کیا گیا حتیٰ کہ آج دمِ تحریر اُس تبصرے کی اشاعت پر کامل ۱/۲ ۱ ماہ گزر چکا ہے لیکن بد قسمتی کہ:۔

.... کچھ نہ دوا نے کام کیا

اور اس لئے آج الفرقان کے صفحات پر اس جسارت کے لئے تیار ہونا پڑ رہا ہے جس کی نہ الفرقان اور اہلِ الفرقان سے کسی بھی واقف کار کو توقع ہوگی اور نہ تو ہمارے خواب و خیال تک میں اس کا گزر ہو سکتا تھا۔

حضرت مولانا علی میاں کے ساتھ اور دار العلوم ندوۃ العلماء اور اسکے اکابر و اصاغر کے ساتھ ہم لوگوں کے تعلقات کی جو نوعیت قریب بینتالیس سال سے رہی ہے اب اگرچہ اسکے بہت نمایاں دور کو دیکھنے اور جاننے والے بہت زیادہ نہیں رہ گئے، لوگ اٹھتے جاتے ہیں پھر بھی ابھی کافی تعداد ایسے لوگوں کی ہوگی جو اپنے علم و مشاہدہ کی بنا پر محسوس کرتے ہونگے کہ ایسے پائیدار اور پُر از اعتماد قریبی تعلقات دنیا میں کم ہوا کرتے ہیں۔ ہم بہرحال اسی طرح سوچتے ہیں اور ان تعلقات میں نشیب و فراز کے مراحل بھی آنے جانے کے باوجود راقم الحروف اپنے بارے میں اور اسی طرح اپنے والد ماجد کے بارے میں بلا کسی تذبذب اور تحفظ کے کہہ سکتا ہے کہ اِن تعلقات کی حلاوت کو کسی بڑی سے بڑی شکایت کی تلخی بھی ایک آنی جانی تلخی سے زیادہ متأثر نہ کر سکی۔ ادھر کافی دن ہو گئے ہیں کہ ہم لوگوں کی راہیں کچھ الگ الگ سی ہو چکی ہیں۔ اشتراکِ عمل کے مواقع ختم سے ہو گئے۔ لیکن سوائے بہت قریبی لوگوں کے کم ہی کوئی اس حقیقت کو محسوس کرتا ہوگا۔ اس لئے کہ ہمارے تعلقات کی کیفیت میں راہوں کی اس گونہ علیحدگی کا نشان الحمدللہ اب تک نمایاں نہیں ہوتے پایا ہے۔

ہرچند کہ تعمیرِ حیات کا تبصرہ اپنے لب و لہجے کی زبان سے صاف پکار رہا تھا کہ تعلقات کی یہ جنّت اگر کبھی آباد تھی بھی جس کا تذکرہ ہم کر رہے ہیں، تو زیادہ سے زیادہ اس دن تک آباد تھی جس دن تک کہ "واقعۂ کربلا" پر ایک نئے مطالعے کی روشنی نہیں ڈالی گئی تھی اس "گناہ" کے بعد سے بہرحال اس کا خیال ایک خام خیالی اور "احمقوں کی جنت" کا مصداق ہے، لیکن ہم بہرحال بآسانی اس خیالی جنّت سے بھی نکلنے کو آمادہ نہ تھے۔ اس لئے ہر ممکن طور سے

کوشش بھی کی گئی کہ اس انتہائی قابلِ حیرت، قابلِ شکایت اور قابلِ اعتراض تبصرے پر الفرقان میں لب کشائی نہ کرنا پڑے۔ اور اسکے بجائے حضرت مولانا علی میاں تعمیرِ حیات ہی کے ذریعے مناسب اور شایانِ شان انداز میں اس شکایت و اعتراض کا ازالہ فرما دیں۔

بہرحال بدقسمتی غالب رہی، جو ایک عرصے سے اہلِ اسلام کا مقدر ہے، اور حضرت مولانا ہماری کسی کوشش کے نتیجے میں بھی اپنے آپ کو اُس بات پر آمادہ نہ کر سکے جس کی ہم بجا طور سے توقع بھی رکھتے تھے، اور مولانا کا فرض بھی سمجھتے تھے۔ اس لئے اُس مقصد سے وفاداری کی خاطر جس مقصد سے اصلاً کتاب (واقعۂ کربلا اور اُس کا پس منظر) لکھی گئی تھی یعنی اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جماعت پر کربلا کے واقعہ کی آڑ میں جو سب و شتم کے تیر آزمائے جاتے ہیں اور پروپیگنڈے کی ہوائیاں اُڑائی جاتی ہیں نیز آپکی ایک دوسری جماعت کو جو کم ہمت، رخصت پسند اور زورِ باطل کے آگے سرنگوں ہو جانے والا باور کرایا جاتا ہے، تاریخی حقائق کی روشنی میں ان تمام ایمان سوز کوششوں کی حقیقت اُجاگر کی جائے اور اس بارے میں مسلکِ اہلِ سنت کو مشتبہ نہ ہونے دیا جائے، اس کی خاطر اپنی زندگی کا یہ سخت ترین اور مشکل ترین فیصلہ ناگزیر ہوا کہ ضرورت کی حد تک اور حدود کی حسبِ توفیق ممکن رعایت کے ساتھ کچھ عرض کیا جائے۔ لیکن اس سے پہلے وہ کوششیں سامنے آجانی چاہئیں جو اس فیصلے سے بچنے کے لئے کی گئیں اور ناکام رہیں۔

(۱)

تبصرے میں جہاں تک کتاب اور اسکے مصنف کے متعلق قابلِ شکایت حصّے کا تعلق تھا، اُس کے لئے تو خود راقم الحروف نے، ادباً حضرت مولانا کے بجائے تبصرہ نگار کو مخاطب کرتے ہوئے ایک عریضہ لکھا لیکن اصل میں تمام ترگزارش حضرت مولانا ہی سے مقصود تھی جس کی بنا پر ایک کاپی حضرت مولانا کی خدمت میں بھی ارسال کی گئی۔ اس عریضے کے متن کے لئے دیکھئے ضمیمہ ۲ (ص ۳۹) نیز ایڈیٹر تعمیرِ حیات کے نام ایک مراسلہ بھیج کر

درخواست کی گئی کہ وہ اسے اپنے مؤقر جریدے میں جگہ دیدیں۔ (اسکے متن کے لئے ملاحظہ ہو ضمیمہ ۳ (ص ۴۲) ان دونوں میں سے صرف آخرالذکر کی محض رسید ابتک مل سکی ہے جب کہ تعمیر حیات کی دو اشاعتیں نکل چکی ہیں۔ لہذا سمجھنا چاہئے کہ ان میں سے کوئی چیز وہاں شائع نہ ہو سکے گی۔

(۲)

رہا تبصرے کا وہ حصہ جس میں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک گروہ کے بارے میں خالص شیعی زبان اور شیعی ذہنیت کا وہ مظاہرہ کیا گیا تھا جس کا نمونہ شروع کے صفحات میں دکھایا جا چکا ہے۔ اسکے لئے خود والد ماجد کو شدید تقاضہ تھا کہ وہ مولانا علی میاں کو اس بارے میں لکھیں اور دریافت کریں کہ کیا وہ اس سے راضی ہیں؟ اس معاملے میں والد ماجد مدظلہ کی حساسیت کا اندازہ کرنا کسی بھی ایسے آدمی کیلئے مشکل نہیں ہے جس نے اُن کی کتاب "ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت" پڑھی ہے، نیز الفرقان کا وہ دو حصوں پر مشتمل ضخیم خاص نمبر دیکھا ہے جو شیعہ اثنا عشریہ کے کفر و اسلام کے بارے میں اُن کے استفتاء اور اُس کے جواب میں سیکڑوں علماء کے جوابات پر مشتمل ہے۔ اور اسکے ساتھ وہ اُن کی صحت کے نہایت کمزور اور نازک موجودہ حال سے بھی واقف ہے۔ ایسا انسان جب دیکھے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء جہاں انھوں نے کئی سال تک حدیث کا درس دیا ہے جس کی انتظامیہ کے وہ مدتوں رکن رہے ہیں۔ اور جس کا تمام دروبست مولانا علی میاں جیسے اُن کے رفیق قدیم کے ہاتھ میں ہے، وہاں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی گروہ کے خلاف شیعیت کی زبان بولتی سنائی دے رہی ہے تو پھر اس کا جو حال ہوگا وہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے نہایت کرب کے عالم میں حسب ذیل مکتوب حضرت مولانا کی خدمت میں خصوصی قاصد کے ذریعہ رائے بریلی روانہ کیا۔

۱۵ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ

صدیق محترم جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب! وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ خدا کرے مزاج گرامی ہر طرح بعافیت ہو۔

میرا جو حال ہے وہ آپ کے علم میں ہے۔ فطری طور پر بات ہر آن آگے ہی بڑھ رہی ہے دعاؤں کا محتاج و سائل ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے آپ کے حق کے مطابق دعا کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے۔

اس وقت یہ خط آپ کو تعمیر حیات (۱۰ر مارچ ۱۹۹۲ء) میں مولوی عبداللہ عباس صاحب کے مضمون واقعۂ کربلا..... کے ان حصوں کی طرف توجہ دلانے کے لئے لکھ رہا ہوں جن میں کربلا کے سانحے کو بنو امیہ اور بنو ہاشم کی دیرینہ عداوتوں کا منطقی نتیجہ اور بالخصوص بدر کی شکست کا انتقام بتایا گیا ہے۔ اور یہ کہ یہ لوگ مجبوراً مسلمان تو ہو گئے تھے مگر جس طرح انگریزوں کے دلوں میں صلیبی جنگوں کی شکست کا غم و غصہ ابتک موجود ہے اسی طرح اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینے کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا، نیز یہ کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت نے البتہ اسلام کی طرف سے ان کے عناد کو ختم کیا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اُن کا دل صاف نہیں ہوا، وغیرہ وغیرہ ـــــ واقعہ یہ ہے کہ اس کو سن کر اور پھر خود پڑھ کر مجھے جو تکلیف اور حیرت ہوئی ہے اسے اپنے اس وقت کے حال میں پوری طرح بیان کرنے سے بھی میں قاصر ہوں اگر معذور نہ ہوتا تو اس سلسلے میں رائے بریلی کا سفر کرتا۔ اب ان سطروں کے ذریعہ آپ کو توجہ دلا کر یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ اس سے راضی ہیں؟ یا اپنی اور ندوے کی طرف سے برأت اور بیزاری کا اظہار کرنا پسند کریں گے؟

مجھے اس مضمون سے جو شدید تکلیف پہنچی اور جس نے آپ سے یہ دریافت کرنے پر مجبور کیا اس میں خاص دخل آپ کی ذات سے رفاقت اور قلبی مودّت کے تعلق کے علاوہ اس کو بھی ہے کہ مولوی عبداللہ عباس صاحب کی حیثیت صرف ایک ندوی فاضل کی نہیں بلکہ وہ دارالعلوم کے معتمد تعلیم کے اس منصب پر فائز ہیں۔ جو تعلیمی

علمی اور دینی لحاظ سے اعلیٰ ترین منصب ہے اور جس پر خود آپ اور آپ سے پہلے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ فائز رہے۔

والسلام
محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

والد ماجد کے اس خط کے جواب میں حضرت مولانا کا جو مکتوب گرامی موصول ہوا وہ یہ تھا۔

۲۱ رمضان المبارک

رفیق مخدوم و مکرم، گرامی مرتبت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب دامت فیوضہم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ برکاتہ آپ کے خادم عزیزی مولوی ضیاء الرحمن مکتوب گرامی لائے، اس وقت کسی کام میں سخت مشغولیت تھی، انکی موجودگی میں پڑھ نہیں سکا، انکو جلد جانے کا تقاضا تھا۔ عنایت نامہ پڑھا تو قلب و دماغ پر ایسا اثر ہوا کہ یاد نہیں آتا، کہ اس سے پیشتر قریب زمانہ میں کسی تحریر یا تاثر یا واقعہ کا ہوا ہو، "تعمیر حیات" میں اس مضمون کے نکلنے کے بعد ہی ہم تے اسکے اثر کے زائل ہونے اور ندوۃ العلماء اور دارالعلوم کے ذمہ داروں کے مسلک و طرز فکر کے اظہار کیلئے اپنا ایک طاقتور و مدلل مضمون صحابۂ کرام کے مرتبہ اور انکی تشکیل وجود میں اعجاز نبوت کے ظہور کو سامنے لانے کیلئے فوراً اشاعت کیلئے بھیجدیا جو اسی اشاعت میں شائع ہو گا، ممکن ہے پرچہ چھپ گیا ہو۔ یہ وہ مضمون ہے جس کا بڑا حصہ آپ کی معرکۃ الآرا کتاب کے مقدمہ کے طور پر لکھا گیا تھا، پھر کچھ اضافہ کیا گیا اس سے زیادہ وضاحت اور تلافی کی کوشش بھی کی جائیگی۔ افسوس ہے مولوی عبداللہ صاحب ندوی اس وقت یہاں نہیں ہیں امید ہے عید کے بعد آئیں، کوشش کی جائیگی کہ انکے قلم سے بھی کوئی ایسی چیز شائع ہو جس سے یہ بدنمائی یا بدنامی دور ہو۔ اپنے احباب اور عزیزوں سے امید ہے کہ عجلت نہ کریں اور اسکو کوئی محاذ نہ بنائیں کہ اس سے اور زیادہ نقصان کا اندیشہ ہے اور جہاں تک خبر نہیں پہونچی وہاں تک بھی

پہونچ جائیگی، اس سلسلہ میں ذرا انتظار اور حکمت کی ضرورت ہے۔

خدا کرے مزاج اور صحت پہلے سے بہتر ہو، ہم بھی سخت ضعف اور صحت کی کمزوری کے شکار رہے، رونے برے بھلے ہوئے ہیں۔ عزیزان گرامی مولوی عتیق الرحمٰن اور سجاد میاں کو سلام۔

آپ کا علی

اپنی کتاب "المرتضیٰ" (اردو ترجمہ) کے تیسرے ایڈیشن کا ایک نسخہ بھیج رہے ہیں، حضرت معاویہؓ کے بارہ میں ایک مضمون کا اضافہ کیا گیا ہے تاکہ اہل سنت کا صحیح نقطۂ نظر اور فکر سامنے آجائے۔

حضرت مولانا کے اس مکتوب سے ایسا ظاہر ہونا تھا جیسے کہ آپ کو خود بھی تعمیر حیات کے تبصرے کی شناعت اور قباحت کا احساس تھا، مگر اسکے اثر کے ازالے کے لئے جس نوعیت کا اپنا مضمون چھپوانے کی بات آپ نے اسی مکتوب میں لکھی تھی اس سے بالکل امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ کسی بھی طرح سے وہ کسی ازالۂ اثر کا کام دے گا۔ چنانچہ وہ چھپ کر آیا تو کسی ایسے مضمون کی حیثیت سے اسکی شناخت ہی ممکن نہ تھی جو کسی دوسرے مضمون کے اثرات بد زائل کرنے کیلئے لکھا گیا ہو، لیکن اسکی جو دوسری پہچانیں حضرت مولانا نے اپنے مکتوب میں درج فرمادی تھیں اُن کی بنا پر والد ماجد کیلئے اور راقم الحروف کیلئے کہ اسکی نظر سے بھی مولانا کا گرامی نامہ گزرا تھا، اُسکو پہچان لینا بہر حال ممکن ہو گیا۔

یہ ایک دوسرا صدمہ تھا جو والد ماجد کو تعمیر حیات کے تبصرے کی اشاعت کے بعد اپنے ضعف کے اس عالم میں کہ دیکھنے والوں کو رحم آتا ہے، حضرت مولانا کے اس مضمون کی اشاعت سے اُٹھانا پڑا۔ اسی لئے کہ وہ کسی طرح بھی یہ گمان نہیں کرسکتے تھے کہ اُن کے مولانا علی میاں کے یہاں عزتِ صحابہ کے مسئلے میں ایسے نہاوں کو بھی خدانخواستہ راہ مل سکتی ہے یا کوئی مصلحت اس معاملے میں دامن گیر ہوسکتی ہے۔ مگر اُن کی اُمید یا کہئے کہ احساسِ فرض نے ساتھ نہ چھوڑا اور ایک دفعہ پھر ایک خصوصی قاصد ہی کا ذریعہ اختیار کر کے ذیل کا خط

حضرت مولانا کی خدمت میں رائے بریلی روانہ کیا۔

۲۸ ر رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ

صدیق محترم جناب مولانا سید ابو الحسن علی ندوی صاحب! وفقنا اللہ وایاکم لما یحبہ ویرضاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہو۔

گرامی نامہ محررہ ۲۱ ر رمضان المبارک مع المرتضیٰ (تیسرا ایڈیشن) مل گیا تھا، آپ نے اپنے جس مضمون کا ذکر فرمایا تھا اس کیلئے تعمیر حیات کا انتظار رہا۔ کل وہ بھی آگیا تو آپ کا مضمون پڑھوا کر سنا۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ میری توقع کے تو بالکل برخلاف نکلا۔ کیونکہ اس میں تو مولوی عبداللہ عباس صاحب کے مضمون کی طرف اشارہ بھی نہیں ہے۔ اس سے اگر کچھ معلوم ہوتا ہے تو یہ کہ مجموعی طور پر جماعت صحابہ اور صحبت نبوی کی تاثیر کے بارے میں آپ کے خیالات یہ ہیں ——— اس عاجز نے جو آپ کو لکھا تھا، اس کا مقصد تو یہ تھا کہ مولانا عبداللہ صاحب کے مضمون کے بارے میں آپ پر خاص ذمہ داری اس لئے عائد ہوتی ہے کہ آپ جس ادارے کے ناظم ہیں۔ اسی ادارے کے وہ رکن رکین بلکہ معتمد تعلیمات ہیں۔ اور وہ مضمون اسی ادارے کے ترجمان کے تبصرے کی حیثیت سے شائع ہوا ہے۔

اگرچہ آپ کے مزاج اور افتادِ طبع سے شاید یہ عاجز دوسرے بہت سے حضرات سے زیادہ واقف ہے، لیکن پھر بھی امید تھی کہ مسئلہ کی غیر معمولی سنگینی کی وجہ سے آپ اس مضمون کے اس حصہ کے بارے میں جس میں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سخت ناروا خیالات کا اظہار ہے، ضرور کچھ نہ کچھ فرمائیں گے۔ اور اس طرح ایک بڑے فتنہ کا تدارک آپ ہی کے ذریعہ ہو جائے گا۔ مگر آپ کا یہ مضمون سن کر جیسی مایوسی ہوئی، اسکے اظہار کے لئے، خاص کر آپ کی دیرینہ رفاقت اور آپ کے اوصاف واخلاق کی دلی قدر کی وجہ سے مجھے مناسب الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔

آپ نے اپنے مکتوب میں عزیزوں اور احباب سے خواہش کی ہے کہ اس بارے میں عجلت نہ کی جائے اور اسے کوئی محاذ نہ بنایا جائے۔ اس عاجز کے خیال میں اس کی واحد شکل یہی ہے کہ آپ کی طرف سے اس بارے میں وہ کیا جائے جو شرعی واخلاقی طور پر آپ کے ذمّے ہے۔

میں یہ بھی واضح کردوں کہ مسئلہ مولوی عتیق الرحمٰن کی کتاب یا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام کے بارے میں دو مختلف نقطہائے نظر کا نہیں ہے کہ اس بارے میں پوری اُمّت کا ایک نقطۂ نظر پر متفق ہوجانا کوئی آسان یا متوقع امر نہیں ہے۔ میری فکر وتشویش بلکہ رنج والم کا اصل سبب صحابہ کرامؓ کے ایک پورے گروہ کے بارے میں وہ گمراہ کن اور بے بنیاد خیالات ہیں جن کا بڑی بے باکی کے ساتھ تبصرہ میں اظہار کیا گیا ہے۔ اور جن سے آپ کے اور ندوے کے نام پر دشمنانِ اصحاب رسول کے ہاتھ میں وہ زبردست ہتھیار آتا ہے کہ وہ جس قدر بھی فائدہ اٹھائیں کم ہے ــــــ اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔ والسلام

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہٗ

والد ماجد کے اس دوسرے خط کے جواب میں مولانا نے اپنے گذشتہ مضمون کی بابت انکے تأثر سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے ایک نئے مضمون کے بارے میں اطلاع دی کہ تعمیر حیات میں اشاعت کیلئے بھیجا جا رہا ہے اس خط کا متن ملاحظہ فرمائیے:۔

محبّ مخدوم ومحترم دامت فیوضہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ امید ہے کہ مزاج پہلے سے بہتر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ صحت وقوت عطا فرمائے اور فیوض وبرکات قائم اور وسیع تر فرمائے ماہ مبارک میں اور اس کے پیشتر اور بعد آپ اور آپ کے متعلقین کے لئے منزل پڑھنے کے بعد

پابندی سے دعا کی سعادت حاصل کرتا رہا اور انشاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

گرامی نامہ ملا، آپ نے مضمون کے بارہ میں جو تبصرہ اور اپنا تاثر تحریر فرمایا وہ بالکل صحیح تھا۔ رمضان کی مشغولیت اور صحت کی موجودہ حالت میں اتنا ہی کر سکا کہ اپنا ایک پرانا مضمون جو صحابہ کرام کے بارہ میں اصولی اور تاریخی جائزہ کے طور لکھا تھا اس کو اشاعت کے لئے دیدیا، اب آپ کے مکتوب اور تبصرہ کے بعد اس سے زیادہ اور واضح تر اظہار حقیقت کی ضرورت سمجھی اور ایک مفصل مضمون جس میں خاص طور پر نام لیکر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے شرفِ صحابیت اور ان کے درجہ و منزلت کے بارہ میں اظہار خیال کیا گیا ہے "تعمیر حیات" کو بھیجا جا رہا ہے، وہ انشاء اللہ ۲ راپریل کی اشاعت میں شائع ہوگا، اس مضمون میں صحابۂ کرام کے بارہ میں اہلِ سنت کے عقیدہ و مسلک کا پورا اظہار ہے، اور ساتھ ہی ندوۃ العلماء کے بانیوں، ذمہ داروں اور کارکنوں کا بھی یہی عقیدہ بیان کیا گیا ہے۔ اور صحابہ کرام کے حالات و مناقب کے پیش کرنے اور انکے سیر و سوانح کی ترتیب و اشاعت میں اسکے سرپرستوں اور فضلاء کا جو حصہ رہا ہے وہ بھی بیان کیا گیا ہے، البتہ حضرت حسینؓ کے اقدام اور واقعہ کربلا کے بارہ میں ائمہ اہلِ سنت و محققین کا مسلک اور اپنا عقیدہ و مسلک بھی صفائی کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے جس پر ہم جینا اور مرنا چاہتے ہیں، انشاء اللہ مضمون چھپتے ہی آپ کی خدمت میں بھیجا جائیگا۔

آپ سے دعا کی درخواست ہے۔ اور امید ہے کہ ضرور فرماتے ہوں گے۔

والسلام مع الاکرام
آپ کا
ابوالحسن علی
رائے بریلی ۔ ۳ رشوال ۱۴۱۲ھ

محترم مولانا کے اس گرامی نامے کو پڑھ کر سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ ایک فتنے اور آزمائش کا جو بادل مولانا کے شاگرد اور ندوے کے معتمد تعلیم مولانا عبداللہ عباس ندوی نے اپنے زورِ علم و قلم سے ہم لوگوں پر مسلط کر دیا ہے، مولانا اُسکے صاف کرنے میں باوجود اپنے رفیق قدیم اور محبّ مخلص کی مکرر توجہ دہانی کے کوئی واقعی دلچسپی لینا مناسب نہیں سمجھتے۔ وہ ایک نیا مضمون اس قصے کے نام پر لکھنا گوارا فرماتے ہیں مگر پہلے مضمون کی وہ کمی جس کی طرف توجہ دلانا ہی والد ماجد کے دوسرے خط کا مقصود تھا (یعنی یہ کہ پہلے مضمون میں مولانا عبداللہ عباس صاحب کے مضمون کی طرف سرے سے کوئی اشارہ بھی نہیں کیا گیا تھا چہ جائیکہ اس سے براءت اور اسکی اشاعت پر معذرت جو اصل ضرورت تھی) اس کمی کو اپنے دوسرے مضمون میں پورا کر دینے کے کسی ہلکے سے ہلکے ارادے کے اظہار سے بھی مولانا کا خط بالکل ساکت ہے۔ اور اس سے زیادہ المناک بات یہ ہے کہ یہ دوسرا مضمون جو ۲۵ اپریل کے تعمیر حیات میں نکلا ہے۔ اس میں اگرچہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ مولانا عبداللہ عباس کے تبصرے کی پیدا کردہ ضرورت کی بنا پر لکھا گیا ہے، مگر وہ ضرورت یہ نہیں بتائی گئی ہے کہ اس سے صحابۂ کرام کے ایک گروہ کے بارے میں کوئی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے جس گروہ کیلئے کہا گیا ہے کہ وہ دل سے مسلمان نہیں ہوا تھا، بلکہ ضرورت یہ بتائی گئی ہے کہ:

> "اس سے ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے ندوۃ العلماء کے بانیوں، ذمہ داروں اور کارکنوں کے بارے میں وضاحت کی ضرورت سمجھی گئی۔"

اور پھر اس وضاحتی مضمون میں اطمینان دلایا گیا ہے کہ اہلِ ندوہ صحابۂ کرام کے بارے میں وہی عقائد رکھتے ہیں جو اہلِ سنّت کے عقائد ہیں۔

گویا حضرت مولانا کے پہلے گرامی نامے سے جو یہ سمجھا گیا تھا اور جس کا اظہار اوپر کے صفحات میں کیا گیا ہے کہ مولانا عبداللہ صاحب کے مضمون سے آپ کو از خود بھی تشویش اور اُسکے اثرات زائل کرنے کی فکر ہے، وہ تشویش و فکر مضمون کے اُن مہلک اثرات کیلئے نہیں تھی،

جو صحابہ کرام کے کسی گروہ کے بارے میں صحیح العقیدہ مسلمانوں کے دل و دماغ پر پڑ سکتے تھے بلکہ صرف اُس بدگمانی کیلئے تھی جو تعمیر حیات میں ایک ذمہ دار ندوی کے قلم سے اس طرح کا تبرائی مضمون دیکھ کر ندوہ اور اہلِ ندوہ کے عقائد کے بارے میں پیدا ہو سکتی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اب ہم مولانا عبداللہ عباس کو کیا کہیں؟

بہرحال جو کچھ بھی کوشش اس تبصرے کے سلسلے میں اس بات کیلئے کی جا سکتی تھی کہ الفرقان کے صفحات پر کچھ نہ لانا پڑے اور مولانائے محترم کے ذریعے تعمیر حیات ہی کے صفحات میں یہ فتنہ دفن ہو کر رہ جائے، وہ ہر کوشش حضرت مولانا کے اس تازہ مضمون کے بعد مکمل ناکامی سے ہمکنار ہو چکی ہے۔ اور اب اسکے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے کہ ایک کتاب پر تبصرے کے نام سے اور اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کی محبت کے پردے میں اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت جو گمراہ کن اور فتنہ وانتشار انگیز خیالات ندوہ جیسی مؤقر اسلامی تعلیم گاہ کے منبر سے نشر کئے گئے ہیں ان پر حسب توفیق علمی اور دینی تنقید کا فرض ادا کیا جائے ۔۔۔۔ اس تنقیدی فریضہ کیلئے ہم آئندہ صفحات میں ایک دوسرے مضمون کی بساط بچھاتے ہیں۔ آیئے وہاں چلیں۔ حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ۔

ضمیمہ ۱

واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر

تعمیر حیات کا تبصرہ

از قلم مولانا عبداللہ عباس ندوی

[ذیل میں ادارۂ الفرقان کے زیر اہتمام شائع ہونے والی تازہ کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" پر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ترجمان "تعمیر حیات" کا تبصرہ شائع کیا جا رہا ہے جو ندوے کے معتمد تعلیم ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی صاحب کے قلم سے معاصر کی اشاعت ۱۰ مارچ ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا ہے۔

الفرقان کے اس شمارے میں متعدد مضامین اسی تبصرہ کے متعلق ہیں جنھیں پڑھ کر بہت سے قارئین کو ضرورت محسوس ہوگی کہ وہ تبصرہ بھی ان کے سامنے ہو اسی ضرورت کے ماتحت یہ تبصرہ بعینہٖ شائع کیا جا رہا ہے۔ اور نقل میں کوئی تبدیلی نہ ہو اس غرض سے الفرقان کے کاتب سے کتابت کرانے کے بجائے "تعمیر حیات" ہی کے مضمون کا فوٹو لیا گیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کے مصنف مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے آج سے ۲۷ سال پہلے ایک طویل مضمون اس عنوان پر لکھا تھا جس میں مزید اضافوں کے ساتھ اس کو کتابی

تشکل دی ہے۔ "تعمیر حیات" میں یہ کتاب برائے تبصرہ آئی ہے اس لئے اس کا مختصر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

اس ۲۶۴ صفحات پر مشتمل کتاب کا مفروضہ تحقیقی نتیجہ بحث (HYPOTHESIS) یہ ہے کہ :- "یزید ایک مسلمان خدا ترس پاک سیرت خلیفہ برحق تھا جس کی ولی عہدی عین کتاب و سنت کے مطابق اور اسلامی مقاصد کے لئے عمل میں آئی تھی اور اس کے مقابلہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ ایک نا عاقبت اندیش، شہنشاہیت کے طالب بلا وجہ اپنی جان گنوانے والے شخص تھے"

نتیجہ بحث اگرچہ محمود عباسی" اور اس کتاب کا ایک ہی ہے لیکن عباسی کے لب و لہجہ و بیان میں جو بے حیائی اور بے باکی ہے اس سے یہ کتاب پاک ہے، اول الذکر کا طرز بیان مجادلانہ تھا اس کا عالمانہ ہے لیکن (THESIS) دونوں کا ایک ہی ہے

تحقیق کی ٹیکنک یہ ہے کہ تاریخ کی کتابوں میں (ابن کثیر، ابن اثیر، طبری) میں جو واقعات مصنف کے مفروضہ عقیدہ کو تقویت پہنچاتے ہیں ان کو بغیر کسی جرح کے ایک تسلیم شدہ حقیقت کی طرح قبول کیا ہے، اور جہاں ان کے رجحان کے خلاف بات ملی اس کو یا تو استغفر اللہ، نعوذ باللہ کہہ کر قصہ مختصر کر دیا یا اس کے راویوں پر جرح کی اور شخص متعلق کے دوسرے اعمال حسنہ کو گواہ بنا کر اس کے خلاف شہادت کو خلاف عقل قرار دیا، اور اگر اس سے بھی کام نہ چلا تو اس کو رافضیت و شیعیت کے خانہ میں ڈال دیا۔

تحقیق کا یہ راستہ بہت ہموار اور آسان اور "نئے مطالعہ کی روشنی" کا دعویٰ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے، فاضل مصنف نے کربلا کی ایک روایت کو اپنی تحقیق کا شاہکار سمجھ کر اپنی کتاب میں متعدد جگہ دہرایا ہے اور ایک تسلیم شدہ حقیقت کی طرح پیش کیا ہے اس لئے سب سے پہلے ہم اسی پر ایک نظر ڈالتے ہیں، چونکہ مصنف نے بھی آغاز کلام اسی سے کیا ہے اور شاید یہی نئے مطالعہ کی وہ روشنی ہے جو ان کو نظر آگئی ہے۔

ہاتھ میں ہاتھ دینے کا مفہوم

مصنف لکھتے ہیں: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے یہ آمادگی ظاہر کی تھی کہ :

"(وإما) أن أضع يدي في يد يزيد بن معاوية فيرى فيما بيني وبينه رأيه"

اس عبارت کا واضح مفہوم یہ ہے کہ یا تو مجھے چھوڑ دو میں خود یزید بن معاویہ سے جا کر صلح جو انداز میں بات کر لوں، پھر وہ میرے حق میں اپنی رائے دے۔

"وضع الید فی الید" دست در دست دادن، فارسی کا محاورہ ممکن ہے جس کے معنی بیعت کرنے اور سپرد کرنے کے ہوں تو بعید نہیں ہے عربی میں کہیں کسی

لغت یا کسی استعمال میں یہ محاورہ نہیں ہے۔ یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جہاں مبایعت کا ذکر ہے وہاں، بایع، بایعنا، لیسا یع ہی آیا ہے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھنے کا تذکرہ بھی کہیں کہیں اس کے بعد آتا ہے، وہ بھی ہر جگہ نہیں کنایہ بھی نہیں ہے اگر کنایہ ہے تو دوستی کرنے مساویانہ انداز میں گفت گو کرنے کا مفہوم رکھتا ہے، مصنف اور مصنف کے جتنے ہم نوا اور ہم خیال ہیں وہ ایک مثال بھی تلاش کر کے کلام عرب سے پیش کریں کہ "وضع الید فی الید" کسی نحوی ترکیب سے بغیر ذکر مبایعت اس مفہوم میں لایا گیا ہو، ہاں فارسی میں یہ محاورہ ہو سکتا ہے جس کا مفہوم بیعت ہو تو تعجب نہیں چنانچہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری قدس سرہ کی طرف منسوب شعر اسی بیعت کے مفہوم میں ہے۔ ؎

سر داد و نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لاالہ است حسین

اس میں بھی "سر داد" کا قرینہ مفہوم کا تعین کر رہا ہے۔

مصنف نے جس شد ومد سے مکرر سہ کرر اس جملہ کو دہرایا ہے کہ ان کے لئے اس تسامح کا اعتراف دشوار ہوگا، لیکن ان کے غور کرنے کے لئے ایک گوشہ اور ہے اگر بفرض محال ان کے سمجھے ہوئے مفہوم کو مان لیا جائے کہ یہ کنایہ بیعت سے ہے تو پھر "فیری فیما بینی و بینہ رایہ" کا کیا موقع رہ جاتا ہے، اور کیا اس سے آپ کے فرض کردہ مفہوم کی تردید نہیں ہوتی؟ یعنی جب بیعت کر ہی لی تو پھر وہ دیکھے میرے اور اس کے درمیان اس کی کیا رائے ہوتی ہے" کا سوال کہاں باقی رہ جاتا ہے؟

روایات کا تضاد اور اس کا سبب

مصنف کے قائم کردہ مقدمات میں سب سے پہلے یہ بات نظر آتی ہے کہ وہ کہتے ہیں:

چنانچہ اس واقعہ (واقعہ کربلا) اور اس کے پس منظر کے واقعات کے سلسلہ میں جہاں بظاہر صحیح اور قابل قبول روایات موجود ہیں وہیں نہایت منکر اور ناقابل قبول روایات کا بھی ڈھیر لگ گیا ہے"

"صحیح اور قابل قبول" جو بظاہر ہیں وہ کیا درحقیقت بھی صحیح ہیں اور آپ کو جو منکر اور ناقابل قبول روایات نظر آتی ہیں وہ کیا واقعی منکر ہیں، اس کا فیصلہ تو لکھنے والے کا پہلے سے قائم کیا ہوا نظریہ یا رجحان ہی کر سکتا ہے، آپ جس کو جھوٹ من گھڑت کہتے ہیں اس کے جھوٹے اور من گھڑت ہونے کی کیا دلیل ہے" یہی نا کہ وہ آپ کے مفروضہ کے خلاف ہے کیا اسی کا نام "نئے مطالعہ کی روشنی" ہے اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو لازم

سلمان رشدی بھی یہی کہتا ہے کہ "خیالات واوہام نے تقدس کا جال بنا ہے"۔

درحقیقت مصنف کو جو الجھن پیش آئی ہے اس کے دو اسباب ہیں۔

ایک یہ کہ انھوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ تاریخ کا کوئی حادثہ یا واقعہ ماضی سے جدا کر کے ایک اکائی کی شکل میں نہیں دیکھا جا سکتا، کربلا کا واقعہ بنو امیہ اور بنو ہاشم کی دیرینہ عداوتوں کا ایک منطقی نتیجہ (COSEQUENCE) تھا، وہ عداوتیں جو ظہور اسلام کے بعد بہت طاقتور شکل میں ابھر کر سامنے آئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ سالہ عرصۂ نبوت میں ۲۱ سال تک بلکہ ساڑھے ۲۱ سال تک شدت سے قائم رہیں غزوہ بدر میں مسلمان فوج کی کامرانی نے جس طبقہ کو سب سے زیادہ برافروختہ کیا اس کے سربراہ ابوسفیان تھے اسی طرح غزوۂ احد میں ان کا اور ان کی اہلیہ جگر خوار حمزہ ہند کا کردار یہ سب وہ باتیں ہیں جن میں مؤرخین کا کوئی اختلاف نہیں ہے، فتح مکہ کے بعد یہ گروہ اسلام لایا (یا بقول سید قطب شہیدؒ کے استسلام کیا) مگر اس اسلام کے بعد اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہوگئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے، اپنی انانیت کو بھول گئے عقلاً محال بات ہے، اور صحاح کی مستند روایات سے ثابت ہے کہ ہند نے بیعت کے الفاظ دہراتے ہوئے بھی اپنے اندرونی کرب وغم اور غیظ و غضب کا اظہار کیا تھا۔

حضرت ابوسفیان نے احتجاج کیا تھا کہ اب وہ دن آگیا ہے کہ یہ پسماندہ ہم اشراف پر فوقیت دیئے جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خلاف حضرت علیؓ کو اکسانے کی کوشش بھی ان سے ثابت ہے۔

اسلام کے پورے طور پر فاتح ہو جانے کے بعد جب مقاومت کی تمام راہیں مسدود ہوگئی تھیں۔ اس عرصۂ مختصر میں اس گروہ کی طرف سے کسی واضح دشمنی کا ثبوت تاریخ میں نہیں ملتا ہے مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں میں شکست کا غم و غصہ آج تک موجود ہے اسی طرح اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینہ کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت نے البتہ اسلام کی طرف سے ان کے عناد کو ختم کیا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ان کا دل صاف نہیں ہوا۔ احمد امین نے فجر الاسلام اور اس کے مقدمہ میں طٰہٰ حسین نے اس کی نشان دہی کی ہے، ممکن ہے یہ تجزیہ غلط ہو مگر یہ غلط نہیں ہے کہ حرہ اور کربلا کے واقعات کو ان خلفیات سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا، لہٰذا ریسرچ کا نقشۂ عمل (SYNOPSIS.) یہ ہونا

چاہیئے تھا کہ پہلے ایک عمومی جائزہ اس وقت کی عقلیت کا لیا جاتا اور نفسیاتی تجزیہ کیا جاتا کہ یہ کشمکش کہاں سے شروع ہوئی اور کس طرح درجہ بدرجہ بڑھی اور کیونکر کم ہوئی اور پھر کس طرح اور کن عوامل کے ماتحت ابھری، اس حادثہ کا سرا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سے نہیں غزوہ بدر کے واقعات سے مربوط کیا جائے تو تاریخی احداث کی کڑیاں ایک دوسرے سے زیادہ پیوست نظر آئیں گی۔

واقعات جو تاریخ کی کتابوں میں متضاد و متناقض ہیں اس کا سبب کوئی معمہ نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آسکے، خلافت راشدہ کے بعد "ملکیت عضوض" کا دور شروع ہوا تو قدرتاً دو گروہ ہو گئے، ایک وہ جس کو حکومت وقت سے وابستگی تھی خواہ جان بچانے کی خاطر یا طمع کی وجہ سے یا مسلمانوں میں آپس کی خانہ جنگی سے نجات حاصل کرنے کی خاطر وہ سمجھتا تھا کہ مناسب یہی ہے کہ جس کا غلبہ ہے اس کی تائید کی جائے، دوسرا طبقہ وہ تھا جو اصل دین کی پامالی پر رنجیدہ تھا، اسلامی روح جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے پیدا ہوئی تھی اس کا گلا گھونٹا جا رہا تھا نبیذ کے پردے میں شراب عام تھی (اس وقت کے شعرا ابو نواس اور بشار بن برد کے کلام سے اس وقت کا معاشرہ دیکھا جا سکتا ہے) جواری و قینات کی اتنی کثرت تھی کہ ابوالفرج الاصبہانی نے اغانی میں ۱۸ ہزار دھنیں اور لاتعداد فواحش و منکرات کے قصے قلمبند کر دیے ہیں، جن کی پرورش دربار شاہی سے ہوتی تھی، عدلیہ کا یہ حال تھا کہ حاکم وقت کے دیوان عام میں ایک چمڑے کا ٹکڑا (نطع) بچھا رہتا تھا اور بغیر کسی دلیل و بحث اور بغیر کسی الزام کے جس کو چاہا اس پر کھڑا کر دیا اور جلاد نے اس کی گردن اتار دی، شاہانہ ٹھاٹ باٹ کسی طرح بھی کسریٰ کے درباروں سے کم نہ تھا، لہٰذا وہ لوگ جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا زمانہ ان کے زہد و ورع اور احتیاط و تقویٰ کی باتیں جانتے تھے اور دوسرے خلفاء راشدین کے ورع و احتیاط کو دیکھے ہوئے یا سنے ہوئے تھے وہ اس فسق و فجور کی گرم بازاری سے نالاں تھے، ان لوگوں میں اسلام سے وابستگی کا جذبہ بھی تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ عقیدت و محبت بھی تھی۔

وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت رکھنے والی ہر شے کو عزیز رکھتے تھے آپ کے خانوادے کی انصار مدینہ کی کس مپرسی دیکھ رہے تھے کہ ان کا حال ایسا ہو گیا ہے جیسے وہ مفتوح قوم کے افراد ہوں جن سے فاتح قوم انتقام لینے پر تلی ہوئی ہے یہ لوگ ان پر ترس بھی کھاتے تھے اور ان کی بلند سیرت اور اعلیٰ کردار کے

چشم دید گواہ تھے، مگر خروج کی عزیمت
اپنے اندر نہیں پاتے تھے اور ان کا حال کم وبیش
وہ تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس
ہمدرد کا حال تھا جو اپنا ایمان پوشیدہ
رکھے ہوئے تھا اور وقت آنے پر کلمۂ حق ادا
کرنے سے اس نے دریغ نہیں کیا۔

فقال رجل مؤمن من آل فرعون
یکتم ایمانہ اتقتلون رجلا
ان یقول ربی اللہ۔

اور فرعون کے لوگوں میں سے ایک
مؤمن شخص جو ایمان کو پوشیدہ رکھتا
تھا کہنے لگا کہ تم اس شخص کو قتل کرنا
چاہتے ہو جو کہتا ہے میرا پروردگار
اللہ ہے۔

ایسے حضرات کی روایات بھی تاریخ میں
ملتی ہیں، وہ دور کلنڈر اور جنتری کے تاریخ
منضبط کرنے کا نہیں تھا، واقعات
پیدائش، حوادث کا حوالہ کبھی موسموں سے
دیا جاتا اور کبھی کسی بڑے حادثہ کی نسبت
سے بتایا جاتا، واقعات قلم بند کرنے کا
کوئی رواج نہیں تھا، تیسری صدی ہجری
میں جب گزشتہ ڈیڑھ سو برس کی روایتیں
ایک دوسرے سے سن سنا کر تدوین دور
میں پہنچیں تو ان کے اندر جتنا بھی تضاد
نہ ہو کم ہے، اور ان قصوں کے راوی دونوں
طرح کے لوگ، حکومت کے ہوا خواہ بھی
اور اس کے بدخواہ بھی، اس طرح تاریخ کی
کتابیں ایک طرح کا اسٹور بن گئیں جن
میں دونوں طرح کی روایتیں موجود ہیں، روایات
کی تنقیح کا دارومدار ان اقتباسات سے
فائدہ اٹھانے والے کے ذوق ورجحان پر
رہ گیا، صحیح اور منکر روایات کا تعین بعد میں
آنے والا کاتب اپنے عقیدہ کے مطابق
ہی کر سکتا ہے۔

ان قصوں کو آپس میں ایک دوسرے
سے مربوط کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا
کہ حکومت وقت کا ساتھ دینے والوں کو
اپنی بات مشہور کرنے کا زیادہ موقع تھا، ان
پر پابندی نہیں ہوتی بلکہ ان کی ہمت افزائی
ہوتی ہے، وہ رائی کا پہاڑ بنا سکتے ہیں
اور پہاڑ کو رائی بنا سکتے ہیں

اور جو لوگ ڈرے سہمے "یکتم ایمانہ"
کی حیثیت والے ہیں وہ اپنی نسل کو صحیح
حالات سے باخبر کرنے کے لئے اپنی معلومات
ان تک منتقل کراتے ہیں اور ان کے اندر
بھی کبھی تناقض پایا جاتا ہے کہ وہ
سب مشورہ کر کے ایک رپورٹ تو تیار نہیں
کرتے تھے مختلف مقامات کے لوگ تھے
جن کے درمیان مسافات طویل تھیں۔

حکومت وقت کے خلاف زبان
کھولنا آسان کیا۔ اپنی موت کو دعوت دینا
ہوتا ہے، وہ دور جس میں کربلا کا واقعہ
پیش آیا۔ ایک شخصی حکومت کا تھا، حاکم وقت
کے دو لبوں کے درمیان سارا قانون (بین
الشفتین) تھا آج بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ جو
شخص حکومت وقت کی مسلمہ سیاست کے
خلاف آواز بلند کرتا ہے اس کو کسی بہانہ

گرفتار کرلیا جاتا ہے، سزادی جاتی ہے اور اس ڈر سے لوگ برملا حکومت کے خلاف زبان نہیں کھولتے حالانکہ چشم زدن میں اس کی گردن نہیں اڑا دی جاتی، اس کو دیواروں میں زندہ نہیں چن دیا جاتا لیکن جب خوف وہراس کا اس دور میں یہ حال ہے تو جب یہ سب کچھ ہوتا تھا۔ اس وقت کتنے ایسے دل گردہ والے ہوں گے جو اپنے مشاہدات وتجربات کا ریکارڈ رکھ سکتے تھے لہٰذا قدرتاً سرکاری! علامیے کو وزنی ثابت کرنے اور افراد کی روایات کو مجروح کرنے کے اسباب موجود رہے اموی حکومت اور اس کے بعد عباسی عہد کے ابتدائی دو سو سال ایسے گزرے ہیں جب کہ تمام خلفائے بنی عباس ناصبی عقیدہ رکھتے تھے اس کا ایک نمونہ حضرت امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مسجد اموی میں جو برتاؤ کیا گیا اور جس کا تذکرہ تمام سیر وسوانح کی کتابوں میں موجود ہے کہ ان سے برسر منبر حضرت معاویہ کے مناقب دریافت کیے گئے، انھوں نے ایک حدیث سنائی جس میں ان شامیوں کو حضرت معاویہ کی توہین معلوم ہوئی انھوں نے منبر سے گھسیٹ کر اتارا اور ان کے خصیوں پر لاتیں مارتے ہوئے باہر لائے اور اسی میں ان کی شہادت واقع ہوئی، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس دور میں کلمہ حق کہنا کس کے بس میں تھا۔ واضح رہے کہ امام نسائی وہ ہیں جن کی سنن، صحاح ستہ میں شمار ہوتی ہے اور وہ شیعہ یا رافضی نہیں تھے، بلکہ اہل سنت کے ائمہ میں تھے۔

تشیع کا الزام:

طبری کے بارہ میں ابن کثیر نے لکھا کہ "کان یتشیع لعلی" اور اس سے یہ سمجھ لیا گیا کہ وہ لکھنؤ کے تبرائی شیعوں کی طرح عقیدہ بدا کے قائل، تحریف قرآن اور افک ام المومنین کو صحیح ماننے والا شخص تھا اور اس طرح جن لوگوں کے بارہ میں یہ لفظ مؤرخین اور سیرت نگاروں نے استعمال کیا ہے ان سب کو ساقط الاعتبار قرار دیکر ان کی روایات کو یکسر نظر انداز کردیا جاتا ہے حالانکہ یہ محض سیاسی اصطلاح تھی، جو لوگ بنو امیہ کے مخالف تھے اور خانوادۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت رکھتے تھے ان کے لیے یہ لفظ رجال کی کتابوں میں بکثرت مستعمل ہے، علامہ ابو زہرہ نے ائمہ مذاہب اربعہ حضرت امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام مالک کی علیحدہ علیحدہ سیرت وسوانح عصر حاضر کے تحقیقی انداز میں لکھی ہیں، اس میں سوائے امام مالک کے تینوں بزرگوں کے بارہ میں لکھا ہے کہ ان کے اندر شیعیت تھی، خاص طور پر امام ابو حنیفہ کی شیعیت تو اس درجہ دکھائی ہے کہ جب حضرت زید بن علی رضی اللہ عنہما نے

ہشام بن عبدالملک کے خلاف خروج کیا تو امام اعظم سے دریافت کیا گیا کہ آیا یہ جہاد ہے؟ تو انھوں نے فرمایا:
خروجه يضاهي خروج رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم بدر، و امدّ جنده بالمال ولكنه كان ضعيف الثقة في انصاره ولذا قال في الاعتذار عن حمل السيف معه[1]

زید بن علی رضی اللہ عنہ کا خروج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدر کے خروج کے مثل ہے انھوں (امام ابوحنیفہ) نے فوج کی مال سے مدد کی، لیکن ان کو انصار زید پر بھروسہ کم تھا۔ اس لئے ان کے ساتھ تلوار اٹھانے سے معذرت کرلی تھی۔

۔ حضرت زید بن علی کا خروج در اصل حضرت حسین کے خروج علی یزید کا اتباع تھا، اس لئے دلالۃ النص سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے خروج کی کیا حیثیت ہوگی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بارہ میں "فیہ نزعۃ شیعیۃ" کا اظہار ان کے استاد حضرت امام مالک کی مجلس میں کیا گیا مگر وہ اپنے موقف سے نہیں ہٹے اور پوری جرأت ایمانی کے ساتھ یہ شعر کہا:

فإن كان رفضا حب آل محمد
فليشهد الثقلان إني رافضي[2]

"اگر آل محمد کی محبت ہی رفض ہے تو جن وانس گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں۔"

لوگوں کو امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے عقائد میں بھی شیعیت جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے کیونکہ وہ حضرت سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کی خلافت راشدہ کے بارہ میں اگر کسی نے تردد کا اظہار کیا تو انکو غصہ آجایا کرتا تھا اور بقول ابوزہرہ وہ فرماتے تھے:

مَن لم يثبت الإمامة لعلي فهو أضل من حمار"

جو حضرت علی کی خلافت کا قائل نہیں ہے وہ حمار سے زیادہ گمراہ ہے۔

اور ان کا یہ بھی قول تواتر سے منقول ہے کہ:

الخلافة لم تزين عليا بل علي زينها. خلافت نے علی کو شرف نہیں بخشا بلکہ علی نے خلافت کو عزت دی۔

اور فرماتے تھے: علي بن أبي طالب من أهل بيت لا يقاس بهم أحد
علی ابن ابی طالب اہل بیت (رسول اللہ) ہی ہیں ان پر کسی کو قیاس نہیں کیا جا سکتا

نیز فرمایا:
ما لأحد من الصحابة من الفضائل بالاسانيد الصحاح مثل ما لعلي رضي الله عنه. (یعنی صحیح حدیثوں میں علی کے جتنے فضائل ہیں وہ کسی کے بھی نہیں ہیں

اسی طرح بخاری کے رواۃ اور تقتلہ الفئۃ الباغیۃ کے راویوں کے اندر بھی

---

[1] ابوحنیفہ حیاتہ وعصرہ لابی زہرۃ ص ۱۶۴۔
[2] ما یلعنت کر العصر ... تاریخ ... ص ۱۴۴

شیعیت کا سراغ لگایا گیا ہے حالانکہ
ان میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جس کو خلافت
راشدہ کی اس ترتیب پر اعتراض ہو جو پیش
آئی، حضرت صدیق اکبر، فاروق اعظم،
عثمان غنی اور علی مرتضیٰ ہر ایک کو اپنی
جگہ پر خلیفہ راشد اور اپنے اپنے وقت
میں ہر ایک کو دوسروں کے مقابلہ میں
اشرف و افضل سمجھتے تھے لیکن اس کے
باوجود محض اہل بیت نبوی سے عقیدت
و محبت کی بنا پر ان کو شیعیت سے قریب
بتایا گیا، لہٰذا ابن کثیر نے اگر طبری کے
بارہ میں تشیع کا الزام لگایا یا رواۃ الاحادیث
کے بارہ میں کسی کو شیعہ کہہ دیا گیا تو اس کے
ہرگز یہ معنی نہیں کہ وہ امامیہ یا زیدیہ قسم
کے شیعہ تھے اور ان کی روایتیں ناقابل
اعتبار ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مصنف نے کربلا کا واقعہ
بیان کرنے اور اس کے پس منظر کو واضح
کرنے میں جن روایات کو منکر اور گمراہ کن
کہا ہے ان کے منکر اور گمراہ کن ہونے کا
سبب یہ کافی نہیں ہے، یا صرف اس لئے
کہ وہ مصنف کے لئے العیاذ باللہ اور
استغفر اللہ کے ضمن کی چیز ہے۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ کی صفائی
اور ان کا دفاع صحابہ سے خوش عقیدگی
کا تقاضا ہے، مصنف نے ان کو گورنری
کے طمع سے بری قرار دیا ہے یہ اچھی بات
ہے مگر اس حسن ظن کے اور لوگ بھی تو
مستحق تھے، خاندان نبوت کے چشم و چراغ
اور پروردہ آغوش علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما کی
کیا جاتا ہے

طرف سے اسی طرح کا دفاع کیوں نہیں کیا جاتا جب کہ
دوسروں کا دفاع کرنے کی بنیاد معروضی
نہیں محض خوش گمانی پر قائم ہے لیکن
حضرت حسین کے سلسلہ میں صرف اموی
عہد کی ان ظالمانہ اور مجرمانہ سرکاری
رپورٹوں کو بنیاد بنا کر تحقیق کی عمارت
کھڑی کی گئی اور سرکاری سطح کی تیار کردہ
عوام پسند نقولوں سے مرتب کی ہوئی
تقریروں کو جو حضرت معاویہ اور یزید کی
طرف منسوب ہیں ان کو عقیدت کے چوکھٹے
میں سجا کر پیش کیا جاتا ہے۔

مصنف نے یزید کے اشعار اور اس
دور کے نظم و نثر کے مجموعوں کو ناقابل التفات
سمجھا ہے جو اس عہد کی ایسی تصویریں
ہیں جو جانبداری کے رنگ و بو سے دور
ہیں، اسی طرح عصر حاضر کے محققین
جن کا طرز بحث موضوعی ہے اور فکری طور
پر وہ کسی گروہ کے پابند نہیں ہیں جیسے
عباس محمود العقاد، عبدالقادر مازنی،
سید قطب، احمد امین وغیرہ ان کو یکسر
نظر انداز کر دیا ہے،

مصنف کا انداز تحقیق وہی ہے جس
کو آجکل کی اصطلاح میں PRESUMPTIVE
(STUDY) کہا جاتا ہے پھر بھی
یقین ہے کتاب مصنف کے ہم خیال طبقہ میں دلچسپی
سے پڑھی جائے گی، البتہ چلتے چلاتے

علامہ سید زینی دحلان کا وہ فقرہ نقل کردینا چاہتا ہوں جو انھوں نے ابو بکر ابن العربی کی "العواصم من القواصم" کے رد "شرالقاصمہ" میں تحریر فرمایا ہے، وہ کتاب میرے سامنے اس وقت نہیں ہے مگر اس کا مفہوم یہ ہے۔

"حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی مخالفت ناشی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت سے، وہ لوگ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا دل صاف نہیں رکھتے اور نہ ہی آپ سے اپنی بیزاری و کراہت کو ظاہر کرنے کی جرأت رکھتے ہیں وہ اس راستہ سے اپنے دل کا بخار نکالتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے:

قد نعلم أنه ليحزنك الذي يقولون فإنهم لا يكذبونك ولكن الظالمين بآيات الله يجحدون

ہم کو معلوم ہے کہ ان کی باتیں تم کو رنج پہونچاتی ہیں مگر تمھاری تکذیب نہیں کرتے، بلکہ ظالم خدا کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں۔

اسی طرح یہ لوگ حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عناد کا اظہار کرتے ہیں"

اس تبصرہ میں صرف اصول بحث اور طریق فکر سے بحث کی گئی ہے پوری کتاب کے تمام مندرجات پر بحث کرنا اور ان کا رد لکھنا نہ پیش نظر ہے اور نہ اس کا وقت ہے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے جب کوئی اس طرح کے مسائل پر گفتگو کرنا چاہتا تو وہ یہ آیت، پڑھا کرتے تھے۔

تلك امة قد خلت، لها ما كسبت ولكم ما كسبتم ولا تسئلون عما كانوا يعملون.

یہ جماعت گذر چکی ان کو ان کے اعمال کا بدلہ ملے گا اور تم کو تمھارے اعمال کا اور جو عمل وہ کرتے تھے ان کی پرسش تم سے نہ ہوگی۔

ضمیمہ ۲

(عریضہ بخدمت جناب مولانا عبداللہ عباس ندوی)

دفتر الفرقان لکھنؤ
۱۷ مارچ ۹۲ء

مکرمی و محترمی جناب مولانا عبداللہ عباس ندوی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اپنی کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" پر آپ کا تبصرہ تعمیر حیات (۱۰ مارچ ۹۲ء) میں پڑھا۔ مجھے اس تبصرے پر قدرتی طور سے اُس وقت بھی حیرت ہوتی۔ جبکہ اسکی یہ حیثیت آپکے ذاتی تبصرے کی ہوتی۔ کیونکہ میرا بہت گہرا نہ سہی پھر بھی کم از کم چالیس برس کا اس درجہ کا تعلق آپ سے ضرور تھا کہ اپنے اور اپنی کتاب کے بارے میں اس انداز کے تبصرے کی توقع آپ سے نہیں کر سکتا تھا، چاہے وہ کتنی ہی ناپسند آپ کو ہوتی۔ لیکن یہ تبصرہ اور بھی زیادہ حیرت کا باعث اس بنا پر ہوا ہے کہ آپ کے قلم سے یہ ندوۃ العلماء کے ترجمان "تعمیر حیات" کے تبصرے کی حیثیت سے نکلا ہے۔ اور مزید برآں، آپ خود ندوے کے اُن فرزندوں ہی میں سے نہیں جن پر ندوہ فخر کرتا ہے بلکہ اُسکے تعلیمی معتمد جیسے اعلیٰ منصب پر بھی فائز ہیں۔ اور ناظم ندوہ حضرت مولانا علی میاں کے نائب کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

اس پہلو سے آپ کے تبصرے پر میری حیرت دو باتوں پر مبنی ہے:۔

۱۔ یہ کہ ندوے کی تحریک "وصل" کے لئے اُٹھی تھی، نہ کہ "فصل" کے لئے۔ اسکے مقاصد کی تحریر میں ایک مقصد کا بیان آج بھی یا یں طور پایا جاتا ہے کہ "اتحاد ملی اور اسلامی اُخوت کے جذبات کو فروغ دیا جائے۔ (روداد چمن۔ مرتبہ سید محمد الحسنی مرحوم ص ۲۴)

۲۔ یہ کہ میں اگرچہ ندوے کا فرزند نہیں ہوں۔ مگر ۱۹۴۸ء سے، جب سے کہ میں نے اپنے والد ماجد

کے ساتھ لکھنؤ میں قیام اختیار کیا، میرا تعلق ندوہ اور اہلِ ندوہ سے بالکل ایسا ہی رہا ہے جیسا کہ ایک گھرانے کے افراد کا ہوتا ہے۔ خود آپ سے بھی شناسائی کی داغ بیل اُسی وقت سے پڑی۔ اور اس ضمن میں ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا علی میاں مدظلہٗ کے ساتھ میرے والد ماجد کے خصوصی اور رفیقانہ تعلق کی بنا پر جو خصوصیت اُس وقت سے آج تک چلی آرہی ہے وہ ندوے کے اندر کس سے مخفی ہے؟

ان دو باتوں کے پیشِ نظر میری سمجھ میں بالکل نہیں آسکا کہ ندوے کا آپ جیسا فرزند جو موجودہ انتظامیہ میں ایک اعلیٰ منصب پر بھی فائز ہے اُس نے ندوے کی روایت اور اسکے مقاصد کی اُس اہم دفعہ کے ہوتے ہوئے جو اُخوتِ اسلامی کے جذبات کی پاسبانی اور فروغ دہی چاہتی ہے، اور اُس پر مستزاد ندوہ اور اربابِ ندوہ کے ساتھ میرے اور میرے گھرانے کے نہایت قریبی اور خصوصی تعلق کے ہوتے ہوئے کیونکہ یہ جائز سمجھا کہ وہ میرے ساتھ تقریباً وہ معاملہ کرے جو ابھی کچھ دن پہلے اس نے عصمت چغتائی نام کی ایک ترقی پسند ادیبہ کے ساتھ اُسے "آگ کا لحاف" اڑھا کر کیا تھا، یا بدنام رشدی کا مماثل مجھے ٹھیرائے؟

آپ نے میری کتاب پڑھ کر محسوس کیا کہ میرے دل میں معاذ اللہ عداوتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا روگ پایا جاتا ہے۔ کتاب تبصرے کے لئے جانے اور تبصرہ شائع ہونے کے بیچ میں آپ سے کئی بار ملاقات ہوئی، کیا اُخوتِ اسلامی کے ماتحت اور مزید اُن رشتوں کے ماتحت جن کا میں نے اوپر تذکرہ کیا، میرا یہ حق نہیں سمجھا جانا چاہیئے تھا کہ آپ مجھے میری ایمان سوز بدنصیبی کی طرف ایسے مناسب انداز میں توجہ دلا دیتے جس سے توقع کی جاسکتی کہ میں اپنی اس بدنصیبی کا احساس کرکے اُس سے نجات پانے کی کوشش کروں گا۔ اور آپ کا احسان مند ہوں گا؟ اس کے بجائے آپ نے مجھے سمجھانے اور برادرانہ انداز سے متنبہ کرنے کے تمام مواقع ٹال کر یہ تبصرہ شائع کرایا جس میں پوری پوری صلاحیت اس بات کی ہے کہ وہ مجھ پر شیطان سوار کرا دے۔ اور یہ جو چالیس بیالیس۴۲ برس کی ایک یگانگت اور باہمی

تعلق و احترام کی صورت بنی ہوئی ہے وہ چشم زدن میں سوخت ہو کر اپنی جگہ ایک "مہابھارت" کو جنم دیدے!___ ہرچند کہ مجھے آپ کا جیسا اچھا لکھنا نہ آتا ہو مگر اس میں تو شاید آپ کو بھی شک نہ ہو گا کہ تھوڑا بہت تو میں بھی لکھ ہی لیتا ہوں، اور ایک زمانہ پہلے تو اس طرح کے معرکوں کا بہت عادی رہا ہوں، مگر اللہ کا شکر ہے کہ اپنوں سے سر ٹکرانے کی تو پہلے بھی عادت نہ تھی۔ اور اب تو طبیعت کا انداز اسقدر بدل گیا ہے کہ بڑی سے بڑی اختلافی بات بھی بالکل غیر جذباتی انداز ہی میں کرنے کو جی چاہتا ہے۔

انداز سے قطع نظر آپ کے تبصرے کے نکات پر بھی کئی باتیں کہنے کی تھیں۔ مگر اس سلسلے میں آپ سے مخاطب ہو کر کچھ بھی کہنے کو اس لئے طبیعت آمادہ نہیں کہ آپ نے ایک کتاب کو "عالمانہ" تسلیم کرنے کے باوجود اُس کے ساتھ بجائے عالمانہ کے مخاصمانہ اور معاندانہ معاملہ کرنا پسند کیا ہے۔ یہ اوپر کی بات بھی صرف اس مجبوری سے لکھی ہے کہ ندوہ اور اہل ندوہ کے اور بالخصوص حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء سے جو تعلق چالیسؔ برس پہلے قائم ہو گیا تھا اس کو جس آزمائش میں آپ کے اس تبصرے نے ڈال دیا ہے شاید میری اس گذارش کے نتیجے میں اس سے خلاصی کی کوئی سبیل نکل آئے۔ اور اسی لئے میں اس کی ایک کاپی حضرت مولانا علی میاں کی خدمت میں بھی ارسال کر رہا ہوں۔

والسلام

خیر اندیش

عتیق الرحمٰن سنبھلی

باقی صفحہ ۴۵ کا

ان مؤرخین کو شیعہ قرار دیا ہے اور نہ ان کی روایتیں اس بنیاد پہ ردّ کردی ہیں۔ بلکہ کتاب کا زیادہ تر مواد انہی دونوں کی روایتوں پر مبنی ہے۔ والسلام

خیر اندیش

عتیق الرحمٰن سنبھلی

ضمیمہ ۳

(مراسلہ بخدمت ایڈیٹر صاحب تعمیر حیات)

از عتیق الرحمن سنبھلی
لکھنؤ ۱۸ر مارچ ۹۲ء

محترمی ایڈیٹر صاحب تعمیر حیات لکھنؤ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ نے میری کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" پر اپنے مؤقر جریدے کی اشاعت ۱۰ر مارچ ۹۲ء میں تبصرہ شائع فرمایا ہے۔ میں اس کے لئے شکر گزار ہوں۔

تبصرہ نگار اپنی رائے کے اظہار میں آزاد ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ رائے صاحب کتاب کو پسند ہی آئے۔ یا وہ اسے مبنی بر انصاف ہی سمجھے۔ لیکن کتاب کے بارے میں تبصرہ نگار کے قلم سے اگر کوئی ایسا بیان نکل گیا ہو، جو واقعہ اور اصلیت کے بالکل ہی خلاف ہو یا ایسی کوئی بات لکھدی گئی ہو جس سے کتاب یا مصنف کے بارے میں خواہ مخواہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہو تو یہ توقع کرنا غالباً معقول ہوگا کہ مصنف اگر اس سلسلے میں کوئی وضاحت یا اظہار حقیقت کرنا چاہے تو مدیر جریدہ کی طرف سے اس کو تعاون میسّر آئے گا۔ میں اسی توقع پر مذکورہ تبصرہ کی چند باتوں کے بارے میں نہایت اختصار سے کچھ وضاحت یا اظہار حقیقت یہاں کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ آپ کے فاضل تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ :۔

"اس ۲۶۴ صفحات پر مشتمل کتاب کا مفروضہ تحقیقی نتیجۂ بحث (HYPOTHESIS) یہ ہے کہ :۔ یزید ایک مسلمان خدا ترس پاک سیرت، خلیفۂ برحق تھا جس کی ولی عہدی عین کتاب وسنت کے مطابق اور اسلامی مقاصد کیلئے عمل میں آئی تھی۔ اور اُسکے

مقابلے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ ایک ناعاقبت اندیش، شہنشاہیت کے طالب بلاوجہ اپنی جان گنوانے والے شخص تھے“

مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میری کتاب کے بارے میں آپ کے تبصرہ نگار کا یہ بیان واقعے سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ کتاب کے ۲۶۴ صفحات میں سے کسی ایک صفحے اور ایک سطر کے اندر میرے قلم سے میرے علم کی حد تک کوئی ایسی بات نہیں نکلی جس سے مذکورۂ بالا نتیجہ نکالا جاسکتا ہو۔

غالب گمان یہ ہے کہ تبصرہ نگار کو اپنے اُن خاص خیالات کی وجہ سے جو انھوں نے بہت تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اپنے اس تبصرے میں واقعۂ کربلا سے متعلق ظاہر کئے ہیں، یہ کتاب اتنی ہی ناگوار گزری ہے جتنی کہ محمود احمد عباسی مرحوم کی کتاب گزری تھی، جس کا انھوں نے اس موقع پر نام بھی لیا ہے۔ اس لئے جو بات اس کتاب کے حق میں کہی جانی بجا تھی وہی اُنکے نزدیک میری کتاب کے حق میں لکھدی جاتی بھی بجا ہو گئی۔ حقیقت اللہ بہتر جانتا ہے۔

میری کتاب کے باب ششم میں ایک جگہ (ص۱۳۰-۱۳۱) یزید کے بعض مشہور عیبوں کی روایات کو اُسکے ایک خطبے کی بنیاد پر مستبعد ٹھیرایا گیا تھا۔ مگر پھر فوراً ہی یہ خیال کر کے کہ معاملہ بڑا نازک ہے کہیں خواہ مخواہ کسی نازک طبع کو غلط فہمی نہ ہو۔ فوراً ہی ایک استدراکی پیراگراف لکھا گیا کہ:-

”...... یہ بات اچھی طرح سمجھ لی جائے کہ مذکورہ بالا خطبے سے ہم صرف یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ بندروں، ریچھوں کے ساتھ کھیلنے والا، شراب و کباب میں غرق، لہو ولعب میں مست اور زنا و قمار کا رسیا نظر نہیں آتا...... رہا یہ کہ وہ کوئی بڑا متقی پرہیزگار ہو، یہ اس خطبے سے نہیں نکالا جاسکتا ہو بھی سکتا ہے۔ اور نہیں بھی ہو سکتا۔ اور غالب گمان یہ ہے کہ ایسا نہیں تھا......“ ص۱۳۱

تعمیر حیات کا تبصرہ پڑھ کر معلوم ہوا کہ یہ احتیاط بھی کسی کام کی نہ ثابت ہوئی۔ فالی اللہ المشتکیٰ۔

رہا حضرت حسین رضؓ کا معاملہ تو کتاب کا ہر قاری بذات خود دیکھ سکتا ہے کہ کتاب میں

جہاں جہاں آپ کا ذکر آتا ہے (اور آپ سے زیادہ آتا ہی کس کا ہے؟) وہاں کس انداز سے، کن الفاظ سے، اور کن صیغوں میں یہ ذکر آتا ہے۔ یہ ادب و اکرام کے صیغے ہیں یا تنقیص و تخفیفِ شان کے انداز؟ البتہ اگر قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ مصنّف کی طرف سے آپ کی عظمتِ شان کی تمام تر نگہداری کے باوجود واقعات کی جو شکل سامنے آتی ہے وہ بالعموم آپ کے شایانِ شان نظر نہیں آتی۔ تو مجھے بھی اعتراف ہے کہ اُس کا یہ احساس صحیح ہے۔ اور یہ بھی اعتراف ہے کہ میں اپنی جیسی تمام کوشش کے باوجود واقعات کی تصویر آپ کے لحاظ سے اس سے بہتر شکل میں پیش کرنے کے قابل نہ ہو سکا۔ اور بے شک اس تصویر کے سامنے آنے پر آپ کے حفظِ شان کے اُن تمام اہتمامات اور رعایتوں کے باوجود جو کتاب میں ملحوظ رکھی گئی ہیں، ایک قاری کا وہ تأثر بھی ہو سکتا ہے جس کا اظہار تبصرہ نگار کے الفاظ کرتے ہیں کہ معاذ اللہ آپ نے محض طلب اقتدار اور ناعاقبت اندیشی میں اپنی جان گنوادی۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں محمود احمد عباسی جیسے لوگوں کا پاؤں پھسل گیا ہے ـــ لیکن اگر وہ قاری بے صبری نہیں کرتا اور کسی نتیجے پر پہنچنے کیلئے مصنف کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کتاب کے آخری باب تک پہنچ جاتا ہے تو وہاں اُسے امام ابن تیمیہ ملیں گے جو اسکی مشکل کو حل کرنے کیلئے فرمارہے ہونگے کہ یہ جو واقعات کا ایک عجیب سا سلسلہ اور سمجھنے نہ سمجھانے کا ایک معمّہ نظر آرہا تھا، یہ بس "اِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِّمَا يَشَاءُ" (سورۂ یوسفؑ) کی ایک کرشمہ آرائی تھی: تاکہ سبطِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو شہادت کے مرتبے سے سرفرازی ملے ـــ الغرض کتاب نے جس نتیجے تک پہنچانے کی کوشش کی ہے وہ تو یہ ہے۔ آگے آدمی کی مرضی ہے وہ جہاں چاہے پہنچے۔

۲۔ فاضل تبصرہ نگار نے یوں تو میری اس کتاب کی بناپر مجھے حضرت حسینؓ ہی سے نہیں خود حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بغض و عداوت کا مجرم ٹھہرادیا ہے۔ مگر اس کے لئے انھوں نے کتاب کے کسی مقام کا کسی بھی طور سے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ اس لئے میں اس پر کوئی گفتگو نہ کرونگا۔ البتہ اپنے اس تأثر کے تحت کہ واقعۂ کربلا کا مصنّف معاذ اللہ حضرت حسینؓ کی تذلیل و تحقیر کے درپے ہے، موصوف نے ایک گفتگو یہ کی ہے کہ حضرت حسینؓ کی یزید کے پاس جانے کی پیش کش کے

الفاظ میں جو "وضع الید فی الید" کی تعبیر آتی ہے اُس کا یہ مفہوم بیان کرنا کہ آپ یزید سے بیعت یا خود سپردگی کیلئے تیار ہو گئے تھے صحیح نہیں ہے۔ اور اسکی کوئی سند عربی محاورے سے پیش نہیں کی جا سکتی۔ اسکے بجائے صحیح مفہوم (یا اُن کے اصل الفاظ میں "واضح مفہوم") یہ ہے کہ آپ "صلح جو انداز میں یزید سے بات چیت کیلئے" تیار ہو گئے تھے۔ اس بارے میں وضاحت کے لئے میری گزارش یہ ہے کہ اگرچہ موصوف نے خود اپنے بیان کردہ مفہوم کیلئے بھی عربی محاورے کی کوئی سند نہیں پیش کی ہے۔ مگر راقم الحروف انکے قول ہی کو سند سمجھ کر اُن کی اس تصحیح یا ترمیم کو بلا کسی بحث کے بسر و چشم قبول کر لینے کیلئے تیار ہے، اگر اس میں حضرت حسین کی عزت و حرمت کا پاس زیادہ ہے۔ مگر اصل معاملے میں اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ اصل معاملہ یہ نہیں ہے کہ حضرت حسین بیعت و سپردگی کیلئے تیار ہوئے تھے یا صلح جویانہ بات چیت کیلئے۔ اصل معاملہ جس کی بنا پر کتاب میں وضع الید فی الید کے الفاظ پر زور دیا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ آپ یزید کی خلافت و حکومت کو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہو گئے تھے یعنی یہ کوئی ایسا باطل نہیں تھا کہ اس سے کسی حال میں صلح کی ہی نہ جا سکتی ہو۔ کسی حال میں اُسے گوارا ہی نہ کیا جا سکتا ہو۔ غور فرمایا جائے تو صلح جوئی کے لئے تیار ہونے سے بھی یہی بات لازم آتی ہے۔

۳۔ خاکسار نے کتاب کے مقدمہ میں صراحتہً لکھا ہے کہ واقعۂ کربلا کی روایات میں جھوٹ اور سچ کی اس بلا کی آمیزش ہے کہ جن روایات کو ہم نے کسی بنیاد پر صحیح یا قابلِ ترجیح قرار دیا ہے، ان کو بھی فی الواقع اور سو فی صد صحیح کہنے کی ذمہ داری ہم نہیں اُٹھا سکتے" کتاب کے مقدمے میں اس صراحت کے ہوتے ہوئے تبصرہ نگار کا یہ لکھنا کہ جن کتابوں کو مصنف نے بظاہر صحیح اور قابلِ قبول قرار دیا ہے کیا ضروری ہے کہ وہ درحقیقت بھی صحیح ہوں؟ اسکو سوائے اس کے کیا سمجھا جائے کہ خاکسار مصنف کی یہ صراحت فاضل تبصرہ نگار کی نظر سے چوک گئی۔

۴۔ آپ کا تبصرہ یہ تأثر دیتا ہے کہ مصنف نے طبری اور ابن اثیر کو شیعہ قرار دیا ہے اور اسی بنیاد پر ان کی روایتیں رد کر دی ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہ کہیں مصنف نے (باقی صفحہ ۴۱ پر)

ضمیمہ ۴

ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں کا صحابہ کرام کے بارے میں مسلک و عقیدہ

صحابۂ کرامؓ کے تعارف اور انکی سیر و سوانح کے سلسلہ میں ندوۃ العلماء کے سرپرستوں اور فضلاء کا امتیاز اور کارنامہ

از:۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

"تعمیر حیات" کی اشاعت مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۹۲ء میں ڈاکٹر مولوی عبداللہ عباس صاحب ندوی کا ایک مضمون "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ جس میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے بارے میں بعض ایسے خیالات اور تاریخی تجزیہ و تبصرہ آیا ہے جس سے ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، اسلئے ندوۃ العلماء کے بانیوں، ذمہ داروں اور کارکنوں کے بارے میں وضاحت کی ضرورت سمجھی گئی ہے جو پیش نظر ہے۔

ندوۃ العلماء کے بانی، ذمہ دار اور کارکن اہل سنت والجماعۃ کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی کے متفقہ اور تحقیقی مسلک کے مطابق "الصحابۃ کلہم عدول" (صحابۂ کرام سب صادق و امین اور معتبر ہیں۔) کے قائل ہیں۔ اور ان کا ایمان ہے کہ تربیت نبوی اور شرف صحابیت کی وجہ سے وہ سب حیاتِ جاہلیت (عہد قبل اسلام) کے اثرات سے ممکن اور زیادہ سے زیادہ قابلِ تصور حد تک پاک اور محفوظ ہو گئے تھے۔ محققین اور راسخین اہلِ سنت کا عقیدہ ہے کہ امت کا بڑے سے بڑا صاحب صلاح و فضائل فرد، صاحب کرامات و خوارق بزرگ کسی غیر مشہور سے غیر مشہور صحابی کے درجہ کو نہیں پہونچتا ہے۔ کہ صحبت نبوی مقبولیت عند اللہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

حضرت ابوسفیان بن حربؓ (والد امیر معاویہ رضی اللہ عنہما) اسی جماعت کے فرد ہیں۔ اور شرفِ صحابیت کے علاوہ ان کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ انکی صاحبزادی

حضرت ام حبیبہؓ ازواج مطہرات میں سے ہیں، حضرت ابوسفیان نہ صرف اسلام سے مشرف ہوئے بلکہ جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہوئے، اور اس میں پامردی اور استقامت دکھائی اور زخمی ہوئے جو انکی قوت ایمانی اور اخلاص کی دلیل ہے۔

اسی کے ساتھ ائمہ اہل سنت اور اس گروہ کے تمام محقق و معتبر علماء اور نمائندوں کا اس پر اتفاق ہے کہ خلافت راشدہ امیر المومنین سیدنا علی کرم اللہ وجہہ پر ختم ہوگئی، حضرت معاویہؓ اور ان کے جانشینوں کی حکومت احادیث صحیحہ کے مطابق (جن میں خلافت راشدہ کی مدت کے بارے میں تیس سال کی پیشین گوئی فرمائی گئی ہے) "خلافت راشدہ نہیں تھی، یہی حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ[1] اور آخر میں امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کا مسلک اور تحقیق ہے،[2]

اسی طرح گروہ اہل سنت یزید بن حضرت معاویہؓ کو اس دور خیر و برکت میں جماعت صحابہ اور صالحین امت پر حکومت کرنے کا مستحق نہیں سمجھتا اور ان کو (معتبر تاریخ و سیر کی روشنی میں) اس دینداری اور صلاح و تقوی کے معیار پر پورا اترتا ہوا نہیں پاتا۔ جو ایک مسلمان حاکم اور فرماں روا کے لئے (کم سے کم) اس عہد میں ضروری تھا، بلکہ ان کو بہت سے ایسے مشاغل و عادات کا مرتکب دعادی جانتا ہے۔ جو شرعی حیثیت سے قابل تنقید و مذمت ہیں، پھر انہیں کے عہد میں واقعہ حرّہ جیسا سنگین اور قابل شرم واقعہ پیش آیا جس کی کوئی تاویل ممکن نہیں، یہی رائے امام احمد بن حنبل[3] اور شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ کی ہے[4] دونوں نے سخت الفاظ میں یزید کی مذمت کی ہے، لیکن وہ لعن و طعن، سب و شتم اور تبرا سے محترز اور مجتنب اور رفض و تشیع سے بیزار اور اس کے منکر و مخالف تھے۔[5]

اس کے نتیجہ میں اور اس پس منظر میں محققین اہل سنت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام کو درست سمجھتے ہیں، جو انہوں نے یزید کے معاملہ اور مقابلہ میں اختیار کیا اور ان کو برسر صواب، شہید راہ حق اور امت کے لئے ایک نمونہ پیش کرنے والا باور کرتے ہیں۔

اگر ایک جمی جمائی حکومت کے

---

[1] ملاحظہ ہو ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ص ۱۴۶

[2] "خلفائے راشدین" از مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی ص ۳۱ مطبوعہ مکتبہ فاروقیہ ۱۴۱۱ھ ۱۹۹۱ء

[3] ملاحظہ ہو فتاوی ابن تیمیہ ج ۴ ص ۴۸۳ طبع اول ۱۳۸۱ھ الریاض

[4] فتاوی ابن تیمیہ ج ۴ ص ۴۸۷

[5] ملاحظہ ہو شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کی معرکۃ الآراء کتاب "منہاج السنۃ"۔

خلاف جس کا حاکم وفرماں روا مسلمان ہو، لیکن اس کی سیرت غیر اسلامی، اس کے اخلاق وعادات قابل تنقید ہوں اور اس سے مسلمانوں کے اخلاق اور اسلامی معاشرہ پر برُے اثرات کے پڑنے کا اندیشہ ہو، کسی قسم کا اقدام، خروج وبغاوت اور انتشار انگیزی کے مرادف قرار دیا جائے تو پھر خاندان سادات ہی کے ان تین صاحب عزیمت افراد، زید شہید، محمد ذی النفس الزکیہ، اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبد اللہ المحض کے متعلق کیا رائے قائم کی جائے گی، جن میں سے اول الذکر نے اموی خلیفہ ہشام ابن عبد الملک ابن مروان اور دو آخر الذکر حضرات نے خلیفہ منصور عباسی کے مقابلہ میں علم جہاد بلند کیا جو بہر حال یزید سے غنیمت اور کہیں بہتر تھے، اور دو عظیم الشان فقہاء اور مذاہب فقہیہ اہل سنت کے جلیل القدر بانی امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہ نے ان کی کھل کر تائید وحمایت فرمائی، حضرت زید بن علی بن حسین نے جب ہشام ابن عبد الملک کے خلاف علم جہاد بلند کیا تو امام ابو حنیفہؒ نے دس ہزار درہم ان کی خدمت میں بھیجے اور حاضری سے معذرت کی۔[1]

جہاں تک ندوۃ العلماء کے ادارہ اور اس کے فضلاء اور نمائندوں کے احترام صحابہ کے عقیدہ اور جذبہ اور ان کے کارناموں اور عظمت کے اظہار واشاعت کے کارنامہ کا تعلق ہے، کم ادارے اور مجالس علمیہ (نہ صرف ہندوستان میں بلکہ موجودہ عالم اسلام میں) اس کا مقابلہ کر سکتی ہیں، اسی ادارہ کے ایک سرپرست اور نامور نمائندہ علامہ شبلی نعمانی کے قلم سے "الفاروق" جیسی عظیم الشان تصنیف نکلی، جس کی کسی اسلامی زبان میں اپنی طاقت اور برجستگی، محکم استدلال اور بلند علمی معیار میں مثال نہیں ملتی، ندوۃ العلماء کے دوسرے جلیل القدر حامی و داعی اور سرپرست رکن، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے قلم سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی سیرت میں "سیرۃ الصدیقؓ" کے نام سے وہ کتاب نکلی جو اپنی تاثیر اور ایمان افروزی میں کم سے کم اردو میں بے مثال ہے، اسی طرح علامہ سید سلیمان ندویؒ کی "سیرت عائشہؓ" وہ فاضلانہ ومحققانہ کتاب ہے جس کے ترجمہ کی خود عربی میں ضرورت سمجھی گئی، ندوہ کے ممتاز فضلاء مولانا عبد السلام ندویؒ کے قلم سے "اسوۂ صحابہؓ" (۱-۲) جیسی شاندار اور مفصل کتاب اور "اسوۂ صحابیات" حاجی معین الدین ندوی کے قلم سے "خلفائے راشدین" معین الدین احمد ...

---

[1] ملاحظہ ہو مناقب ابی حنیفہؒ ج ۱ ص ۵۵ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی" ... مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانیؒ

ندوی کے قلم سے "مہاجرین" اور آخرالذکر کے قلم سے "سیر الانصار" کے بعض حصے نکلے۔ لہ

لہ یہ سب کتابیں علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی سرپرستی میں قائم اور جاری عالمی شہرت کے ادارہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کی طرف سے شائع ہوئیں اور علمی حلقوں میں مقبول و متداول ہیں۔

الحمدللہ اس ادارہ کے ذمہ دار اور نمائندے اب بھی اسی عقیدہ و مسلک اہل سنت پر قائم ہیں، اور اب بھی اردو عربی اور انگریزی میں اس مبارک عہد اور اس کے رہنماؤں اور اسلام کے اولین اور بہترین نمائندوں کے تعارف، ان کے حالات اور کارناموں کی اشاعت اور ان کے اتباع اور احترام کی دعوت کا وقیع اور مؤثر کام کر رہے ہیں، ان کی تصنیفات کے تراجم ترکی، انڈونیشی، انگریزی اور فرنچ زبانوں میں کیے جا رہے ہیں اور ان ملکوں کا علمی طبقہ انکو وقعت اور عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے

عتیق الرحمٰن سنبھلی

زاغوں کے تصرّف میں عُقابوں کا نشیمن

تعمیر حیات کا تبصرہ آپ نے پڑھ لیا۔ اب تک کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جو یہ تبصرہ پڑھ کر ہم سے ملا ہو اور یہ سوال نہ کیا ہو کہ کیا ان تبصرہ نگار صاحب کو صحابۂ کرام کے ایک گروہ کے ساتھ بغض کے علاوہ آپ سے بھی کوئی عداوت و عناد ہے؟ ہو سکتا تھا کہ ہمارے اس بیان کو مبالغہ یا اپنی مظلومیت کا تأثر دینے کیلئے افسانہ طرازی پر محمول کر لیا جاتا۔ مگر اللہ کی کارسازی کے قربان، کہ اُس نے ایک طرح سے "وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا"[1] (شہادتِ یکے از اہلِ خانہ) کی صورت پیدا فرمادی۔ آئندہ صفحات میں آپ اس تبصرے کا ایک اور تجزیہ پڑھیں گے جو ایک ایسے ندوی فاضل کے قلم سے ہے جو اپنے علمی خلوص اور ترقیوں کی بدولت اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ مطالعہ علوم اسلامیہ (ISLAMIC STUDIES) کے پروفیسر کا منصب رکھتے ہیں۔ راقم کو اُن سے کوئی تعارف اور ملاقات یاد نہیں جو امسال فروری میں علی گڑھ کے سفر سے پہلے ہوئی ہو، اگرچہ وہ اس طرح ملے جیسے ایک واقف کار ہی نہیں ایک محب اور قدرداں ملتا ہے، (کیونکہ بقول اُن کے وہ الفرقان پڑھنے والوں میں سے تھے، اور ندوے کی طالب علمی کے دور سے مجھے جانتے تھے) اور بہت ہی خلوص اور تواضع کے ساتھ اپنی یونیورسٹی میں پہنچنے والے اس مسافر کی پذیرائی کی۔ مجھے وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ یہ (پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی) صاحب بھی اس تبصرے سے نہ صرف بدمزہ ہونگے بلکہ اس کا ایک

---

[1] سورۂ یوسف آیت ۲۶ (قصہ حضرت یوسف علیہ السلام)

مفصّل علمی اور اخلاقی رد لکھنے کو اس طرح مضطرب ہوں گے کہ:۔

گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا[1]

کے مصداق اُن کا یہ سولہ صفحات کا تجزیہ اُس وقت (۱۶ر اپریل کو) لکھنؤ آجائے گا جبکہ یہاں اس معاملہ میں لکھنا نہ لکھنا ابھی طے بھی نہ ہوا ہوگا۔ اللہ ان کو اس خلوصِ علم اور اعانتِ حق کی اعلیٰ تر جزاء عطا فرمائے۔ اپنے اس مضمون کے ساتھ عنایت نامے میں پروفیسر صدیقی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ:۔

"تعمیر حیات" کے شمارہ میں مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب کا دلخراش تبصرہ پڑھ کر دماغ کھول اُٹھا۔ اس تبصرے پر استدراک بھیج رہا ہوں، ہو سکے تو الفرقان میں شائع کرا دیں۔"

اپنا پہلا تأثر اس تبصرے کو پڑھ کر یہ تھا کہ کیا ندوہ ملّتِ اسلامیہ ہند کی "زبانِ ہوشمند" بھی اب نہیں رہا؟ حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم نے دیوبند اور ندوۃ العلماء کے بارے میں اپنے مطالعے اور تأثر کا نچوڑ ان الفاظ رقم کیا تھا کہ ؎

ہے دلِ روشن مثالِ دیوبند
اور ندوہ ہے زبانِ ہوشمند

اسی شعر کی تلمیح راقم کے اس تأثر میں تھی۔ دوسرے لوگوں نے اپنے اسی قسم کے تأثر کو "بغض و عداوت" ہونے کے الفاظ سے ظاہر کیا۔

ندوے کی "زبانِ ہوشمند" کا بہترین نمونہ تو مولانا شبلی اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کے بعد آج خود ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کی ذات عالی میں موجود ہے ہمیں مولانا کی جن چیزوں سے عقیدت و محبت رہی اور بڑھتی گئی ان میں سے ایک نہایت

---

[1] فارسی شاعر کا مصرعہ، جس کا مفہوم ہے کہ کتے والے ابھی سو کے ہی پڑے تھے کہ ہزاروں میل دور چینی مسلمان احرام باندھ کے کھڑے بھی ہو گئے۔

اہم چیز یہی تھی اور اسے بقدر توفیق اُن سے اخذ کرنے کی بھی کوشش کی آپ نے اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے ایماء پر ردِّ قادیانیت میں کتاب لکھی تو خود قادیانی پریس کا تبصرہ یہ تھا کہ اُن کی زبان میں بڑی شائستگی ہے، اس پہلو سے کوئی شکایت نہیں کی جا سکتی۔ مولانا ایک مُرتد اور مدعی نبوتِ کاذبہ کی تردید میں کتاب لکھیں اور شائستگی زبان پر حرف نہ آنے دیں۔ اور اُن کے تلمیذ رشید، مولانا عباس ندوی، خود مولانا ہی کے سابق منصب مُعتمدی تعلیم، پہ سرفراز ہو کر بھی، مولانا کی شائستہ زبانی کی روش سے اس حد تک بے اعتنائی برتیں کہ ایک ایسے شخص کی کتاب پر لکھتے ہوئے بھی اس شائستہ روش کو اپنانے کی ضرورت نہ سمجھیں جس شخص کا یہی نہیں کہ ندوہ، اُسکے منتسبین اور اکابر و اصاغر سے مختلف سطحوں کا ۴۳ برس پرانا تعلق ہے، بلکہ اُس نے اُن کے استاذ محترم کی، اپنی عقیدت و محبت کی بنا پر، جو مختلف طرح کی قلمی خدمات ایک طویل مدت تک انجام دی ہیں اُن میں سے ایک خدمت یہ بھی تھی کہ تبصرے کے لئے الفرقان میں کتاب آئی تو بعض دفعہ پوری کتاب کی تلخیص کر کے قارئین الفرقان تک پہنچا دی، جس سے تبصرہ نگار نا واقف یقیناً نہیں ہو سکتے، اس شخص کی پہلی کتاب پر ندوے کے پرچے میں، وہ بھی خود مولانا کے زیر سایہ خالص معاندانہ قسم کی سنگ باری کرتے ہوئے کچھ تو سوچا ہی تھا کہ اس کے احساسات پر کیا گزرے گی۔ اور اس گزرے دور کی کیا کیا بات اسے یاد نہ آئے گی!

تبصرے کے روایتی طور پر کچھ آداب بھی ہیں۔ کوئی کتاب سختی سے قابلِ تنقید بھی ہوتی ہے، اُسکی کمزوریاں نمایاں کرنا ضروری ہوتا ہے، تب بھی اگر وہ کسی بہت ہی مردود و مغضوب اور ناقابلِ رعایت قسم کے فرد یا حلقے و ادارے کی طرف سے نہیں ہوتی تو تبصرے کی عمومی روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور اپنی رائے کو کسی تعصب کی بدگمانی سے بچانے کیلئے کتاب میں کوئی خوبی اور اچھا پہلو بھی تلاش کر کے نوٹ کرا دیا جاتا ہے۔ اور اگر کسی قابلِ لحاظ

حلقے یا فرد کی کتاب زیر تبصرہ ہے تب تو تبصرے میں توازن کی رعایت کا کچھ زیادہ ہی خیال کیا جاتا ہے، دارالمصنفین ہمارے ملک میں ایک نمونہ کا علمی ادارہ ہے، اتفاق سے ہے بھی ندوی الاصل۔ اُسی کے ایک تبصرے کی مثال اس موقع پر زیادہ موزوں رہے گی۔

مولانا علی میاں صاحب کی کتاب "المرتضیٰ" پہلی بار اشاعت پذیر ہوئی۔ دارالمصنفین کے مجلّہ معارف نے اُس پر بہت مفصل تبصرہ کیا۔ شروع میں اس کا ایک مجموعی تعارف کرایا، پھر تفصیل سے خوبیاں دکھائیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ خوبیاں ہی خوبیاں ہیں۔ حالانکہ مُبصّر کو کمزوریوں کی بھی اتنی لمبی نشاندہی کرنی تھی کہ آخر کے پورے چھ صفحے اس کی نذر ہوئے۔ (ماہنامہ معارف اعظم گڑھ بابت ماہ جون ۸۹ء) اسکے برعکس "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" پر تعمیر حیات کے فاضل تبصرہ نگار نے تبصرہ کا آغاز ہی کتاب کے بارے میں ہٹلر کے نامور وزیر اطلاعات و نشریات گوبلز کے مخالفانہ پروپیگنڈے کا فن اپناتے ہوئے اِس صدفی صد کذب و افتراء سے کیا ہے کہ:

"اس ۴۲۶ صفحات پر مشتمل کتاب کا مفروضہ تحقیقی نتیجۂ بحث (HYPOTHESIS) یہ ہے کہ یزید ایک مسلمان خدا ترس پاک سیرت خلیفۂ برحق تھا جس کی ولی عہدی عین کتاب و سنت کے مطابق اور اسلامی مقاصد کیلئے عمل میں آئی تھی۔ اور اُس کے مقابلے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ ایک ناعاقبت اندیش شہنشاہیت کے طالب اور بلا وجہ جان گنوانے والے تھے۔"

تعمیر حیات (بلکہ الفرقان کا بھی) کون قاری سوچ سکے گا کہ ندوے کے ذمہ داروں میں تعلیمی نظام کی نگرانی اور ذمہ داری کے اعتبار سے نمبر ایک ہستی جو تعمیر حیات کے صفحات میں انھیں مختلف قسم کے دینی افادات سے بھی نوازتی رہتی ہے، وہ ایک کتاب کی طرف سے اپنے حلقۂ قارئین کا دل و دماغ مسموم کرنے کیلئے سوفی صد کذب بیانی کا ارتکاب بھی کر سکتی ہے؟ واقعہ بہر حال اِس بیان کے برعکس سوفی صد یہ ہے کہ کتاب میں کہیں مصنف نے نہ یزید کے بارے میں اِن باتوں میں سے ایک بات بھی کہی ہے۔ اور نہ حضرت حسینؓ کی بابت اپنے قارئین کو اِس

خبیث نتیجے تک پہنچایا ہے۔ ہاں ہر شخص کے کلام کی ممکن حد تک اچھی وجہ تلاش کرنے کی جو اپنی طبیعت ایک عرصے سے بحمداللہ بن گئی ہے، اُسکی بنا پر تعمیر حیات کے فاضل تبصرہ نگار کی اس سوفی صد کذب بیانی کی بھی ایک توجیہہ کی جا سکتی ہے، اور وہ یہ کہ انھوں نے پوری کتاب پڑھی نہیں، یا پڑھی تو ایک ایسے اشتعال اور مخالفانہ جذبات کے عالم میں پڑھی کہ نہ پڑھنے ہی کے برابر رہی۔ اور یہ جو کچھ انھوں نے بالکل خلاف واقعہ لکھا یہ صرف اُس تأثر کا نتیجہ تھا جو بظاہر اپنے خاص خیالات کی وجہ سے کتاب کے وہ اجزاء پڑھ کر اُن کے دل میں قائم ہو گیا تھا جو کتاب کی اشاعت سے پہلے الفرقان میں رفتہ رفتہ نکل گئے تھے، جن میں کتاب کا مقدمہ بھی شامل تھا۔[1]

یہ بات اس لئے قرین قیاس ہے کہ ندوے ہی کے ایک نوجوان استاد مولوی سید سلمان صاحب ندوی، جو مولانا علی میاں صاحب کے نہایت قریبی عزیزوں میں بھی ہوتے ہیں انھوں نے بھی کتاب کا مقدمہ الفرقان (بابت مئی جون ۱۹۷۷ء) میں شائع ہونے پر ایک زوردار تردیدی مضمون، جو خاص طور سے یزید کے فاسق و فاجر اور ملعون ہونے کے دلائل پر مشتمل تھا، اپنے ایک پرچے میں سپرد قلم کیا تھا۔ اور پھر حضرت مولانا علی میاں صاحب نے انہی دنوں (جولائی ۱۹۷۷ء) میں لکھنؤ میں "شہدائے اسلام" نامی جلسوں کے سالانہ پندرہ روزہ پروگرام میں حصہ لیتے ہوئے جو تقریر فرمائی، اُس میں بھی راقم کی کتاب کے مقدمے سے خفگی اور اُسکی تردید کی صاف جھنکار اُن سامعین کو سنائی دی تھی جو وہ مقدمہ اور دوسرے شائع شدہ ابواب پڑھ کر ذہن میں رکھے ہوئے تھے۔ اور پھر خود میرے کانوں تک یہ جھنکار تقریر کے ایک ماہ بعد ہی خود مولانا ہی کے ذریعے اس طریقے سے پہنچی کہ حضرت مولانا اپنے سالانہ معمول کے مطابق

---

[1] تبصرے کے وقت موصوف کے اشتعال اور عدم توازن کی ایک نہایت کھلی دلیل یہ ہے کہ آج تک ایسا تبصرہ کسی نے نہ پڑھا ہوگا جس میں تبصرہ شروع کرنے سے پہلے یہ بتانے کا خیال بھی نہ رہے کہ کتاب کہاں چھپی کہاں سے مل سکتی ہے؟ کیا قیمت ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اول سے آخر تک خود سے دیکھ لیجئے کہیں ان باتوں کا ذکر نہیں ہے۔

گزشتہ سال اگست یا ستمبر ۹۱ء میں آکسفورڈ (OXFORD) تشریف لے گئے۔ تو میں ایک خاص وجہ سے ــــ جس کا شاید کہیں آگے ذکر آجائے ــــ اپنے معمول کے خلاف لندن ہی میں انتظار کرکے مولانا کی واپسی کے وقت ملاقات کرلینے کے بجائے اس بار آکسفورڈ ہی چلا گیا۔ بلکہ دو دفعہ گیا۔ اور دوسری دفعہ رات میں وہاں ٹھیر ابھی۔ تو صبح کو ناشتے کی میز پر جہاں میرے علاوہ مولانا کے بھانجے مولانا سید محمد رابع صاحب، آپ کے خادم عثمان صاحب، میزبان فرحان نظامی صاحب اور اُن کے والد ماجد پروفیسر خلیق احمد نظامی بھی تشریف رکھتے تھے، مولانا بڑے نظامی صاحب سے مخاطب ہوکر کچھ اپنے یہاں کے ذخیرۂ خطوط کی بات کررہے تھے جس میں اُن کے بزرگوں کے نام اکابر وقت اور سلاطین وقت کے خطوط کا خاصہ ذخیرہ ہے، بس اسی سلسلۂ گفتگو میں کچھ اس طرح کا جو تذکرہ آیا کہ دوسرے لوگ اُن کے بزرگوں کو اہلبیت کی نظر سے دیکھنے کی وجہ سے کیسا کیسا اکرام اور اظہار نیاز کرتے تھے، تو ایک دم بات اپنے طبعی حدود سے نکلی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اُس اقدام پر آگئی جس کے نتیجے میں آپ کی شہادت ہوئی، اور اس بارے میں یہ کہتے ہوئے کہ کسی نے حضرت حسین کے اقدام کو غلط قرار نہیں دیا، امام ابن تیمیہ نے بھی یہ لکھا اور مجدد الف ثانیؒ نے بھی یہ لکھا مولانا کی آواز میں ایک برہمی کی آہٹ سنائی دینے لگی، نظر اُٹھا کر دیکھا تو چہرے پر بھی کھُلے آثار تھے۔ اسکی کوئی وجہ بجز اسکے سمجھ میں نہ آئی کہ جیسے مولانا نے بھی الفرقان میں شائع شدہ کتاب کے اجزاء پڑھ لئے یا کسی سے اُنکے بارے میں کچھ سن لیا ہے اور وہ ناگوار خاطر ہوا ہے، جیسے کہ بہت سے اُن لوگوں کو ہوا ہوگا جو اس مسئلے میں اُس موروثی اور روایتی طرز فکر کو ناقابلِ نظر ثانی بلکہ نہایت مقدس سمجھتے ہیں، جس پر نظر ثانی کی اپیل کتاب کے مقدمے میں کی گئی تھی، اور کتاب میں اس نظر ثانی والے نہج کو برتا بھی گیا ہے۔ اور اب اس موقع کی مناسبت سے کہ اہلِ بیت کا تذکرہ ہے مجھے سامنے پاکر مولانا کی وہ تہ نشیں ناگواری بے ساختہ اُبھر آئی جو کہ مولانا کی مجلس میں اپنی نوعیت کا یہ میرے لئے بالکل پہلا تجربہ تھا جو غیر معمولی حیرت میں ڈوبا۔ مگر کیا عرض کرسکتا تھا۔ ہاں یہ سوچا کیا کہ اگر ایسی بات تھی تو مولانا اپنے بزرگانہ اور مشفقانہ انداز میں

مجھ سے فرما سکتے تھے۔ ناشتے کے بعد مجھے لندن واپس ہونا تھا۔ اور مولانا کو کسی ڈاکٹر کے یہاں جانا۔ مجلس ختم ہو گئی۔

اب تک کی یہ بات تمام تر قیاس و گمان پر مبنی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ لکھنؤ کے سامعین کو بھی محض وہم ہوا ہو۔ اور اس خاکسار کو بھی۔ مگر مولانائے محترم کی آکسفورڈ سے واپسی پر بس کوئی ایک مہینہ ہی گزرا ہوگا کہ ایک دن ڈاک میں مولانا کی مجلس تحقیقات و نشریات (لکھنؤ) کا مرسلہ ایک پیکٹ وصول ہوا جس میں لکھنؤ کے جلسۂ شہدائے اسلام کی وہ تقریر بھی مطبوعہ شکل میں بھیجی گئی تھی جس کا اوپر ذکر ہوا۔ راقم اُس وقت تک اس تقریر سے بالکل بے خبر تھا۔ کتابچے کا عنوان تھا۔

"خلفائے اربعہ کی ترتیب خلافت میں قدرت و حکمت الٰہی کی کارفرمائی

اور

حضرت حسینؓ کے اقدام میں اُمّت کے لئے رہنمائی"

اِسکو پڑھتے پڑھتے جب حضرت حسینؓ کے اقدام کی بات اس میں آئی تب مجھے بعینہٖ وہ الفاظ پڑھنے کو ملنے لگے جو مولانا کی زبان سے آکسفورڈ میں ناشتے کی میز پر سنے تھے۔ وہاں اس تقریر کے ایک دو جملے ہی مولانا نے دُہرائے تھے، یہاں پورا کلام پڑھنے کو ملا جس میں ایک گھن گرج اور للکار کی کیفیت تھی، تو بات بالکل صاف ہو گئی کہ یہ خاکسار اور اُسکے خیالات کے ہمنوا اور متأثرین ہی تقریر کے اس حصے کے اصل مخاطب تھے، اور اس بات پر اگر کسی مزید شہادت کی بھی ضرورت تھی تو راقم کے نام اس تقریر کا بھیجا جانا، جو کہ کوئی عام معمول کی بات نہ تھی، بالکل کافی و وافی شہادت تھی۔[1]

الغرض فاضل تبصرہ نگار کے اردگرد سے تعلق رکھنے والے یہ واقعات اس بات کا بہت کافی قرینہ ہیں کہ وہ بھی کتاب کی اشاعت سے قبل اس کا مقدمہ اور دوسرے بعض اجزاء الفرقان میں پڑھ کر اسی طرح مشتعل ہو گئے ہوں اور پھر یا تو کتاب پڑھنے کو طبیعت مارے کراہت کے روادار نہ ہوئی ہو اور یا پیشگی قائم ہوئے اپنے تأثرات ہی اس میں بھی پڑھتے چلے گئے ہوں۔ اس

---

[1] امید ہے کہ اس مسئلے میں مولانائے محترم کے خیالات کا جائزہ بھی کسی مناسب سیاق و سباق میں ان شاء اللہ لیا جا سکے گا۔

توجیہ کے ذریعے دانستہ کذب وافتراء کی فردِ جرم تبصرہ نگار پر سے ہٹائی جاسکتی ہے، اور ہمیں ایسا کرنے میں اس وجہ سے خوشی ہوگی کہ وہ ایک ایسی اسلامی درسگاہ کے ایک اعلیٰ عہدیدار ہیں جس کی عزت پر ہم نہیں چاہتے کہ کوئی حرف آئے۔ مگر کسی ذمہ داری کی ادائیگی میں ایک سنگین غیر ذمہ دارانہ رویّے کا الزام تو پھر بھی اُن پر آکر رہے گا۔ اور اس سے اُن کو بچانے کی ہمارے پاس کوئی تدبیر نہیں ہے۔

دانستہ کذب وافتراء نہ سہی غیر ذمہ داری کی انتہا کا اندازہ اس بات سے کرنا چاہئے کہ کتاب کے باب ۶ میں جس کا عنوان ہے "یزید کی ولی عہدی پر حضرت معاویہ کو اصرار کیوں؟ اور مخالف حضرات کو اختلاف کیوں؟" اس بات پر گفتگو کرتے ہوئے کہ حضرت معاویہ کی وفات کے وقت یزید کی دینی اور اخلاقی حالت تاریخ کی روشنی میں کیا ظاہر ہوتی ہے؟ اُسکے بحیثیت "امیر المؤمنین" اوّلین خطبے کی روشنی میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ:۔

"اس خطبے کی عبارت اس کا مضمون اور اس کا لہجہ ہر چیز اس شخص (یزید) کے بارے میں اُس عام خیال کی تردید کرتی ہے جو کسی واقعی بنیاد کے بغیر صرف اس لئے پھیلنے میں کامیاب ہوگیا ہے کہ اس شخص کی حکومت کے زمانے میں اُس کے حکّام اور لشکریوں کے ہاتھوں ریحانۂ رسول ؐ، جگر گوشۂ بتول ؓ حضرت حسین ؓ کی شہادت المناک واقعہ پیش آیا۔ اور اُس نے اپنے حکّام سے کوئی باز پُرس نہ کی اس لئے ایسے آدمی کے متعلق جو بھی بُرائی کسی نے سنادی وہ قابلِ یقین ہوگئی۔" (ص ۱۳۱)

وراس کے بعد لکھا گیا کہ:۔

"مگر ہے یہ یقیناً اسلامی انصاف کے خلاف بات کہ کسی کے ایک جرم کی سزا میں، اس جرم سے پہلے کی اُسکی زندگی کو بھی خواہ مخواہ بدنام کیا جائے، ہاں جن لوگوں کے نزدیک جھوٹ سچ ہر طریقے سے صحابۂ کرام کو بدنام کرنا ایک کارِ ثواب ہے اُن کیلئے

بالکل ٹھیک ہے کہ وہ پروپیگنڈے کا یہ تیر بھی جو بہت موقع کا ہے صحابہ کرام ہی کو نشانہ بنانے کی نیت سے چلائیں" (ص۱۳۱)

مگر پھر فوراً ہی یہ خیال کر کے کہ یہ بات جو کہی گئی، کتنی ہی معقول ہو اور کیسے ہی محتاط انداز میں کہی گئی ہو، پھر بھی معاملہ یزید جیسے (بدنام) آدمی کا ہے۔ پتہ نہیں کون نازک مزاج اس بات کا بھی بتنگڑ بنادے۔ اس لئے فوراً ہی اگلے پیراگراف میں لکھا گیا کہ:۔

"یہ بات اچھی طرح سمجھ لی جائے کہ مذکورہ بالا خطبے سے ہم صرف یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ بندروں ریچھوں کے ساتھ کھیلنے والا، شراب وکباب میں غرق، لہو ولعب میں مست اور زنا وقمار کار سیا نظر نہیں آتا جیسا کہ بتایا جاتا ہے۔ ...... رہا یہ کہ وہ کوئی بڑا متقی پرہیزگار ہو یہ اس خطبے سے نہیں نکالا جاسکتا۔ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہوسکتا۔ اور غالب گمان یہ ہے کہ ایسا نہیں تھا" (ص۱۳۱)

کتاب کے یہ اقتباسات سامنے رکھئے اور پھر اُس بیان میں کسی سچائی یا واقعیت کو تلاش کیجئے جو فاضل تبصرہ نگار نے اِس کتاب کی بابت یزید کے سلسلے میں بایں الفاظ دیا ہے کہ اس کتاب کا نتیجۂ بحث یہ ہے کہ:۔

"یزید ایک مسلمان، خداترس، پاک سیرت، خلیفۂ برحق تھا"

کیا اس بیان میں سچائی اور واقعیت کا ایک ذرہ بھی کتاب کے مذکورہ بالا اقتباسات کی روشنی میں کسی کو نظر آتا ہے؟ اور کیا یہ امکان بھی کوئی پڑھا لکھا آدمی اِن اقتباسات کو پڑھنے کے بعد محسوس کرسکتا ہے کہ شاید کتاب میں کسی اور جگہ ایسی کوئی بات کہی گئی ہو جس سے تبصرہ نگار کے بیان اور الزام کی تائید ہوجائے؟

مذکورہ بالا الفاظ کے آگے یزید کے بارے میں کتاب کا (معروضہ) "نتیجۂ بحث" مزید یہ بھی بتایا گیا ہے کہ (وہ) "خلیفۂ برحق تھا جس کی ولی عہدی عین کتاب وسنت کے مطابق

اور اسلامی مقاصد کیلئے عمل میں آئی تھی!!

اس الزام کا بھی یہی حال ہے کہ آدمی پورے بھروسے کے ساتھ کہہ سکتا ہے "سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ" اور پھر اسکی دستاویزی تردید کیلئے قارئین کو حوالہ دیا جاسکتا ہے کہ وہ یہی چھٹا باب جسکے اقتباسات ابھی پیش کئے گئے اسے اول سے آخر تک پڑھنے کی زحمت کریں ورنہ کم از کم شروع کے ۱۴ صفحے (صلا تا ۱۲۴) تو بہر حال پڑھیں وہاں سے تبصرہ نگار کے اس الزام کی قلعی بھی اُن پر کھل جائے گی۔ کتاب کا اتنا لمبا اقتباس ظاہر ہے کہ یہاں نہیں پیش کیا جاسکتا البتہ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ قارئین کرام کتاب کے محوّلہ صفحات (صلا تا ۱۲۴) میں دیکھیں گے کہ یزید کی ولی عہدی کے بارے میں ایک حد تک تائیدی رائے ابن خلدون کے یہاں ملتی ہے جس کا اقتباس مذکورہ صفحات میں دیا گیا ہے، مگر اس میں بھی کہیں یزید کو "خلیفۂ برحق" ٹھیرانے کی بات نہیں ملتی ہے۔ رہا کتاب کا مصنف تو اُس نے اپنی طرف سے تو اس سلسلے میں کوئی ایک لفظ کہا ہی نہیں ہے، البتہ ابن خلدون کی رائے کے ایک جزو کو قابلِ تسلیم نہ بتاتے ہوئے دوسرے ایک جزو پر پورے ۲ صفحے کی تنقید کرتے ہوئے اسے قابلِ بحث ٹھیرایا ہے!—— الزامات کے اسی جائزے کی روشنی میں اگر یہ کہا جاتا ہے کہ تبصرہ نگار نے کتاب پڑھنے کی زحمت ہی نہیں اُٹھائی یا اُٹھائی تو ایسی اُٹھائی کہ وہ نہ اُٹھانے ہی کے برابر رہی تو کیا غلط ہے؟

یزید کی بات تمام ہوئی، اب حضرت حسینؓ کی بابت فرد جرم (چارج شیٹ) پر آجائیے۔ وہی جو اقتباسات چھٹے باب میں سے اوپر دیئے گئے ہیں، اُن میں کا پہلا اقتباس از سر نو پڑھنا شروع کیجئے اور ان الفاظ پر آجائیے...... "ریحانۂ رسولؐ جگر گوشۂ بتول کی شہادت کا المناک واقعہ..... کیا جس کتاب میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ذکر اس پیرایۂ بیان میں کیا جاتا ہو وہاں اس کا کوئی امکان بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کو "ناعاقبت اندیش شہنشاہیت کے طالب، بلاوجہ اپنی جان گنوانے والے" بتایا گیا ہو؟

"تاہم معلوم ہے کہ "پھول کی" ایسی "پتّیوں" سے یوں تو "ہیرے کا جگر" کٹ سکتا ہے، مگر

آدمی جیسی ذی حس مخلوق میں پھر بھی کچھ لوگ ہوتے ہیں جن پر "کلامِ نرم و نازک" اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اور وہ نہیں سمجھ سکتے کہ شہادت کے ذکر کے ساتھ حضرت حسینؓ کیلئے "ریحانۂ رسولؐ" (رسول اکرمؐ کا پھول) اور "جگر گوشۂ بتولؓ" کی تعبیر اختیار کرنا مصنف کے دل و دماغ کے بارے میں کس بات کی شہادت دیتا ہے ایسے لوگوں کی رعایت سے مزید کہنا پڑے گا کہ کتاب میں شروع سے آخر تک کہیں بھی حضرت حسینؓ کے اقدام اور اسکے انجام کے بارے میں اپنی طرف سے کوئی حکم نہیں لگایا گیا، کوئی رائے نہیں دی گئی۔ اس لئے کہ تحقیقی نقطۂ نظر سے اپنی تفصیلات کی روشنی میں یہ ایک بہت ہی نازک اور پیچیدہ معاملہ تھا۔ اس پر اظہار رائے کتاب کے اندر اگر ملتا ہے تو وہ یا تو حضرت حسینؓ کے معاصر صحابۂ کرامؓ کے کلام میں ہے۔ اور یا کتاب کے آخری باب میں امام ابن تیمیہؒ کے اقتباسات ہیں، جو کہ اُن کی عظیم المرتبت کتاب منہاج السنۃ سے لئے گئے ہیں۔ یہ امام ابن تیمیہؒ کی وہ کتاب ہے جس کی توصیف میں تبصرہ نگار کے استاذ مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے اپنی کتاب دعوت و عزیمت کی جلد دوم میں (جو کہ پوری کی پوری امام ابن تیمیہؒ کی شخصیت، کمالات اور کارناموں کے بیان میں ہے) تحریر فرمایا ہے، اور یاد رکھنے کے لائق تحریر فرمایا ہے کہ:۔

> "ابن المطہر حلی کی کتاب "منہاج الکرامۃ"[1] کے جواب میں انھوں نے "منہاج السنۃ" کے نام سے جو کتاب لکھی وہ اُنکی تمام تصانیف میں ایک امتیازی شان رکھتی ہے ابن تیمیہؒ کے علمی تبحرؒ، وُسعتِ نظر، حاضر دماغی، حفظ و استحضار، پختگی اور اتقان اور ذہانت و طباعی کا اگر صحیح نمونہ دیکھنا ہو تو اس کتاب کو دیکھنا چاہئے مصنفؒ منہاج الکرامۃ کی عبارت نقل کرنے کے بعد جب اُن کے علم و حمیّتِ دینی کو جوش آتا ہے، اور اُن کے علم کے سمندر میں طوفان اُٹھتا ہے اور تفسیر و حدیث، تاریخ و سیر کے معلومات کا

---

[1] "الفرقان" یہ کتاب ابن تیمیہ ہی کے زمانے میں شیعیت کی حمایت اور سنیت کے رد اور مخالفت میں لکھی گئی تھی امام ابن تیمیہ نے اپنی دو جلدوں کی ضخیم کتاب میں اس کی ہر ہر بحث کا جائزہ لیا ہے۔

لشکر امنڈ تا ہے تو بے اختیار اُن کے فریق مقابل سے کہنے کو جی چاہتا ہے کہ
"یٰاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا یَحْطِمَنَّكُمْ سُلَیْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ
وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ[1] (ص ۲۸۶ طبع چہارم)

کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء نے "واقعۂ کربلا ....." کے غریب مصنّف پر تو اس درجہ کرم فرمایا کہ اس کا بوجھ اُٹھائے نہیں اٹھتا مگر ابن تیمیہؒ کے کلام پر ایک لفظ نہ فرمایا! غالباً وہی بات کہ پڑھا نہیں گیا۔ ورنہ پھر وہی یٰاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ[2] الآیہ کا مشورہ اپنے لئے بھی نہایت مناسب سمجھا گیا جو مولانا سید ابوالحسن علی صاحب نے ابن المطہر حلّی کو دینا تجویز کیا تھا!

بات ناتمام رہے گی اگر یہ نہ بتایا جائے کہ ابن تیمیہؒ اگرچہ یزید کے خلاف حضرت حسینؓ کے اقدام کی صحت کے قائل ہونے سے انکار کرتے ہیں اور اُنہی کے کیا وہ تو ایک صاف کھلے شرعی اصول اور عقائدِ اہلِ سنت کی بنا پر حضرت عائشہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے اُن اقدامات کی صحت کا قول بھی اپنے لئے ممکن نہیں پاتے جن کے نتیجے میں جمل اور صفّین کی باہمی خونریزی مسلمانوں میں ہوئی۔ مگر اتنی ہی صفائی کے ساتھ اور بلا کسی شک و شبہے اور تحفظ کے وہ ان تینوں بزرگوں کو مقبولانِ بارگاہِ حق اور جنت الفردوس کے ساکنوں میں جانتے ہیں؛ اور اِن کے اقدامات کی خطا کو اجتہادی خطا سمجھتے ہیں جس میں مجتہد نہ صرف معذور ہوتا ہے بلکہ ماجور بھی۔

محمود احمد عباسی کی کتاب اور واقعۂ کربلا کا مصنّف

کتاب کی بابت مندرجہ بالا صدقی صد کذب یا خلاف واقعہ بیان کے بعد ایک اور

---

[1] النمل - ۱۸ - قرآن پاک کی ۲۷ ویں سورہ النمل کے یہ الفاظ آیت ۱۸ میں آئے ہیں، ان کا ترجمہ ہے کہ "اے چیونٹیو اپنے بلوں میں گھس جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اس کا لشکر (جو آرہا ہے) انجانے میں تمہیں کچل ڈالے۔

[2] اے چونٹیوں اپنے بلوں میں گھس جاؤ۔ الخ

کوشش شاید قارئین کے دل و دماغ کتاب کیلئے بالکل ہی بند کر دینے کے جذبے ہی میں جناب تبصرہ نگار نے اس عنوان سے کی ہے کہ محمود احمد عباسی مرحوم کی کتاب (خلافتِ معاویہؓ و یزید) جس کے حصے میں بہتاسوں کی قدر دانی کے ساتھ بڑی بدنامی بھی اپنے وقت میں آئی تھی، اس کتاب کو اس موقع پر یاد کر کے حکم لگایا ہے کہ ان کی زیرِ تبصرہ کتاب اور محمود احمد عباسی کی کتاب میں صرف لہجے اور اندازِ بیان کا فرق ہے، ورنہ "نتیجۂ بحث" دونوں کا "ایک ہی ہے"۔

کس کس بات پر فریاد کی جائے۔ ایسا ظلم تو زمانے میں کم ہی ہوتا ہے، محمود احمد عباسی کی کتاب سے دو تین جگہ تو اسی کتاب کے اندر اختلاف کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۱۳۶ (حاشیہ) اور ص ۱۷۱ اسکے علاوہ اُس کتاب پر راقم الحروف ہی کے قلم سے الفرقان (بابت رمضان شوال و ذی قعدہ ۱۳۷۹ھ) میں بہت مفصّل تبصرہ اسکے پہلے ہی ایڈیشن پر نکلا تھا۔ اس میں تو جیسی تنقید اس کتاب پر کی گئی ہے، اگر خود ستائی نہ کہا جائے تو شاید دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، آیئے اس کے چند ٹکڑے یہاں بھی پڑھ لیجئے۔

(۱)

"کتاب اب تک جس انداز میں بھی متعارف ہوئی ہو، ہمارے نزدیک مؤلف کا اصل مطمحِ نظر اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ بنی اُمیّہ سے شروع ہونے والا عہدِ خلافت جو مشہور تاریخی روایات کی روشنی میں، اپنے بعض پہلوؤں کے لحاظ سے اسلامی تاریخ پر ایک افسوسناک اور وحشت انگیز دھبہ بن کر نمایاں ہو گیا ہے۔ اس سے متعلق روایات کو من وعن مان لینے کے بجائے حتی الامکان روایات کی تنقیح کی جائے، اور واقعات کی ایسی توجیہ کی جائے کہ وہ اسلامی تاریخ کے چہرے پر بدنما داغ بن کر نمایاں نہ رہیں۔

لیکن اسکے ساتھ ہماری رائے یہ بھی ہے کہ اس کام میں جس توازن کی ضرورت تھی۔ عباسی صاحب اس توازن کو بالکل نہیں برت سکے ہیں، جس کے نتیجہ میں ان کی یہ کاوش ایک سخت قسم کے ردّعمل کی سی صورت اختیار کر گئی ہے، علاوہ ازیں موصوف

اپنے مطمح نظر کی تحصیل کی خاطر بعض باتیں تصنیفی دیانتداری سے مختلف قسم کی بھی کر گئے ہیں۔

(۲)

"اموی خلافت کا پس منظر تیار کرنے میں عباسی صاحب نے بڑے جانبدارانہ بلکہ غیر دیانتدارانہ طریقوں تک سے کام لیا ہے۔ اور اُن کی اس ردِّ عمل والی غیر منصفانہ روش کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ اب جو لوگ اس کتاب کے جواب لکھ رہے ہیں وہ بھی ردِّ عمل ہی کی کیفیت میں ڈوب کر لکھ رہے ہیں۔ اور اس طرح صحابہ کے احترام اور انکے معاملات میں کفِّ لسان کا مسلک اس ردّ عمل کی چکّی میں بُری طرح پس رہا ہے۔"

(۳)

غرض یہ ہے عباسی صاحب کا معاملہ کہ وہ یزید اور اس کے اعوان کی فضیلت و مدح میں نہ صرف ہر رطب و یابس کو سر آنکھوں پر رکھ لیتے ہیں، بلکہ واعظانہ نکات آفرینی تک سے دریغ نہیں کرتے، لیکن سیدنا حسینؓ کی مدح و ستائش پر اسی طرح چیں بہ جبیں ہوتے ہیں جیسے کہ اُن کے گھر سے کچھ جا رہا ہو اور دور از کار قیاس آرائیوں کا پورا زور صرف کر کے چاہتے ہیں کہ اس مدح و ستائش کا ایک ایک لفظ حرفِ غلط کی طرح مٹا دیں!!

(۴)

"کتاب کی دوسری اہم بحث حضرت حسینؓ اور یزید کے نزاع کی حقیقت اور اُس کے شرعی محاکمہ کی ہے۔ اس بحث میں بھی مؤلف نے حسب عادت بڑی افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ ایک طرف وہ یزید کی پوزیشن مضبوط کرنے کیلئے غیر ثابت شدہ دعوؤں اور عبارت آرائی و سخن پروری کے فن سے کام لیتے ہیں۔ دوسری طرف حضرت حسینؓ کا کیس کمزور کرنے کیلئے مستشرقین کا کندھا استعمال

کرنے سے بھی نہیں چوکتے" (الفرقان ماہ رمضان، شوال، ذی قعدہ ۱۳۷۹ھ)

اس سے زیادہ اس کرم فرمائی پر کیا کہا جائے؟ ہاں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ طرزِ بیان کے اعتبار سے اس کتاب کو عباسی کی کتاب کے مقابلہ میں "عالمانہ" ہی نہیں بتا دیا گیا بلکہ یہ بھی کہ:۔

"عباسی کے لہجہ و بیان میں جو بے حیائی اور بے باکی ہے اس سے یہ کتاب پاک ہے"

سبحان اللہ! کیا کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان اور تعریف و اعتراف ہے کہ "بے حیائی سے پاک ہے"۔ ع تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی!

ہاتھ میں ہاتھ دینے کا مفہوم

اکالم کے لیے چوڑے نام نہاد "تبصرے" میں ۲۶۴ صفحے کی کتاب کے اندر متعین طور سے صرف ایک جگہ انگلی رکھ کر کوئی تنقید کی گئی ہے، ورنہ یا (بقول ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی) "جلے دل کے پھپولے پھوڑے گئے ہیں" یا کچھ تحقیق و ریسرچ کے اصول و قواعد سکھائے گئے ہیں اور یا اصحاب نبیؐ کے ایک گروہ کو دشمنِ نبی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) بنا کر اپنا نامۂ اعمال سیاہ کیا گیا ہے ___ اور وہ واحد متعین تنقید بھی ایسی الجھی ہوئی ہے کہ جیسے درمیان تحریر وہ تو دبے یقینی اور کشمکش کا شکار ہو گئے ہوں۔ حضرت حسینؓ کے بارے میں اس روایت کو کتاب میں بار بار دہرائے جانے پر کہ آخری مرحلے میں "یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینے" کو تیار ہو گئے تھے، ایک اندازِ تکدر میں وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"فاضل مصنف نے کربلا کی ایک روایت کو اپنی تحقیق کا شاہ کار سمجھ کر اپنی کتاب میں متعدد جگہ دہرایا ہے۔ اور ایک تسلیم شدہ حقیقت کی طرح پیش کیا ہے"......

نگار کے ان الفاظ سے ہر سمجھدار قاری یہی سمجھے گا کہ اب اس روایت کی "تسلیم شدہ"
ت کو چیلنج کیا جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف اُس مفہوم کو چیلنج کیا جاتا ہے جو
اس روایت میں حضرت حسینؓ کے الفاظ (وَإِمَّا ان اضع یدی فی ید یزید بن
یۃ الخ) کا کتاب کی بحث سے ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ آپ بیعت یا سپردگی کیلئے اور اپنا
یزید پر چھوڑنے کیلئے آمادہ ہو گئے تھے۔ فرماتے ہیں:۔

"وضع الید فی الید" دست در دست دادن۔ فارسی کا محاورہ ممکن ہے جس کے معنیٰ بیعت کرنے اور سپرد کرنے کے ہوں تو بعید نہیں ہے عربی میں کہیں کسی لغت یا کسی استعمال میں یہ محاورہ نہیں ہے[1]۔ یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جہاں مبایعت کا ذکر ہے، وہاں بایع، بایعنا اور لیبایعہم ہی آیا ہے اور ہاتھ پہ ہاتھ رکھنے کا تذکرہ بھی کہیں کہیں اسکے بعد آتا ہے وہ بھی ہر جگہ نہیں۔ کنایہ بھی نہیں ہے۔ اگر کنایہ ہے تو دوستی کرنے اور مساویانہ انداز میں گفتگو کرنے کا مفہوم رکھتا ہے۔"

روایت میں حضرت حسینؓ کی طرف منسوب اُن الفاظ کے ساتھ جن کا ترجمہ ہے کہ "یا پھر
بول کرلو کہ میں یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدوں" مزید یہ الفاظ بھی بیشتر روایتوں
یا "فیری فیما بینی وبینہ رأیہ" یا "فیحکم فیّ ما رأی" اِن الفاظ کی طرف
نے ہوئے فاضل تبصرہ نگار نے مصنّف کو توجہ دلائی ہے کہ اگر "ہاتھ میں ہاتھ دینے"
مفہوم بیعت ہی لینے پر مصنّف کو اصرار ہے تو سوچنا چاہیئے کہ پھر آگے کے ان الفاظ
بات تک بیٹھے گی جن کا مطلب ہے کہ "پھر وہ (یزید) دیکھے کہ میرے اور اُسکے درمیان
ئے ہوتی ہے؟"

---

[1] قاری کو اس عبارت کا مطلب سمجھنے میں دقت ہو تو جہاں تک ہماری سمجھ میں آتا ہے مطلب یہ ہے کہ یہ ممکن ہے کہ دست در دست دادن کے معنیٰ بیعت یا سپردگی کے ہوں، عربی میں نہیں ہیں۔

"یعنی جب بیعت کر ہی لی تو پھر وہ دیکھے کہ میرے اور اُس کے درمیان اُس کی کیا رائے ہوتی ہے کا سوال کہاں باقی رہ جاتا ہے؟"

محترم تبصرہ نگار کی اصل بحث کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے یہ کہے بغیر اب نہیں رہا جاتا کہ آخر یہ کونسی اردو ہے جو انھوں نے اس تنقیدی بحث میں استعمال کی ہے؟ اوپر بھی قارئین کیلئے مدد کی کچھ زیادہ ہی ضرورت محسوس کر کے ایک توضیحی حاشیہ لکھنا پڑا (ورنہ حاشیہ طلب تو اس درمیان میں اور بھی کئی جگہیں تھیں) اور اب "فیری فیما بینی وبینہ رأیہ" کا یہ ترجمہ یا مطلب جو انھوں نے لکھا ہے کہ "پھر وہ دیکھے کہ میرے اور اُسکے درمیان اُس کی کیا رائے ہوتی ہے" لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّابِاللّٰہِ، یہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم کی اردو ہے! آخر کس عالم میں انھوں نے یہ تبصرہ لکھا ہے کہ نہ الفاظ ٹھیک نہ اُن کا دروبست ٹھیک؟ سمجھنے کی کوشش کرنا پڑتی ہے کہ کہنا کیا چاہتے ہیں عبارت کو ٹھیک کرنے کا اُن کے پاس وقت نہیں تھا تو تبصرہ چھپوانے کی آخر ایسی عجلت کیا تھی کہ اسے اگر ریسرچ کا موضوع بنا یا جائے تو عجلت کے اعتبار سے شاید ایک ریکارڈ تبصرہ ثابت ہوگا؟ جنوری کے آخر ہفتے میں کتاب بھیجی گئی اور ۱۰ رمارچ کے شمارے میں تبصرہ نکل آیا، ورنہ لوگوں کو کتاب بھیج کر اکثر تقاضے کرنا پڑتے ہیں تب کہیں اُن کی باری آتی ہے۔

بہرحال اب اصل بحث پر آیئے۔ فاضل تبصرہ نگار نے سب سے آخر میں جو سوال مصنف کے غور و فکر کیلئے اٹھایا ہے، جو ابھی اوپر مذکور ہوا، اولاً اسکے بارے میں گزارش ہے کہ تبصرہ نگار نے "ہاتھ میں ہاتھ دینے" کا جو مفہوم مصنف کی طرف بذاتِ خود منسوب کیا ہے وہ ہے "بیعت کرنا اور سپرد کرنا" (بیعت یا سپردگی) پس اگر آگے آنے والے الفاظ "فیری فیما بینی وبینہ رأیہ" کے ساتھ اسکی کوئی تُک نہیں بیٹھتی تھی کہ "وضع الید فی الید" (ہاتھ میں ہاتھ دینے) کے معنی بیعت کرنے کے لئے جائیں تو دوسرا متبادل لفظ "سپردگی" کا موجود تھا اسے رکھ کر دیکھنا چاہئے تھا کہ آیا اُسکے ساتھ بھی بات بنتی ہے یا نہیں؟ یعنی اگر روایت کا مفہوم یوں بیان

کیا جائے کہ "ایک صورت یہ ہے کہ میں اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ (یعنی اسپردگی) دیدوں اور پھر وہ جو سمجھے فیصلہ کرے" تو کیا اب بھی کوئی اشکال باقی رہے گا؟ پھر آخر یہ سوال قائم کرنے کیلئے وہ "سپرد کرنے" کا لفظ جو چند ہی سطریں پہلے شامل مسل ہو چکا تھا کیوں فراموش کر دیا گیا؟ یہ کوئی ذمہ دار لوگوں کا طریقہ تو نہیں ہے، جن کے سپرد قوم نے اپنے نونہال تعلیم و تربیت کے لئے کر رکھے ہوں!

چیلنج خیر یہ تو ضمنی معاملہ تھا۔ اس "ہاتھ میں ہاتھ دینے" کے محاورے کی بحث میں اصلی چیز تو جناب تبصرہ نگار کا وہ دعویٰ ہے جو اوپر اُنہی کے الفاظ میں نقل ہو چکا کہ "وضع الید فی الید (یعنی ہاتھ میں ہاتھ دینا) یہ عربی محاورے میں بیعت یا سپردگی کے معنی میں کہیں نہیں بولا جاتا۔ اور پھر اس دعوے کو انھوں نے اس چیلنج کی زبان میں بھی پیش کیا ہے کہ:۔

"مصنف اور مصنف کے جتنے ہم نوا اور ہم خیال ہیں وہ ایک مثال بھی تلاش کر کے کلام عرب سے پیش کریں کہ وضع الید فی الید کسی نحوی ترکیب سے بغیر ذکر میا بیعت اس مفہوم میں بولا گیا ہو۔"

اس سے تو انکار نہیں کہ تبصرہ جب پہلی بار پڑھا تو یا ذاتی طور پر دلخراش ہونے کا تاثر ہوا تھا اور یا اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک گروہ کے خلاف ہرزہ سرائی کا۔ مگر آج کے عام رنگِ زمانہ میں کون آسانی سے یقین کرے گا کہ اُن اوّلین لمحات کے بعد سے ذاتی تاثر کی جگہ شاید تمام کی تمام ہی اِس احساس اور تأثر نے لے رکھی ہے کہ جو لوگ اندھی بہری وابستگی اور عقیدت کے درجے سے ذرا بلند سطح کا تعلق ندوہ اور اربابِ ندوہ سے رکھتے ہیں۔ اور ندوہ اور بالخصوص حضرت مولانا علی میاں صاحب (ناظم ندوۃ العلماء) سے الفرقان اور اہلِ الفرقان کا

لہ ویسے حقیقت یہ ہے کہ بیعت اور سپردگی میں سوائے اسکے کوئی فرق نہیں کہ بیعت ایک اصطلاحی لفظ بن گیا ہے جس میں عہدِ اطاعت کا مفہوم بھی شامل ہے جبکہ سپردگی کے لفظ کو یہ بات حاصل نہیں ہے اور اسی لئے ان دونوں کے استعمال میں ایک گونہ فرق سمجھا جاتا ہے۔ ورنہ بیعت کر کے آدمی اپنے آپ کو کسی کے سپرد ہی کرتا اور ہاتھ میں دیتا ہے۔

تعلق بھی جانتے ہیں وہ کیسی آزمائش میں اس تبصرے سے پڑے ہوں گے۔۔۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔اور پھر اب جو نظامت ندوۃ العلماء کی طرف سے مایوس کر دیئے جاتے پر اس تبصرے پر جائزے کی جو روشنی نہیں ڈالنی پڑ رہی ہے، اگر اُسے وہ کھلے دل و دماغ کے ساتھ پڑھ سکے تب تو اللہ ہی جانے کہ کیا کیا اسکے اثرات و عواقب نہ صرف اُن پر بلکہ پورے ہندوستان پر بالخصوص اور عالمِ اسلام پر بالعموم ہوں گے، فالی اللہ المشتکیٰ۔

خیر، یہ چیلنج آپ غور فرمایئے، کیا بعینہ اُس چیلنج کا ہم قافیہ اور ہم وزن نہیں ہے، جو ہم قرآن پاک میں اللہ رب العزت کی طرف سے مشرکین و کفار کے نام پڑھا کرتے ہیں۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ	(اے پیغمبر) آپ کہیئے کہ اگر جنّ و انس
عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ	سب اس بات پر لگ جائیں کہ اس
لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ	قرآن جیسی کتاب بنالیں تب بھی ممکن
بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ۝	نہیں کہ وہ ایسا کریں، ہر چند کہ ایک
(بنی اسرائیل — ۸۸)	اُن میں سے دوسرے کی مدد پر لگا ہو۔

یا

فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا	پس لے آؤ (بنا کر) اس کی ایسی ایک
شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ	ہی سورت اور بلا لو اپنے حمایتیوں
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۔ (البقرہ ۲۳)	کو (بھی) اگر تم سچے ہو۔

جہاں تک اللہ اور اُسکے رسول کی بتائی ہوئی صداقتوں کا سوال ہے ہر مؤمن کیلئے روا ہے کہ وہ اُنکے بارے میں منکرین کو قرآن و حدیث کے جیسے آہنگ ہی میں چیلنج کرے مگر اس سے باہر بشری علوم و معلومات کے دائرے میں چیلنج کی وہ زبان جو خالقِ کائنات اور عالم الغیب والشہادۃ ہی کو زیبا ہے، جو بھی اختیار کرے وہ اپنی حد سے بڑھنے کا ارتکاب کرے گا۔ اور اسی لئے صحیح معنیٰ میں اہل علم و دانش ایسا کیا نہیں کرتے۔ اور راقم کو

یہ کہتے ہوئے افسوس ہے کہ معتمد صاحب دارالعلوم ندوۃ العلماء نے چیلنج کی یہ زبان اختیار کرکے اپنے منصب کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ رہیں مثالیں تو ان کی تلاش میں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ کتاب جس کسی کے پاس ہو وہ ص۱۸۱ کھولے جہاں سے دسواں باب شروع ہوتا ہے۔ ص۱۸۱ کو پڑھتا ہوا ص۱۸۲ پر آئے وہاں وہ حضرت حسینؓ کی پیش کش کے سلسلے میں یہ عبارت پائے گا:۔

"عمر (بن سعد) نے آپ کی اس پیش کش کو قبول کرکے ابن زیاد کو اطلاع بھیجی مگر وہاں سے جواب آیا کہ یوں نہیں بلکہ انھیں پہلے میرے ہاتھ میں ہاتھ رکھنا ہوگا۔" لاولا کرامۃ حتیٰ یضع یدہ فی یدی"۔

فقال لہ الحسین لاواللہ — اس پر حسینؓ نے کہا کہ نہیں، یہ تو بخدا

لایکون ھٰذا ابداً۔[1] — کبھی نہیں ہوگا۔

کیا ابن زیاد کے بارے میں بھی یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت حسینؓ کو یزید کے پاس جانے دینے سے قبل اس بات پر بضد تھا کہ آپ اس سے "دوستانہ اور مساویانہ" حیثیت سے بات کریں؟ یا اسکے بجائے ابن زیاد کی ضد کہ "لاولا کرامۃ حتّٰی یضع یدہ فی یدی" کا واحد اور قطعی مفہوم اسکے ہاتھ پر یزید کی بیعت، یا خود سپردگی و سپر اندازی ہوتا ہے؟ جسے انگریزی میں شاید (SURRENDER) کہتے ہوں گے۔ اور اگر خدا نخواستہ اب بھی وہی ضد ہے تو پتہ نہیں حضرت حسینؓ اسے "لاواللہ لایکون ھٰذا ابداً" کے الفاظ سے قطعی ناقابلِ قبول ٹھیرا کر۔ بجائے "دوستانہ اور مساویانہ" حیثیت میں ابن زیاد سے ملنے کے اور کیا چاہتے تھے؟

اسکے بعد امید تو نہیں کرنی چاہئے کہ کوئی "ایں وآں" باقی رہ جائے۔ تاہم کیا حرج ہے کہ طبری ہی میں کچھ صفحوں کے بعد جو ایک روایت میں کچھ دوسرے الفاظ کے ذریعہ ابن زیاد

---

[1] طبری ج ۶ ص۲۲۰

لے مذکورہ بالا قول کا گویا ترجمہ کر دیا گیا ہے وہ بھی پیش نظر کر دی جائے۔

قال ابو مخنف..... ثم ان	ابو مخنف (اپنی سند سے) بیان کرتا ہے کہ
عبید اللہ بن زیاد دعا شمر	پھر عبید اللہ بن زیاد نے شمر بن ذی الجوشن
بن ذی الجوشن فقال لہ	کو بلایا۔ اور کہا کہ میرا یہ خط لیکر عمر بن
اخرج بھذا الکتاب الی عمر بن	سعد کے پاس جاؤ جس کے مطابق
سعد فلیعرض علی الحسین	اُسے چاہیئے کہ حسین اور اُن کے ساتھیوں
واصحابہم النزول علی حکمی	سے غیر مشروط سپر اندازی کا مطالبہ کرے
فان فعلوا فلیبعث بھم	اور وہ اگر اسکو مان لیں تو انھیں میرے
الی سلما.....[1]	پاس پا بجولاں (قیدی بنا کر) حاضر کرے۔

تیسری شہادت خود مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی شہرۂ آفاق کتاب المرتضیٰ کی ہے، جس کا عربی سے اردو ترجمہ خود انہی تبصرہ نگار (مولانا عبد اللہ عباس ندوی) کے قلم سے ہے۔ اس ترجمے کے تیسرے ایڈیشن میں عبید اللہ بن زیاد اور حضرت حسینؓ کے اسی قصہ کے بیان میں یہ عبارت آئی ہے:۔

"عبید اللہ بن زیاد نے عمر بن سعد کو بھیجا تو حضرت حسینؓ نے فرمایا کہ تین باتوں میں سے میرے لئے ایک بات مان لو، یا تو مجھے چھوڑ دو جیسے آیا ہوں واپس جاؤں، اگر اس سے انکار کرتے ہو تو مجھے یزید کے پاس لے چلو، اسکے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدوں، وہ جو پسند کرے فیصلہ کرے[2]....."

"وہ جو پسند کرے فیصلہ کرے" یہ الفاظ ہاتھ میں ہاتھ دینے کے کونسے مفہوم کی گواہی دیتے ہیں؟ سپردگی و سپر اندازی کے مفہوم کی؟ یا کسی دوسرے مفہوم کی؟

محترم تبصرہ نگار نے چونکہ شدّت جوش میں اس خاطیؔ وعاصی مصنف ہی کو چیلنج

لے طبری ج ۶ ص ۲۳۶   کہ المرتضیٰ اردو ایڈیشن سوم ص ۳۷

نہ دیا تھا بلکہ "مصنف کے جتنے ہم نوا وہم خیال ہیں" ان سب کو بھی انھیں صریح الفاظ کے ساتھ جوابدہی کا مکلّف بنا دیا تھا اس لئے ان میں سے بعض نے بھی ہماری معلومات میں ذیل کی دو مثالوں کا اور اضافہ کیا ہے۔

۱۔ حیاۃ الصحابہ ۔ مؤلفہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی رح کی جلد اول میں حضرت عکرمہ ابن ابی جہل کے اسلام کے قصے میں حسب ذیل روایت آئی ہے کہ جب وہ فتح مکہ کے موقع پر یمن کو فرار ہوئے تو راہ میں کشتی طوفان میں آگئی اور اُس وقت اُن کی زبان پر یہ الفاظ آئے :۔

اللھم اِنَّ لک عَلَیَّ عھداً اِن	اے اللہ میں عہد و قرار کرتا ہوں کہ اگر
عافیتنی مما انا فیہ ان آتیَ	اس مصیبت سے تو نے مجھے نجات عطا
محمداً حتّٰی اضع یدی فی یدہ	فرمائی تو میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے
فلا اجدنّہٗ اِلا عفوّاً	پاس پہنچ کر اپنا ہاتھ انکے ہاتھ میں رکھ دونگا
کریماً[1] ۔۔۔۔۔	مجھے امید ہے کہ وہ بجز ایک شریف اور
	عفو فرما کچھ اور نہ ثابت ہوں گے۔

۲۔ اور غضب خدا کا حیاۃ الصحابہ پر (اسی جلد اول میں) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا جو مقدمہ ہے اُس میں بھی یہی محاورہ بظاہر اسی معنیٰ میں استعمال فرمایا گیا ہے :۔

انھا تاریخ رجال جاء تھم دعوۃ	یہ (کتاب) اُن لوگوں کی تاریخ ہے جنھیں
الاسلام فآمنوا بھا وصدّقتھا	اسلام کی دعوت ملی اور وہ اس پر ایمان
قلوبھم وما کان قولھم	لائے، اُنکے دلوں نے اسکی تصدیق کی اور
اذا دعوا الی اللہ ورسولہ	(جیسا کہ قرآن میں ہے) جب انھیں اللہ اور
اِلّا ان قالوا (ربّنا اِنّنا	اسکے رسول کی طرف بلایا گیا تو اُنکا قول۔

---

[1] ص۱۸۱ (حاشیہ)

سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِي لِلْاِيْمَانِ
اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا)
وو ضعوا ايديهم في يد
الرسول[1] ......

بجز اسکے کچھ نہ تھا کہ: اے ہمارے پروردگار
ہم نے ایک منادی کو سنا جو ایمان کے لئے
صدا دیتا تھا کہ (اے لوگو) اپنے رب پر
ایمان لاؤ سو ہم ایمان لائے" اور اپنے ہاتھ
انھوں نے رسول کے ہاتھ میں دیدیئے.....

اور یہ سب کچھ الگ، ذرا سوچنے کی بات ہے کہ ہمارے کونسے رشتہ دار (خدا نہ کردہ، غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے کہ اسکی جلن مٹانے کو ہمیں کچھ اور نہ ملا تو کربلا کا قصّہ لکھ کر ہی یہ حساب اس طرح چکایا کہ یزید کے مقابلے میں سبط رسول علیہ السلام کی ہیٹی دکھائی اور اسکے لئے عربی محاوروں کا مفہوم تک بدل ڈالا؟ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ کتاب کے مقدمے میں اس گنہگار راقم الحروف نے اسی قسم کے لایعنی خیالات و اعتراضات کے خلاف آگاہی کیلئے (جن کی کسی دانشگاہ کے ماحول سے اُٹھنے کی تو ہرگز توقع نہ تھی) ایک بالکل صاف اور سیدھی حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے لئے لکھا تھا کہ:-

"یزید سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں. اور اگر ہے تو پہلے حضرت حسینؓ سے ہے، حضرت معاویہؓ سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں اور اگر ہے تو پہلے حضرت علیؓ سے ہے....." (ص۲۰)

کیا یہ کوئی ایسی بات بتائی جا رہی تھی جس کے ماننے میں کوئی دقّت ہو؟ یزید اور ان کے والد حضرت معاویہؓ سے ہمارا کیا واسطہ اور کیا ناتہ تھا اگر حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کا پائے مبارک درمیان میں نہ ہوتا. اور جب اس رشتے سے کسی دوسرے کے ساتھ ہمارا ناتہ بنے گا تو پہلے علی اور حسن و حسین (رضی اللہ عنہم) آئیں گے یا یزید و معاویہؓ؟ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ!

---

[1] ص۵

واقعۂ کربلا اور غزوۂ بدر

ایڈیٹر تعمیر حیات کے نام راقم الحروف کے خط میں جو وہاں نہیں شائع ہوا اور الفرقان کی اس اشاعت میں آپ پڑھ چکے ہوں گے، تبصرہ کی چار باتوں کے سلسلے میں مختصر طور پر اور بیحد نرم لہجے میں کچھ عرض کیا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ وہاں ان اشاروں سے اپنی غلطی کا، جو خالص بے مغز اشتعال کا نتیجہ تھی، جسکی لپیٹ میں صحابۂ کرامؓ کے ایک پورے گروہ کا ایمان و اسلام تک آگیا، احساس کرلیا جائے اور مناسب تلافی کی تدبیر کی جائے۔ مزید برآں صحابہ کرام کے مسئلے کے پیش نظر ندوے کے سربراہ و سرپرست جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو بھی اس بارے میں توجہ دلانا مناسب سمجھا گیا، جس کی پوری روداد آپ پیچھے پڑھ آئے ہیں۔ مگر جیسا کہ انہی پچھلے صفحات میں بتایا جاچکا، توقع کے بالکل برخلاف ہر جگہ سے مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اور مایوسی بھی، وہ جس کے کماحقہ بیان پر اب تک مولانا علی میاں صاحب کے ساتھ لحاظ ملاحظے کے اُس تعلق کی بنا پر جو مدتوں سے طبیعت ثانیہ بن گیا ہے، خود کو آمادہ نہ کیا جاسکا۔ اس مایوسی کے بعد کوئی چارہ اسکے سوا نہیں رہ گیا کہ تبصرہ کی اُس بے سوادی اور بدتوفیقی کو، جسے علم و دانش اور نکتہ رسی کی معراج جان کر "تعمیر حیات" کے ۲½ صفحے میں پھیلایا گیا تھا۔ اور جسے فوراً ہی لکھنؤ کے شیعہ حلقے کے ایک روزنامے نے ایک متاعِ عزیز کے طور سے سرآنکھوں پہ سجالیا، کھول کر بیان کیا جائے۔

تعمیر حیات کے نام خط کے چار نکات میں سے دو زیادہ اہم تھے اُنہی کو تین عنوانات میں تقسیم کرکے اب تک گفتگو کی گئی۔ باقی دو (یعنی ۳ اور ۴) کو کسی مزید تفصیل کی حاجت نہ تھی اس لئے ان کو اس جگہ مکرر نہیں چھیڑا گیا ہے۔ اب آگے جس نکتے پر گفتگو کرنا مقصود ہے، وہ ہے، واقعۂ کربلا میں غزوۂ بدر کی کارفرمائی کا وہ جاہلی نظریہ جسے تبصرہ نگار نے مصری مصنفین طٰہٰ حسین اور احمد امین سے اخذ کرکے اسلامی تاریخ کے مطالعے میں

بہت "مددگار" پایا اور "واقعۂ کربلا....." کے مصنف کو بھی توجہ دلائی ہے کہ وہ اگر اس روشنی میں واقعہ کو دیکھتا تو اُسے جو الجھن اس مطالعے میں پیش آئی ہے وہ نہ آتی یعنی مصنف نے جو اپنی کتاب میں اس بات پر کئی جگہ الجھن کا اظہار کیا ہے کہ ہماری تاریخی کتابوں میں اس واقعے اور اس کے پس منظر کے سلسلے میں جہاں بظاہر صحیح اور قابلِ قبول روایات موجود ہیں وہاں اللہ جانے کیوں کر نہایت منکر اور ناقابلِ قبول روایات کا بھی ڈھیر لگا ہوا ہے! یہ الجھن اُسے بقول تبصرہ نگار اس لئے پیش آئی کہ اُس نے "حادثہ کا سرا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد (کے واقعات) سے" ملایا، نہ کہ "غزوۂ بدر کے واقعات سے" ورنہ یہ اگر یہ سرا "غزوۂ بدر کے واقعات سے مربوط کیا جائے" تو تبصرہ نگار کے نزدیک "تاریخی احداث کی کڑیاں ایک دوسرے سے زیادہ پیوست نظر آئیں گی"!

تبصرہ نگار نے اپنے اس مشورے کی بنیاد کہ واقعۂ کربلا کو غزوۂ بدر سے مربوط کرکے دیکھا جائے، اپنے اس خیال یا دعوے پر رکھی تھی کہ :-

"کربلا کا واقعہ بنو امیہ اور بنو ہاشم کی دیرینہ عداوتوں کا ایک منطقی نتیجہ (CONSEQUENCE) تھا۔ وہ عداوتیں جو ظہور اسلام کے بعد بہت طاقتور شکل میں اُبھر کر سامنے آئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ سالہ عرصۂ نبوت میں ۱۲ بلکہ ساڑھے ۱۲ سال تک شد ومد سے قائم رہیں۔

واقعۂ کربلا....." کا یہ خاکسار مصنف سچے دل سے خوشی محسوس کرتا اگر اس جلے کٹے تبصرے میں بھی اُسے اپنے موضوع کے سلسلے کی کوئی مفید اور معاون بات ہاتھ آتی۔ مگر اولاً تو تبصرہ نگار نے غلط سمجھا کہ مصنف کی الجھن روایتوں کے تضاد میں تھی، جس کا حل انھوں نے مذکورہ بالا نظریے میں بتایا ہے۔ "واقعۂ کربلا....." کے مصنف کی الجھن روایتوں کے تضاد میں نہیں بلکہ اس بات میں تھی کہ ہمارے مؤرخین نے کیوں کر بدیہی طور سے منکر اور ناقابلِ قبول روایات کا ڈھیر اپنی کتابوں میں لگا رکھا ہے؟ اور یہ الجھن ان کی مفروضہ الجھن سے بہت مختلف قسم کی

چیز ہے۔ دوم یہ کہ کالم کے کالم اس نظریے کی تشریح اور توصیف میں لکھنے کے باوجود فاضل تبصرہ نگار سے یہ نہ ہوسکا کہ اس قضیے کے سلسلے کی صرف دو متضاد روایتیں بھی وہ لیتے اور نظریے کے آسمان سے ذرا عمل کی زمین پہ اُتر کر اُن دو روایتوں کے حل (یا تطابق) میں اس نظریے کی کارفرمائی ہمیں دکھا دیتے ؎

رگوں میں دوڑتے پھرتے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو پھر لہو کیا ہے؟

سوئم یہ کہ یہ نظریہ اس قدر جاہلی اور سراسر غیر اسلامی ہے کہ بفرضِ محال اس سے ہزار عُقدے بھی حل ہوتے ہوں اور "کھُل جا سُم سُم" کا تماشہ دیکھنے کو ملتا ہو تب بھی اسے بہت دور سے سلام۔

اور یہ جاہلی نظریہ لانے کیلئے اُنھیں "بازار مصر" میں جانے اور احمد امین و طٰہٰ حسین کا احسان اُٹھانے کی ضرورت کیا تھی، یہاں ہندوستان بلکہ خاص لکھنؤ شہر میں اس نوعیت کی کیا چیز نہیں ملتی؟ نہایت شستہ اور دھلے دھلائے خیال کئے جانے والے شیعہ مجتہد سید علی نقی صاحب قبلہ نک کی مشہور و معروف کتاب "شہید انسانیت" ہی میں یزید کے منہ سے یہ شعر سنوائے گئے ہیں، جن میں یہ واقعۂ کربلا پوری طرح غزوۂ بدر سے جُڑا ہوا نظر آرہا ہے:۔

لیت اشیاخی ببدر شہدوا　　جزع الخزرج من وقع الاسلْ

کاش میرے بدر (میں کام آنے) والے بزرگ آج ہوتے اور نیزوں کی مار سے خزرج (انصار) کی جزع فزع دیکھتے![1]

لاھلّوا واستھلّوا فرحاً　　ولقالوا یا یزیدُ لاتشل

تو خوشی سے چیخنے چلّاتے اور کہتے کہ یزید بس اب ہاتھ نہ روک۔

---

[1] اس شعر میں خزرج یعنی انصار خزرج کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ یہ شعر واقعۂ حرّہ کے سلسلے میں گھڑا گیا ہوگا۔ مگر جناب نقّن صاحب نے واقعۂ کربلا کے ذیل ہی میں اسے درج کیا ہے۔　　ص۲۹۵ (مطبوعہ سید العلماء اکیڈمی لکھنؤ)

بابائے ندوہ اور فرزندِ ندوہ

واقعۂ کربلا میں غزوۂ بدر کی کارفرمائی کا یہ شیعی نظریہ جسے مبصّر تعمیر حیات نے چند مصری مصنفین کی سند پر پیش کیا ہے، اس پر اور اس کے لئے دئے گئے دلائل و شواہد پر بات مکمل کرنے سے پہلے ایک عبرت کا باب درمیان میں کھولنا ہے۔ اور وہ یہ کہ بابائے ندوہ علامہ شبلی نعمانی، جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سب سے پہلے معتمد تعلیم رہے ہیں اُن کا ایک مختصر سا رسالہ عربی میں الانتقاد ہے۔ جو بنو اُمیہ پر جُرجی زیدان کے حملوں کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ کوئی اُسے دیکھے اور آج کے معتمد تعلیم ندوۃ العلماء مولانا عبداللہ عباس کے یہ فرمودات دیکھے جن میں جُرجی زیدان ہی کے کچھ تیر اُٹھا کے بنو امیّہ پر آزمائے گئے ہیں تو بے اختیار غنی کاشمیری کا شعر یاد آتا ہے ؎

غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشہ کن ❊ کہ نورِ دیدۂ ش روشن کند چشمِ زلیخا را[1]

مولانا عبداللہ عباس صاحب دورِ بنو اُمیّہ کے وہ "حالات" پیش کرتے ہوئے جنھوں نے حضرت حسینؓ اور اُن کے بعد کچھ دوسروں کو اموی حکومت کے خلاف اقدام پر مجبور کیا، ابوالفرج الاصبہانی کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں کہ اُس نے اپنی کتاب۔

> "اغانی میں ۱۸ ہزار دُھنیں اور لاتعداد فواحش و منکرات کے قصے قلمبند کردئے ہیں جن کی پرورش دربار شاہی سے ہوتی تھی۔"

اب "فرزند" کے مقابلے میں ذرا "بابا" کی سنئے۔

جُرجی زیدان نے اپنی کتاب التمدّن الاسلامی میں عربوں کی تصویر بگاڑنے کی غرض سے خصوصی طور پر بنو امیّہ اور ان کے عہد خلافت کو نشانہ بنایا۔ اور اِس نشانہ بازی میں اُس نے

---

[1] غنی پیرِ کنعاں کی "سیاہ بختی" یہ تو نظر کرو کہ ان کا نورِ نظر اور زلیخا کی آنکھ کا نور بن جائے! یہ اس شعر کا اردو مفہوم ہے۔

الزامات (یا اسکی اپنی زبان میں بیانِ واقعات وحالات) کیلئے جو ماخذ اپنائے ان میں اہم ترین ماخذ بھی ابوالفرج الاصبہانی کی الاغانی تھی۔ ہرچند کہ جرجی زیدان نے اپنی اس کتاب میں مولانا شبلی کے بھی کافی حوالے بڑی قدر و منزلت کے ساتھ دیئے تھے جس کا مولانا نے اپنے اس رسالے کے شروع میں تشکر کے ساتھ ذکر کیا ہے[1]، (ص۲) مگر مولانا نے اسی کے ساتھ یہ کہتے ہوئے کہ "اپنی مدح کے صلے میں عربوں کی ہجو سننے پر راضی ہو جاؤں یہ کبھی نہ ہوگا....." ایک ایک اعتراض اور اُس کے ماخذ کو لیا اور علمی دنیا میں زیدان کی پوری رسوائی کا سامان کر دیا۔ اسی ذیل میں بار بار اغانی کے حوالوں کی بے بضاعتی کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ایک جگہ کچھ زیادہ کہنے پر مجبور ہوتے ہوئے فرماتے ہیں (ترجمہ)

"ہم ابھی کہہ آئے ہیں کہ اغانی قصہ کہانیوں کی کتاب ہے۔ پس اگر کوئی سرسری سا مسئلہ ہو یا کوئی تفریحی اور وقفۂ استراحت (RELAXATION HOUR) کی بات چیت ہو تو اُسکے اور اس جیسی دوسری کتابوں کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر کوئی سنجیدہ موضوع ہے اور کسی ایسے معرکۃ الآراء مسئلے کا میدان ہے جس میں کسی کا تخت اور کسی کا تختہ ہوتا ہو تب اس جیسی کتاب ادنیٰ التفات کے لائق نہیں۔"

"پھر مزید یہ کہ صاحبِ اغانی شیعی ہے۔ اُسے کوئی بھی ایسی چیز ملے جو معاویہ کو عیب لگاتی ہو تو اُسے تو وہ دل جان سے قبول کرنے کو تیار رہتا ہے خواہ کیسی ہی لچر اور محض جھوٹ ہو۔" (ص۲۶)

فواحش و منکرات کے بعد اس دورِ بنو امیہ کے ظلم و جور کا "حال" بیان کرتے ہوئے مولانا عبداللہ عباس صاحب لکھتے ہیں کہ:-

"عدلیہ کا یہ حال تھا کہ حاکمِ وقت کے دیوانِ عام میں ایک چمڑے کا ٹکڑا (نطع) بچھا رہتا تھا اور بغیر کسی دلیل و بحث اور بغیر کسی الزام کے جس کو چاہا اس پر کھڑا کر دیا اور جلاد نے اسکی گردن اُتار دی۔"

---

[1] مولانا کا یہ رسالہ "الانتقاد" ۱۹۱۲ء میں مطبع آسی محمود نگر لکھنؤ سے چھپا ہے۔ ندوے کے کتبخانہ میں نمبر ۵۴۴۹ ۲۰/۶۰ ۷ پر موجود ہے۔

"وہ دور جس میں کربلا کا واقعہ پیش آیا، ایک شخصی حکومت کا تھا حاکم وقت کے دو لبوں .... کے درمیان سارا قانون تھا"

مولانا شبلی حضرت معاویہؓ کے زمانے کا نہیں قریب ۵۰ برس بعد ہشام بن عبد الملک کا حال جرجی زیدان کے جواب میں لکھتے ہیں کہ :-

"سفیان ثوری کے استاد سلیمان اعمش، جو کہ ایک عجمی غلام تھے ان کو خلیفہ ہشام نے ایک خط اس فرمائش میں لکھا کہ مناقب عثمان اور مساوئی علی میں میرے لئے ایک رسالہ تحریر فرما دیں تو آپ نے وہ خط لیکے اپنی بکری کے منہ میں دیدیا اور کہا جاؤ کہہ دینا یہ تمہارے خط کا جواب ہے!"

ایک بات اس سلسلے میں بڑے پتے کی مولانا شبلی نے یہ فرمائی ہے (ص۲۳) جو تاریخ کے طالب علموں کو نوٹ کر لینی چاہئے کہ کسی قوم کے ایک دو آدمی اگر غلط حرکات (مثلاً ظلم و جبر) کے عادی پائے جائیں تو اُسے عام طور سے قوم اور جماعت کا معمول اور کردار بنا دینا (GENERALISATION) کوئی اچھی حرکت نہیں ہے۔ بنو اُمیہ میں ایسی مثالیں مل سکتی ہیں۔ اُن کا انکار نہیں کیا جائے گا۔ مگر پورے قبیلے کو مجرم ٹھیرانا یہ صرف بدخواہوں کا شیوہ ہے۔

ہماری تاریخی کتابیں عہد عباسی میں تیسری اور چوتھی صدی میں مرتب ہوئی ہیں۔ مولانا عبد اللہ عباس نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ مگر یہ بات جو بالکل معقول تھی کہ روایتیں تو سب طرح کی تھیں لیکن حکومت کے طرفداروں کی روایتوں کو زیادہ مشہور ہونے کا موقع ملا مخالفوں کی بات دبا رہی یہ بنی امیہ کے جور و ظلم کی حکایت کے درمیان میں اس طرح کہی گئی ہے جس سے تاثر ہوتا ہے کہ گویا روایتوں کا پلہ بنی امیہ کے حق میں جھک گیا حالانکہ واقعہ برعکس ہے جیسا کہ مولانا شبلی جرجی زیدان سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں :-

"مورخین جو سب کے سب عہد عباسی کے ہیں اُن میں سے کوئی دم نہیں رکھتا تھا کہ محاسن بنی امیہ کو بیان کرے۔ اور اگر کسی سے یہ غلطی سرزد ہو گئی تو پھر اُسے ہتک و ایذا وغیرہ طرح طرح کے مصائب سے گزرنا پڑتا تھا جس کی مثالوں کی تاریخ کے صفحوں میں کچھ کمی نہیں ہے (وکم لنا من امثال ھذہ فی اسفار التاریخ)"
(ص۱۱۶)

اصل بحث کی طرف رجوع

اس جاہلی یا شیعی نظریے کی صداقت منوانے کیلئے کہ سانحۂ کربلا میں دراصل غزوۂ بدر کا حساب چکایا گیا تھا، ایک تو خاندانِ بنو ہاشم اور خاندانِ بنو امیّہ کی "دیرینہ عداوتوں" کا افسانہ سنایا جاتا ہے، جسے سنانے والوں کو آج تک باوجود اسکے شرم نہیں آتی کہ اہلِ علم نے اِن دونوں خاندانوں کے درمیان شادی بیاہ کے اُن رشتوں کی مکمل فہرستیں پیش کردی ہیں؛ جو واقعۂ کربلا سے پہلے بھی ہوتے رہے اور بعد میں بھی۔ اور سب چھوڑیئے عمِّ نبی (علیہ السلام) حضرت عباسؓ بن عبد المطلب کی اور یزید کے دادا ابو سفیانؓ بن حرب کی اس دوستی کو کیسے اِن "دیرینہ عداوتوں" کے افسانے میں فِٹ کیا جائے گا جو فتح مکہ کے موقع پر حضرت عمرؓ کی تلوار اور ابو سفیان کے بیچ میں حائل ہوئی اور اِس سے کم پر راضی نہ ہوئی کہ نہ صرف ابو سفیان کا اسلام دربارِ نبویؐ میں قبول فرمایا جائے بلکہ اُن کے گھر کو مانندِ حرم "جائے امن" قرار دیدیا جائے؟[1]

دوسری دلیلِ "صداقت" معتمد صاحب نے ذیل کے الفاظ میں پیش فرمائی ہے کہ:۔

"غزوۂ بدر میں مسلمان فوج کی کامرانی نے جس طبقے کو سب سے زیادہ برافروختہ کیا اُسکے سربراہ ابو سفیان تھے۔ اسی طرح غزوۂ اُحد میں اُن کا اور اُن کی اہلیہ جگر خوارِ حمزہ ہند کا کردار یہ سب وہ باتیں ہیں جن میں مؤرخین کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ فتح مکہ کے بعد یہ گروہ اسلام لایا (یا بقول سید قطب شہید کے استسلام کیا) مگر اس استسلام کے بعد اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہو گئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے، اپنی انانیت کو بھول گئے عقلاً محال بات ہے۔ اور صحاح کی مستند روایات سے ثابت ہے کہ ہند نے بیعت کے الفاظ دُہراتے ہوئے بھی اپنے اندرونی کرب و غم اور غیظ و غضب کا اظہار کیا تھا"

ان واقعات کے حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ:۔

"اسلام کے پورے طور پر فاتح ہو جانے کے بعد جب مقاومت کی تمام راہیں مسدود ہو گئی تھیں اس عرصۂ مختصر میں اس گروہ کی طرف سے کسی واضح دشمنی کا ثبوت تاریخ میں نہیں ملتا۔ مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں کی شکست کا غم و غصہ آج تک موجود ہے اسی طرح اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینے کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت نے البتہ اسلام کی طرف سے اُن کے عناد کو ختم کیا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اُن کا دل صاف نہیں ہوا۔"

کیسے بار بار کہا جائے؟ اور نہیں تو کیسے نہ کہا جائے؟ کہ یہ دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسی بڑی اسلامی و دینی درسگاہ کے معتمد تعلیم کے ارشادات ہیں! صحاح میں تو حضرت ہندؓ کے "غیظ و غضب" والی روایت (کم از کم ہماری تلاش کی حد تک) کہیں نہیں ملتی۔ البتہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ کے حوالے سے حسب ذیل روایت ملتی ہے :-

قالت جاءَ ھندٌ بنت عتبۃ	آپ نے فرمایا کہ پھر ہند بنت عتبہ آئیں
قالت یا رسول اللہ ما کان	اور کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ (کل تک)
علیٰ ظھر الارض أھل خِباءٍ احبُّ	روئے زمین پر کوئی دوسرا گھرانہ ایسا
اِلیَّ ان یذلّوا من اھل خبائِك	نہ تھا جس کی ذلت مجھے آپ کے گھرانے
ثُمّ ما اصبح الیوم علیٰ ظھر	کی ذلت سے بڑھ کر منظور ہو، اور آج
الارضِ اھل خباءٍ احبُّ اِلیَّ اَن	روئے زمین پر کوئی دوسرا گھرانہ نہیں
یعزّوا من اَھلِ خبائك۔[۱]	ہے جس کی عزت آپ کے گھرانے کی
	عزت سے بڑھ کر محبوب ہو۔

اور اس کے جواب میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد با ایں الفاظ روایت ہوتا ہے کہ :-

[۱] صحیح بخاری ج اول . کتاب المناقب . باب ذکر ہند بنت عتبہ۔

قال وایضاً والذی نفسی بیدہٖ[1]

اس کی شرح میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

قال ابن التین فیہ تصدیق لہا فیما ذکرتہ .... وقال غیرہ: المعنیٰ لقولہ "وایضاً" ستزیدین فی المحبۃ کلما تمکن الایمان من قلبک وترجعین عن البغض المذکور حتیٰ لا یبقیٰ لہ اثر۔[2]	ابن تین نے فرمایا ہے کہ آنحضرتؐ کے اس ارشاد میں ہند کے قول کی تصدیق فرمائی گئی ہے..... اور دوسروں نے کہا ہے کہ لفظ "ایضاً" سے آپؐ کا مطلب یہ تھا کہ تمہاری یہ محبت اور بڑھے گی جیسے جیسے تمہارے دل میں ایمان جمے گا۔ اور بغض سے اس طرح پاک ہو جاؤ گی کہ اس کا کوئی شائبہ باقی نہ رہے گا۔

کیا اسکے بعد بھی کہا جائے گا کہ "ایک پل میں ایسی تبدیلی ہو گئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے، اپنی انانیت بھول گئے؟" "عقلاً محال بات ہے؟" کسقدر بے خبری اس جملے میں مقام نبوتؐ و محمد عربیؐ سے ٹپک رہی ہے۔ جس کے اعجاز سے پتھر گویا ہو گئے ہوں، اشجار حرکت میں آئے ہوں۔ ایک پیالہ آب چشمۂ جاری بن گیا ہو۔ اُسکے دست اعجاز اور نفس مسیحائی و نظر کیمیا اثر کی تاثیرات کی طرف سے خاص اہل انسانی میدان میں اشکال جو اس کی اثر نمائی کا اصل میدان تھا؟ کیا فضالہ بن عمیر کے جیسے مشہور واقعات بھی ذہن میں نہیں جو اسی فتح مکہ کے موقع پر اپنی دشمنی کے جذبات سے مجبور ہو کر عین حالتِ طواف کعبہ میں حضورؐ کو شہید کرنے کے ارادے سے نکلا تھا۔ اور حضورؐ کے دست مبارک کی اُسکے سینے پر ایک دستک نے اُسکی عداوت کو سراپا محبت بنا دیا۔

یہ پل بھر میں معاملہ کچھ سے کچھ ہو جانے کا ایک ہی واقعہ تھوڑے ہی ہے۔ زیادہ کی تو اس وقت گنجائش نہیں۔ لیکن حضرت عمرو بن عاص کا ایسا ہی واقعہ یہاں اور ذکر کر دینا چاہیئے۔

---

[1] ایضاً [2] فتح الباری ج ۷، ص ۱۴۱ طبع سعودیہ۔

کیونکہ وہ بھی اُنہی اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ہیں، جن سے کتنے ہی سُنّیوں کا دل بھی شیعی روایتوں نے میلا کر رکھا ہے۔ صحیح مسلم کی طویل روایت ہے جس میں حضرت عمروؓ کے آخری وقت کا حال بیان ہوا ہے۔ اُنکے اور اُنکے صاحبزادے کے درمیان اُس وقت کی گفتگو کا بیان کرتے ہوئے راوی حضرت عمروؓ کے الفاظ نقل کرتے ہیں کہ :-

...... لقد رأيتني وما احدٌ	..... میرا ایک زمانہ وہ تھا کہ مجھ سے
اشدَّ بغضاً لرسول الله صلى الله	بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
عليه وسلم منّي ولا احبَّ اليَّ	ساتھ عداوت رکھنے والا اور اس بات کی
ان اكون قد استمكنتُ منه	آرزو رکھنے والا کوئی دوسرا نہ تھا کہ مجھے
فقتلتهُ منه فلو مُتُّ على تلك	قابو ملے اور آپ کو قتل کر دوں۔ میں اگر
الحال كنتُ من اهل النار فلما	اس حال میں مرجاتا تو دوزخ میرا ٹھکانہ
جعل الله الاسلام في قلبي	تھا۔ پھر جب اللہ نے میرے دل میں اسلام
اتيت النبي صلى الله عليه وسلم	ڈالدیا تو میں آنحضرت کی خدمت میں
فقلتُ ابسط يمينك فلأبايعك	حاضر ہوا اور عرض کی کہ اپنا ہاتھ دیجئے
فبَسَطَ يمينهُ قال فقبضت	میں بیعت کروں۔ آپؐ نے دست مبارک
يدي قال مالك يا عمرو قال	بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ آپؐ نے
قلتُ اردت ان اشترط قال	فرمایا یہ کیا؟ میں نے عرض کی، میں کچھ
تشترط بماذا قلتُ انْ يغفرلي	شرط کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا، کیا شرط
قال اما علمت يا عمرو ان	کروگے؟ عرض کیا شرط یہ ہے کہ بخشدیا
الاسلام يهدم ما كان قبله	جاؤں۔ فرمایا، عمرو کیا تم کو نہیں معلوم
وان الهجرة تهدم ما كان	کہ اسلام اپنے سے پہلے کا سب کچھ
قبلها وانّ الحج يهدم ما كان	مٹا دیتا ہے۔ ہجرت اپنے سے پیشتر کا

قبلہ وما کان احدٌ احبَّ الیَّ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا اجلّ فی عینی منہ وما کنتُ اطیقُ ان املأ عینی منہ اجلالاً لہ ولو سُئلت ان اصفہ ما اطقتُ لانی لم اکن املأ عینی منہ ....[1]

سب کچھ مٹا دیتی ہے اور حج اپنے سے پہلے کے ہر گناہ کو مٹا دیتا ہے۔ اور پھر اسکے بعد میرا حال یہ ہوا کہ کوئی اور نہ تھا جو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب ہو اور میری نگاہ میں آپ سے بڑھ کر محترم ہو۔ اور آپ کی عظمت کے مارے مجھ میں تاب نہ تھی کہ نظر بھر کے آپ کو دیکھ لوں چنانچہ اگر مجھ سے کوئی کہتا کہ آپ کا حلیہ بیان کروں تو میں نہ کر پاتا، کیونکہ میں نے کبھی آپ کو آنکھ بھر کے دیکھا ہی نہ تھا۔!!

غرض یہ ہے کہ آن کی آن میں لوگوں کے دلوں کی دنیا بدل جانا یہ تو ہمارے سرکار کے یہاں اللہ کے حکم سے صبح و شام کی بات تھی۔ ہند اور ابو سفیان (رضی اللہ عنہما) کے دلوں کی بابت آخر یہ بے یقینی کیوں ہو؟ اور مزید یہ ہے کہ وہ جو روایت حضرت ہند کے غیظ و غضب کی تاریخ کی کتابوں میں آتی ہے جس کی طرف تبصرہ نگار نے صحاح کی روایت کہہ کر اشارہ کیا ہے اُسکے بارے میں حافظ ابن کثیر کا تبصرہ یہ ہے کہ "ھٰذا اثر غریبٌ وفی بعضہ نکارۃٌ"[2] اسکے بعد اس روایت کی جو اوقات رہ جاتی ہے وہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔ علاوہ ازیں یہی غیظ و غضب" والی روایت اس طرح بھی نقل ہوئی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ جو آنحضرت کی طرف سے عورتوں کی بیعت لے رہے تھے۔ انھوں نے جب ہند سے یہ باتیں سنیں اور ایک خاص سوال کے نتیجے میں اسکو پہچانا تو ہنستے ہنستے لوٹ گئے[3] اگر ہند کے سوال وجواب

---

[1] صحیح مسلم۔ کتاب الایمان۔ باب الاسلام یھدم ما قبلہ [2] تفسیر ابن کثیر۔ سورۃ الممتحنہ آیت بیعت

[3] ایضاً۔ عربی کے الفاظ ہیں۔ فضحک عمر بن الخطاب حتّٰی استلقٰی۔

غیظ و غضب کے ماتحت ہوتے تو کیا حضرت عمرؓ سے اس پر ہنسنے کی توقع کی جاسکتی تھی؟

نہایت افسوس ہے کہ معتمد تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء نے احمد امین اور طٰہٰ حسین کے حوالے سے الفاظ کے برائے نام فرق کے ساتھ، بعینہ وہ بات فرمائی ہے جو جناب علی نقی صاحب قبلہ مجتہد اپنی کتاب "شہید انسانیت" میں "اسلام کا مزاحم طاقتوں سے تصادم" کے زیر عنوان "مدتوں پہلے تحریر فرما چکے ہیں۔ اس بیان میں وہ فتح مکہ پر آتے ہیں اور حضرت ابوسفیان اور اُن کی بیوی ہند اور دیگر کفار مکہ کے قبول اسلام کا ذکر کرکے فرماتے ہیں:-

"مگر مذکورہ واقعات سے ہر انسان یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ بے بس ہو جانے کے بعد آدمی سر جھکا سکتا ہے۔ ہاتھ روک سکتا ہے۔ ہتھیار ڈال سکتا ہے۔ زبان بند کر سکتا ہے لیکن اپنے دل میں تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا۔ اپنے قلب میں یقین کی صفت پیدا نہیں کر سکتا۔ اور اپنی نفرت کو محبت میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ وہ نفرت اور دشمنی جو اُن حدود تک پہنچ چکی تھی جن کا مظاہرہ گزشتہ واقعات سے ہو چکا ہے۔ کیا اس سب کے بعد (وہ) محبت و عقیدت سے تبدیل ہو سکتی ہے؟ عام اصولِ فطرت اور واقعات کی رفتار کے مطابق یہ بات غیر ممکن معلوم ہوتی ہے۔ عام فطرت کے مطابق صرف اتنا سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ دشمن جو اب تک پھنکارے مارتے ہوئے اژدھے کی طرح سامنے موجود تھا اب مار آستین بن کر خفیہ ریشہ دوانیوں کے لئے آزاد ہو گیا۔" صفحہ ۵۹-۶۰ (شہید انسانیت)

اسکے بعد کیا ہم غلط ہوں گے اگر علی نقی صاحب قبلہ میں اور مولانا عبداللہ عباس میں کوئی بڑا فرق نہ سمجھیں؟

طٰہٰ حسین اور احمد امین کا ایسے معاملے میں حوالہ تو جیسا کچھ ہے اُسے کیا کہیں، اس اشاعت میں کچھ دوسرے لوگوں کی تحریروں، بالخصوص ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی صاحب کے گرانقدر تنقیدی مقالے میں اس پر کچھ کہا بھی گیا ہے، ہمیں تو سید قطب کا نام بطور سند

پیش کئے جانے پر بھی حیرت ہے۔ مرحوم کی قابلِ قدر باتیں اپنی جگہ مگر دینی سند تو وہ جہاں تک ہم جانتے ہیں اخوان المسلمین کے ذی علم لوگوں کی نظر میں بھی نہ تھے۔ اسکے علاوہ معتمد صاحب کو اس بات سے بھی بے خبر نہ ہونا چاہیئے تھا کہ کم از کم برصغیر میں تو اس نام کو کوئی دینی وزن حاصل نہیں ہے، دینیات میں اعتبار رکھنے والے حلقوں میں تو اس نام سے آشنائی بھی شاذ و نادر ہی ہے۔ ہاں اخوان المسلمین سے تعارف یا روابط رکھنے والے کچھ حلقے یہاں ہیں اُنکے یہاں اِس نام کی ضرور مان دان ہے۔

بے شک بعض تاریخی روایتیں حضرت ابوسفیان کے اسلام میں داخلے کو "استسلام" (مجبورانہ اسلام) ہی کی شکل میں پیش کرتی ہیں۔ مگر جب صحاح کی بخاری جیسی درجہ اول کی کتاب میں "استسلام" کے بجائے اُن کے اسلام کی صاف روایت پائی جاتی ہے تو دینی اعتبار سے اور اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں تقاضائے واختیار کے اعتبار سے بخاری کی اس روایت کو چھوڑ کر کہیں اور جانے کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ بخاری کتاب المغازی باب این رکز النبی صلی اللہ علیہ وسلم الرأیۃ یوم الفتح کی پہلی ہی روایت میں فتح مکہ اور اسلام ابوسفیان کا تفصیلی ذکر ہے۔ اور وہاں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے سچے اسلام کے بجائے بادلِ ناخواستہ کلمہ پڑھنے کی بات نکلتی ہو۔ اور مانا کہ واقعہ کی اصل صورت وہی تھی جس سے استسلام اور بادلِ ناخواستہ اسلام ظاہر ہوتا ہے تب بھی کیا ایک مومن کو یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ اس روایت کے مطابق اسی شخص کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس درجے کی تألیف قلب (بلکہ سچ یہ ہے کہ ناز برداری) کا معاملہ فرماتے نظر آرہے ہیں؟ بایں حالتِ استسلام — جیسا کہ روایت ظاہر کرتی ہے — یہ تو گزر ہی چکا کہ اُن کے گھر کو حرم کی طرح جائے امن قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ علمبردار انصار حضرت سعد بن عبادہ ابوسفیان کو سامنے دیکھ کر نعرہ لگاتے ہیں کہ آج "رن پڑے گا۔ آج کعبے میں بھی خون بہے گا۔" ابوسفیان کو آنحضرت سے شکایت کرتے ہیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ

سعد نے غلط کہا۔ اور پھر سعد سے جھنڈا لیکر دوسرے کو دیدیا جاتا ہے۔ کیا اس شخص کو عمر بھر استسلام ہی کی حالت میں بتا کر ہم معاذ اللہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حضور اس شخص کے ساتھ یہ معاملہ فرما کر غلطی کر رہے تھے ؟

معاملے کے اس پہلو کو سامنے رکھا جائے تو ایک سید قطب کیا دشمن "قطب الاقطاب" بھی یہ کہتے ہوئے اچھے نہیں لگ سکتے کہ "وہ اسلام کہاں لائے تھے۔ استسلام کیا تھا"۔۔۔ امام ابن تیمیہ کے فتاوی کے ایک مضمون کا ترجمہ ماہ گزشتہ ہی کے الفرقان میں چھپا تھا۔ اسکی یہ سطریں اس موقع پر پڑھ لیجئے :۔

"۔۔۔۔ وہ صحابہ جو فتح مکہ کے بعد اسلام لائے (اور جن کو اسلامی تاریخ کی اصطلاح میں طُلَقاء کہا جاتا ہے) جیسے عکرمہ بن ابی جہل، حرث بن ہشام، سُہیل بن عمرؓ، صفوان بن اُمیہؓ اور ابو سفیان بن حرث ان تمام لوگوں کے بارے میں پوری اُمّتِ مسلمہ کو اتفاق ہے کہ ان کو اچھی اسلامی زندگی نصیب ہوئی اور ان میں سے کسی پر بعد کے دور میں بھی کسی نفاق کی تہمت نہیں لگائی گئی۔۔۔۔"

الفرقان۔ مارچ ۹۲ئہ ص۱۱

اور یہاں یہ بھی یاد کیجئے کہ ابو سفیان بن حرب (اموی) کے ساتھ تو یہ کشادہ قلبی اور ناز برداری کا معاملہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ابوجہل کے بیٹے عکرمہ جو خود بھی اشتہاری مجرم ہیں اور فرار ہو کر یمن جا چکے ہیں اُن کی مسلمان اہلیہ کی درخواست پر معافی عطا کی جاتی یقین دہانی کرائی جاتی ہے ۔۔۔۔۔۔۔ اور وہ یقین کر کے آجاتے ہیں تو اس گرمجوشی سے استقبال فرمایا جاتا ہے کہ عجلت میں ردائے مبارک جسم اطہر سے ہٹ جاتی ہے اور ایسا ہی مہر و کرم کا معاملہ صفوان ابن امیہؓ کے ساتھ فرمایا جاتا ہے جو اسی صف اول کے نامی گرامی دشمنوں میں رہے ہیں۔ معافی کی نشانی کیلئے عمامہ مبارک دیا جاتا ہے۔ مگر اسکے برعکس ۔ ہاں اسکے برعکس ابو سفیان بن حرث بن عبد المطلب (ہاشمی) جو اپنے عم زاد ہیں اور اُنھیں اُم ہانی (بنت ابی طالب)

جیسی پیاری بہن[لہ] اپنے ساتھ لیکر معافی دلانے کیلئے حاضر ہوتی ہیں تو سرکار رُخِ انور پھیر لیتے ہیں۔ وہ بھائی ہونے کا واسطہ دیتی ہیں تو فرماتے ہیں مجھے ایسے بھائی کی ضرورت نہیں۔ غرض بڑی مشکلوں سے معافی ملتی ہے! کیا اسکے بعد بھی یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ جن کا اعزاز و اکرام خود حضور اکرم ؐ نے فرمایا ہمیں اُنکی توہین تو کم از کم نہ کرنی چاہیئے۔ اور کچھ تو غور کرنا چاہیئے کہ اعزاز و اکرام اور مہر و کرم کا آخر راز کیا تھا؟ — کیا اللہ کا رسول ؐ — معاذ اللہ — مارہائے آستین پال رہا تھا؟ قبلہ نقّن صاحب مجتہد کو بالکل روا ہے کہ یہی تصوّر دیں کیونکہ اُنکے نزدیک تو سب سے بڑے "مارہائے آستین" خلیفۂ اول و دوم تھے، مگر ندوے کے منبر سے بھی ہم ایسی ہی صدا سنیں! الامان، الحفیظ!

تشیعیت اور تشیّع سے یکجہتی

جناب تبصرہ نگار نے، ندوے کے منبر سے، صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایسے گروہ کے بارے میں بھی تشیعیت کی ہم زبانی ہی نہیں کی ہے جسے اسلام میں لانے کی خاطر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھُلی ناز برداریاں فرمائیں، بلکہ معاملہ تشیعیت اور تشیّع سے ایک طرح کی یکجہتی (SOLIDARITY) تک پہنچا دیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے بعض لوگوں کی طرف سے ائمہ اربعہ میں سے کم از کم تین (امام ابو حنیفہ، امام احمد، اور امام شافعی) کے حبِّ اہلِ بیت کیلئے "تشیعیت" کی تعبیر کو اس طور پر نقل کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس تعبیر میں کوئی اعتراض کی بات نہیں، بالفاظ دیگر ہم وہ تمام لوگ جو الحمد للہ حبِّ اہلِ بیت سے محروم نہیں ہیں اُنھیں اس لفظ سے کوئی وحشت نہیں ہونی چاہیئے۔

ائمہ اربعہ کا زمانہ جب کہ یہ لفظ محض لغوی معنیٰ میں، یا بقول تبصرہ نگار بطور ایک سیاسی اصطلاح کے حضرت علیؓ اور اُن کی اولاد کی سیاسی ہمنوائی کیلئے بولا جاتا تھا، ظاہر ہے کہ اُس وقت اس کے استعمال میں احتیاط، پرہیز یا وحشت کی کوئی بات نہ تھی، مگر اب جبکہ یہ لفظ اہلِ سنت والجماعۃ کے مقابلے میں دین اسلام کی ایک متوازی تعبیر ہے، جو ہر ہر نکتے پر اپنے آپ کو ایک جُدا دین ثابت کرتی ہے ایسے وقت میں اہلِ سنت کی کسی درسگاہ

لہ اور ایک روایت کے مطابق اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہؓ

سے یہ آواز اُٹھنے کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے کہ "عقیدۂ بدا، تحریف قرآن اور افک اُمّ المؤمنین" جیسی باتوں کو نہ مانتے ہوئے اگر خود کو شیعہ کہو کہلاؤ یا کہلائے جانے پر راضی ہو تو حرج کی بات نہیں اور کم از کم اس لفظ سے وحشت تو ہونی ہی نہ چاہیئے، کیونکہ ہمارے تو ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ جیسے ائمہ "شیعہ" اور "رافضی" کہلائے ہیں!

یقین فرمایئے کہ حضرت حسن وحسین (رضی اللہ عنہما) کا نام زبان وقلم پر لاتے ہوئے بے اختیار جی چاہتا ہے کہ "امام" اور "علیہ السلام" کے الفاظ اُن کیلئے استعمال کئے جائیں۔ مگر صرف اس لئے ان کے استعمال سے پرہیز کرنا پڑتا ہے کہ ان الفاظ کو اب شیعہ اُس خاص مفہوم میں استعمال کرتے اور اُن عقیدوں کے ساتھ استعمال کرتے ہیں جو اہلِ سنت کے یہاں قطعی ضلالت اور تحریفِ دین ہے۔ اور ایسی صورت میں عوام کے دین کی حفاظت کے لئے ہمارا فرض ہے کہ جذباتی تقاضہ قربان کریں۔ سو اسی نقطۂ نظر سے ہمارے لئے یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ "واقعۂ کربلا اور اُس کا پس منظر" کے مقدمے میں سُنّی گھرانوں اور سُنّی دماغوں سے بھی کسی نہ کسی حد تک بالعموم بسی ہوئی شیعیت کو نکالنے کی ضرورت اور اہمیت پر جو کلام کیا گیا تھا اُسے ندوے کے ذمہ داروں اور ترجمانوں کے یہاں بجائے خود ایک "تحریفِ دین" سمجھا جائے اور اسکے برخلاف عامۂ مسلمین کو یہ باور کرایا جائے کہ شیعیت سے اُنس وعقیدت تو ہمارے ائمہ واکابر کی "سنّت" ہے۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے!

اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خاص گروہ کے بارے جس سے شیعیت کا کلیجہ خاص طور پر پُھنکتا ہے ٹھیک وہی تبرّائی زبان جو کُتبِ شیعہ میں مذکور ہے، اور تصوّرِ شیعیت سے وہ فتنہ انگیز تضامُن ویکجہتی جو اس تبصرے میں ڈنکے کی چوٹ پر برتی گئی ہے۔ ندوۃ العلماء کی انتظامیہ سے قطعی طور پر اس بات کی طالب تھی کہ صاف اور صریح الفاظ میں اس سے براءت کی جائے،

ترجمان ندوۃ العلماء میں اس کی اشاعت پر معذرت کی جائے اور متعلقہ ذمہ داروں کی اُنکی ذمہ داریوں کے بقدر تأدیب کی جائے ـــــ اور اس باب میں اُن کیلئے قریب ترین اُسوۂ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا عمل تھا۔

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جلد اول جو سید صاحب کے استاد مولانا شبلیؒ کی تألیف تھی، مگر استاذ کی وفات نے اس پر نظر ثانی اور اشاعت وغیرہ کے مراحل شاگرد سعید کے حصے میں ڈالدیئے۔ اس نظر ثانی میں اُن کے قلم سے غزوۂ بدر کی حدیثی روایتوں کے سلسلے میں صحابیٔ رسول حضرت کعب بن مالکؓ کی روایت پر کچھ ایسی تنقید نکل گئی جس سے، خود سید صاحب کے الفاظ میں "صحابیٔ رسول کی شان میں سوءِ ظن کا پہلو پیدا ہوتا تھا" سید صاحب کو غالباً کسی نے توجہ دلائی یا خود اُنکی سعید روح نے احساس کیا تو چوتھے ایڈیشن کے دیباچہ میں یہ عبارت تحریر فرمائی جو سچ یہ ہے کہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے اور انشاء اللہ مرحوم کی راحت ابدی کے سامانوں میں سے ایک بڑا سامان بنے گا۔ فرماتے ہیں:-

"غزوۂ بدر کی روایتوں کی تنقید کے سلسلے میں ایک مقام پر اس نافہم ہیچمداں کے خطا کار قلم سے حضرت کعب بن مالک صحابی کی روایت پر نامناسب تنقید نکل گئی تھی، جس سے ایک گونہ ایک جلیل القدر صحابی کی شان میں سوءِ ظن کا پہلو پیدا ہوتا تھا، جس پر مجھے شرمندگی ہے۔ اور اب میں اپنی اس غلطی و نادانی کو مان کر اس عبارت کو قلم زد کر کے صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی براءت کرتا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ سے عفو کا خواستگار ہوں۔

بندہ ہماں بہ کہ زتقصیر خویش
عُذر بہ درگاہِ خدا آورد

(جلد اول طبع چہارم (دار المصنفین۔ صفحہ ۱ [1])

[1] سید صاحب نے یہاں اپنے قارئین سے مزید یہ درخواست بھی کی ہے کہ جن لوگوں کے پاس پہلے کے نسخے ہیں وہ اپنے نسخہ سے صفحہ فلاں اور سطر فلاں پر متعلقہ عبارت قلم زد فرمادیں۔

ایسا پاکیزہ اور قابلِ فخر و اتباع اُسوۂ عمل ندوے کے قریب ترین بزرگوں کی زندگی میں پایا جائے. لیکن اُسکے موجودہ بزرگ اس کے برخلاف اس تبرّائی تبصرے کے سلسلے میں وہ رویہ پسند فرمائیں جس کا پوری تفصیل سے بیان راقم ہی کے قلم سے نکلے گزشتہ مضمون (مجھے ہے حکم اذاں .....) میں ہو چکا ہے، یہ کوئی معمولی سانحہ نہیں ہے اس لئے کہ معاملہ دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسی اہلِ سنت کی ایک مرکزی درسگاہ کا ہے. سید صاحب نے بڑی حد تک محض ایک شخصی ذمہ داری کا احساس فرماتے ہوئے اپنی غلطی کے اثرات کو محو کرنے کی بجان و دل اور بکمالِ صراحت کوشش فرمائی اور آج کے ندوے کے وہ بزرگ جو محض ضابطے ہی میں اسکے بزرگ نہیں، عملاً اور اخلاقاً بھی بزرگ اور بزرگ تر ہیں یا ندوے کے محدود دائرے سے بھی آگے بڑھ کر وہ آج کی ملّتِ اسلام کے بزرگ ترین افراد میں شمار ہوتے ہیں، وہ ایک شخصی نہیں محض ایک اداری بھی نہیں بلکہ مزید برآں ایک ملّی ذمہ داری کے ادا کرنے میں اسقدر تکلّف، دقّت اور اسقدر پریشانی محسوس فرما رہے ہیں کہ یصدالحاج والتیا جو آخری چیز اس ضمن میں اُنکے قلم سے نکلی ہے اور بظاہر حرفِ آخر بن گئی ہے، وہ ۲۵ اپریل ۹۲ء کے تعمیر حیات کے صفحہ ۵ کا مضمون ہے. جو قارئین الفرقان کے مطالعے کیلئے اس اشاعت میں بتمامہ شامل بھی کر دیا گیا ہے.

ہم کیا بتائیں، کسقدر حیرت اور رنج و الم کے ساتھ مولانا کا یہ مضمون دیکھا ہے، جس کے متعلق آپ نے اسکی اشاعت سے پہلے اپنے رفیق و محبّ قدیم یعنی راقم کے والد ماجد کو، ان کے دوسرے خط کے جواب میں (جس میں مولانا کے مضمون مجریہ ۲۵ مارچ ۹۲ء پر گہری مایوسی کا اظہار کیا گیا تھا) یہ تحریر فرمایا تھا کہ اُن کے تأثر اور تبصرے کو اپنے ۲۵ مارچ کے مضمون کے بارے میں بالکل صحیح سمجھتے ہوئے اب وہ ایک زیادہ واضح اظہارِ حقیقت پر مشتمل مضمون شائع کرا رہے ہیں. وہ زیادہ واضح اظہارِ حقیقت اس مضمون میں فقط یہ نکلا کہ:

۱۔ سابق مضمون میں مولانا عبداللہ عباس کے تبصرہ کا کوئی ذکر نہیں تھا. اس مضمون کی تقریب یا

شانِ نزول میں اس کا اس طور پر ذکر کیا گیا کہ اس میں "حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے بارے میں بعض ایسے خیالات اور تاریخی تجزیہ و تبصرہ آیا ہے جس سے ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے"!

۲۔ اس اندیشے کے ماتحت ندوۃ العلماء کے بانیوں، ذمہ داروں اور کارکنوں کے بارے میں وضاحت کی گئی کہ وہ "اہلِ سنت والجماعت کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں"۔ اور صحابہ کرام کے بارے میں اہلِ سنت کے متفقہ مسلک کے قائل ہیں۔

۳۔ حضرت ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کے بارے میں صراحت کی گئی کہ وہ شرفِ صحابیت رکھتے ہیں اور کچھ مزید فضائلِ اسلام کے بھی حامل ہیں۔

یہ تمام قصہ چار کالم (ایک صفحہ) کے مضمون میں کُل ایک کالم کے اندر طے ہو جاتا تھا۔ باقی تین میں سے اڑھائی سوا کالم کے اندر ندوے کے فضلاء اور نمائندگان کا حصہ صحابہ کرام کے سوانح اور خدمات کی نشر و اشاعت میں بتایا گیا تھا۔ اور پونے دو کالم حضرت ابوسفیان کے تذکرے کے بعد اِن امور کے بیان میں صرف کئے گئے تھے کہ:۔

۱۔ ..... "ائمہ اہلِ سنت اور اس گروہ کے تمام محقق اور معتبر علماء اور نمائندوں کا اس پر اتفاق ہے کہ خلافت راشدہ امیر المؤمنین سیدنا علی کرم اللہ وجہہ پر ختم ہو گئی۔ حضرت معاویہؓ اور اُن کے جانشینوں کی حکومت احادیث صحیحہ کے مطابق ...... خلافتِ راشدہ نہیں تھی ......"

۲۔ "اس طرح گروہ اہلِ سنت یزید بن معاویہؓ کو اس دورِ خیر و برکت میں جماعتِ صحابہ اور صالحین امت پر حکومت کرنے کا مستحق نہیں سمجھتا ....؟

۳۔ "اسکے نتیجے میں اور اس پس منظر میں محققین اہلِ سنت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کو درست سمجھتے ہیں جو انھوں نے یزید کے معاملے اور مقابلے میں

اختیار کیا ......"

اسکے بعد ایک ۴؎ بھی تھا جو حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کی اولاد میں سے بعض کے اپنے اپنے زمانے میں ایسے ہی اقدامات کی تصویب میں لکھا گیا تھا۔ اس کی عبارت دینے میں طوالت درپیش تھی اس لئے اقتباس نہیں دیا جا رہا ہے۔

چار کالم کے اس مضمون میں ایک لفظ مولانا عبداللہ عباس کے اس تبصرے پر رنج اور افسوس کا نہیں، معذرت کا نہیں، شرمندگی اور ندامت کا نہیں جس میں حضرت ابوسفیان اور اُن جیسے دوسرے اُن صحابہ اور صحابیات پر جو فتح مکہ میں اسلام لائے بدترین شیعی انداز کا تبرّا کیا گیا تھا جبکہ تبصرہ ندوے کے ترجمان تعمیر حیات کی طرف سے تھا اور تبصرہ نگار ندوہ کے "معتمد تعلیم" تھے۔

سچے دل سے مسلمان نہ ہونے، اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بغض و عداوت کی بھڑکتی ہوئی آگ دل میں بھرے رکھنے اور دورِ خلافتِ عثمانی سے قبل تک بس مجبوراً مسلمان بنے رہنے کی فردِ جرم اس تبصرے میں حضرت ابوسفیان کے علاوہ اُن کی اہلیہ ہندؓ پر اور ان دونوں کے خاندان (بنی اُمیّہ) کے اُن تمام افراد پر جو فتح مکہ میں اسلام لائے لگائی گئی تھی، مولانا نے "مجرمین" کی اس فہرست میں سے صرف ایک فرد، حضرت ابوسفیان کو — بلا کسی اظہارِ افسوس وندامت کے — نکالا اور اُن کے لئے شرفِ صحابیت اور بعض فضائل کی گواہی دی لیکن اُن کی اہلیہ حضرت ہند اور اُن کے مبیّنہ "گروہ" کے دوسرے تمام افراد کو صحابیت ہی نہیں صدقِ اسلام کے دائرے سے بھی باہر اسی جگہ پر کھڑا چھوڑ دیا جہاں مولانا کے معتمد تعلیم مولانا عبداللہ عباس ندوی نے اُن کو اپنی "نَزْعَۃٌ شِیْعِیَّۃٌ"[۱] کے ماتحت نکال کر کھڑا کر دیا تھا۔ آخر یہ کیسے ممکن ہوا اور مولانا نے اپنے لئے کیسے اس کا جواز سمجھا؟ —— کیا اس کی کوئی اور توجیہ سوائے اسکے کی جا سکتی ہے کہ مولانا بھی اِن بقیہ افراد کے معاملے میں

---

[۱] اردو میں "شیعی رگ" اس کا ترجمہ سمجھئے۔

مولانا عبداللہ عباس کا ہم خیال ہیں؟ اور بالخصوص ہندؓ کے معاملے میں ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی اس گواہی کو بھی (خاکم بدہن) خاطر میں لانے کیلئے تیار نہیں ہیں؟ جس کو اوپر رقم الحروف نے بھی بخاری کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ اور عربی و اُردو کے مصنفین اسے برابر ہی نقل کرتے آرہے ہیں جو ندوے کے حلقے میں علامہ سید سلیمانؒ کی مختصر کتاب "رحمتِ عالم" کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل نصاب ہے مزید برآں دارالمصنفین کی مشہور "سیر الصحابیات" (از مولانا سعید انصاری) کا حوالہ فوری طور پر ہمارے سامنے ہے۔ مولانا انصاری نے تو حضرت عائشہؓ کی روایت ہی نقل کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مزید لکھا کہ:-

"حضرت ہندؓ مسلمان ہو کر گھر گئیں تو وہ ہند نہ تھیں، ابن سعد نے لکھا ہے کہ انھوں نے گھر جا کر بت توڑ ڈالا اور کہا کہ ہم تیری طرف سے دھوکہ میں تھے۔" ص۱۸۴

کیسے عرض کریں حضرت ہندؓ اور دوسرے طُلَقاء بنی اُمیّہ کا معاملہ تو اس درجے کا سنگین ہے کہ یہ کم علم نہیں جانتا کہ کیسے اس معاملے میں مولانا عبداللہ عباس کی قول یا سکوت سے ہمنوائی اور ہمت افزائی کر کے کوئی شخص، چاہے وہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ، تحقیقی مسلک کے مطابق اہلِ سنت کے گروہ میں شامل رہ سکتا ہے؟ ہمیں تو اس سے بہت کمتر یہ معاملہ بھی مولانا کی شان کے شایاں نہیں لگ رہا کہ انھوں نے اس مضمون کے اندر حضرت ابو سفیان کیلئے جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت کی طرف اشارے میں "استقامت دکھائی اور زخمی ہوئے" کے الفاظ استعمال کرنے پر اکتفاء کی ہے جبکہ اُن کا جہاد فی سبیل اللہ میں "زخمی ہونا" خاصی معتبر روایات کے مطابق اس شکل میں تھا کہ:-

وَشَهِدَ قِتَالَ الطَّائِفِ فَقُلِعَت عَيْنُهُ حِينَئِذٍ، ثُمَّ قُلِعَت الأُخْرَىٰ يَوْمَ الْيَرْمُوكِ[1]...	وہ (آنحضرت کے ساتھ) غزوۂ طائف میں شریک ہوئے جس میں اُنکی ایک آنکھ گئی۔ دوسری یرموک کی جنگ (بہ عہدِ فاروقی) میں نذر ہوئی...

[1] سیر اعلام النبلاء ج ۲۔ اور سیرۃ حلبیہ میں تو مزید یہ بھی ہے کہ طائف میں آنکھ نکل پڑی تو (باقی حاشیہ ص۹۴ پر)

اور معاملے کے اس پہلو کے ساتھ یہ منظر تو حیرت کو ہوش رُبا بنائے دیتا ہے کہ مولانا عبداللہ عباس کے تبصرے سے صحابۂ کرام اور بالخصوص حضرت ابوسفیان کے بارے میں بانیان و ذمہ داران ندوۃ العلماء کے مسلک و عقیدے کی بابت ہو سکنے والی غلط فہمی کے سدّباب کیلئے لکھے جانے والے اس مضمون میں حضرت ابوسفیان کی بابت مولانا کا مختصر سا بیان ختم ہوتے ہی (جو صرف دس سطروں میں ہے) حضرت معاویہ ابن ابی سفیان پر حضرت علی کی فضیلت کا بیان شروع ہو جاتا ہے، پھر یزید بن معاویہ بن ابی سفیان کی برائیوں کا بیان اور اسکے مقابلے میں حضرت حسین بن علیؓ کے اقدام کی ضرورت اور صحت کا اظہار آتا ہے۔ اور پھر حضرت حسن اور حضرت حسین (رضی اللہ عنہما) کی اولاد میں سے جن لوگوں نے بھی خلفائے بنو امیہ یا عباسیہ کے خلاف تلوار اٹھائی اُن کی فضیلت اور اُنکے اقدام کی صحت اور اسکے دلائل و شواہد کا بیان ہوا ہے (جیسا کہ اوپر ان بیانات کا خلاصہ دیا جا چکا ہے) ـــــ ہمیں حیرت اس بنا پر ہے کہ آخر اس مضمون میں اِن بیانات کا محل کیا تھا؟ ان میں سے تو کوئی ایک بات بھی ایسی نہ تھی جس کے بارے میں مولانا عبداللہ عباس کا تبصرہ کوئی مختلف تأثر دیتا ہو، بلکہ اُس میں تو یہ باتیں اور بہت ہی زور شور سے کہی گئی تھیں! ـــــ لیکن کوئی توجہ اس حصّۂ مضمون کی ہونی ہی چاہیئے جو تقریبِ مضمون اور عنوانِ مضمون کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں کھا رہا!

راقم کو اس سوالیہ موقع پر آکسفورڈ کا وہ واقعہ یاد آرہا ہے جو مضمون کے شروع میں درج کیا جا چکا ہے، وہاں لکھا گیا ہے کہ (گزشتہ ستمبر کی کسی تاریخ کو) آکسفورڈ میں جب مولانا، راقم کی موجودگی میں پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی سے مخاطب تھے تو بظاہر کوئی موقع وہاں حضرت حسین اور یزید کے قصّے کا نہیں تھا۔ مگر بات یکا یک اپنے طبعی حدود سے نکلی اور حضرت حسینؓ کے اقدام بمقابلۂ یزید پر آگئی اور مولانا ایک گونہ برہمی کے لہجے میں، جس کا اثر چہرے پر

(باقی حاشیہ ص۹۵ کا) حضرت ابوسفیان ہاتھ پر لیئے آنحضرت کی خدمت میں آئے۔ آپ نے فرمایا چاہو تو دعا کروں ٹھیک ہو جائے چاہو تو ذخیرۂ آخرت بنا لو ابوسفیانؓ نے دوسری بات کو پسند کیا۔

بھی نمایاں تھا، یوں فرماتے سنائی دینے لگے کہ "حضرت حسین کے اقدام کو کسی نے غلط قرار نہیں دیا، امام ابن تیمیہ نے بھی یہ لکھا ہے اور حضرت مجدد الف ثانی نے بھی یہ لکھا ہے[1] الخ اس واقعے کی توجیہ میں عرض کیا گیا تھا کہ اسکی کوئی وجہ بجز اسکے سمجھ میں نہ آئی کہ جیسے مولانا کے عزیز مولوی سید سلیمان حسینی صاحب (استاذ ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے کتاب کا مقدمہ کتاب کی اشاعت سے کافی پہلے الفرقان میں پڑھ کر ایک سخت سُست مضمون اسکے خلاف لکھ ڈالا تھا، اسی طرح معلوم ہوتا ہے وہ مقدمہ مولانا کی نظر سے بھی گزر گیا۔ یا (جیسا کہ زیادہ امکان ہے) اسکے بارے میں کچھ سن لیا اور اُس سے ایسی ہی ناگواری محسوس فرمائی جیسی عزیز موصوف کو ہوئی تھی۔ اور موقع کی فی الجملہ مناسبت سے (کہ تذکرہ بہرحال اہل بیت کا تھا) راقم کو سامنے پاکر مولانا کی وہ تہ نشیں ناگواری بے قابو ہو کر اُبھر آئی۔ پس مولانا کے مضمون کے زیر غور حصّے پر جو سوال پیدا ہوتا ہے اُسکی توجیہ بھی اپنی سمجھ میں تو اس کے سوا کچھ نہیں آتی کہ حضرت ابوسفیانؓ والی سطریں لکھ کر مولانا نے اپنے آپ کو جو مولانا عبداللہ عباس کے تبصرے سے ذرا فاصلے پر کیا تھا، یہ فاصلہ پیدا کرنا مولانا کے اُن احساسات پر بہت گراں ہو گیا جن احساسات پر راقم کی کتاب کا مقدمہ گراں ہوا تھا۔ اور پھر اس گرانی نے اپنی تشفی کیلئے مضمون کو اسی طرح اُسکے طبعی حدود سے باہر نکال دیا جس طرح آکسفورڈ کی گفتگو باہر نکل آئی تھی۔

ہائے افسوس! یہ عمر بھر کے احترام، لحاظ اور عقیدت کو آزمائش کے اس موڑ پر بھی پہنچنا تھا! کسی طرح دل ماننے کو تیار نہیں ہوتا تھا کہ مولانا کے علم سے یا اُنکی رضامندی کا اطمینان کرکے تعمیر حیات کا یہ تبصرہ شائع ہوا ہوگا، جس میں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی گروہ پر تبرّا تو بڑی چیز ہے اس بے قیمت کاتب الحروف اور اسکی کتاب پر یہ اندازِ کرم برتا گیا ہو۔ مگر یہ بھی قابلِ تصوّر چیز نہ تھی کہ اس طرح کا تبصرہ کم از کم اس اطمینان کے بغیر شائع کر دینے کی جراءت کوئی کرے کہ مولانا اسے ناپسند تو ہرگز نہیں فرمائیں گے۔ مولانا نے جو رویّہ اس تبصرے کے خلاف ایک حرف نہ کہنے کا مختلف جہات کی کوششوں کے باوجود اپنایا، جن میں سے کچھ کی تفصیل آپ پڑھ چکے اور کچھ کی تفصیل "الفرقان کی ڈاک" کے صفحات میں شاید آئے گی۔ اور پھر بہت مجبور ہو کر

---

[1] یہاں اس بات کا ذکر مناسب ہوگا کہ حضرت حسینؓ کے اقدام کی بابت امام ابن تیمیہ کا کلام ہی کتاب میں نقل کیا گیا ہے۔

کچھ کہا تو وہ کہا جس کی بات ابھی ہم کر رہے تھے. تب کوئی گنجائش اپنے دل کو سمجھانے کی باقی نہیں رہ گئی، اور بالکل یقین کرنا پڑا کہ یہ تبصرہ اُسی برہمی و برافروختگی کے تسلسل کی ایک کڑی تھی جو برہمی کبھی "شہداءِ اسلام" کے جلسۂ لکھنؤ میں ظاہر ہوئی، کبھی مولوی سید سلمان حسینی صاحب کے مضمون میں نظر آئی اور کبھی آکسفورڈ کی ٹیبل ٹاک (TABLE TALK) میں دکھائی دی —— اور اس برہمی کا سراغ لگانے کی (جو کہ مولانا کے ساتھ اپنے چالیس[۴۰] برس کے خوردانہ تعلق کا ایک غیر معمولی تجربہ تھا) جو کوشش کی تو پتہ چلا کہ اس حقیر کی کتاب اور اُس کا مقدمہ مولانا کے کچھ ایسے مخصوص خیالات سے ٹکرا گیا ہے جن کو کبھی انکی تحریروں سے اخذ کرنے کی طرف ذہن نہ گیا تھا. (اس لئے کہ اُن خیالات کی توقع ان سے نہیں تھی) مگر اب اس تجربے کی روشنی میں وہ بالکل آئینہ ہیں[۱].

حسرت "دم واپسیں"

بہر حال یہ حسرت رہ گئی، اور شاید اب اسکے مقدر کو تبدیل نہیں ہوتا ہے کہ کاش حضرت مولانا نے اس خورد سے تفہیم کے انداز میں اس مسئلے پر اپنے خیالات کا کچھ اظہار فرما دیا ہوتا اور اُسے موقع دیا ہوتا کہ کچھ عرض کرنا چاہے تو عرض کر سکے، اسلئے کہ اُس سے اس معاملے میں کسی نا اتفاقی کا اندیشہ کرنیکی کوئی گنجائش نہ تھی، زیادہ باتیں اس بارے میں کہنے کی ضرورت نہیں صرف ابھی گزشتہ ہی سال کی یہ بات یاد دلاتی کافی ہوگی کہ عراق اور کویت کے قضیے میں امریکہ کی مداخلت کے بعد محترم مولانا کے خیالات جو "برا یر تعمیر حیات" وغیرہ میں شائع ہو رہے تھے اس حقیر کیلئے اس حد تک نا قابلِ فہم ہوئے کہ صریح زبان میں "نا قابلِ برداشت" کہنا چاہیئے. مگر ہرگز اس بات کی جرأت نہیں کی جا سکی کہ سامنے آکر اعتراض کیا جائے اسکے بجائے ایک عریضہ لکھا جس میں اپنے دل کا درد کھول کر بیان کیا. اور چاہا کہ مولانا کوئی تشفی بخش توجیہہ اپنے موقف کی کردیں. وہ عریضہ بعینہٖ ذیل کی سطروں میں پڑھ لیا جائے اور دیکھ لیا جائے کہ یہ شخص جس نے ایک ملّی معاملے میں ایسے شدید احساسات کے باوجود نہ صرف یہ کہ علانیہ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا بلکہ نجی خط میں بھی سراپا ادب بنکر بات عرض کی اُس سے کیا یہ توقع نہیں کی جانی چاہیئے تھی کہ وہ مولانا کے ارشادات بسر و چشم اور پورے ادب و لحاظ کے ساتھ سنے گا؟

[۱] آئندہ کبھی فرصت ملی تو مولانا کے ان خیالات پر کچھ عرض کرنے کی صورت بھی انشاء اللہ نکالی جائے گی۔

جمعہ ۲۱ ذوالقعدہ ۳۱ مئی ۱۹۹۱ء

مخدومی و معظمی دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

میرے ایک عریضے کی یہ بات شاید یاد ہو کہ "مجھ سے بزرگوں کو خط نہیں لکھا جاتا" بنا بریں دل میں ایک گزارش کا تقاضہ کم ازکم چھ ماہ سے تھامے ہوئے چلتا رہا ہوں کہ گزارش کی جرأت کہاں سے لاؤں ــــ مگر اب ایک دوسرا احساس اس تقاضائے ادب پر غالب ہو رہا ہے کہ شاید اب زیادہ وقت نہ گزرے کہ مشافہہ کی نوبت آجائے جو اس بوجھل دل کے ساتھ کسی طرح مناسب نہ ہوگی۔

دل کا یہ بوجھ خلیج کے المیہ میں آنمخدوم کے اور ندوۃ العلماء کے اس موقف سے متعلق ہے جو تعمیر حیات، الرائد اور البعث الاسلامی وغیرہ کے ذریعہ سامنے آتا رہا۔

اس قضیے میں صدام حسین کے متعلق آپ جو کچھ فرماتے رہے اس میں کوئی اشکال کی بات نہ تھی۔ اشکال (اور بے پناہ اشکال) وہاں ہوتا رہا جہاں ان امور میں بھی تنہا صدام حسین ہی کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا جن امور میں سعودی اور کویتی حکمراں صدام سے کہیں زیادہ قابل گرفت اور مستحق ملامت تھے۔ مثلاً عراق کی تباہی، امریکہ کا قلب اسلام میں مکمل گرفت کی حد تک دخیل ہو جانا اور اسرائیل کے لیے علاقے کے اندر حالات کا زیادہ سازگار ہو جانا۔

صدام حسین نے کویت پر حملے اور قبضے کے ذریعہ ایک ایسی صورت حال ضرور پیدا کر دی تھی کہ امریکہ اسے مذکورہ بالا مقاصد کی طرف پیش قدمی کے لیے ایک بہانہ اور ذریعہ بنائے — چاہے یہ اُس نے دانستہ کیا ہو یا نادانستہ۔ لیکن اس پیش قدمی کے لیے امریکہ کو نہ صرف راہ دینے بلکہ دعوت دینے اور اپنے تمام وسائل اس راہ میں امریکہ کے لیے بچھا دینے کی ذمہ داری تو سعودی اور کویتی حکمرانوں نے پوری دنیا کے سامنے اپنے کاندھوں پر اٹھائی ہے۔ پھر آپ کے خدام کے لیے یہ کیوں کر روا ہو سکتا ہے کہ ان المناک اور پریشان کن نتائج کے لیے وہ عراقی حکمراں کی تو مذمت کریں اور سعودی اور کویتی حکمرانوں کے لیے صرف تعریف و توصیف اور حمایت و مدافعت روا رکھیں؟ حالانکہ صدّام سے تو کبھی بھلائی کی توقع تھی ہی نہیں، جب کہ ان دوسرے لوگوں کو ہم تھوڑا یا بہت حامئ اسلام سمجھتے تھے۔ اس لئے شکوہ تو ہمیں درحقیقت یا زیادہ انہی سے ہونا چاہئے تھا، کہ ایک بعثی نے اعداء اسلام کو ایک ذرا سا بہانہ (ممکن ہے کہ بالکل ہی نادانستہ) فراہم کیا اور ان حامیانِ اسلام نے بجائے اس کی کوشش کے کہ ایک ناخداترس اور ناعاقبت اندیش کا پیدا کیا ہوا یہ بہانہ اعداء کے کام نہ آئے۔ اعداء کو دعوت دی کہ وہ اس سے بھرپور فائدہ اٹھائیں اور ان کا نام "اصدقاء" رکھا اور پھر یہاں تک اُن سے دوستی اور یگانگت دکھائی کہ بُلایا ان کو مملکت سعودیہ کی حفاظت کے نام پر تھا مگر جب انھوں نے سعودیہ کی حفاظت سے آگے بڑھ کر کویت کی آزادی کے لیے اقدام، اور کویت کی آزادی کے لیے اقدام سے آگے بڑھ کر عراق کی حسبِ ضرورت اور حسبِ منشا تباہی کو اپنا نشانہ قرار دیا، تب بھی ان دوستوں کو نہ صرف یہ کہ کوئی پریشانی نہ لاحق ہوئی بلکہ خود بھی

ان کے شانہ بشانہ ہوئے اور امریکہ کی کمان میں اس دادِ شجاعت کا نام جہاد رکھا۔

یہ اپنے دل کا حسرت بوجھ ہے اور اس کا اظہار بھی اگرچہ کچھ کم شاق نہیں مگر اسے دل میں رکھ کر ملنا شاید اس سے زیادہ مشکل ہو جاتا۔ اس لیے کسی طرح جرأت کی ہے کہ جو کچھ دل میں ہے وہ سامنا ہونے سے پہلے ہی آپ کے سامنے رکھ دوں۔ کوشش پوری کی ہے کہ دامنِ ادب پر ہاتھ کی گرفت بھرپور ہے۔ لیکن اگر کچھ چوک ہوئی ہو تو آپ کا دامن عفو یقیناً بہت وسیع ہے۔

عفو خواہ

عتیق الرحمٰن سنبھلی

لندن

یہ عریضہ آپ نے پڑھ لیا، اب اس کے چار ماہ بعد کا ایک خط مولانا کے بھانجے اور دستِ راست مولانا محمد رابع صاحب حسنی کے نام کا پڑھ لیجئے جو آکسفورڈ کے ناشتے کی میز کے" اس تجربے کے بعد لکھا گیا تھا جس کے بارے میں راقم نے کہا ہے کہ وہ مولانا کی مجلس میں اپنی زندگی کا ایک منفرد تجربہ تھا۔ یعنی جسے کہا جا سکتا تھا کہ :

جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی!

اس خط کو پڑھ کر بھی اور غور کیجئے کہ کیا اس خط کا لکھنے والا اسی رویے کا مستحق تھا جو حضرت مولانا اور ان کے نائبین کی طرف سے اختیار فرمایا گیا۔

عتیق الرحمن سنبھلی

صدیق عزیز،　　(مولانا محمد رابع صاحب)

امید ہے آپ اپنے پروگرام کے مطابق لکھنؤ پہنچ گئے ہوں گے دعا ہے کہ سفر خیریت سے تمام ہوا ہو — میری اہلیہ۔ اگر ان کا حال معلوم کرنے سے آپ کو دلچسپی ہو تو۔ اللہ کے فضل و کرم سے اُس وقت کے مقابلے میں کافی بہتر ہیں۔

ہماری آپ کی مجبوری کہ ملے تو وقت کی وہ نہایت اہم بات آپس میں نہ چھیڑ سکے جس کے تئیں اضطراب نے حضرت مولانا علی میاں مدظلہٗ کی خدمت میں ایک کرب نامہ تحریر کرا دیا، جو یقیناً آپ کی نظر سے بھی گزرا ہوگا[1]۔ تعمیر حیات (۱۰ ستمبر) کے ایک مضمون کا تراشہ لکھنؤ سے ملا ہے جس میں نشان زد کی گئی چند سطروں میں بظاہر میرے اس عریضے ہی کی طرف اشارہ ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ اس اشارے کو میرے گھر والوں نے کیسے سمجھا جبکہ میں نے تو اس عریضے کی ہوا بھی کسی کو نہ دی تھی، بہر حال کہنا یہ چاہتا ہوں کہ یہ اشارہ جس انداز میں کیا گیا ہے اس سے حضرت مولانا کی اور آپ حضرات کی گرانی کا اظہار ہوتا ہے۔ کاش اس کا علم کچھ پہلے ہو جاتا تو یہاں ملاقات میں آپ سے بھی معذرت خواہی کرتا اور حضرت مولانا سے تو دست بستہ معافی مانگتا۔ اگرچہ اس مسئلہ میں میرے کرب کا عالم آج بھی وہی ہے جو اُس دم تھا اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ آپ جیسے احباب اور حضرت مولانا جیسے بزرگوں کے سامنے ہونے کی وجہ سے اپنے دل کی بات کھل کر نہیں کہی

---

[1] یہ وہی عریضہ ہے جو اوپر گزرا۔

جا سکتی۔ "قہر درویش بجان درویش" کا معاملہ ہے۔

یہاں ایک مولوی صہیب حسن صاحب ہوتے ہیں۔ مدینہ یونیورسٹی کے فارغ اور دعوت وارشاد کے چیف مبعوث۔ ان سے ایک اور پرکارشتہ بھی ہے۔ مولانا عبدالغفار حسن کے بیٹے ہیں، جو گویا حضرت مولانا کے اور والد ماجد کے دوستوں میں ہوتے ہیں۔ قدرتی طور پر یہاں خلیجی المیہ کے موقع پر سعودی عرب کی یا کہئے ادارۂ دعوت وارشاد کی مہم کے سربراہ وہی تھے۔ اس پورے عرصہ میں میری ان کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اور انھیں ضرور اندازہ رہا ہوگا کہ اس میں میرے قصد کو بھی دخل ہے۔ میری پوزیشن ان کو معلوم تھی۔ کل ایک جلسے میں ساتھ ہوگیا وہاں ان کی تقریر کے بعد سامعین میں سے ایک نے اس مسئلہ پر ان سے کچھ سوال کر لیا۔ میرا خیال ہے کہ یہی چیز اس کا باعث ہوئی کہ صہیب صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ اس مسئلہ میں آپ کی اب بھی وہی رائے ہے جو شروع میں تھی؟ میں نے کہا۔ بالکل وہی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اعتماد اور وثوق کے ساتھ۔ کہنے لگے مولانا علی میاں تشریف لائے تھے آپ کی ملاقات ہوئی؟ میں نے کہا جی ہاں ہوئی۔ کہنے لگے ان سے اس مسئلہ میں کوئی بات نہیں ہوئی؟ میں نے کہا نہیں بھائی۔ ایک خط البتہ میں نے مولانا کی خدمت میں لکھا تھا جس کا کوئی جواب حضرت مولانا نے نہیں دیا۔ اپنے دو رسالے اس سلسلہ کے مضامین کے بھجوا دیئے تھے۔ مگر ان میں میرے سوال اور میرے نقطۂ نظر سے متعلق کوئی بحث ہی نہ تھی۔ بولے کہ آپ نے یہاں پھر اس کے بارے میں بات نہیں کی؟ میں نے کہا: مولانا کو میں نے اپنی ۱۲ سال کی عمر سے اپنے والد ماجد کے ساتھ دیکھا ہے اور ہمیشہ بڑا ہی جانا ہے۔ میں

جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ مولانا جواب نہ دینا چاہیں اور میں کہوں کہ کچھ جواب دیجئے۔ وہ بزرگ ہیں میں ان سے نہایت چھوٹا ہوں۔ یہ میری مجبوری ہے کہ میری سمجھ میں اُن کی بات نہیں آرہی اور ادب کے ساتھ ساتھ اپنے ضمیر کے تقاضوں کو بھی ان کا حق دینے کی تعلیم جن بزرگوں سے پائی ہے اُن میں سے ایک خود مولانا مدظلہ کی ذات ہے۔"

اچھا جناب یہ تو ہوگیا۔ اب ایک دوسری بات سنیے۔ بلکہ ایک شکریہ قبول کیجیے۔ آکسفورڈ میں آپ حضرات کے ساتھ گزرنے والی ایک رات زندگی کی ایک یادگار رات بن گئی ہے۔ کافی دن سے راتیں بڑی بے توفیقی کے ساتھ گزر رہی تھیں۔ اس رات آپ کی معیت کے طفیل مجھ پر بھی بقدرِ نصیب توفیق خیر کا در کھلا۔ یعنی ھم قوم لایشقیٰ جلیسھم آپ کو اگر ہی طفیل کی نسبت اپنی طرف کرنے میں تکلف ہو تو حضرت مولانا کا طفیل ماننے میں تو بہرحال کوئی دقت نہ ہوگی۔ اللہ آپ کو اور حضرت مولانا کو عافیت سے رکھے۔ والسلام

عتیق الرحمٰن سنبھلی
لندن۔ ۱۲ر ستمبر ۱۹۹۱ء

مجھے نہیں معلوم کہ اگر آکسفورڈ میں مولانا کی گفتگو کا واقعہ پیش نہ آیا ہوتا تب بھی میں اپنے یہ احساسات اس مکتوب کی صورت میں قلم بند کرنے کی ضرورت سمجھتا یا نہیں، لیکن اس واقعہ میں مولانا کی گرانیٔ خاطر دیکھ کر یہ مفید سمجھا کہ ان سے متعلق اپنے دل کا حال مولانا رابع صاحب کے توسط سے اُن تک پہنچے اور امید کی کہ انشاء اللہ مولانا کی کیفیت میں فرق پڑے گا۔ مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

یہ امید تعمیر حیات کے اس تبصرے کی شکل میں پوری ہوئی جس کے خاتمہ پر یہ وعید آمیز آگاہی بھی حضرت حسینؓ کی مفروضہ مخالفت پر دی گئی تھی۔

"حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی مخالفت ناشی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت سے، وہ لوگ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا دل صاف نہیں رکھتے اور نہ ہی آپ سے اپنی بیزاری و کراہت کو ظاہر کرنے کی جرأت رکھتے ہیں وہ اس راستے سے اپنے دل کا بخار نکالتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے۔

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ۝	ہم کو معلوم ہے کہ ان کی باتیں تم کو رنج پہنچاتی ہیں مگر یہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے، بلکہ ظالم خدا کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں۔"

حرفِ آخر

بہرحال ذاتی احساسات کی جراحت کا تو کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔ لیکن صحابہ کرام کے ایک گروہ کی بابت جو بدزبانی تبصرے میں کی گئی ہے اس کے لئے ضرور پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی صاحب کے ہم زبان ہو کر دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اُس کی ذمہ داری کے ہر شریک کو خلوص دل سے سرعام توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔ اور اگر راقم الحروف سے کوئی ایسی غلطی الفرقان کے ان صفحات میں یا کتاب کے صفحات میں ہوئی ہو تو یہی دعا اپنے لئے بھی ہے اور قارئین کتاب سے خاص طور پر استدعا بھی ہے کہ ان کی نظر میں اگر کوئی عبارت توہین اہل بیتِ کرام کا مفہوم رکھتی ہو تو وہ ضرور اس خاکسار مصنف کو اس سے آگاہ فرما کر احسان کریں۔

افسوس ہے کہ راقم الحروف بہت زیادہ دیر تک پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی صاحب کے نہایت قیمتی مقالے اور قارئین کے درمیان حائل رہنے پر مجبور رہا۔ اب اپنی گزارشات کا ورق تمام ہوتا ہے۔ آیئے اور صدیقی صاحب کے مقالے سے مستفید ہو جیے۔ سبحانک اللھم وبحمدک نشھد ان لا الٰہ الا انت نستغفرک ونتوب الیک

ے نتیجہ

ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی
پروفیسر ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر"
ایک تبصرہ کا تجزیہ

"تعمیر حیات" لکھنؤ کے ۱۰ مارچ ۱۹۹۲ء کے شمارے (ص۱۵-۱۳) میں مولانا عتیق الرحمن سنبھلی صاحب کی تازہ کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب کے زیر تبصرہ آئی ہے، فاضل مبصر نے تبصرہ کے آخر میں ایک خاص نوٹ میں فرمایا ہے کہ "اس تبصرہ میں صرف اصول بحث اور طریق فکر سے بحث کی گئی ہے، پوری کتاب کے تمام مندرجات پر بحث کرنا اور ان کا رد لکھنا نہ پیش نظر ہے اور نہ اس کا وقت ہے۔" اس کے بعد تبصرہ نگار نے حضرت امام مالکؒ کے ایک قول پر یہ نوٹ ختم کیا جس کے مطابق وہ اس قسم کے مباحث میں خاموشی اختیار فرماتے اور سورۂ بقرہ کی آیت ۱۴۱ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ الخ (یہ جماعت گزر چکی ان کو ان کے اعمال کا بدلہ ملے گا تم کو تمھارے اعمال کا اور جو عمل وہ کرتے تھے ان کی پرسش تم سے نہ ہوگی) پڑھ دیا کرتے تھے۔

مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب کا تبصرہ پڑھ کر خاص کر اس نوٹ کی روشنی میں سخت حیرت ہوئی کہ تبصرہ نگاری کا یہ کون سا علمی، اخلاقی، اسلامی اور دینی معیار ہے؟ سچ یہ ہے کہ تبصرہ نگاری کے پردے میں دشنام طرازی دیکھ کر بہت صدمہ ہوا، اور وہ بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ایک نمائندہ مجلہ و پرچہ میں جس کی شرافت قلم اور معتدل و شریفانہ اظہار اختلاف کے

گن گائے جاتے ہیں، راقم سطور عام طور سے اِن مناظرانہ اور اختلافی مباحث سے گریز کرتا ہے، کیونکہ وہ افہام و تفہیم کے جذبے سے عاری ہوتے ہیں اور صرف الزام تراشی اور ہٹ دھرمی کے شاہ کار ہوتے ہیں لیکن اس تبصرہ کو پڑھ کر اتنا ہیجان اور اضطراب ہوا کہ اس پر یہ استدراک قلم سے نکل پڑا۔

چونکہ فاضل تبصرہ نگار نے بعض علمی اسلامی اور تحقیقی اصولوں کی آڑ میں اسلامی تعلیمات اور اسلامی تاریخ کو اپنے پسندیدہ مزعومات کے دفاع میں مسخ کرنے کی کوشش کی ہے اس لئے خاکسار ضروری سمجھتا ہے کہ بعض معروضات اس تبصرہ کے قارئین کے سامنے پیش کر دیئے جائیں تاکہ وہ تبصرہ کے مزعومات کو اصل تعلیمات اور اصول نہ سمجھ لیں۔ مولانا سنبھلی صاحب کی کتاب پر تبصرہ میں بھی نہیں کروں گا کہ وہ مفصل مطالعہ کا متقاضی ہے جس کا یہاں موقعہ نہیں۔ میں تبصرہ نگار کے اٹھائے ہوئے نکات سے ہی بحث کروں گا۔

محترم تبصرہ نگار نے بعض اردو اور انگریزی اصطلاحات کا سہارا لے کر کتاب زیر تبصرہ کا خلاصہ اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ اول تو مفروضہ تحقیقی نتیجۂ بحث (HYPOTHESIS) اور (THESIS) دونوں کو ایک ہی معنی ... استعمال کیا ہے۔ حالانکہ دونوں اصطلاحیں الگ الگ ہیں۔ وہ ایک نہیں ہو سکتیں۔ ان میں سے صرف ایک ہی اس موقع پر صحیح ہو سکتی ہے، مولوی عبدالحق نے اپنی اردو انگلش ڈکشنری میں (HYPOTHESIS) کے دو معانی "مفروضہ"، "قضیہ" اور "بے دلیل دعویٰ" دیئے ہیں جبکہ (THESIS) کے معنی بتائے ہیں، دعویٰ، نظریہ، مقالہ مع تشریحات، ظاہر ہے کہ ایک دعویٰ بلا دلیل ہے اور دوسرا دلائل سے مدلل نظریہ اور ثبوت سے آراستہ دعویٰ و علمی مقالہ۔ تبصرہ نگار یا تو ان الفاظ کا فرق نہیں سمجھتے یا جان بوجھ کر انھوں نے الجھن پیدا کی ہے۔

پھر فاضل تبصرہ نگار نے مولانا سنبھلی کی کتاب کا جو نتیجۂ بحث اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے اسے انگریزی محاورہ کے مطابق اپنی بات دوسرے کے منہ میں رکھنے کا مصداق اور علمی بددیانتی کہا جا سکتا ہے۔ مؤلف کتاب نے کہیں یہ نہیں کہا کہ "حضرت حسین رضی اللہ عنہ ایک ناعاقبت اندیش، شہنشاہیت کے طالب بلاوجہ اپنی جان گنوانے والے شخص تھے"۔ اس جملہ کے تینوں صفاتی فقرے

محترم تبصرہ نگار کے پُرغضب قلم کے تراشیدہ اور اُن کے پُرغیظ دماغ کے زائیدہ ہیں۔ مؤلف کتاب کا نظریہ کیا ہے فی الحال اس سے بحث نہیں مگر یہ تینوں صفات الزام تراشی کے ضمن میں آتے ہیں۔ فاضل تبصرہ نگار نے غالباً یہ نہیں سوچا کہ شہنشاہیت کے طالب کا مطلب کیا ہے؟ مؤلف کتاب نے دلائل وشواہد کی روشنی میں یہ واضح کیا ہے کہ حضرت حسینؓ کا موقف ان کے بڑے بھائی حضرت حسنؓ سے ہمیشہ الگ رہا اور انھوں نے اپنے برادر بزرگ کے احترام اور حالات کے دباؤ کے تحت حضرت معاویہؓ کی خلافت تسلیم کی تھی۔ حضرت معاویہؓ کے بعد کے حالات میں وہ اپنے آپ کو دوسرے موقف کے لئے آزاد سمجھتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ وہ یزید سے اپنے آپ کو خلافت کے لئے بہتر سمجھتے تھے اور اگر طالب تھے تو خلافت کے نہ کہ شہنشاہیت کے۔ جہاں تک حضرت حسینؓ کے "بلا وجہ اپنی جان گنوانے" والے فقرہ کا تعلق ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فاضل تبصرہ نگار نے شہادت حسین پر کتاب کا آخری باب اور ابن تیمیہؒ کی بحث پڑھی نہیں، یا پڑھی تو اپنے مزعومات کے تحت اس کو نظر انداز کر دیا۔

تحقیق کی تکنیک پر مبصّر گرامی قدر نے جو دو پیراگراف سپرد قلم فرمائے ہیں، اُن کا ماحصل یہ ہے کہ اپنے نظریہ، بقول اُن کے "مفروضہ عقیدہ" کے موافق واقعات کو مؤلف کتاب نے "ایک تسلیم شدہ حقیقت کی طرح قبول کیا ہے اور جہاں ان کے رجحان کے خلاف بات ملی" اس کو کسی نہ کسی بہانے سے مسترد کر دیا ہے۔ مؤلفِ کتاب کی تحقیقی تکنیک کیا ہے اس سے یہاں بحث نہیں یہاں اصل بحث یہ ہے کہ کیا فاضل تبصرہ نگار نے یہی تکنیک اپنے تبصرہ میں نہیں اپنائی ہے پورا تبصرہ پڑھ جائیے۔ انھوں نے اپنے مفید مطلب اور ہمنوا مؤلفین و مؤرخین کے اقتباسات یا حوالوں کے ذریعہ گفتگو کی ہے۔ انھوں نے بھی اپنے رجحان کے مخالف یا مفروضہ تبصرہ کے ناموافق کسی بڑے سے بڑے اہلِ قلم کا ذکر و حوالہ تک نہیں دیا۔ پھر انھوں نے بعض ایسے اہلِ قلم کے حوالہ سے مؤلف کتاب تو درکنار صحابہ کرام جیسی بزرگ شخصیات پر کیچڑ اچھالی ہے جن کو وہ خود اسلام کا نمائندہ نہیں سمجھتے مگر اس پر گفتگو ذرا بعد میں ہوگی۔

ہاتھ میں ہاتھ دینے والی روایت کا مفہوم جو فاضل تبصرہ نگار نے مؤلف کتاب کے منہ میں اپنی جانب سے رکھا ہے وہ بھی ان کی علمی دیانت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ مؤلف کتاب نے اپنی فہرست کے صفحہ (ز) پر اس کا مفہوم "یزید کے پاس جانے کی پیشکش" بیان کیا ہے پھر ص۲۲۳ پر اسی ذیلی سرخی کے تحت اس پر بحث کی ہے۔ اس سے قبل اور بعد جہاں مؤلف نے اس روایت کا مفہوم بیان کیا ہے اس میں صرف ہاتھ میں ہاتھ دینے اور صلح کرنے کی بات کہی ہے، بیعت کرنے کا مفہوم کہیں نہیں بنایا گیا جس کی مبصر محترم نے بڑے دعووں اور چیلنج کے ساتھ تردید کی ہے۔ انھوں نے نہ صرف مؤلف کتاب بلکہ ان کے ہمنواؤں کو بھی چیلنج کر دیا ہے کہ "وضع الید فی الید" کا مبایعت کے معنی میں استعمال کلام عرب سے ایک مثال کے ذریعہ ہی پیش کر دیں۔ پھر اس روایت کے آخری جملہ "فیری فیما بینی وبینہ رأیہ" کی دلیل سے بیعت کے مفہوم کی تردید دکھائی ہے۔ مؤلف کتاب نے جہاں بھی اس جملہ کو نقل کیا ہے وہاں ہاتھ میں ہاتھ دینا ہی ترجمہ کیا ہے۔ ص۲۲۵ کے حاشیہ ۱ میں مؤلف کی عبارت ملاحظہ ہو: "ان روایتوں کے الفاظ ہیں "حتی اضع یدی فی یدہ" جس کا لفظی ترجمہ ہے (تاکہ میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدوں) کوئی اس عبارت کا ترجمہ "بیعت" سے نہ بھی کرنا چاہے تو "سپردگی" سے پھر بھی کرنا ہی ہوگا اور پھر فرق کیا رہا؟" جملہ زیر بحث کے ترجمہ کے لئے ملاحظہ کیجئے کتاب کے صفحات (۱) ص۱۷ (جس پر روایت کے الفاظ کا یہی ترجمہ متن و حاشیہ میں دیا ہے) (۲) ص۱۹ جس پر ہے کہ "یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدوں، پھر وہ میرے اور اپنے معاملہ میں جو سمجھے فیصلہ کرے" (۳) ص۲۰ پر بھی یہی ترجمہ ہے اور ترجمہ کے بعد والی بحث میں "ہاتھ میں ہاتھ دینے کی بات کہی ہے"۔ بقیہ صفحات میں بھی ترجمہ یہی ہے۔ فاضل مبصر کی سخت زیادتی ہے کہ انھوں نے اپنا مفہوم مؤلف کے سر تھوپ دیا۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ خود مبصر محترم نے بیعت کے معنی میں اس محاورہ کے وجود سے انکار کیا ہے پھر لکھتے ہیں کہ "جہاں مبایعت کا ذکر ہے وہاں بایع، بایعنا، بیایع ہی آیا ہے، اور ہاتھ پر ہاتھ رکھنے کا تذکرہ بھی کہیں کہیں اس کے بعد آتا ہے،

وہ بھی ہر جگہ نہیں۔ کنایہ بھی نہیں ہے۔ اگر کنایہ ہے تو دوستی کرنے، مساویانہ انداز میں گفتگو کرنے کا مفہوم رکھتا ہے" (ص ۱۳) اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ عربوں میں بیعت کا طریقہ ہاتھ پر ہاتھ رکھنا ہی تو تھا۔ تاریخ اسلام اور ادب اسلامی سے اسکی صدہا مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ سب سے اہم شہادت لسان العرب کی ہے جہاں بیعت کا مفہوم یوں بیان کیا ہے۔ البیعۃ الصفقۃ علی ایجاب البیع وعلی المبایعۃ والطاعۃ الخ (مادّ بیع)........ ....اور صفق صفقۃ اصفیق کی تعریف میں لکھا ہے.... صفق یدیہ بالبیعۃ والبیع وعلی یدہ صفقا ضرب بیدہ علی یدہ الخ (بذیل مادہ صفق) اور احادیث اور اسلامی تاریخ سے ہاتھ پر ہاتھ مارنے سے مراد بیعت ہونے کی کئی مثالیں پیش کی ہیں۔ جہاں تک وضع الید کے محاورہ کا تعلق ہے اسکے بارے میں کہا ہے: "وضع الید کنایۃ عن الاخذ" (اور ایک حدیث نبوی کی رعایت سے اسکی موقع کی تشریح کی ہے (بذیل وضع)۔

قرآن مجید نے اگرچہ اس محاورہ کا استعمال نہیں کیا لیکن بیعت کے ساتھ "ید" کا استعمال کرکے وہی مفہوم پیش کیا ہے۔ ارشاد ربّانی ہے:۔

ان الذین یبایعونک انما	جو لوگ ہاتھ ملاتے ہیں تجھ سے وہ ہاتھ
یبایعون اللہ ید اللہ فوق	ملاتے ہیں اللہ سے، اللہ کا ہاتھ ہے اوپر
ایدیھم۔ (الفتح ۱۰)	انکے ہاتھ کے۔ (ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی)

حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر القرآن العظیم (مطبوعہ عیسیٰ البابی وشرکاؤہ غیر مورخہ جلد چہارم ص ۱۵ پر اس آیت کی تفسیر میں خاص اس جملہ "ید اللہ فوق ایدیھم" کے تحت لکھا ہے:۔

ای ھو حاضر معھم یسمع	یعنی وہ انکے ساتھ موجود انکے اقوال سنتا،
اقوالھم ویری مکانھم ویعلم	انکے موقف کو جانتا۔ اور انکے دلی بھید اور
ضمائرھم وظواھرھم فھو تعالیٰ	ظاہر احوال کو جانتا ہے۔ وہ (اللہ) تعالیٰ

هو المبايع بواسطة رسول الله صلى الله عليه وسلم۔	ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے بیعت کرنے والا (مبایع) ہے۔

محترم مبصر کی خدمت میں عرض ہے کہ حافظ ابن کثیر نے "يد الله فوق ايديهم" کا مفہوم بیعت سے لیا ہے اور اس بنا پر اللہ تعالیٰ کو مبایع کہا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کے لئے اس فقرہ میں بیعت کا لفظ یا اس کے مشتقات میں سے کوئی بھی استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ پھر حافظ ابن کثیر پر ہی موقوف نہیں۔ تقریباً تمام مفسرین کرام نے اس فقرہ کا یہی مفہوم لیا۔ ان کی تفصیلات پیش کرنے کا یہ موقعہ نہیں۔ آخر میں یہ عرض ہے کہ حافظ موصوف نے اس آیت کریمہ کے فقرہ بالا کے بارے میں جو احادیث و روایات نقل کی ہیں ان میں ہاتھ میں ہاتھ دینے کا مفہوم بیعت کرنے ہی کا ہے (ص۱۸۵-۹) مثلاً حضرت انس کی روایت کے الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعۃ الرضوان کا حکم دیا تو آپ نے فرمایا "اے اللہ! عثمان اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا کام کر رہے ہیں پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں میں سے ایک کو دوسرے پر مارا اور آپ کا دست مبارک حضرت عثمانؓ کے لئے تھا جو لوگوں کے ہاتھوں سے بہتر تھا (ص۱۸۶)

خود محترم تبصرہ نگار نے تسلیم کیا ہے کہ کنایہ ہونے کی صورت میں وہ "دوستی کرنے اور مساویانہ انداز میں گفتگو کرنے کا مفہوم رکھتا ہے"۔ یہی تو مطالبۂ حکومت تھا کہ دوستی کر لیں، اختلاف نہ کریں۔ وہ دوستی پر راضی تھے، اور آپ بھی اس پر راضی ہیں تو خدارا بتائیں کہ پھر اس محاورہ کا مطلب "بیعت" کے سوا کیا ہے؟ کیا دوستی کرنے کا اور کوئی راستہ تھا؟

جہاں تک مؤلف کے اس جملہ و محاورہ کے شد و مد سے مکرر و سہ کرر دہرانے کا تعلق ہے وہ تسامح کا قطعی انکار کرتا ہے اور ہاتھ میں ہاتھ دینے کا وہی مفہوم رکھتا ہے جو انھوں نے بیان کیا ہے۔ رہا آخری جملہ کا مفہوم تو واضح ہے کہ خود سپردگی، بیعت، ہاتھ میں ہاتھ دینے یا بقول مبصر "دوستی کرنے اور مساویانہ انداز میں گفتگو کرنے" کا صرف ایک ہی مفہوم تھا کہ خلیفۂ وقت کیا سلوک و فیصلہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی دستبرداری پر تو راضی نہ ہوتا اور نہ خلافت

حضرت حسینؓ کے لئے چھوڑتا۔ دوسری صورت کیا ہوسکتی تھی۔ وہ ظاہر ہے کہ قبول بیعت یا قبول دوستی کی ہی ہوسکتی تھی۔ تیسری صورت ممکنہ عدم قبول اور سزا دہی کی ہوسکتی تھی۔ لیکن یہ تو امکانات ہیں جو غلط بھی ہوسکتے ہیں۔

"روایات کا تضاد اور اس کا سبب" کے تحت فاضل مبصر نے جو بحث کی ہے وہ بڑے معرکہ کی ہے۔ بایں معنی کہ اول تو ان کو مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی اور سلمان رشدی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ایک مسلم و عالم دین مؤلف سے ایک ایسے مصنف کا موازنہ کرنا جو اس عہد میں اسلام دشمنی کا نمونہ ہو اس دریدہ قلمی کی مثال ہے جو شرافت و اخلاق اور اسلام و ایمان کی تمام حدود کو پھلانگ جاتی ہے۔ دوم یہ کہ مؤلف نے جن روایات کو نا قابل قبول اور منکر اور من گھڑت کہا ہے ان کے لئے انھوں نے روایات کا تجزیہ کرکے اُن کا تضاد روایت و درایت کی بنیادوں پر واضح کیا ہے اور ان کے موضوع و جعلی ہونے کے دلائل دیئے ہیں۔ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ ان کے دلائل و تجزیہ کو نہ تسلیم کرے اور اپنی پسندیدہ روایات کو خواہ وہ موضوع کیوں نہ ہوں مانتا اور قبول کرتا رہے۔ مگر مبصر گرامی قدر نے یہ جو الزام مؤلف پر عائد کیا ہے کہ وہ روایات کے ردّ و قبول میں اپنے مزعومہ نظریے کے اسیر رہے ہیں یہ تو دراصل خود ان پر صادق آتا ہے کیونکہ وہ اپنے مفروضات و مزعومات کا اسیر ہونے کے سبب اُن کے دلائل و تجزیہ سے ہی انکاری ہیں معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مؤلف کی وہ پوری بحث پڑھی ہی نہیں کیونکہ وہ مبصر کے مزعومات کے خلاف ہے۔

اس کے بعد تبصرہ نگار نے جو تاریخ نگاری کا اصول و طریقہ پیش کیا ہے وہ اس سارے تبصرہ کا شاہکار ہے اور ہر لحاظ سے خطرناک، غیر علمی اور غیر اسلامی ہے۔ فرماتے ہیں کہ "تاریخ کا کوئی حادثہ یا واقعہ ماضی سے جدا کرکے ایک اکائی کی شکل میں نہیں دیکھا جاسکتا، کربلا کا واقعہ بنو امیہ اور بنو ہاشم کی دیرینہ عداوتوں کا ایک منطقی نتیجہ (CONSEQUCN) تھا" مبصر محترم نے اسلام و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت کی ساری ذمہ داری بنو امیہ اور ان کے سربراہ

حضرت ابوسفیان کے سر ڈال دی ہے اور اس ضمن میں حضرت ہند زوجۂ ابی سفیان کی جگر خوارئ حمزہ کا ذکر بھی درمیان میں لائے ہیں۔ اُن کے خیال میں یہ نفرت وعداوت اس طبقہ بنی امیّہ کے دلوں میں جاگزیں رہی حتیٰ کہ وہ فتح مکہ میں بظاہر مسلم ہو گئے اور بباطن دشمنِ اسلام رہے۔ کچھ مدت تک خاموش رہے پھر واقعۂ کربلا کی شکل میں ان کی عداوت رونما ہوئی۔

محترم مبصر کا یہ مفروضۂ عداوتِ بنی امیہ، دعوائے باطل اور غیر تاریخی ہونے کے علاوہ غیر اسلامی بھی ہے۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ کی دشمنی کا مفروضہ بھی باد رہوا کا مصداق ہے جس کی واقعات سے تصدیق نہیں ہوتی۔ اگر ایسی ہی دونوں خاندانوں میں دشمنی ہوتی تو عبد المطلب کے عہد سے واقعۂ کربلا کے مدتوں بعد تک ان دونوں خاندانوں کے درمیان بہت سے ازدواجی رشتے نہ ہوتے، ان کے بہت سے سربرآوردہ افراد کے درمیان دوستی اور منادمت کے روابط نہ ہوتے، حضرت حسن، حضرت علی زین العابدین اور حضرت محمد بن الحنفیہ اور نہ جانے کتنے علوی وہاشمی بزرگوں کے اموی خلفاء بالخصوص حضرت معاویہ ویزید سے خوشگوار اور دوستانہ تعلقات نہ ہوتے۔ محترم مبصر نے اگر اس موضوع پر قدیم مآخذ اور جدید تحقیقات اس باب میں دیکھ کر آنکھیں موند نہ لی ہوتیں تو ایسی بات نہ کہتے۔ پھر اموی خلفاء اور فوج کے ساتھ اکثریت غیر امویوں کی تھی وہ کس چیز کے انتقام لینے کے درپے تھے۔ بنو ہاشم اور بنو امیّہ کے درمیان عداوت ودشمنی ثابت کرنے والے بالعموم بعد کے چند ناخوشگوار واقعات جیسے اختلاف علی ومعاویہ اور واقعۂ کربلا وغیرہ اور چند بلاسند روایات کا سہارا لے کر تاریخ کا وہ مطالعہ کرتے ہیں جسے جدید اصطلاح میں (محترم مبصر کی پسندیدہ اصطلاحات کی خاطر) (PROJECTION BACK) کہتے ہیں جس میں الٹی گنگا بہائی جاتی ہے۔

جنگ بدر سے واقعۂ کربلا اور واقعۂ حرہ کا تعلق اس وقت تک جوڑا ہی نہیں جاسکتا جب تک عقل وخرد کے ساتھ اسلامی تعلیمات اور اصولوں سے بھی ہاتھ نہ دھو لیا جائے۔ اسی طرح صلیبی جنگوں میں شکست پر انگریزوں کے غم وغصہ کا اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینہ کے

اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارنے کی بات بھی وہی شخص کہہ سکتا ہے جو کفر و اسلام کا فرق نہیں جانتا۔ جو مسلمانوں کے باہمی اختلافات و مشاجرات کو اور کافروں و مشرکوں کی عداوتوں ..... کا امتیاز نہیں سمجھتا۔ فاضل تبصرہ نگار نے طلقاءِ مکہ یعنی فتح مکہ کے مسلمانوں بالخصوص بنو امیہ کے مسلمانوں کے اسلام پر شک و شبہ ہی نہیں کیا بلکہ سید قطب وغیرہ کی آڑ لے کر ان کے منافق ہونے بظاہر مسلم اور بباطن دشمنِ اسلام ہونے اور ان کے اسلام کو "استسلام" کہنے کی جسارت بے جا تک کر کے صحابہ کرام کی سخت توہین کی ہے۔ وہ شاید بھول گئے کہ ان کے اسلام کو خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کیا تھا اور قرآن مجید نے فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والوں کو مومن ہی قرار دیا ہے اگرچہ ان کو سابقون یا فتح سے قبل کے مسلمانوں سے فروتر درجہ میں رکھا ہے۔ فاضل مبصر نے اس باب میں وہ صحیح حدیث بھی بھلا دی جس میں زبان رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن کو اس بنا پر سید قرار دیا تھا کہ اُن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں (مسلمین) کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرا دے گا۔ اس کی جگہ انھوں نے اپنی تائید میں سید قطب کے علاوہ احمد امین اور طٰہٰ حسین کو اپنی تائید میں پیش کیا ہے۔ غالباً وہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ان حضرات بالخصوص موخر الذکر دو کا اسلامی تاریخ نگاری میں کیا درجہ ہے؟ پھر انھوں نے اپنے مزعومات و رجحانات والے مؤلفین کے حوالے دیئے ہیں وہ بھی اُن مؤلفین کے جو تاریخ نگاری میں کسی درجہ کے مستحق نہیں۔ انھوں نے قدیم مآخذ میں طبری، ابن اسحاق، ابن ہشام، ابن کثیر، واقدی وغیرہ، کسی کا حوالہ نہیں دیا۔ حتیٰ کہ انھوں نے اپنے محترم استاذ الطائفہ حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ کا حوالہ بھی نہیں دیا جو طُلقاءِ مکہ بشمول حضرت ابوسفیان اور بنو امیہ کے اسلام خالص کے قائل ہیں۔ (سیرت النبی اول ص ۵۳۷ حاشیہ ۱، ۲) حضرت ابوسفیان کے خلوصِ اسلام و راسخ الایمان ہونے کا واقعاتی ثبوت یہ ہے کہ حضرت سعید بن المسیّب جیسے ثقہ تابعی کی روایت کے مطابق ان کی ایک آنکھ غزوۂ طائف میں اللہ کی راہ میں پھوڑی گئی اور دوسری جنگ یرموک میں اور جب ساری آوازیں اس جنگ میں خاموش ہوگئیں تو تنہا ان کی آواز اللہ کی قدرت کی گواہی دے رہی تھی۔

پھر حضرت معاویہ اور ان کے برادر اکبر حضرت یزید کے بارے میں ایک بھی تاریخی روایت نہیں ملتی کہ انھوں نے اسلام یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کسی جنگ یا سازش میں کبھی حصہ لیا ہو مبصّر محترم نے بعض روایات کی بنا پر جن کی صحت مشکوک ہے ان کے پورے ایمان و اسلام اور اخلاص پر ہی پانی پھیر دیا۔ اور تمام دوسرے علماء و مؤرخین کے نتائج و فیصلوں سے آنکھ موند لی۔ کیا وہ ایک بھی ثبوت احادیث و اعمال نبوی اور صحابہ کرام و تابعین کے اقوال و آثار سے پیش کر سکتے ہیں جو ان امویوں کے مومن ہونے کی تردید کرتے ہوں؟

محترم مبصّر نے مزید ظلم یہ کیا کہ بنو امیہ کو صرف حضرت ابوسفیان اور ان کے خاندان تک محدود کر دیا۔ اور تمام دوسرے اموی صحابہ کرام جن میں سابقین اولین اور شہداء اسلام بھی ہیں۔ اسلام و ایمان سے انکار کر دیا۔ کیا ان کو وہ حدیث نبوی یاد نہیں جس کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چہیتے صحابی حضرت اُسامہ بن زیدؓ کو سرزنش کی تھی۔ ھلا شققت قلبه (کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا؟) ان کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے ایک دشمن کو عین تلوار کے نیچے کلمہ پڑھنے کے باوجود قتل کر دیا تھا۔ ہر مسلمان پوچھ سکتا ہے اور حضرت ابوسفیان اور دوسرے اموی صحابہ جن کے ایمان و اسلام پر تبصرہ نگار نے شک و شبہ کرکے اُن کو غیر مسلم یا منافق قرار دیا ہے اللہ کے ہاں پوچھیں گے: "ھلا شققت قلوبنا" پھر محترم تبصرہ نگار نے حضرت ہند کی جگر خوارئ حمزہ کا ذکر بڑے طعن و تشنیع کے ساتھ کیا ہے۔ کیا وہ دوسری اسلامی تعلیم "الاسلام يهدم ما كان قبله والهجرة تهدم ما كان قبلها" (اسلام اور ہجرت اپنے سے پہلے گناہوں کو ختم کر دیتے ہیں) بھی بھول گئے؟ اسلام سے قبل کے جرائم و عداوتوں کا اسلام لانے کے بعد طعنہ دینے کے کیا معنی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اسلام اور اللہ تعالیٰ نے تو ان کے جرائم کو معاف کر دیا اور تبصرہ نگار محترم ان کو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں۔ پھر اس گروہ ہی کے جرائم کا ذکر کیوں؟ سب مخالفِ اسلام صحابہ کا ذکر کریں کہ اسلام سے پہلے وہ ان کے مرتکب تھے؟ کیا وہ حضرت عمر فاروق اور دوسرے بزرگوں کے بارے میں بھی ایسی دریدہ دہنی اور دریدہ قلمی کی

جسارت کر سکتے ہیں، صحابہ کرام کے بارے میں یہ طرز فکر تو رافضیت کی دین ہے جو چند حضرات کو چھوڑ کر باقی تمام صحابہ کرام کو منافق و مرتد قرار دیتے ہیں۔

تبصرہ نگار نے صحابہ کرام کی عدالت و کردار کا مضحکہ اپنے اس جملہ میں بھی اڑایا ہے جو یوں ہے "ایک وہ جس کو حکومتِ وقت سے وابستگی تھی خواہ جان بچانے کی خاطر یا طمع کی وجہ سے یا مسلمانوں کی آپس کی خانہ جنگی سے نجات حاصل کرنے کی خاطر وہ سمجھتا تھا کہ مناسب یہی ہے کہ جس کا غلبہ ہے اس کی تائید کی جائے دوسرا طبقہ وہ تھا جو اصل دین کی پامالی پر رنجیدہ تھا۔" اس دوسرے طبقہ میں کتنے آدمی تھے؟ پہلے طبقہ میں تو وہ تمام لوگ آتے ہیں جنھوں نے حضرت معاویہ اور ان کے فرزند کی خلافت کی بیعت کر لی تھی۔ ان میں حضرت عبداللہ بن عمر جیسے بہت سے صحابی تھے، ان میں حضرت عبداللہ بن عباس بھی تھے، اور حضرت حسین کے بڑے بھائی حضرت حسن، محمد بن الحنفیہ اور دوسرے کئی بھائی تھے اور خود واقعۂ کربلا کے بعد ان کے لخت جگر حضرت زین العابدین بھی تھے۔ بعد کے اموی خلفاء کے کردار و سیرت کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہنا۔ صرف اتنا کہ اخلاف کے کارناموں، کرتوتوں کے ذمہ دار اسلاف نہ تھے۔ پھر قرآن محکم کا فیصلہ ہے "لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ" (کوئی دوسرے کے بوجھ کا ذمہ دار نہیں)۔ پھر ان اموی خلفاء و اخلاف کی لغزشوں کے لئے محترم تبصرہ نگار گواہی لائے بھی تھے تو کہاں سے شیعی اور من گھڑت راوی ابوالفرج اصفہانی کی اغانی اور ابونواس اور بشار بن برد جیسے فحش گو شعراء کی خرافات سے یہ تو قاتل سے گواہی لانے کے مترادف ہے۔

"تاریخ اسلامی کی کتب کی روایات کے سلسلہ میں جو بات یا دعویٰ محترم تبصرہ نگار نے کیا ہے کہ سرکاری روایات اور چھپے ہوئے مومنین کی روایات میں واضح فرق تھا اور اس فرق کو آل فرعون کے مرد مومن کے حوالہ سے اور قرآن کی آیت سے مدلل کیا ہے وہ خالصتہً تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش ہے، اس کا بہترین عنوان "تاریخی روایات یا تاریخ نگاری میں تقیہ کا کردار" ہو سکتا ہے۔ اس پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں کہ وہ مؤلف کتاب پر تبصرہ سے زیادہ محترم تبصرہ نگار کا نظریۂ

تاریخ ہے جس سے سرِ دست ہمیں بحث نہیں۔ البتہ اتنا کہنا ضروری ہے کہ مردِ مومن جیسے لوگوں کی روایات کے بارے میں جو دعویٰ محترم مبصر نے کیا ہے کہ "وہ اپنی نسل کو صحیح حالات سے باخبر کرنے کے لئے اپنی معلومات ان تک منتقل کراتے تھے"! وہ تقیہ سازی باطل روایات یا قصہ کہانیوں کے سوا کیا ہے؟

واقعۂ کربلا کے زمانے کی جس شخصی حکومت اور حاکم کے دونوں لبوں کے درمیان قانون ہونے اور ظلم و جبر کرنے کی داستانوں کا محترم مبصر نے حوالہ دیا ہے اس کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ ہمارے مآخذ میں متعدد روایات موجود ہیں جو بتاتی ہیں کہ حضرت معاویہ اور ان کے بیٹے کے خلاف ان کے رُو دَر رُو بہت سی ناروا اور سخت باتیں کہی گئیں اور کسی کو سزا دینے یا قتل کرنے کا حکم نہیں ملا۔ معلوم نہیں تبصرہ نگار محترم کا ان روایات کے بارے میں کیا خیال ہے جن میں یزید کو خاص اس کے قصر و دربار میں خانوادہ علی رضی اللہ عنہ کے بچے کھچے افراد نے سخت سست کہا تھا؟ رہا حضرت امام نسائی کا واقعہ تو تبصرہ نگار نے یہاں دو مغالطے دیئے ہیں اول یہ کہ حضرت موصوف نے حضرت معاویہ کے مناقب سنانے کی فرمائش کے جواب میں کہا تھا کہ ان کی مغفرت ہی ہو جائے تو کافی ہے' ابن خلکان' وفیات الاعیان' قاہرہ ۱۹۴۸ء اول ص۵۹ نے ان کا جملہ نقل کیا ہے "امایرضی معاویۃ أن یخرج رأسًا برأسی حتیٰ یفضّل" ابن کثیر البدایۃ والنہایۃ، مطبع السعادۃ مصر جلد ۱۱ ص۱۲۴ (دو تین روایات الفاظ کے فرق کے ساتھ) حافظ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، حیدرآباد ۱۹۵۶ء دوم ص۷۰۱، انھوں نے صرف حدیث سنانے پر اکتفا نہیں کی تھی، دوم یہ کہ مسجد اموی کے حاضرین نے ان کے ساتھ جو برتاؤ کیا تھا اس کے لئے اموی اور عباسی خلفاء کیونکر ذمہ دار تھے اور اس سے ان کے ناصبی عقائد کا ثبوت کیونکر ملتا ہے؟ پھر کسی ایک گروہ کے خیال میں امام نسائیؒ کا تبصرہ کلمۂ حق تھا اور ہے مگر دوسرے گروہ کے خیال میں وہ کلمۂ حق نہ تھا بلکہ صحابی جلیل کی توہین تھی۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ مؤلف کتاب کے بیانات سے اس پوری بحث خاص کر اس واقعہ کا کیا تعلق؟ اور ناصبیت کی بھی خوب رہی، جو آپ کی مانند عقائد نہ رکھے

وہ ناصبی ہے۔ لہذا وہ تمام صحابہ کرام، تابعین اور علماء جنھوں نے خلافت یزید تسلیم کرلی تھی۔ کیسے بھی کی تھی، وہ سب کیا ناصبی تھے؟ کیا حضرت حسن کو بھی آپ ناصبی کہیں گے؟

مورخ طبری اور دوسرے ائمہ خاص کر ائمہ اربعہ اور ان میں بھی بالاخص امام ابوحنیفہ کے بارے میں شیعیت کی بحث سے محترم تبصرہ نگار کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ اور اس کا مؤلف یا کتاب سے کیا تعلق ہے؟ جہاں تک شیعیت کا تعلق ہے خواہ وہ کسی کی ہو اصولاً ایسے طرفدار شخص کی گواہی یا روایت مخالف کے خلاف یا طرفدار کے حق میں نہیں قبول کی جاتی کہ وہ انصاف واعتدال پر قائم نہیں رہا۔ بہرحال یہ بحث ہم سے زیادہ تعلق نہیں رکھتی۔ اس پر مزید تبصرہ کسی اور موقعہ پر کیا جاسکتا ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ کے حوالہ سے تبصرہ نگار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدر میں خروج کو حضرت زید بن علی کے خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے خلاف خروج کے مماثل قرار دیا ہے یا کہئے کہ حضرت زید کے خروج کو اقدام نبوی کے مماثل قرار دیا ہے۔ پھر دلالۃ النص کی گہری اصطلاح کے حوالہ سے حضرت حسین کے خروج کو اقدام نبوی کے مماثل بتایا گیا اور حضرت زید کے خروج کو حضرت حسین کے خروج کا اتباع قرار دیا گیا ہے۔ تبصرہ نگار گرامی نے اس روایت کا حوالہ موجودہ دور کے ایک مؤلف شیخ ابوزہرہ کی کتاب سے دیا ہے جو ثانوی حوالہ ہے۔ اگر اصل کا حوالہ دے دیتے تو اس روایت کے رُواۃ کی حیثیت ومقام پر بحث کی جاسکتی۔ اس سے قطع نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقدام اور بدر کے لئے خروج سے کسی بھی شخص کے خروج کی مماثلت تلاش کرنا جرات بے جا کے علاوہ توہین رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے مترادف ہے۔ پھر غزوۂ بدر کفر واسلام کا معرکہ تھا کیا خروجِ حسین یا خروجِ زید کفر واسلام کا معرکہ تھا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ کے کافروں اور مشرکوں اور اسلام کے علانیہ دشمنوں کے خلاف نکلے تھے کیا حضرت حسین اور حضرت زید کے مخالف ومقابل ایسے ہی کافر ومشرک اور دین کے علانیہ دشمن تھے؟ اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے آخری برگزیدہ رسول اور ختم الانبیاء کا

اقدام تھا۔ کسی غیر نبی کے اقدام کو نبی کے اقدام کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے؟ پھر ایسے غیر نبی کے اقدام کو جس کو ان کے معاصر صحابہ کرام اور ان کے عزیز و اقارب اور امتِ مرحومہ کے غالب طبقات میں سے کسی ایک کی بھی تائید حاصل نہ تھی بلکہ جن کے اقدام و خروج کے سلسلے میں علماء امت اور صحابہ کرام کے ایک غالب اکثریت والے طبقہ کے ہاں عدم صحت کی تصریح پائی جاتی ہے۔ امام ابو حنیفہ پر یہ خالص الزام ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خروج زید کے حامی ہوں مگر وہ اسے اقدام نبوی کے برابر سمجھتے تھے یہ روایت کا اور اس کے ناقل تبصرہ نگار کا کمال ہے؟ پھر روایت کا طرفہ ستم یہ کہ مال کے ساتھ معاونت کی مگر تلوار اٹھانے سے گریز کیا محض اس لئے کہ ان کے انصار کمزور تھے۔ کیا حق کا ساتھ دینا اسی کو کہتے ہیں؟ بدر کے غزوہ میں مسلمان بھی تو کمزور تھے کیا کسی صحابی یا مسلم نے مال دے کر جان بچا لی تھی؟ تلوار اٹھانے سے معذرت کرنے کا واضح مطلب ہے کہ امام صاحب بفرضِ محال موقفِ زید صحیح بھی سمجھتے تھے تو وقتِ خروج صحیح نہیں سمجھتے تھے کہ اقدام کا کوئی مثبت نتیجہ مرتب ہونے والا نہیں تھا۔ ایسے خروج کی اجازت ظاہر ہے کس اصولِ فقہ اور اصول دین سے ملتی ہے؟

حضرات ائمہ مالک، احمد بن حنبل اور شافعی کی شیعیت علی سے یہاں کیا بحث؟ یہ مسئلہ تو مؤلف کتاب نے چھیڑا ہی نہیں پھر اگر اس نکتہ کو شیعیت کے ضمن میں اٹھانا ضروری تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے سلسلے میں شاہ ولی اللہ دہلوی اور انکے ہمنواؤں کا ذکر بھی آنا ضروری تھا[1] اور ان صحابہ کرام کا بھی جو حضرت معاویہ کے ساتھ تھے۔ فاضل مبصر نے حدیث نبوی کے الفاظ "تقتلہ الفئۃ الباغیہ" نقل کئے ہیں جو صحیح نہیں ہیں۔ دوسرے اس بحث کا بھی یہاں کوئی موقع نہیں کسی نے اس حدیث کے راویوں میں شیعیت کا سراغ لگایا ہے تو عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب اس کے لئے کیونکر ذمہ دار ہیں۔ یہ دونوں بحثیں دراصل کسی اور کے خلاف نشانہ ہیں اور مؤلف کتاب

---

[1] "الفرقان" اپنی مشہور و معرکۃ الآرا کتاب ازالۃ الخفاء میں خلافت راشدہ کو دو حصوں یا دو درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے درجے میں حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان کی خلافت جسے وہ خلافت خاصہ منتظمہ (یا کاملہ) کا نام دیتے ہیں۔ دوسرے درجے میں حضرت علی کی خلافت جو منتظمہ یا کاملہ نہ ہو سکی۔ فاضل تجزیہ نگار کا اشارہ غالباً اسی طرف ہے۔

کا کاندھا اس کے لئے تلاش کیا گیا ہے۔ دراصل وہ مارے گھٹنا پھوٹے آنکھ کی مصداق ہیں۔

اگر فاضل تبصرہ نگار نے جذبات و مزعومات سے دب کر کتاب نہ پڑھی ہوتی تو محسوس کرتے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ جیسے صحابی کے ساتھ ساتھ مؤلف کتاب نے حضرت حسین کا بھی دفاع کیا ہے۔ ان کو میدانِ کارزار میں لاکھڑا کرنے کی ذمہ داری اُن شیعوں پر ڈالی ہے جنھوں نے پہلے ان کے والدگرامی اور برادرِ محترم کے ساتھ اور پھر ان کے ساتھ غدّاری کی تھی۔ پہلے ان کو خروج پر آمادہ کیا، طرح طرح سے برانگیختہ کیا، دعوت دی، اصرار کیا، اور جب وہ ان کے اصرار پر ان کے "گھر" گئے تو ان سے غدّاری کر کے حکومتِ وقت سے جا ملے اور ان کے قتل کے لئے میدان میں آ گئے۔ مؤلف گرامی نے حضرت حسین کے انجام کو قتل یا باغی کی موت نہیں کہا بلکہ شہادت قرار دیا ہے، " یہ ان کا دفاع نہیں تو اور کیا ہے۔؟

محترم تبصرہ نگار نے عباس محمود العقاد، عبدالقادر مازنی، سید قطب اور احمد امین جیسے مؤلفین کی تحقیقات و تصنیفات و خیالات سے اعراض کرنے کا شکوہ مؤلفِ کتاب سے کیا ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ تبصرہ نگار کے ہم خیال و ہمنوا ہیں۔ وہ ان کے نزدیک فکری طور پر کسی گروہ کے پابند نہیں اور ان کا طرزِ بحث موضوعی ہے۔ یہ ان کا خیال ہے ورنہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ مؤلفین کس طرزِ فکر کے قائل ہیں اور وہ کتنے اسلام پسند ہیں۔ اگر مصنف کتاب کا اندازِ تحقیق PRESUMPTIVE STUDY ہے تو تبصرہ نگار کا تبصرہ اسی کے مانند PRESUMPTIVE REVIEW ہے۔ یہ جملہ جیسے کو تیسا کے لحاظ سے ہے۔ محترم مبصر نے ایسے (PRESUMPTIVE) مطالعہ کی تشریح نہیں کی، ورنہ عام قارئین کے ساتھ ہمیں بھی معلوم ہوتا کہ اس کا مفہوم و مطلب کیا ہے؟ جدید اصطلاحات اور الفاظ بالخصوص انگریزی الفاظ و مصطلحات کے استعمال کا رعب ہم جیسے عامیوں پر تو پڑ سکتا ہے مگر اہلِ علم و تحقیق پر ان کا رعب نہیں پڑتا۔ دوسرے یہ کہ تبصرہ نگار نے ان سب کا استعمال بیدردی کے ساتھ اور بے سمجھے بوجھے کیا ہے۔ ان کے اسلوب و زبان میں بھی تحقیر و استہزاء کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ پورا تبصرہ مؤلفِ کتاب اور ان کے ہمنواؤں کے خلاف ایک فردِ جرم ہے

جسے لاطائل دلائل، غلط بیانات اور نا قابلِ قبول توجیہات اور دور از کار مباحث سے سجایا وسنوارا گیا ہے۔ تبصرہ نگاری کی یہ ایک ایسی مثال ہے جسے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، افسوس کہ محترم مبصّر نے علمی تبصرہ نگاری کے بنیادی اصول وضوابط سے دانستہ روگردانی کی ہے۔

اس استدراک کا خاتمہ تبصرہ نگار محترم کے آخری نکتہ پر کیا جا رہا ہے جو انھوں نے علامہ سید زینی دحلان کے حوالہ سے پیش کیا ہے سچ یہ ہے کہ ان کے ترکش کا یہ آخری تیر بڑا قاتل، بڑا غیر اسلامی اور سخت غیر اخلاقی ہے۔ فرماتے ہیں کہ "حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی مخالفت ناشی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت سے ..... یہ لوگ حضرت سیدنا حسین سے نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عناد کا اظہار کرتے ہیں ..." اول تو اس پوری کتاب میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی مخالفت کہیں کی نہیں گئی بلکہ انکی ہر طرح سے تحسین وتعریف کی گئی، دوم حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اولین موقف سے اختلاف کیا گیا ہے[1] جو انکے تمام معاصرین کو تھا، باستثنائے چند نفوس۔ تو کیا وہ سب صحابۂ کرام، ازواجِ مطہرات اور علماء وتابعین اس جرم عظیم کے مرتکب تھے؟ کیا ابن تیمیہ، قاضی ابن العربی شاہ ولی اللہ جیسے بزرگ نفوس بھی اس عنادِ رسول کے مجرم ہیں؟ ایک علامہ زینی دحلان نہیں ہزار ہا ایسے بزرگ ہوں تب بھی وہ کسی مسلم و مومن کے بارے میں عنادِ رسول کا الزام نہیں لگا سکتے۔ اور اگر لگا دیں تو اسکی حیثیت پرکاہ کے برابر نہیں۔ فاضل تبصرہ نگار ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ وہ مسلمانوں کے کن طبقات پر کن کن بزرگوں اور کن کن نفوس قدسیہ پر ایک شخص کے حوالہ سے عناد ومخالفتِ رسول کا الزام لگا رہے ہیں۔ اگر اللہ توفیق دے تو اس سے توبہ کریں اور تمام مسلمانوں سے معذرت کریں۔ مگر حبِ تشیع بلکہ حبِ رافضیت کے وہ گن گاتے رہے ہیں، وہ انکو شاید رجوع واستغفار کی مہلت نہ دے کہ اعتقادِ باطل کی کورانہ تقلید اسی طرح دلوں اور آنکھوں پر پردے ڈال دیتی ہے۔ لیکن وہ مقلب القلوب ہر چیز پر قادر ہے اور اسی کے ارشاد کے مطابق ہم اسکی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہو سکتے۔

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔

[1] فاضل تجزیہ نگار کا اشارہ غالباً امام ابن تیمیہ کی عبارت مندرجہ باب ۱۲ کی طرف ہے ورنہ خود مؤلف کتاب نے اتفاق یا اختلاف کے اظہار کو اپنے حدود سے خارج ٹھہرایا ہے۔

الفرقان کی ڈاک

۱

(مولانا عبد القدوس رومی
مفتی شہر شاہی جامع مسجد آگرہ (یوپی)

محب گرامی جناب مولوی خلیل الرحمٰن سجاد صاحب زید فضلہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

"اتفاق ہی ہے کہ بہت دنوں بعد جامعہ افضل المعارف میں آج تعمیر حیات کا تازہ شمارہ سامنے آگیا اور دوسرا اتفاق یہ بھی دیکھئے کہ یہ شمارہ ایک ایسے مضمون پر مشتمل نکلا کہ اگر کہیں تعمیر حیات اب بھی میرے پاس آتا ہوتا تو اس مضمون کو پڑھنے کے بعد آپ کو خط لکھنے سے پہلے مجھے ادارۂ تعمیر حیات کو خط لکھنا پڑتا کہ ازراہ کرم آیندہ سے وہ مجھے اس اعزاز سے محروم فرمادیں اور میرے نام رسالہ کا اجرا بند کردیں لیکن اس کی ضرورت ہی نہ رہی کہ تعمیر حیات ادھر جب سے میرا الہ آباد میں قیام کا سلسلہ شروع ہوا از خود ہی آنا بند ہوگیا ہے۔

اگر آپ نے تعمیر حیات کا تازہ شمارہ مورخہ ۱۰ مارچ ملاحظہ فرمایا ہے تو غالباً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا اشارہ کس مضمون کی طرف ہے؟ وہ مضمون ہے کتاب "واقعۂ کربلا" پر تبصرہ۔

یہ تبصرہ جن صاحب کے قلم سے نکلا ہے مجھے بالکل نامعلوم الوجہ بنیاد پر اپنے اندر ایک اختلاف و بُعد سا برابر ہی محسوس ہوتا تھا لیکن اب تک اسے صرف عدم مناسبت پر ہی محمول کرتا تھا لیکن اس مضمون کو پڑھنے کے بعد یہ بُعد اتنا زیادہ ہوگیا کہ دل نہیں چاہتا کہ اپنے قلم سے ان کا نام ہی لکھ کر قلم کو گنہگار کروں۔

تعمیر حیات تو وہاں آپ کے پاس ہوگا ہی آپ نے خود بھی دیکھ ہی لیا ہوگا ورنہ اب

دیکھ لیں کہ "روایات کا تضاد اور اس کا سبب" کی سرخی کے تحت کیسا "علمی تبرّا" لکھ کر ایمان وعافیت دونوں ہی کو داؤں پر لگا دیا ہے۔

اس تحقیق کی داد وتحسین کے لئے ابلیس لعین سے بہتر کون ہوگا کہ حضرات صحابہ کرام کے مرتبہ ومقام اور ان کے تقدس واحترام کا درجہ متعین کرنے کے لئے آیات خداوندی وارشادات نبوی کافی نہیں ہیں......... بلکہ اگر ان کا صحیح مرتبہ ومقام سمجھنا ہے تو آیات قرآنی وارشادات نبوی سے قطع نظر کر کے سید قطب، احمد امین، عبدالقادر مازنی، عباس محمود العقاد جیسے محروم الحقیقہ محققین کی کتابوں کی ظلمات کی تاریکی میں دیکھنا ہوگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پتہ نہیں مولانا عتیق الرحمٰن صاحب تک بھی یہ تبصرہ پہنچا ہوگا کہ نہیں؟ اور آپ یا وہ کوئی صاحب اس تبصرہ کا نوٹس لیں گے یا نہیں؟

اپنے حضرت والد صاحب کی خدمت میں سلام عرض کر کے دعا کی درخواست پیش کر دیں اور خود بھی رمضان المبارک کی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ والسلام

عبدالقدوس رومی غفرلہٗ

نوٹ :۔ الفرقان میں آپ نے اپنے ناظرین کے تأثرات شائع کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اگر آپ کا جی چاہے اور آپ ان تأثرات کی اشاعت مفید ومناسب سمجھیں تو شائع بھی کر سکتے ہیں۔

(۲)

مولانا مفتی منظور احمد مظاہری، قاضی شہر کانپور، ورکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند ملک کے دینی وعلمی حلقوں میں جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ مولانا موصوف نے "تبصرہ" کے بارے میں اپنے تأثرات حضرت مولانا علی میاں مدظلہٗ کو بھیجے تھے ـــــ حال ہی میں انھوں نے اس کی ایک نقل مدیر الفرقان کے نام اپنے خط کے ساتھ بھیجی ہے۔ ذیل میں وہ دونوں چیزیں ملاحظہ فرمایئے :۔

بسمہ تعالیٰ

محترم جناب مولانا سجاد صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

گذارش یہ کہ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" پر عبداللہ عباس ندوی صاحب نے جو تبرّائی تبصرہ کیا ہے وہ آپ نے ملاحظہ فرمالیا ہوگا۔ ۱۰ر مارچ ۹۲ء کے تعمیر حیات میں وہ تبصرہ چھپا ہے میں نے اس سے متاثر ہوکر ایک خط مولانا علی میاں صاحب کی خدمت میں روانہ کیا ہے اسکی فوٹو کاپی روانہ ہے امید کہ اس تبصرہ کی اطلاع مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کو ہوچکی ہوگی۔ حضرت مولانا کی خدمت میں سلام عرض ہے اور دعا کی درخواست۔ فقط

منظور احمد مظاہری
کانپور
۲۵ر ۹ر ۱۴۱۲ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۵ر رمضان۔ کانپور

محترم ومکرم بندہ حضرت مولانا علی میاں صاحب دامت برکاتہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ

رمضان المبارک کا یہ محترم مہینہ جس میں بزرگوں کے یہاں ڈاک کا سلسلہ ہی بند رہتا ہے اس میں قلبی تاثرات سے مجبور ہوکر آنجناب کی توجہ "تعمیر حیات لکھنؤ" کی ۱۰ر مارچ ۹۲ء کی اشاعت کی جانب مبذول کرا رہا ہوں جس میں مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کی کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" پر مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب نے تبصرہ کرتے ہوئے مودودی صاحب کی کتاب "خلافت وملوکیت" سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں ان صحابہ کرام پر تبرّا کیا ہے جو بنوامیہ سے تعلق رکھتے ہیں بالخصوص حضرت ابوسفیانؓ اور انکے خانوادہ کو خوب خوب ہدف ملامت بنایا ہے بلکہ انکے اسلام کو بھی مشکوک بنانے کی سعی نامشکور کی ہے۔ ہم اس تبرّائی ذہنیت کا جواب دینا جانتے ہیں لیکن آپ کو صرف اس لئے

زحمت دی گئی کہ "تعمیر حیات" ندوہ کا ترجمان ہے اور مولانا عبداللہ عباس ندوی ندوہ کے ناظم تعلیمات ہیں اور آنجناب ندوہ کے ناظم اور تعمیر حیات کے سرپرست ہیں اس لئے اس تبرائی مضمون کی تردید آپ کی طرف سے ضروری ہے ورنہ ایک بڑا طبقہ غلط فہمیوں کا شکار ہو سکتا ہے، اور لوگ ایک ندوی کے خیال باطل کو ندوہ کی ترجمانی سمجھ سکتے ہیں اس لئے باوجودیکہ آپ کے بارے میں ہمارا یقین ہے کہ آپ مذکورہ تبصرہ سے بیزار ہوں مگر بوجوہ مذکورہ سے آپ کی خاموشی سے بہت سی بدگمانیاں پیدا ہو سکتی ہیں اس لئے اسکے بارہ میں اپنی دوٹوک رائے عالی جلد ظاہر فرمائیں۔ بڑوں کے سامنے زبان کھولنا بے ادبی ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ صحابہ کے بارے میں ایسا بیباک ندوہ کے اس منصب جلیلہ کے لائق نہیں ایسا شخص ندوہ کو مسلک اہل سنت کے معتدل مسلک سے ہٹا کر رفض کے غار میں ڈھکیل دے گا یہ صاحب عرب میں زیادہ رہے ہیں اور سید قطب اور سید مودودی سے زیادہ فیض یاب ہوئے انھیں غالباً ابھی لکھنؤ کی ہوا نہیں لگی اور شاید انھیں ابھی ہندوستان میں صحابہ کے شیدائیوں سے واسطہ نہیں پڑا ہے۔ کاش میں نے رمضان میں یہ گندا مضمون نہ پڑھا ہوتا دو روز سے مجھ پر مجھ پر ایک ہیجانی کیفیت طاری ہے۔ تعمیر حیات میں آپ کی جانب اس تبصرہ کی تردید سکون بخش ہوگی اور بہت سے فتنہ کو دبادے گی۔

فقط والسلام۔ منظور احمد مظاہری کانپور

(۳)

چودھری علی مبارک عثمانی
ستر کھ، بارہ بنکی

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر مصنفہ مولانا عتیق الرحمن سنبھلی صاحب پر آپ نے الفرقان (مارچ ۱۹۹۲ء) میں میرے تأثرات شائع کردیئے، اس کے لئے آپ کا مشکور ہوں۔ اب پھر آپ سے اسی سلسلہ میں مخاطب ہوں، اور اس کا سبب اس کتاب پر ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ترجمان

تعمیر حیات (۱۰ر مارچ ۹۲ء) میں مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب (معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء) کے قلم سے شائع ہونے والا تبصرہ ہے ـــــ اس تبصرہ نے ہم لوگوں کو جو ندوۃ العلماء اور اسکے عالی مقام ناظم صاحب سے نیازمندانہ تعلق و عقیدت رکھتے ہیں، جس مشکل میں ڈال دیا ہے، اس کا اظہار کرنا، اس تعلق کی پوری رعایت کے ساتھ کچھ آسان کام نہیں ہے
میں نے ایک خط اس سلسلہ میں حضرت مولانا علی میاں مدظلہٗ کی خدمت میں ارسال کیا ہے، احتیاطاً اس کی ایک نقل آپ کو بھیج رہا ہوں ـــــ اگر آپ اس سلسلہ میں کچھ لکھیں اور عام مسلمانوں کا تأثر ظاہر کرنا چاہیں تو خاکسار کے اس خط کا حوالہ دے سکتے ہیں۔ بلکہ اسے شائع کر سکتے ہیں۔ اللہ آپ سب کا حامی و ناصر ہو۔

والسلام
مبارک عثمانی

نقل مکتوب چودھری مبارک عثمانی صاحب بخدمت حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ

مخدوم المکرم السلام علیکم و رحمۃ اللہ

اللہ کرے آپ مع الخیر ہوں۔
۱۰ر مارچ ۹۲ء کے تعمیر حیات میں مولانا عبداللہ عباس صاحب کا تبصرہ "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" پر شائع ہوا، جو نہایت دل آزار اور افسوسناک ہے۔ کسی حال میں یہ توقع نہ تھی کہ صحابۂ کرامؓ کی شان میں اس درجہ گستاخانہ تحریر تعمیر حیات میں شائع ہوگی۔ کتاب پر تبصرہ تو کم ہی ہے مگر تنقیصِ اصحابِ رسولؐ دل کھول کر کی گئی ہے اس طرح رافضیت اور شیعیت کی ازل سے ابد تک جو روح کشید کی گئی ہے شاید اُن کے نزدیک شیعی تبرکات کا حصول ممکن ہو مگر ہم کلمہ گو آخر کسے اعتماد کی نظر سے دیکھیں؟ جب آنجناب کی موجودگی میں "ندوہ کے ترجمان میں اصحابِ رسولؐ کے بارے میں مولانا عبداللہ عباس صاحب یہ لکھدیں کہ "صحابہ کے ایک گروہ کا دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صاف نہیں تھا" معاذ اللہ یہ قاتل ایمان جسارت تو کوئی صاحبِ ایمان کرہی نہیں سکتا۔

میں نے عبد اللہ عباس صاحب کے تبصرہ پر تبصرہ لکھ کر تعمیر حیات میں اشاعت کے لیئے بھیج دیا ہے۔ آپ سے بصد ادب گزارش ہے کہ جلدی تعمیر حیات میں اس کی وضاحت شائع کرادیں کہ مولانا عبد اللہ عباس صاحب نے غلط لکھا ہے اور صحابہ کرام کی تنقیص کے سلسلہ میں انھیں خود توبہ کرنی چاہیئے۔ ہ کتاب پر تبصرہ اس کے جواب میں دس کتابیں لکھ دیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو حفظ وامان میں رکھے اور ہر حال آپ کی مدد فرمائے۔ والسلام

خادم۔ طالب دعائے خیر
مبارک عثمانی۔ ۱۲/۳/۹۲ء

طعنِ صحابہؓ

صحابہ پر طعن کرنا درحقیقت پیغمبر پر طعن کرنا ہے۔ جس نے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابہ کی تعظیم وتوقیر نہ کی وہ رسول پر ایمان لایا ہی کب؟ اگر اصحاب نبیؐ میں کوئی خباثت تھی تو (نعوذ باللہ) یہ بات پیغمبر تک پہنچے گی۔ اللہ ہمیں ایسے برے اعتقاد سے بچائے۔ علاوہ ازیں جو احکامِ شرعیہ قرآن وحدیث کی راہ سے ہم تک پہنچے ہیں۔ وہ صحابہ کے توسط اور ذریعہ سے ہی تو پہونچے ہیں۔ صحابہ قابلِ طعن ہوں گے تو انھوں نے جو چیزیں نقل کی ہیں وہ بھی قابلِ طعن ہوں گی، اور یہ بات کسی ایک کے ساتھ یا چند کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ کل کے کل صحابہ عدالت صدق اور تبلیغ میں مساوی ہیں۔ پس ان میں سے کسی پر طعن وتبرّا کرنا دین پر طعن کرنا ہے، اللہ اس جرأت بیجا سے پناہ میں رکھے۔

ماخوذ از مکتوب امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ
بنام مرزا فتح اللہ شیرازی
تجلیات ربانی نمبر ۔ از مولانا نسیم احمد فریدی

ناظرین کرام سے کچھ ضروری گزارشات

۱۔ الفرقان کی یہ اہم اشاعت مئی جون ۱۹۹۲ء کی مشترک اشاعت ہے۔ اس میں ۳۲ صفحات آپ کو زائد ملیں گے۔ سالانہ خریداروں کو یہ خاص اشاعت خریداری کے حساب میں ہی پیش کی جارہی ہے، اگرچہ عام قیمت میں معمولی سا اضافہ کیا گیا ہے۔

۲۔ الفرقان کی توسیع اشاعت کے سلسلہ میں بعض مخلصین نے ہمیں لکھا ہے کہ اگر ادارہ الفرقان کا کوئی نمائندہ نئے خریدار بنانے اور ایجنسیاں قائم کرنے کی غرض سے ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کرے تو بہت مفید ہوگا اور یہ کہ وہ حضرات اس سلسلہ میں بھرپور تعاون دیں گے۔ چنانچہ طے کیا گیا ہے کہ اپنے مخلصین کی متعینہ فرمائش پر انشاء اللہ ہم اپنا نمائندہ بھیجیں گے۔ لیکن اس کے لئے انھیں خود کوئی نشانہ مقرر کرنا ہوگا۔ کم از کم پچاس ۵۰ خریدار بنوانے کے وعدہ پر ہم اپنا نمائندہ بھیج سکتے ہیں۔

۳۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں الفرقان کی ایجنسیاں قائم ہیں جن کے نام و پتے آئندہ صفحہ پر شائع کئے جارہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ ایجنسیاں زیادہ سے زیادہ شہروں میں قائم ہوں۔ خاص طور پر ان شہروں میں جہاں الفرقان بڑی تعداد میں جاتا ہے جیسے بمبئی، کلکتہ، مدراس، احمد آباد، سورت، بھروچ، بلگام، گلبرگہ، پٹنہ، سری نگر، اعظم گڑھ، مرادآباد، سہارنپور، دیوبند، علی گڑھ، گونڈہ، بستی وغیرہ۔ اس سلسلہ میں آپ کی کوششوں کے لئے ادارہ مشکور ہوگا۔

۴۔ ہندوستانی سکہ کی قیمت میں گراوٹ کی وجہ سے بیرونی ممالک کے چندہ میں تخفیف کا فیصلہ کیا گیا ہے اس کے علاوہ لائف ممبری فیس میں بھی نظر ثانی کرکے تبدیلی کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل اور رسالہ چندہ کی شرح صفحہ ۱۲۲ پر ملاحظہ ہو۔

۵۔ کسی قسم کی مراسلت کرتے وقت یا رقم بھیجتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔ اگر آپ نئے خریدار ہیں تو منی آرڈر کوپن پر اس کی وضاحت کریں۔

ناظم ادارہ الفرقان لکھنؤ

ہندوستان کے مختلف شہروں میں الفرقان کی ایجنسیاں

میسرز مکتبہ عزیزیہ
نورانی مسجد
مالیگاؤں - ۴۲۳۲۰۳
ضلع ناسک)

میسرز مکتبہ معارف الاسلام
جمیعۃ کالونی - انصار محلہ
روم نمبر ۶۸، فورتھ نظام پورہ
بھیونڈی (ضلع تھانہ)

سنٹرل نیوز ایجنسی (پرائیوٹ) لمٹیڈ
پی او باکس نمبر ۳۷۴
۲۳/۹۰ کناٹ سرکس - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مسٹر محمد غوث الدین
مکان ۳/۸ این - ایس - پی کیمپ
مقام مریال گڈا ضلع نلگونڈہ (اے پی)

میسرز شمس ایجنسی
۵-۳-۸۳۱ - شنکر باغ
حیدرآباد ۵۰۰۰۱۲ (اے پی)

میسرز مکتبہ دینیہ
جامع مسجد کالینا
بمبئی ۴۰۰۰۹۸

لون نیوز ایجنسی
باندی پورہ ۱۹۲۵۰۲ (جے اینڈ کے)

جناب ابن غوری ایم اے
مکان نمبر ۷۷-۱۰-۴ رحمان باغ
نلگونڈہ ۵۰۸۰۰۱ (اے پی)

مسٹر مہر علی خاں
۹-۸/۱۲ سیکٹر ۲ بھلائی نگر سیوک سنٹر
ضلع (درگ) ۴۹۰۰۰۶

میسرز بھوپال بک ہاؤس
برھوارہ - بھوپال ۴۶۲۰۰۱ (ایم پی)

میسرز محمد زکریا اینڈ سنس ٹمبر مرچنٹ
۲۰۲ بانس منڈی - الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

مسٹر حلیم الدین حکیم الدین
نواب پورہ - ناگ پور روڈ
یوتمال ۴۴۵۰۰۱

مسٹر ایم نورالدین
البو بازار (اچوا)
گورکھپور - ۲۷۳۰۰۱

میسرز زکریا لائبریری
پی او باکس نمبر ۵۶
گورکھپور ۲۷۳۰۰۱

مسٹر ایم اے خاں
کفایت بک ڈپو
جامع مسجد انجم پیٹ
کڈپا ۵۱۶۱۱۵ (اے پی)

مسٹر ایس قمرالزماں
(عباسی ہوزری)
محلہ دھرم پور ضلع سمستی پور ۸۴۸۱۰۱
بہار

شیخ عبدالغنی فاضل
مکان نمبر ۲۵۷-۳-۱ پھاڑی نگر
پوسٹ بھونگیر ۵۰۸۱۱۶
ضلع (نلگونڈہ) (اے پی)

مسٹر نسیم الدین مظاہری
جامع مسجد ائیڈل کالونی
مقام کالاگڑھ
ضلع پوڑی گڑھوال ۲۴۶۱۴۲

میسرز ناصر ڈپارٹمنٹل اسٹورس
محلہ شیخ صاحبان مقام خورجہ
ضلع (بلند شہر)

میسرز شاکر القرآن
احمدیہ بک ڈپو - مقام مدینہ مسجد
مکرم پورہ بس اسٹینڈ کریم نگر ۵۰۵۰۰۲

مسٹر محمد نعیم
میل نرس پی - ایچ - سی - بامن واس
ضلع (سوائی مادھوپور) ۳۲۲۲۱۱

مسٹر خان یار خاں - وارڈ نمبر ۴
اردو ہائی اسکول
بلڈانہ ۴۴۳۰۰۱ (مہاراشٹر)

محمد مصدق القاسمی
معاذ بک ڈپو - گلزار کامپلکس مارکیٹ
ڈاکخانہ نرمل (ضلع عادل آباد) (اے پی)

مسٹر ایم انصاری - گلزار ڈریسز
ایم ایم شاپنگ سنٹر - قدوائی روڈ
مالیگاؤں ضلع (ناسک) ۴۲۳۲۰۳
(مہاراشٹر اسٹیٹ)

مسٹر شاہ عالم
(ریٹائرڈ انجنیر)
ڈاکخانہ و موضع بنجریا سونبرسا
براہ برجمان گنج
ضلع (مہاراج گنج)

سالانہ چندہ ماہنامہ الفرقان

	عام خریداری	اعزازی	لائف ممبری
ہندوستان	۶۰/- روپئے	۱۲۰/- روپئے	۲۰۰۰/- روپئے
پاکستان	۱۲۰/- روپئے	۲۴۰/- روپئے	۳۰۰۰/- روپئے
دیگر ممالک ذریعہ ہوائی ڈاک	۲۰/- ڈالر	۴۰/- ڈالر	۵۰۰/- ڈالر
〃 بحری ڈاک	۱۲/- ڈالر	۲۴/- ڈالر	۳۰۰/- ڈالر

ایجنسی ماہنامہ الفرقان

۱۔ کم از کم ۵ کاپیوں پر ایجنسی دی جاتی ہے۔
۲۔ ایجنسی کے آغاز پر ۷/- روپیہ فی کاپی کے حساب سے زرضمانت جمع کرنا لازمی ہے۔
۳۔ دس عدد تک کی ایجنسی کو پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جاتے ہیں — اور ایک ماہ کے بل کی ادائیگی کے بعد ہی دوسرے ماہ کا شمارہ بھیجا جاتا ہے۔
۴۔ دس سے زیادہ کاپیاں وی پی سے ہی بھیجی جاتی ہیں۔
۵ اخراجات بہرصورت بذمہ ادارہ ہوتے ہیں۔

۶۔
شرح کمیشن

۵ تا ۹ کاپی پر ۱۵٪ ۱۰ تا ۲۴ پر ۲۵٪
۲۵ یا زائد کاپی پر ۳۳٪ فی صد کمیشن دیا جائے گا۔

۷۔ ایجنسیوں کا بل فی شمارہ کی قیمت سے بنایا جاتا ہے

نرخنامہ اشتہارات

پورا صفحہ	۹۰۰/- روپئے
نصف صفحہ	۵۰۰/- 〃
چوتھائی صفحہ	۳۰۰/- 〃
ٹائیٹل کا اندرونی صفحہ	۱۰۰۰/- 〃
ٹائیٹل کا آخری صفحہ	۱۲۰۰/- 〃

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:- ماہنامہ الفرقان ۳۱/۱۱۴ نظیر آباد لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

جلد ۶۰ | اگست ۱۹۹۲ء مطابق صفر ۱۴۱۲ھ | شمارہ ۸

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سرپرست
حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

مُدیر
خلیل الرحمٰن سجاد ندوی

فی شمارے کی قیمت
۵/۵۰

پاکستان و بیرونی ممالک کے قیمت آئندہ کا اعظم الشتہار ہیں

سالانہ چندہ برائے ہندوستان
عام -/۶۰
اعزازی -/۱۲۰
لائف ممبری -/۲۰۰۰

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے آپ کی خریداری ختم ہو گئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی روانہ کیا جائے گا۔ منیجر

دفتر ماہنامہ الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی نظیر آباد لکھنؤ

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ نمبر
۱	نگاہ اولیں	مولانا عتیق الرحمن سنبھلی	۳
۲	معارف الحدیث	حضرت مولانا محمد منظور نعمانی	۵
۳	حضرت معاویہؓ اور یزید کی ولی عہدی	مولانا عبد العلی فاروقی	۱۶
۴	الفرقان کی ڈاک		۲۹

سالانہ چندہ ماہنامہ الفرقان

برائے	عام خریداری	اعزازی	لائف ممبری
پاکستان	-/۱۲۰ روپئے	-/۲۴۰ روپئے	-/۳۰۰۰ روپئے
دیگر ممالک ذریعہ ہوائی ڈاک	-/۲۰ ڈالر	-/۴۰ ڈالر	-/۵۰۰ ڈالر
״ ״ بحری ڈاک	-/۱۲ ڈالر	-/۲۴ ڈالر	-/۳۰۰ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :- ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور

برطانیہ میں ترسیل زر کا پتہ — Mr. R. RAHMAN

90-B. HANLEY ROAD LONDON N4 3DW

محمد حسان نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی نظیر آباد لکھنؤ سے شائع کیا۔

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

نگاہِ اوّلیں

دارالعلوم دیوبند

اس ماہ (محرم الحرام) کی ۲ تاریخ کو، پانچ سال کے وقفے کے بعد مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کی زیارت کیلئے جانا ہوا۔ ۶۸ھ (۴۸ء) میں یہاں سے فراغت کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ کامل ایک ہفتہ قیام کرنا میسّر آیا۔ الفرقان میں اس زیارت کے تذکرے کا تقاضہ جس چیز نے پیدا کیا وہ برطانیہ سے یہاں (ہندوستان) تک بار بار سننے اور پڑھنے میں آنیوالی یہ بات تھی کہ دارالعلوم حضرت قاری طیب صاحب علیہ الرحمۃ کی علیحدگی کے بعد جن ہاتھوں میں آیا اُن ہاتھوں میں آکر وہ بالکل برباد ہوگیا اور اب صرف اپنے شاندار ماضی کا مرثیہ خواں ہے۔ دارالعلوم کے اندر اس ایک ہفتے کے قیام میں قدرتی طور سے بیحد مسرت یہ دیکھ کر ہوئی کہ کوئی ایک بھی ایسی چیز سامنے نہیں آسکی جس سے دارالعلوم کی بابت اس "مرثیہ خوانی" کی تائید ہوتی۔ اور پھر قدرتی طور سے رنج بھی ہوا۔ پس اس صورتِ حال میں یہ اپنا نہایت خوشگوار فریضہ معلوم ہوا کہ کم از کم وہ لوگ جو راقم الحروف کو اور اُسکے مزاج اور افتادِ طبع کو جانتے ہیں اور اس لئے ان کیلئے اُس کی بات کچھ قابلِ لحاظ ہوگی، اُن میں سے اگر کوئی دارالعلوم کے بارے میں مذکورہ بالا قسم کی باتوں سے کسی تشویش میں مبتلا اور فکرمند ہے تو وہ راقم کی اس تحریر کے ذریعہ جان لے کہ کم از کم اُسے تو ایسی کوئی بات دارالعلوم میں نظر نہیں آئی جس سے اِن تشویش انگیز باتوں کی تائید ہوتی ہو۔ بلکہ اسکے برعکس وہاں کی صورتِ حال کے متعدد پہلو کھلے طور سے یہ بشارت دیتے ہوئے ملے کہ دارالعلوم کا آج کا دور ایک ترقی اور شادابی کا دور اور کامل امن و سکون کا دور ہے۔

دورۂ حدیث سے جس سال راقم نے فراغت حاصل کی اُس سال ساتھیوں کی تعداد ڈھائی سو تھی اور اب جو جا کر دیکھا تو آج کی تعداد ڈھائی گنی سے کم نہ تھی۔ اور اس مشاہدے کے بالکل

مطابق جو فطری گنتی علم میں آئی تو وہ سات سو کے لگ بھگ تھی۔ اپنے زمانے میں دارالعلوم کے کل طلبہ کی تعداد پندرہ سو یا دو ہے اِن دنوں معلوم ہوا کہ تین ہزار ہے۔ عمارتوں کے لحاظ سے بھی دارالعلوم نہایت محسوس اور نمایاں توسیع و ترقی کے دور میں نظر آتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ قدرتی طور سے دارالعلوم کا رقبہ بھی بڑھ رہا اور پھیل رہا ہے۔ دارالعلوم کی زیرِ تعمیر نئی مسجد جس کا کام اب صرف ایک تہائی یا چوتھائی باقی رہ گیا ہے، سچ یہ ہے کہ ایک شاہجہانی تعمیری منصوبے کا نمونہ ہے جس دن یہ مکمل ہوگئی تو کیا بلحاظِ وسعت اور کیا بلحاظِ شان و شوکت دیکھنے کی یہ چیز ہوا کرے گی ــــ ربّ المساجد اسے معنوی طور سے بھی ایک نمونے کی مسجد بنائے ــــ تنہا اس مسجد ہی کو اسکی اِس وقت کی نامکمل حالت میں بھی دیکھ کر ایک آدمی اس بات کا بخوبی اور بہ اطمینان فیصلہ کر سکتا ہے کہ دارالعلوم جیتا ہے یا (بد اندیشوں کے منہ میں خاک) مر رہا ہے؟

کمزوریاں اور کوتاہیاں کہاں نہیں ہوتیں؟ اور پھر اتنے بڑے اور اتنے قدیم اداروں میں تو سب کچھ ہی ٹھیک اور معیاری رہنا ایک غیر فطری بات ہے لیکن یہ بات معمولی نہیں بہت بڑی ہے کہ ایک آدمی ہفتہ بھر ایک دارالعلوم میں رہے۔ وہاں کے پچاسوں طلبہ، اساتذہ اور دوسرے شعبہ جات کے ذمہ داروں اور کارکنوں سے اسکی ملاقات اور بات چیت ہو اور کسی خاص خرابی، کمزوری اور بدعنوانی کا تذکرہ نہ سنے اور نہ کوئی بدنما چیز اُسے دیکھنے کو ملے۔ یوں بہت سی باتیں جو پہلے بھی اپنی نظر میں قابلِ اصلاح اور ذمہ داروں کیلئے قابلِ توجہ تھیں وہ ضرور آج بھی بالعموم پائی جاتی ہیں۔ اور یہ ایک بالکل دوسرا مسئلہ ہے۔

دارالعلوم میں ترقیات، وسعت کار اور امن و سکون کی جو صورت دیکھنے میں آئی، وہ دو باتوں کی کھلی دلیل ہے۔ ایک یہ کہ انتظامیہ کی حالت اچھی ہے۔ اور معاملات پر اسکی گرفت ہے۔ دوم یہ کہ ملت کا اعتماد پہلے کے مقابلے میں گھٹا نہیں بڑھا ہے۔ اور علاوہ آنکھوں سے نظر آنے والی علامتوں کے انتظامیہ کے حضرات سے بات چیت میں کسی وقت اور کسی معاملے پر بھی اُن میں سے کسی کی زبان سے کسی پریشانی کا اظہار نہ ہونا خود اس بات کی علامت تھی کہ معاملات قابو میں بھی ہیں اور ملت سے ضروری تعاون بھی مل رہا ہے۔ ہاں ایک پریشانی ضرور سامنے آئی جو ہمارے اداروں میں ہے کہ کام کے آدمی حسب ضرورت نہیں ملتے۔

(باقی ص۲۸ پر)

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ

معارف الحدیث

کتاب المناقب والفضائل (۴۰)

فضائل اہلبیتِ نبوی: ازواجِ مطہرات اور ذریتِ طیبہ (۴)

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ (۲)

فضائل و کمالات

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: کَمُلَ مِنَ الرِّجَالِ کَثِیْرٌ، وَلَمْ یَکْمُلْ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَرْیَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ، وَآسِیَۃُ امْرَأَۃُ فِرْعَوْنَ، وَفَضْلُ عَائِشَۃَ عَلَی النِّسَآءِ کَفَضْلِ الثَّرِیْدِ عَلٰی سَائِرِ الطَّعَامِ ــــــــــــ (رواہ البخاری ومسلم)

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مردوں میں تو بہت لوگ درجۂ کمال کو پہونچے ہیں، مگر عورتوں میں سے صرف مریم بنت عمران اور فرعون کی بیوی آسیہؓ ہی کامل ہوئی ہیں، ـــــ اور عائشہؓ کی فضیلت تمام عورتوں پر ایسی ہے جیسے کہ تمام کھانوں میں ثرید افضل و اعلیٰ ہے ــــــــــــ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح: ـــ ظاہر ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام جن کی تعداد بعض روایات کے مطابق

ایک لاکھ سے اوپر ہے سبھی درجۂ کمال کو پہونچے ہوئے تھے' اسی طرح اُن کے حواریین اور خلفاء جنکی تعداد اللہ ہی کے علم میں ہے' سب کامل ہی تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کی پیدا فرمائی ہوئی خواتین میں سے اسی حدیث میں صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ مریم بنت عمران اور فرعون کی بیوی آسیہ کے بارے میں فرمایا گیا کہ بس وہی درجۂ کمال کو پہونچ سکیں —— اِن دونوں کے اِس امتیاز ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ قرآنِ پاک سورۂ تحریم کے آخر میں اِن دونوں کے مومنانہ کردار کو سب ایمان والوں کے لئے لائقِ تقلید مثال اور نمونہ کے طور پر پیش فرمایا گیا ہے۔

بعض شارحین نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ حضورؐ کے اس ارشاد کا تعلق صرف اگلی امتوں سے ہے' اس لئے اس حدیث سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ آپ کی امت میں اللہ کی کوئی بندی درجۂ کمال کو نہیں پہونچی —— کچھ ہی پہلے حضرت خدیجہ رضؓ کے فضائل کے بیان میں یہ حدیث گذر چکی ہے: "خَيْرُ نِسَائِهَا مَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ، وَخَيْرُ نِسَائِهَا خَدِيجَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ" (دنیا کی سب عورتوں میں بہتر مریم بنتِ عمران ہیں' اور خدیجہ بنت خویلد) —— خود اسی زیرِ تشریح حدیث کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے "وَفَضْلُ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَاءِ كَفَضْلِ الثَّرِيدِ عَلَى سَائِرِ الطَّعَامِ" جس کا مطلب یہ ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضؓ کو اللہ تعالیٰ کی پیدا فرمائی ہوئی تمام خواتین پر ایسی فضیلت و برتری حاصل ہے جیسی ثرید کو تمام کھانوں پر —— واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ثرید کو لذت اور نافعیت میں دوسرے سب کھانوں پر فوقیت و برتری حاصل تھی —— ثرید کے بارے میں لغت کی کتابوں میں اور شروحِ حدیث میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے اس کی حقیقت کو نہیں سمجھا جا سکتا —— اس عاجز راقم سطور کو حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحؒ کے دسترخوان پر بار بار ثرید کھانا نصیب ہوا ہے' —— اس عاجز کا تجربہ اور احساس بھی یہی ہے کہ وہ لذت، کھانے میں سہولت، سرعتِ ہضم اور نافعیت کے لحاظ سے ہمارے زمانہ کے اُن تمام کھانوں سے بھی جو عام طور پر بہتر سمجھے جاتے ہیں' فائق ہے۔

بعض حضرات نے اس حدیث کی بناء پر یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی کو تمام دنیا کی عورتوں پر، اگلی امتوں، اور امتِ محمدیہ کی بھی تمام خواتین پر فضیلت و برتری حاصل ہے ___ لیکن اُن تمام حدیثوں پر غور کرنے کے بعد جن میں اس طرح کسی کی فضیلت بیان فرمائی گئی ہے قرینِ صواب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فضیلت کلی نہیں، بلکہ کسی خاص جہت سے ہوتی ہے، مثلاً حضرت صدیقہ رضی کو احکامِ شریعت کے علم، تفقہ جیسے کمالات کی بناء پر دوسری تمام خواتین پر فضیلت و برتری حاصل ہے، اور ام المومنین حضرت خدیجہ رضی کو اُن خصوصیات کی وجہ سے جو ان کے احوال و اوصاف کے بیان میں ذکر کی جا چکی ہیں، دوسری تمام خواتین پر فضیلت حاصل ہے، اور مثلاً سیدہ حضرت فاطمہ رضی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ جگر ہونے کے ساتھ اُن کمالات کی وجہ سے جن کا بیان اُن کے فضائل کے بیان میں قارئین کرام پڑھیں گے، جو شرف و فضیلت حاصل ہے، وہ بلاشبہ اُنھیں کا حصہ ہے۔

یہ حدیث حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی کی روایت سے ہے، صحیح بخاری ہی میں حضرت انس رضی کی روایت سے حدیث کا صرف آخری حصہ (فَضْلُ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَاءِ كَفَضْلِ الثَّرِيدِ عَلَى سَائِرِ الطَّعَامِ) روایت کیا گیا ہے۔

وَعَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: قَالَ لِي رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُرِيتُكِ فِي الْمَنَامِ ثَلَاثَ لَيَالٍ، يَجِيءُ بِكِ الْمَلَكُ فِي سَرَقَةٍ مِنْ حَرِيرٍ، فَقَالَ لِي، هٰذِهِ امْرَأَتُكَ، فَكَشَفْتُ عَنْ وَجْهِكِ الثَّوْبَ فَإِذَا أَنْتِ هِيَ، فَقُلْتُ: إِنْ يَكُنْ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللهِ يُمْضِهِ۔

(رواہ البخاری ومسلم)

ترجمہ:۔ حضرت عائشہ رضی سے روایت ہے، انھوں نے بیان کیا کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ تم مجھے دکھائی گئیں خواب میں تین رات،

فرشتہ ریشمی کپڑے کے ایک ٹکڑے میں تمھیں لیکر آتا، اور مجھ سے کہتا کہ: یہ آپ کی بیوی ہیں، تو میں نے تمھارے چہرے سے کپڑا ہٹایا، تو دیکھا کہ وہ تم ہو، تو میں نے دل میں کہا کہ اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو وہ اس کو پورا فرمائے گا۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح:۔ حدیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ آپ نے یہ خواب کب اور کس زمانہ میں دیکھا؟ بظاہر قرین قیاس یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد جب اُن جیسی شریک حیات کی مفارقت کا فطری طور پر آپ کو سخت صدمہ تھا، اور مستقبل کے بارے میں فکر تھی تو اس وقت آپ کی تسلی کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو یہ دکھایا گیا ـــــ حضرت عائشہ صدیقہؓ اگرچہ اس وقت قریباً چھ سال کی بچی تھیں، لیکن اس بچپن ہی میں اُن کے جو احوال و اطوار تھے اُن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کی ذہانت و فطانت اور غیر معمولی صلاحیت کا بخوبی اندازہ تھا، اس طرح آپ کو منجانب اللہ بتلایا گیا کہ یہی آپ کیلئے مستقبل میں حضرت خدیجہؓ کا بدل ثابت ہونگی، واللہ اعلم ـــــ یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ نبوت کے ابتدائی دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی شریک حیات میں جن خصوصیات کی ضرورت تھی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت خدیجہؓ کو بھرپور عطاء ہوئی تھیں۔ اور ہجرت کے بعد کے مدنی دور میں اپنی رفیقۂ حیات میں آپ کو جن خاص صفات کی ضرورت تھی، وہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہؓ کو بدرجۂ کمال عطا فرمائی تھیں۔

حدیث شریف کے آخر میں ہے کہ آپؐ نے خواب دیکھنے کے بعد اپنے دل میں کہا: اِنْ یَّکُنْ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ یُمْضِهٖ۔ (جس کا لفظی ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ اگر یہ خواب منجانب اللہ ہے تو وہ اسکو پورا فرمائیگا) اس پر کسی کو اشکال ہو سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام، خاصکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب تو وحی کی ایک قسم ہے تو اس کے بارے میں شک شبہ کی کیا گنجائش تھی ـــــ حقیقت یہ ہے کہ "اِنْ یَّکُنْ" کا لفظ شبہ ظاہر کرنے کے لئے نہیں ہے، بلکہ یہ بالکل اس طرح

ہے کہ کسی ملک کا بادشاہ کسی شخص سے راضی ہو کر کہے: اگر میں بادشاہ ہوں تو تمہارا یہ کام ضرور کیا جائے گا۔ الغرض اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دل میں اطمینان محسوس کیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور ضرور ایسا ہی ہوگا ۔۔۔ اور ایسا ہی ہوا۔

آخر میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جامع ترمذی کی روایت میں صراحت ہے کہ خواب میں حضرت عائشہؓ کی صورت لیکر آنے والے فرشتے حضرت جبرئیل تھے، اور انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا: "هٰذِهٖ زَوْجَتُكَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ" (یہ آپ کی بیوی ہونے والی ہیں دنیا اور آخرت میں)

وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَائِشُ! "هٰذَا جِبْرِيْلُ يُقْرِئُكِ السَّلَامَ" قَالَتْ: وَعَلَيْهِ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ، قَالَتْ: وَهُوَ يَرٰى مَا لَا اَرٰى ۔ (رواہ البخاری ومسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے بیان فرماتی ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: "اے عائشہ! یہ جبرئیل ہیں جو تم کو سلام کہلوا رہے ہیں" تو میں نے عرض کیا "وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ" (اُن پر بھی سلام ہو اور اللہ کی رحمت) آگے حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہ دیکھتے تھے، جو ہم نہیں دیکھتے ۔۔۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

تشریح: ۔ حضرت خدیجہ کے فضائل کے بیان میں یہ حدیث گذر چکی ہے کہ حضرت جبرئیل (حرا میں) آپؐ کے پاس آئے، اور آپ سے کہا کہ خدیجہ کھانے پینے کا کچھ سامان لیکر آرہی ہیں، اُن کو اپنے رب کا سلام پہونچایئے اور میرا ۔۔۔ اور یہاں اس حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ سے فرمایا کہ "یہ جبرئیل ہیں جو تم کو سلام کہلوا رہے ہیں" حضرت صدیقہؓ نے جواب میں عرض کیا "وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ" ۔۔۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ جبرئیل کو حضورؐ دیکھ رہے تھے میں نہیں دیکھ رہی تھی۔

وَعَنْهَا قَالَتْ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا يَتَحَرَّوْنَ بِهَدَايَاهُمْ يَوْمَ عَائِشَةَ يَبْتَغُوْنَ بِذٰلِكَ مَرْضَاةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَقَالَتْ: اِنَّ نِسَاءَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُنَّ حِزْبَيْنِ: فَحِزْبٌ فِيْهِ عَائِشَةُ وَحَفْصَةُ وَصَفِيَّةُ وَسَوْدَةُ، وَالْحِزْبُ الْآخَرُ اُمُّ سَلِمَةَ وَسَائِرُ نِسَاءِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَكَلَّمَ حِزْبُ اُمِّ سَلِمَةَ، فَقُلْنَ لَهَا: كَلِّمِيْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُكَلِّمُ النَّاسَ فَيَقُوْلُ: مَنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْدِيَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلْيُهْدِهٖ اِلَيْهِ حَيْثُ كَانَ، فَكَلَّمَتْهُ، فَقَالَ لَهَا: لَا تُؤْذِيْنِيْ فِيْ عَائِشَةَ، فَاِنَّ الْوَحْيَ لَمْ يَأْتِنِيْ وَاَنَا فِيْ ثَوْبِ امْرَأَةٍ اِلَّا عَائِشَةَ، قَالَتْ: اَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مِنْ اَذَاكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، ثُمَّ اِنَّهُنَّ دَعَوْنَ فَاطِمَةَ فَاَرْسَلْنَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَلَّمَتْهُ فَقَالَ: "يَا بُنَيَّةُ اَلَا تُحِبِّيْنَ مَا اُحِبُّ، قَالَتْ: بَلٰى، قَالَ: فَاَحِبِّيْ هٰذِهٖ" ——— (رواہ البخاری ومسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے وہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب خصوصیت سے میری باری ہی کے دن ہدیے بھیجنے کا اہتمام کرتے تھے، وہ اپنے اس عمل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی چاہتے تھے، (اور صورتِ حال یہ تھی کہ) آپ کی ازواج کے دو گروہ تھے، ایک گروہ میں عائشہ، حفصہ، صفیہ، اور سودہ تھیں، اور دوسرے گروہ میں ام سلمہ اور باقی ازواج، ام سلمہ کے گروہ والیوں نے ام سلمہ سے بات کی، اور اُن سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تم کہو کہ آپ اپنے اصحاب سے فرما دیں کہ اگر کوئی آپ کے لئے ہدیہ بھیجنا چاہے تو آپ جہاں بھی ہوں (یعنی ازواج میں سے کسی کے یہاں بھی

مقیم ہوں) تو وہ وہیں آپؐ کو ہدیہ بھیجے، چنانچہ ام سلمہؓ نے آپؐ سے یہی عرض کیا، آپؐ نے فرمایا کہ تم مجھے عائشہ کے بارے میں اذیت نہ دو، یہ عائشہ ہی کی خصوصیت ہے کہ انھیں کے لحاف میں مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے، ام سلمہؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں اللہ کے حضور میں آپؐ کو اذیت دینے سے توبہ کرتی ہوں —— پھر ام سلمہؓ کی گروہ والی ازواج مطہرات نے (آپؐ کی صاحبزادی) حضرت فاطمہؓ کو اسی غرض سے آپؐ کے پاس بھیجا، چنانچہ انھوں نے حضورؐ سے وہی عرض کیا تو آپؐ نے فرمایا: اے بیٹا! کیا تم اس سے محبت نہیں کروگی جس سے مجھے محبت ہو، عرض کیا: کیوں نہیں! (یعنی آپؐ جس سے محبت کرتے ہیں میں ضرور اس سے محبت کروں گی) آپؐ نے فرمایا: فَأَحِبِّي هٰذِهِ، تو تم اِس (عائشہ) سے محبت کرو"—————— (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح: — اس حدیث میں چند باتیں وضاحت طلب ہیں —— ایک یہ کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے دو گروہ میں تقسیم ہونے کی بات کہی گئی ہے، دو گروہوں میں یہ تقسیم کسی باہمی اختلاف کی وجہ سے نہیں تھی، بلکہ یوں سمجھنا چاہئے کہ کچھ ازواجِ مطہرات کو مزاجی مناسبت حضرت عائشہ صدیقہؓ سے زیادہ تھی، اور کچھ کو حضرت ام سلمہؓ سے (واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل و دانش کے لحاظ سے یہ دونوں تمام ازواجِ مطہرات میں ممتاز تھیں، اور حضورؐ کو قلبی تعلق بھی اِن دونوں کے ساتھ بہ نسبت دوسری ازواج کے زیادہ تھا) —— —— دوسری بات قابلِ وضاحت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھانے پینے، پہننے اور شب باشی جیسے اختیاری معاملات میں اپنی تمام ازواج کے ساتھ امکانی حد تک یکساں برتاؤ کا خاص اہتمام فرماتے تھے —— لیکن قلبی محبت کا تعلق انسان کے اختیار میں نہیں ہے، اسی بناء پر آپؐ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے کہ اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِي فِيمَا اَمْلِكُ فَلَا تَلُمْنِي فِيمَا تَمْلِكُ وَلَا اَمْلِكُ، (اے اللہ میں تقسیم میں برابری کرتا ہوں اُن چیزوں میں

[illegible]

جو میرے اختیار میں ہیں، اے میرے مالک مجھ سے درگذر فرما اُس چیز کے بارے میں جو صرف تیرے اختیار میں ہے اور میرے اختیار میں نہیں ہے یعنی دل کا لگاؤ) بہر حال یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی بعض ازواج کے ساتھ زیادہ محبت تھی، اور سب سے زیادہ محبت حضرت عائشہ صدیقہ رضی سے تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی تعلق رکھنے والے اصحاب کرام اس حقیقت سے باخبر اور واقف تھے، اس لئے وہ جب کوئی کھانے وغیرہ کی قسم کی کوئی چیز ہدیہ کے طور پر بھیجنا چاہتے تو اس کا اہتمام کرتے کہ اُس دن بھیجیں جس دن آپؐ کا قیام حضرت عائشہ کے یہاں ہو ——— یہاں یہ بات خاص طور سے قابل لحاظ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے کبھی کسی کو کوئی اشارہ بھی نہیں فرمایا، تاہم یہ بات اُن ازواج کے لئے گرانی کا باعث تھی جو حضرت ام سلمہ رضی سے خصوصی تعلق رکھتی تھیں، انھوں نے ان سے کہا کہ تم حضورؐ سے اس بارے میں بات کرو اور یہ عرض کرو، پھر ام سلمہ رضی کا حضورؐ سے عرض کرنا، اور آپؐ کا جواب، اور اس پر ام سلمہ کی گذارش، یہ سب حدیث کے ترجمہ میں آپ پڑھ چکے ہیں — آگے حدیث میں یہ ہے کہ اس کے بعد انھوں نے حضورؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی سے بات کی، اور اُن کو اِسی غرض سے حضورؐ کی خدمت میں بھیجا، انھوں نے جا کر آپ کی اُن ازواج کی طرف سے وہی عرض کیا جو حضرت ام سلمہ نے کیا تھا، پھر حضورؐ نے جو کچھ فرمایا، اور حضرت فاطمہ رضی نے جو عرض کیا وہ بھی ترجمہ میں آپ پڑھ چکے ہیں ——— البتہ یہ بات خاص طور سے قابلِ لحاظ ہے کہ حدیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ حضرت فاطمہ کو اس کا علم تھا کہ حضرت ام سلمہ اس بارے میں حضورؐ سے عرض کر چکی ہیں، یقین ہے کہ اگر انھیں اِس کا علم ہوتا تو وہ ہرگز اسکے لئے تیار نہ ہوتیں ——— واللہ اعلم۔

علمی فضل وکمال

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی، قَالَ ، مَا اُشْکِلَ عَلَیْنَا اَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

...... حَدِيثٌ قَطُّ فَسَأَلْنَا عَائِشَةَ إِلَّا وَجَدْنَا عِنْدَهَا
مِنْهُ عِلْمًا ——— (رواہ الترمذی)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت ہے فرمایا کہ جب کبھی ہم لوگوں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو کسی بات اور کسی مسئلہ میں اشتباہ ہوا، تو ہم نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی سے پوچھا تو ان کے پاس اس کے بارے میں علم پایا ——— (جامع ترمذی)

تشریح: معلوم ہونا چاہیئے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری قدیم الاسلام ہیں اُن چند صحابۂ کرام میں ہیں جو علم اور تفقہ میں ممتاز تھے، یہ دراصل علاقۂ یمن کے رہنے والے تھے، دعوتِ ایمان و اسلام کے ابتدائی دور ہی میں ان کو اس کی خبر پہونچی تو یہ خود مکہ معظمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے معمول کے مطابق ان کے سامنے بھی اسلام کی دعوت پیش کی تو ان کے قلبِ سلیم نے بغیر تردد و توقف کے اسلام قبول کر لیا، اور مکہ معظمہ ہی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا، اور پھر جب مکہ کے کفار و مشرکین نے اسلام قبول کرنے والوں کو اپنے مظالم کا نشانہ بنایا، اور بات ناقابلِ برداشت حد تک پہونچ گئی تو حضور ہی کے مشورہ سے اِن ستم رسیدہ مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کا فیصلہ کیا، اور حضرت جعفر بن ابی طالب کی قیادت میں صحابۂ کرام کی جو جماعت حبشہ کیلئے روانہ ہوئی اُن ہی میں ابوموسیٰ اشعری بھی تھے —— چند برسوں تک یہ حضرات حبشہ ہی میں مقیم رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ ہجرت فرمانے کے بعد یہ حضرات مدینہ طیبہ آگئے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری کو اللہ تعالیٰ نے خاص درجہ کی علمی صلاحیت عطا فرمائی تھی وہ حضور کے دورِ حیات ہی میں اُن چند صحابہ میں شمار ہوتے تھے جن کی طرف عام مسلمان دینی معلومات حاصل کرنے کے لیے رجوع کرتے تھے، اصطلاحی الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ فقہاءِ صحابہ میں سے تھے ان کا یہ بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ ہم کو یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کہ اصحاب کرام کو حضورؐ کے بعد کسی مسئلہ میں مشکل پیش آتی تو وہ حضرت عائشہؓ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے اور جو مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا گیا تو ہم نے دیکھا کہ اس کے بارے میں ان کے پاس علم ہے ـــــ یعنی وہ مسئلہ حل فرما دیتیں، یا تو ان کے پاس اس بارے میں حضورؐ کا ارشاد ہوتا یا اپنی اجتہادی صلاحیت سے مسئلہ حل فرما دیتیں ـــــ اس سلسلہ میں چند اکابر تابعین کی یہ شہادتیں بھی ذیل میں پیش کی جاتی ہیں :ـــ

حضرت عروہ ابن زبیرؓ جو حضرت عائشہؓ کے حقیقی بھانجے ہیں، اور حضرت صدیقہؓ کی روایتوں کی بڑی تعداد کے وہی راوی ہیں، حاکم اور طبرانی نے ان کا یہ بیان حضرت صدیقہؓ کے بارے میں روایت کیا ہے کہ :ـ

مَا رَأَيْتُ اَحَدًا اَعْلَمَ بِالْقُرْآنِ وَلَا بِفَرِيْضَةٍ وَلَا بِحَرَامٍ وَلَا بِحَلَالٍ وَلَا بِفِقْهٍ وَلَا بِشِعْرٍ وَلَا بِطِبٍّ وَلَا بِحَدِيْثِ الْعَرَبِ وَلَا نَسَبٍ مِّنْ عَائِشَةَ[1]	میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو اللہ کی کتاب قرآن پاک اور فرائض کے بارے میں اور حرام وحلال اور فقہ کے بارے میں اور شعر اور طب کے بارے میں اور عربوں کے واقعات اور تاریخ کے بارے میں اور انساب کے بارے میں ہماری خالہ جان) عائشہؓ سے زیادہ علم رکھتا ہو۔

اور حاکم اور طبرانی ہی نے ایک دوسرے تابعی مسروق سے روایت کیا ہے۔ فرمایا :ـ

وَاللّٰهِ لَقَدْ رَأَيْتُ الْاَكَابِرَ مِنَ الصَّحَابَةِ وَفِیْ لَفْظٍ مَشْيَخَةَ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ اِلَّا کَابِرَ يَسْأَلُوْنَ عَائِشَةَ عَنِ الْفَرَائِضِ[2]	میں نے اکابر صحابہ کو دیکھا ہے فرائض کے بارے میں حضرت عائشہ سے دریافت کرتے تھے۔

اور حاکم ہی نے ایک تیسرے بزرگ تابعی عطاء ابن ابی رباح کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ

ا ـ ۲ ـ زرقانی ج ۳ ص ۲۳۴

كَانَتْ عَائِشَةُ أَفْقَهَ النَّاسِ وَأَعْلَمَ النَّاسِ وَأَحْسَنَ النَّاسِ رَأْيًا فِي الْعَامَّةِ۔ [1]	حضرت عائشہؓ بڑی فقیہہ تھیں اور بڑی عالم، اور عام لوگوں کی رائے ان کے بارے میں بہت اچھی تھی۔

کمالِ خطابت

مندرجۂ بالا علمی کمالات کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خطابت میں بھی کمال عطا فرمایا تھا، طبرانی نے حضرت معاویہؓ کا بیان نقل کیا ہے، فرمایا:۔

قَالَ مُعَاوِيَةُ وَاللّٰهِ مَا رَأَيْتُ خَطِيبًا قَطُّ أَبْلَغَ وَلَا أَفْصَحَ وَلَا أَفْطَنَ مِنْ عَائِشَةَ۔ رواه الطبراني۔ [2]	خدا کی قسم میں نے کوئی خطیب نہیں دیکھا جو فصاحت و بلاغت اور فطانت میں حضرت عائشہ سے فائق ہو۔

یہی وہ خدا داد کمالات تھے جن کی وجہ سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام ازواجِ مطہرات میں آپؐ کو سب سے زیادہ محبوب تھیں۔ (رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا وَأَرْضَاهَا)

[1-2] زرقانی ج ۳ ص ۲۳۴

مولانا عبد العلی فاروقی

حضرت معاویہؓ اور یزید کی ولی عہدی

[خانوادۂ امام اہلسنت حضرت مولانا محمد عبد الشکور فاروقیؒ کے چشم و چراغ دار العلوم فاروقیہ کاکوری کے ناظم اور ماہنامہ البدر کے مدیر مولانا عبد العلی فاروقی کی تازہ تصنیف "تاریخ کی مظلوم شخصیتیں" ادارہ الفرقان میں تبصرہ کے لئے آئی ہے — فی الحال اس کا ایک باب ہم ناظرین الفرقان کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ آئندہ کسی قریبی فرصت میں کتاب پر تبصرہ کا فرض بھی ادا کیا جائے گا۔ اس کتاب میں جن "دس مظلوم شخصیتوں" کا تذکرہ ہے، ان میں ایک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔ اُن پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں فاضل مصنف کے خیال میں ان میں بنیادی حیثیت ... دو اعتراضوں کی ہے۔ "اول یہ کہ انھوں نے چوتھے خلیفۂ راشد حضرت علیؓ کی متفقہ خلافت کو قبول کرنے سے انکار کیا، اور ان کے ہاتھ پر بیعت نہ کرکے اُن کے خلاف جنگ کے میدان میں آگئے۔ اور صلح صفائی ہو جانے کے باوجود حضرت علیؓ انکے خاندان اور ان کے ہمدردوں کی عداوت انکے دل سے ختم نہ ہو سکی جس کا موقع بہ موقع اظہار ہوتا رہا — دوم یہ کہ انھوں نے "اسلامی سنت" اور "رائے عامہ" کے خلاف اپنے بعد اپنی جانشینی کے لئے اپنے بیٹے کو نامزد کرکے نہ صرف ملوکیت کی بنیاد رکھی بلکہ ایک ایسا فتنہ پیدا کر دیا جس نے اسلام کے حسین پیکر کو مسخ کر دیا۔"

ہم نے اپنے محترم ناظرین کے مطالعہ کیلئے اس باب کے صرف اُس حصہ کا انتخاب کیا ہے جس میں دوسرے اعتراض کا جائزہ لیا گیا ہے — البتہ حضرت معاویہؓ

کے متعلق باب کے شروع کی تمہیدی سطروں کو بھی نقل کرنا ہم نے موضوع کے لحاظ سے مناسب سمجھا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ایک جلیل القدر صحابی رسول اور امت کے ایک عظیم محسن کے متعلق ایک شدید غلط فہمی اور سنگین بدگمانی کو دور کرنے میں یہ مضمون بہت معاون ثابت ہوگا۔ خدا کرے ایسا ہی ہو ——————— مدیر]

حضرت معاویہؓ کاتب وحی تھے، حضرت معاویہؓ اسلامی تاریخ کے پہلے امیر البحر تھے، جن کی قیادت میں سب سے پہلی بحری جنگ لڑی گئی، اور حضرت معاویہؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی سالے یعنی ام المومنین حضرت اُمّ حبیبہؓ کے بھائی تھے، ان تمام خوبیوں کے باوصف ان کی شخصیت کو مجروح کرنے اور ان کے "ناکردہ گناہوں" کی فہرست تیار کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عظیم المرتبت اور "ہدایت یافتہ" صحابی کی طرف سے مسلمانوں کو بدظن کرنے کی جس طرح منظم انداز میں سازش کی گئی ہے، تاریخ شاید اس سے گھناونی اور بدنما مثال نہیں پیش کر سکتی۔

اگر حضرت معاویہؓ پر جادۂ حق سے انحراف کرنے، خانوادۂ رسالت کی بے حرمتی کرنے، خلافتِ اسلامیہ کی جگہ ملوکیت و بادشاہی نظام قائم کرنے اور موروثی حکومت کی داغ بیل ڈالنے جیسے الزامات ان دشمنانِ صحابہؓ ہی کی طرف سے عائد کئے جاتے، جو سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ اور سیدنا حضرت عمر فاروقؓ جیسے اکابر صحابہؓ پر بھی اپنی ملامت کے تیر برسانے نہیں ڈرتے تو چنداں حیرت و افسوس کی بات نہ ہوتی لیکن حیرت تو ان "دوستوں" پر ہوتی ہے جو ایک طرف "صحابیت" کے بلند مقام کا اعتراف کرتے ہوئے اہلِ سنت وجماعت کے متفق علیہ عقیدے الصحابۃ کلھم عدول[1] (تمام

---

[1] چودہویں صدی کے ایک نامور اور "خوش فکر محقق" نے عدالتِ صحابہؓ کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ صحابہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے یا ان کی طرف کوئی بات منسوب کرنے میں عادل تھے، یعنی روایت کے سلسلے میں انھوں نے عدالت و راستبازی کے خلاف کوئی کام نہیں کیا، رہ گیا ان کی عملی زندگی کا معاملہ تو اس میں ان سے لغزشوں اور گناہوں کا صدور بھی ہوا ہے، اور پھر اس سلسلے میں حضرت ماعزؓ اور غامدیہؓ وغیرہ کے (باقی ص ۔ پر)

اصحاب رسول عادل ہیں) کا دم بھرتے ہیں، اور دوسری طرف "مشاجرات صحابہؓ" کی نازک بحث چھیڑ کر حضرت معاویہؓ بلکہ ان کے پورے خاندان بنو اُمیہ پر طبری، واقدی، یعقوبی اور مسعودی کی پامال اور مکذوبہ روایات کا سہارا لے کر ایسی ایسی تہمتیں باندھتے ہیں کہ بس خدا کی پناہ!

یزید کی ولی عہدی

حضرت معاویہؓ کے "جرائم" کی فہرست میں ان کا یہ "جرم" بھی بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے بعد امارت کیلئے اپنے بیٹے یزید کو نامزد کر کے "جبراً" اس کی بیعت کرادی، اور اس طرح انھوں نے خلفائے راشدینؓ کی سنت کیخلاف شخصی و موروثی حکومت کی

(باقی صـــکا) واقعات پیش کر کے محقق موصوف نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ عدالت کا ان کا بیان کردہ مفہوم مراد لینے کے بعد صحابہؓ تنقید سے بالاتر نہیں رہے، اور ان کے "مشاجرات" کے درمیان "حکم" بن کر فیصلہ دینا کوئی معیوب بات نہیں قرار پائی، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ صحابہؓ صرف روایت ہی کے معاملہ میں نہیں بلکہ اپنی عملی زندگی میں بھی عادل تھے، اور حق تعالیٰ نے ان کو گناہوں سے "محفوظ" کر دیا تھا، اور اگر کسی صحابی سے اتفاقاً کوئی گناہ سرزد ہو گیا تو ان کو بلا تاخیر توبہ کی توفیق ملی، جیسا کہ محقق موصوف کے بیان فرمودہ ماعز و غامدیہ کے واقعات سے ظاہر ہے اور اس طرح وہ التائب من الذنب کمن لاذنب لہ کے زمرہ میں داخل ہو گئے، کسی صحابی کیلئے گناہوں پر اصرار کرنا اور ظلم و طغیان کو اپنی مستقل پالیسی بنا لینا ثابت نہیں کیا جاسکتا، اور اگر یہ ثابت ہو جائے تو ایسے کسی فرد کو ہرگز ہرگز عادل نہیں قرار دیا جاسکتا بلکہ گناہوں کو مستقل پالیسی بنا لینے والا شخص تو کھلا ہوا فاسق ہی کہا جائیگا، جہاں تک نقل و روایت کی حد تک عدالت کا معاملہ ہے تو ہمارے آج کے دور میں بھی ایسے لوگ مل جائیں گے جو باوجود دوسرے گناہوں کے مرتکب ہونے کے راستباز ہوتے ہیں اور نقل و روایت کے معاملہ میں کسی قسم کی خرد برد نہیں کرتے پھر کیا انکے دیگر گناہوں سے صرف نظر کر کے ان کو عادل قرار دیا جائیگا؟ اور ایسی صورت میں اہلسنت کے اجماعی عقیدے الصحابۃ کلھم عدول کی کیا اہمیت باقی رہ جائے گی اور اس سے صحابہؓ کی کون سی فضیلت ثابت ہو جائے گی اور اس کا فائدہ کیا ہوگا؟

بنیاد رکھدی، جبکہ حکومت کا یہ تصور اسلامی تعلیمات اور اسلام کے اعلیٰ نصب العین کے قطعاً مخالف تھا، پھر یزید کی شراب نوشی، زناکاری اور دیگر فسق و فجور کے افسانے جوڑ کر جرم کی سنگینی میں اس طرح اضافہ کیا جاتا ہے کہ کسی امیر کا اپنے لائق و صالح فرزند کو اپنے بعد امارت کیلئے نامزد کرنا ہی اس کو متہم کرنے کیلئے کافی ہے چہ جائیکہ حضرت معاویہؓ کا اپنے "رسوائے زمانہ فرزند" یزید کو اصحابؓ رسولؐ اور بہت سے تابعین عظام جیسے اخیار امت کی موجودگی میں اپنا ولی عہد مقرر کرکے اپنے بعد امارت کے لئے نامزد کرنا ایک ایسا مکروہ و شنیع فعل ہے جس کی نظیر اسلام کی پچھلی تاریخ سے نہیں پیش کی جاسکتی، چنانچہ اس "ہوا و ہوس" پر مبنی فیصلے نے اسلامی تاریخ پر بدترین اثرات ڈالے۔ اور پھر جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری سے حضرت معاویہؓ بری نہیں ہو سکتے۔

اس الزام یا "جرم" کی حقیقت واضح کرنے کے لئے ہم درج ذیل سوالات قائم کر رہے ہیں، جن کے جوابات سے صورت حال کی واقعی اور حقیقی تصویر سامنے آئے گی۔

۱۔ کیا حضرت معاویہؓ نے قانون و اخلاق کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر محض اس لئے کہ یزید ان کا بیٹا تھا اس کو اپنے بعد امارت کے لئے نامزد کرکے جبراً بیعت کرادی تھی؟

۲۔ ایک امیر کے بعد دوسرے امیر کے تقرر کا "اسلامی طریقہ" کیا ہے اور اس سلسلہ میں خلفائے راشدین کی وہ سنت کیا ہے جس کی خلاف ورزی کرکے حضرت معاویہؓ "مجرم" بنے؟

۳۔ کیا باپ کے بعد بیٹے کا امیر بننا، یا باپ کا اپنے بیٹے کی امارت پر رضامند ہونا، یا خود اسے اپنے بعد امارت کے لئے مقرر کرنا اسلامی قانون کے لحاظ سے جرم ہے؟

۴۔ کیا امیر کے لئے اپنے تمام اصحاب زمانہ سے افضل و برتر ہونا ضروری ہے؟

۵۔ کیا یزید کو اس کے ہمعصر لوگ بھی شراب نوش، زناکار اور فاسق و فاجر ہی کی حیثیت سے جانتے تھے اور حضرت معاویہؓ بھی اس کے ان معائب پر مطلع تھے؟

۶۔ یزید کے ہاتھ پر ولی عہدی اور پھر امارت کی بیعت کرنے والے کون لوگ تھے اور ان کی بیعت سے کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے؟

ہم چاہتے ہیں کہ ان سوالات کے جوابات تاریخی افسانوں اور سبائی روایات کے بجائے ان صحیح اور معتبر ذرائع سے دیں جن کے انکار کی کوئی جرأت نہ کر سکے، ساتھ ہی بقدر ضرورت ان "سبائی کارروائیوں" کی نشان دہی بھی کر دیں جن کے ذریعہ منظم طور پر ایک صحابی رسول کی سیرت و کردار کو داغدار کر کے اسے ظلم کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

پہلے سوال کا واضح جواب یہ ہے کہ یہ ایک بہتان ہے جو خوف خدا سے بے نیاز ہو کر ایک ایسی شخصیت پر باندھا گیا ہے جس کی عدالت و ثقاہت کو چیلنج کرنا امت کے اجماعی عقیدے پر ضرب لگانے کے مرادف ہے، کیونکہ یزید کی ولی عہدی کی تحریک نہ حضرت معاویہؓ کی طرف سے ہوئی نہ خود یزید کی طرف سے، بلکہ اس کی تحریک حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی طرف سے ہوئی جو ایک جلیل القدر صحابی رسول تھے، پھر یہ تحریک بھی اس لئے نہیں ہوئی کہ یزید کو حضرت معاویہؓ کی فرزندی کا شرف حاصل تھا بلکہ امت کو فتنہ و فساد سے بچانے اور اتحاد برقرار رکھنے کیلئے ہوئی چنانچہ "الکامل" کی وہ سبائی روایت جس کا سہارا لے کر حضرت معاویہؓ پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے، اس میں بھی یہ بات موجود ہے کہ حضرت مغیرہؓ نے یزید کی ولی عہدی کی تحریک کرتے ہوئے حضرت معاویہؓ سے کہا کہ "امیر المومنین" آپ دیکھ چکے ہیں کہ قتل عثمانؓ کے بعد کیسے کیسے اختلافات اور خون خرابے ہوئے، اب بہتر یہ ہے کہ آپ یزید کو اپنی زندگی ہی میں ولی عہد مقرر کر کے بیعت لے لیں تاکہ اگر آپ کو کچھ ہو جائے تو اختلاف برپا نہ ہو[1]" ظاہر ہے کہ یزید کا صرف فرزند معاویہؓ ہونا اختلافات اور خون خرابے سے بچانے کے لئے کافی نہیں ہو سکتا تھا اس لئے حضرت مغیرہؓ کا یزید کی ولی عہدی کی تحریک کرتے ہوئے یہ دلیل دینا کہ یزید کے ولی عہد مقرر ہو جانے سے اختلاف برپا نہ ہوگا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے خیال میں یزید کے اندر اس بات کی صلاحیت موجود تھی کہ وہ اُمت کو اختلافات اور خون خرابے سے بچا سکے، اور یہ چیز جہاں ایک طرف یزید کے کردار پر ایک صحابی رسول کی شہادت ہے وہیں حضرت مغیرہؓ کے اس جذبۂ خیر کو بھی ظاہر کرنے والی ہے کہ

---

[1] الکامل ج ۳ ص ۲۴۹

انکے اس مشورہ کی غرض نہ حضرت معاویہؓ کی خوشنودی تھی نہ یزید کی. بلکہ انکے پیش نظر امت کا اتحاد تھا جس کو بنائے رکھنے کیلئے انھوں نے یہ مخلصانہ تجویز حضرت معاویہؓ کے سامنے رکھی تھی۔

اس وضاحت کے بعد اس الزام کا باطل ہونا بالکل ظاہر ہو جاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کو جبراً ولی عہد مقرر کر کے اس کی بیعت کرا دی۔

دوسرے سوال کے جواب میں علامہ ابن حزم تحریر فرماتے ہیں :-

"خلافت کا انعقاد کئی صورتوں سے صحیح ہو سکتا ہے، اس میں سب سے اوّل، افضل اور صحیح ترین صورت یہ ہے کہ مرنے والا خلیفہ اپنی پسند سے کسی کو ولی عہد نامزد کر دے، چاہے یہ نامزدگی حالت صحت میں ہو، بیماری کی حالت میں ہو یا عین مرنے کے وقت ہو، اسکے عدم جواز پر نہ کوئی نص ہے نہ اجماع، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بکرؓ کو، اور ابو بکرؓ نے عمرؓ کو اور جس طرح سلیمان بن عبد الملک نے عمر بن عبد العزیزؒ کو نامزد کیا، یہ صورت ہمارے نزدیک مختار و پسندیدہ اور اسکے علاوہ دوسری صورتیں ناپسندیدہ ہیں، کیونکہ اس صورت میں امت کا اتحاد اور امور اسلام کا انتظام قائم رہتا ہے، نیز اختلاف اور شور و شر ایسے کا خوف نہیں رہتا۔ اسکے برعکس دوسری صورتوں میں یہ متوقع ہے کہ ایک خلیفہ کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد امت میں انارکی اور امور شریعت میں انتشار پیدا ہو جائے اور حصول خلافت کی کوشش لوگوں کے اندر طمع کے جذبات پیدا کر دے[1]۔"

علامہ ابن حزم کی اس تشریح سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنا ولی عہد مقرر کر کے "اسلامی قانون" کی خلاف ورزی نہیں کی. بلکہ انتخاب امیر کے سلسلہ میں سب سے افضل اور صحیح ترین طریقہ اپنایا. کیونکہ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اشارتاً اور خلفائے راشدین میں سے خلیفۂ اول حضرت ابو بکرؓ کی صراحتاً سنت ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی بھی یہی سنت ہے کیونکہ انھوں نے بھی اپنے بعد امارت و خلافت کے لئے چھ آدمیوں کو نامزد کر دیا تھا کہ

---

[1] الفصل فی الملل والاھواء والنحل ج ۴ ص ۱۶۹ منقول از خلافت و ملوکیت از صلاح الدین یوسف ص ۲۷۲

بس ان ہی میں سے کوئی ایک خلیفہ ہوگا، البتہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے اس طریقہ کو نہیں اپنایا، یا نہ اپنا سکے تو اس کا نتیجہ حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ کی خلافت کے بارے میں اختلاف وانتشار کی صورت میں ظاہر ہوکر رہا۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ تینوں میں سے کوئی صورت اسلامی قانون کے خلاف نہیں ہے کیونکہ باپ کے بعد بیٹے کی امارت قائم ہونے یا باپ کے اپنے بیٹے کو امارت کے لئے نامزد کرنے کی کہیں کوئی ممانعت نہیں ہے اور کسی گری پڑی روایت سے بھی اس ممانعت کا ثبوت نہیں فراہم کیا جا سکتا ہے، پھر حضرت معاویہؓ اور یزید سے پہلے حضرت علیؓ اور ان کے بعد انکے بیٹے حضرت حسنؓ کی خلافت قائم ہونا اور اس پر کسی بھی حلقہ کی طرف سے یہ اعتراض نہ ہونا کہ "باپ کے بعد بیٹے کی امارت اسلامی قانون کے لحاظ سے غلط ہے" امت کے اس اجماع کو ثابت کرتا ہے کہ باپ کے بعد بیٹے کا امیر ہونا کوئی جرم نہیں ہے، علاوہ ازیں جب حضرت علیؓ سے انکے آخر وقت میں یہ دریافت کیا گیا کہ کیا ہم آپ کے بعد آپ کے فرزند حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلیں؟ تو اس کے جواب میں حضرت علیؓ نے فرمایا "میں نہ تم کو اس کا حکم دیتا ہوں نہ اس سے منع کرتا ہوں تم لوگ خود اچھی طرح دیکھ سکتے ہو۔"[1] حضرت علیؓ کے اس جواب سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ بھی باپ کے بعد بیٹے کی امارت وخلافت میں کسی قسم کی کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے ورنہ وہ یہ جواب نہ دیکر یہ کہتے کہ "یہ طریقہ اسلامی قانون کے لحاظ سے غلط ہے اس لئے تم لوگ ایسا نہ کرنا" یا کم سے کم یہ کہتے کہ "میرے لئے اپنے بیٹے کو اپنے بعد خلافت کیلئے نامزد کرنا اسلامی قانون کے لحاظ سے جرم ہے اس لئے میں یہ کام نہیں کر سکتا۔" پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ حضرت علیؓ سے یہ دریافت کرنیوالے ایک صحابی رسول حضرت جندبؓ بن عبداللہ تھے، اگر باپ کا اپنے بیٹے کو اپنے بعد خلافت کے لئے نامزد کرنا اسلامی قانون کے خلاف ہوتا تو حضرت جندبؓ خود ہی اس سلسلہ میں حضرت علیؓ سے استفسار نہ کرتے۔

چوتھے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ بات بھی محض حضرت معاویہؓ پر اعتراض جڑنے کیلئے اٹھائی

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۳۲۷

گئی ہے ورنہ امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کیلئے امارت و خلافت کی اہلیت تو شرط ہے لیکن اس کا اپنے زمانہ کے تمام لوگوں سے افضل ہونا ضروری نہیں ہے، نہ ہی عملاً اس کا اہتمام ہو سکتا ہے، کیونکہ فضیلت کا کوئی ایک مقرر پیمانہ نہیں ہے جسکی بنیاد پر کسی شخص کو من کل الوجوہ افضل قرار دیا جا سکے۔

یہ صحیح ہے کہ یزید کی ولی عہدی اور پھر امارت کے وقت اکابر صحابہؓ اور بہت سے ایسے تابعینؒ موجود تھے جن کو ہر طرح یزید پر فضیلت حاصل تھی لیکن کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ خود حضرت معاویہؓ اپنے دور کے تمام اصحابؓ سے افضل تھے؟ اور پھر ان سے پہلے حضرت حسنؓ کی خلافت کے وقت حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت سعید بن زیدؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے بہت سے اکابر صحابہؓ موجود تھے جن کو علم و فضل میں حضرت حسنؓ پر برتری حاصل تھی، اسکے باوجود حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت حسنؓ ہی خلیفہ مقرر ہوئے، ایسی صورت میں یزید کی ولی عہدی یا خلافت پر افضل و مفضول کی بحث چھیڑنا "بغض معاویہؓ" کے ایک حسین عنوان سے زیادہ کوئی قیمت نہیں رکھتا۔

پانچویں سوال کے جواب کے سلسلہ میں سب سے قوی شہادت تو حضرت محمد بن علیؓ (محمد بن الحنفیہ) کی ہے جس کو حافظ ابن کثیر نے یوں نقل کیا ہے۔

"حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے داعی حضرت عبداللہ بن المطیعؓ اپنے ساتھیوں کے ساتھ حضرت محمد بن علی بن ابی طالب کے پاس گئے اور درخواست کی کہ آپ (یزید کی) بیعت توڑ دیں لیکن انھوں نے اس سے انکار کر دیا۔ ابن المطیع نے کہا کہ یزید شراب پیتا ہے، نماز نہیں پڑھتا ہے اور کتاب اللہ کے احکام کی اسے پرواہ نہیں ہے۔ محمد نے فرمایا کہ "میں نے ایسی کوئی بات نہیں دیکھی میں یزید سے ملا ہوں، انکے ساتھ رہا ہوں میں نے ان کو نماز کا پابند، خیر کا متلاشی، فقہ کا سائل اور سنت کا متبع پایا"...... الخ۔[1]

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۲۳۳، یہ روایت کافی طویل ہے جس میں آگے ذکر ہے کہ ابن المطیع نے ہر چند کوشش کی کہ محمد بن الحنفیہ کسی طرح یزید کی بیعت توڑ کر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی حمایت پر آمادہ ہو جائیں حتیٰ کہ یہ پیشکش بھی کی کہ اگر آپ خود یزید کے بجائے خلافت کی بیعت لینا چاہیں تو ہم آپ کی خلافت تسلیم (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت علیؓ کے فرزند حضرت محمد نے یزید سے اپنی ذاتی واقفیت کی بنیاد پر حضرت عبداللہ بن المطیع کے اس بیان کی تردید کی کہ یزید شراب پیتا ہے، نماز نہیں پڑھتا ہے اور کتاب اللہ کے احکام کی پرواہ نہیں کرتا، پھر ان کی اس تاویل پر کہ یزید نے نماز کی پابندی وغیرہ جیسے نیک عمل آپ کو دکھانے کیلئے کئے ہونگے" جواباً عبداللہ بن المطیع سے جب یہ استفسار کیا کہ کیا تم نے خود یزید کو شراب پیتے دیکھا ہے؟ اسکے جواب میں انھوں نے کہا کہ" اگرچہ میں نے خود نہیں دیکھا مگر میرے نزدیک یہ بات سچی ہے" اس تفصیل سے یہ بات تو واضح ہوتی ہے کہ یزید کے ہمعصروں میں بھی اسکے فسق وفجور کا چرچا تھا جس کی بنیاد پر حضرت ابن المطیعؓ جیسے بزرگوں کو یزید کے فسق کا یقین ہو گیا تھا لیکن حضرت محمد بن الحنفیہ جیسے بزرگوں کا اپنے ذاتی علم و واقفیت کی بنیاد پر یزید کو اس الزام سے بری قرار دیتے ہوئے اس کی نمازوں کی پابندی، خیر کی تلاش، اور سنت کی اتباع کی گواہی دینا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یزید دشمنوں کی طرف سے اس کی شراب نوشی و دیگر منکرات میں ملوث ہونے کا پروپیگنڈہ اور بات ہے لیکن اس کے لئے کوئی معتبر عینی گواہ نہ تھا۔

اسی طرح بخاری شریف کی ایک روایت سے جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا واضح طور پر یہ موقف معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی قیادت میں اہل مدینہ کی یزید کے خلاف چھیڑی جانے والی مہم کو بغاوت تصور کرتے تھے اور انھوں نے اپنے خاندان و اولاد کو سختی کے ساتھ اس سے منع کیا تھا۔ الفاظ روایت یہ ہیں:-

عن نافع قال لما خلع اهل	حضرت نافع سے روایت ہے کہ جب اہل مدینہ
المدینة یزید بن معاویة جمع	نے یزید کی بیعت توڑ دی تو حضرت عبداللہ
ابن عمر حشمه وولده فقال	بن عمرؓ نے اپنے مخصوصین و اولاد کو جمع کیا
انی سمعت النبی صلی الله علیه وسلم	اور کہا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ
یقول ینصب لکل غادر لواء	فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے دن ہر بے وفا

(حاشیہ صفحہ گذشتہ کا) کرنے کو تیار ہیں، مگر حضرت محمد بن الحنفیہ یزید کی بیعت توڑنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

يوم القيامة وانا قد بايعنا	کرنیوالے کیلئے ایک جھنڈا گاڑا جائیگا، اور
هذا الرجل على بيع الله ورسوله	ہم نے اس شخص (یزید) سے اللہ اور اسکے رسول
واني لا اعلم غدرا اعظم من	کے نام پر بیعت کی ہے اور میں اس سے بڑی کوئی
ان يبايع رجل على بيع الله	غداری نہیں جانتا کہ کسی شخص سے اللہ اور
ورسوله ثم ينصب له القتال	اسکے رسول کے نام کی بیعت کی جائے، پھر اسی کے
واني لا اعلم احدا منكم خلعه	مقابلہ میں قتال کیلئے کھڑا ہوا جائے اور
ولا تابع في هذا الامر الا كانت	مجھے یہ علم نہ ہو کہ تم میں سے کسی نے یزید کی بیعت
الفيصل بيني وبينه۔	توڑدی اور اس معاملہ میں کوئی حصہ لیا، ورنہ
(بخاری ج ۲ ص ۱۰۵۲)	میرے اور ایسا کرنیوالے کے درمیان کوئی تعلق نہ رہیگا۔

حضرت ابن عمرؓ کا یزید کی بیعت پر قائم رہنے کیلئے یہ اصرار، اپنے متعلقین و اولاد کو اہتمام کے ساتھ جمع کرکے بیعت کے پابند رہنے اور خلاف ورزی کی صورت میں ان سے ترک تعلق کرلینے کی دھمکی دینا اور یزید کے خلاف قتال کو غدر سے تعبیر کرنا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ یا تو ان کو فسق یزید کے پروپیگنڈے کا علم نہ تھا، یا وہ اس پروپیگنڈے پر اعتماد نہ کرکے اس کو امارت وخلافت کے منصب کے لئے موزوں قرار دیتے تھے، اور یزید کے ہاتھ پر کی ہوئی بیعت کو وہ اللہ اور اسکے رسول کی بیعت گردانتے تھے، اور اس سلسلہ میں اہلِ مدینہ کی مخالفانہ کارروائیوں کو خلاف حق اور غداری سمجھتے تھے۔

اسی طرح بلاذری کی انساب الاشراف میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے افقہ واعلم صحابی کی یزید کے بارے میں یہ شہادت موجود ہے۔

ان ابنه يزيد لمن صالحي	بیشک معاویہؓ کا بیٹا یزید انکے گھرانے کے نیک
أهله فالزموا مجالسكم	لوگوں میں سے ہے تو تم لوگ اپنی جگہ بیٹھے رہو
واعطوا طاعتكم وبيعتكم۔	اور اسکی فرمانبرداری اور بیعت پر قائم رہو۔

یزید کے ہمعصروں میں سے یہ وہ چند نام ہیں جن کی عظمت وجلالت پر ہر مسلمان کو کامل اعتماد

ہے اور جنھوں نے اپنے اقوال و اعمال کے ذریعہ یزید کی شراب نوشی اور دوسری فسق و فجور کی داستانوں کی تغلیط کی ہے اب اگر انکے مقابلہ میں کچھ ہم عصر ایسے ہوں بھی جو یزید کو شراب نوش و ناکارہ اور فاسق و فاجر گردانتے ہوں تو اوّلا تو ان کی بات ان اکابر صحابہؓ کے مقابلہ میں اہمیت نہیں رکھتی، پھر اگر وہ بہت ہی قابل لحاظ و احترام شخصیات ہوں تو بھی یہی سمجھا جائیگا کہ وہ لوگ یزید مخالف پروپگنڈے سے اسی طرح متأثر ہو گئے جس طرح حضرت عبداللہ بن المطیع متأثر ہو گئے کیونکہ کسی بھی معتبر معاصر نے یہ گواہی نہیں دی ہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے یزید کو فسق و فجور میں مبتلا دیکھا ہے، اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت معاویہؓ یزید کے معائب اور فسق و فجور پر کیونکر مطلع ہوں گے؟

چھٹے سوال کا جواب یہ ہے کہ بیعت کرنے والوں میں اکابر صحابہ بھی تھے، اور تابعین عظام بھی، پھر اصحاب کرام میں اصحاب بدر بھی تھے، اصحاب بیعت الرضوان بھی، اور اصحاب بیعت عقبہ اولیٰ بھی، چنانچہ بیعت کرنے والے ممتاز اصحاب رسولؐ میں سے چند یہ تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت کعب بن عمرؓ، حضرت صہیب بن سنانؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، حضرت عمرو بن ابی سلمہؓ، حضرت عبداللہ بن جعفرؓ، حضرت نعمان بن بشیرؓ، حضرت عوف بن مالکؓ، حضرت ابوامامہ باہلیؓ، حضرت ضحاک بن قیسؓ، حضرت مالک بن حویرثؓ، حضرت عمرو بن امیہؓ، حضرت عقبہ بن نافعؓ، حضرت عقبہ بن عامرؓ، حضرت مقدام بن معدیکربؓ، حضرت ثابت بن ضحاکؓ وغیرہم۔

یہ اور ان سے زائد دیگر اصحاب رسولؐ، تابعین عظام اور صلحائے امت کے یزید کی امارت کو تسلیم کر کے اس کی بیعت کر لینے سے درج ذیل نتائج بدیہی طور پر سامنے آتے ہیں۔

۱۔ حضرت معاویہؓ نے یزید کی بیعت جبراً نہیں لی تھی، ورنہ اتنی بڑی تعداد میں خیر القرون کے افراد اس بیعت پر اتفاق نہ کرتے، اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت معاویہؓ اتنے بڑے زور دست تھے کہ ان کے سامنے کسی کا بس نہ چل سکا تو ان کی وفات کے بعد ان سب ہی کو

یا کم ازکم ان کی بڑی تعداد کو یزید کی بیعت توڑ دینا چاہئے تھی۔

۲۔ حضرت معاویہؓ کا یزید کو اپنا ولی عہد مقرر کرنا کوئی غیر شرعی یا غیر اخلاقی کام نہ تھا، بلکہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے امت کے مفاد کا یہی بہترین تقاضا تھا، اور اگر یہ تسلیم نہ کیا جائے تو صحابۂ کرامؓ جیسی پاکباز جماعت کی ایک بڑی تعداد کو حق سے منحرف اور مداہنت کار تسلیم کرنا پڑے گا۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

۳۔ یزید بن معاویہؓ اونچے درجہ کا متقی و پرہیزگار شخص نہ سہی لیکن سبائی پروپیگنڈے اور من گھڑت روایتوں کے ذریعہ یزید کے فسق و فجور اور حدود اللہ سے تجاوز کی جو کہانیاں بیان کی جاتی ہیں، اور جس طرح اسلام کی "قانونی خلافت و امارت" کے لئے اسے نااہل گردانا جاتا ہے، یزید کے ہم عصر صحابہؓ اور تابعین کی غالب اکثریت اسے غلط اور بے اصل سمجھتی تھی، ورنہ یہ ماننا ہوگا کہ یہ "اخیارِ امت" حمیت دینی اور شعور ملی سے محروم تھے، اس لئے انھوں نے "ایک فاسق و نااہل" فرد کے ہاتھ پر بیعت قبول کرلی تھی۔

۴۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کو اپنی "خواہشِ نفس" کی تکمیل کے لئے ولی عہد نہیں مقرر کیا تھا، نہ ہی ان کے دل میں اس کا داعیہ پیدا ہوا، اور نہ ہی اس سلسلہ میں انھوں نے کسی زور زبردستی سے کام لیا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایک صحابی رسول حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی تحریک اور بصرہ، مدینہ اور کوفہ وغیرہ کے اکثر اہل الرائے اصحاب کے مشورے اور پرجوش حمایت پر انھوں نے یزید کو ولی عہد مقرر کیا، اور چند اصحابؓ کے سوا باقی تمام لوگوں نے برضا و رغبت پہلے یزید کی ولی عہدی کی اور پھر امارت کی بیعت کی۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کو اپنے بعد امارت کے لئے نامزد کرکے نہ کسی اسلامی قانون کی خلاف ورزی کی نہ ہی خلفائے راشدین کی کسی "متفق علیہ" سنت سے بغاوت کی، اور نہ ہی ان کا یہ فیصلہ "ہوا و ہوس" پر مبنی تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے منتشر افرادِ ملت کو متحد کرنے کا جو عظیم الشان اور بے مثال کارنامہ انجام دیا تھا اور اس کیلئے جیسی جیسی صعوبتیں

برداشت کی تھیں اس کا فطری تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے بعد بھی اس اتحاد کے برقرار رہنے کے خواہشمند تھے، اور جب پوری مملکت اسلامیہ کے اہل الرائے افراد کی غالب اکثریت نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ اس مقصد کے حصول کیلئے آپ کے بعد یزید کا امیر ہونا اور آپ کی طرف سے اس کا ولی عہد مقرر کردینا ہی بہتر اور مناسب طریقہ ہوگا، تو انھوں نے یزید کو ولی عہد مقرر کرکے اس کی بیعت عام لے لی۔

اب رہے وہ حوادث جو یزید کے دورِ امارت میں پیش آئے تو ظاہر ہے کہ نہ حضرت معاویہؓ عالم الغیب تھے جو اپنی وفات کے بعد پیش آنے والے حوادث سے مطلع ہوتے، نہ ہی وہ قضا و قدر کو ٹالنے پر قدرت رکھتے تھے، البتہ انھوں نے اپنی دور اندیشی، تدبیر اور سیاسی بصیرت کے ذریعہ یہ اندازہ ضرور کرلیا تھا کہ یزید کو اپنے دورِ امارت میں کچھ مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑے گا، اور انھوں نے حضرت حسین بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہما کے سلسلہ میں واضح طور پر یزید کو کچھ وصیتیں بھی کی تھیں اور ہم یقین کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اگر یزید نے حضرت معاویہؓ کی ان وصیتوں پر پوری طرح عمل کیا ہوتا تو ہماری تاریخ ان صدموں سے دوچار نہ ہوتی جن کی وجہ سے یزید کا دورِ امارت بدنام ہوا، اور جن کے ذریعہ "سبائیوں" کو اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے کا موقع مل گیا۔

باقی نگاہِ اولیں ص۲۱ کا

اس قیام میں دارالعلوم کے اندر اگر کسی بڑی کمی کا احساس ہوا تو وہ کسی ایسی شخصیت کی کمی تھی جو بھرپور نہ سہی کسی بھی درجے میں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت قاری طیب صاحب علیہ الرحمۃ کی شخصیتوں کے خالی خانے کو پُر کرے۔ اِن بزرگوں کی ذات سے اپنے اپنے انداز پر دارالعلوم کی جو نمائندگی ہوتی تھی، نگاہیں بے اختیار اسی طرح کی کسی نمائندہ شخصیت کو ڈھونڈتی ہیں۔ دیکھئے یہ کمی کب پوری ہوتی ہے اور ہمت عالی کا ہما کس کے سر پر سایہ کرکے اُسے اِن بزرگوں کی "جانشینی" کے قابل بناتا ہے۔

الفرقان کی ڈاک

فاضل مکتوب نگاروں کی ہر بات سے ادارۂ الفرقان کا متفق ہونا ضروری نہیں

(۱)

حضرت مولانا مفتی منظور احمد مظاہری
قاضی شہر، کانپور

محترم و مکرم مولانا خلیل الرحمٰن سجاد صاحب، مدیر الفرقان لکھنؤ
السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

جولائی کا شمارہ نظر سے گذرا۔ ایک ایک لفظ پڑھا، اور آپ حضرات کے لئے دل سے دعا نکلی۔ یہ توقع ہم جیسوں کے لئے نہایت اطمینان اور تقویت کا باعث ہوئی ہے کہ ہر قسم کے فتنوں اور اہلِ باطل کے حملوں سے دین کی حفاظت اور حمایت حق کیلئے ہمہ وقت سینہ سپر رہنے اور اس سلسلہ میں کسی لومۃ لائم کی پرواہ کئے بغیر اس عظیم الشان اور نازک ذمہ داری کی ادائیگی کو ہر دوسری مصلحت پر مقدم رکھنے کی وہ خاص نسبت جو نہ صرف ہم لوگوں کی دانست میں، بلکہ بڑے بڑے اہلِ نظر کے خیال میں بھی گذشتہ طویل زمانہ سے مخدومنا حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب دامت برکاتہم و عمت فیوضہم کو ملی ہوئی تھی، اور جس کی بہترین شہادت الفرقان کے ۶۰ سالہ فائلوں کے صفحات میں موجود ہے، انشاء اللہ آپ برادران کو بھی اس کا حصہ ملے گا، اور انشاء اللہ الفرقان جب تک رہے گا، اپنے اسی مزاج کے ساتھ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو بہت استقامت بصیرت اور اخلاص و للّٰہیت کی نعمتوں سے نوازے، اور آپ کی مساعی کو قبول فرمائے نیز حاسدین کے حسد کے شر سے بھی آپ سب کی حفاظت فرمائے۔

جولائی کے شمارہ کے تمام مشتملات تو احقر کی نظر میں بہت مناسب ہے۔ البتہ آپ کے تحریر کردہ

"گذارش احوال واقعی" کے ایک حصہ پر مجھے بہت حیرت ہوئی، اور اسی حیرت کے اظہار کیلئے اس وقت آپ سے مخاطب ہوں ـــ آپ نے ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی صاحب کے وضاحتی بیان کی اِن آخری سطروں کے بارے میں جن میں انھوں کہا تھا :-

"میں پھر پوری صفائی سے عرض کرتا ہوں کہ میرے قلم سے جو غلط عبارت نکل گئی تھی اس سے میں رجوع کر چکا ہوں ۔ مزید اپنی براءت ظاہر کرتا ہوں ۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ تمام صحابہ عدول ہیں، اللہ تعالیٰ نے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مقام بلند کتاب وسنت میں بیان فرمایا ہے ۔ میں اسی عقیدہ پر جینا اور مرنا چاہتا ہوں"۔

آپ نے لکھا ہے :-

"ہم وضاحتی بیان کی ان آخری سطروں کی اس خبر پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہیں اور بخوشی تسلیم کرتے ہیں کہ مولانا عبداللہ عباس صاحب نے بالآخر اپنی قابلِ اعتراض "عبارت" سے رجوع کر لیا ہے"۔

آپ کا یہی وہ جملہ ہے جس پر مجھے سخت حیرت ہوئی، آپ نے ان آخری سطروں پر اپنی مسرت کا اظہار فرمایا ہے ـــ اور میرا تأثر یہ ہے کہ یہ آخری سطریں بھی کتمان وتقیہ والے اس مخصوص مزاج پر مبنی ہیں، جو اس گروہ منافقین کا شعار ہے جس کے مسلک کی مسلمانوں میں اشاعت وحمایت کا کام نہ جانے کن مقاصد کے تحت عبداللہ عباس صاحب نے سنبھال لیا ہے ۔ عبداللہ عباس صاحب کے بیان کی ان آخری سطروں سے خوشی کے بجائے میری فکر وتشویش تو دو چند ہو گئی ہے ۔ میرے نقطۂ نظر پر غور کرتے وقت آپ اگر عبداللہ عباس صاحب کی یہ عبارت پیش نظر رکھیں تو بہتر ہو گا کہ :-

"غزوۂ بدر میں مسلمان فوج کی کامرانی نے جس طبقے کو سب سے زیادہ برافروختہ کیا اس کے سربراہ ابوسفیان تھے، اسی طرح غزوۂ احد میں ان کا اور ان کی اہلیہ جگر خوار حمزہ ہند کا کردار، یہ سب وہ باتیں ہیں جن میں مورخین کا کوئی اختلاف نہیں ہے فتح مکہ کے بعد یہ گروہ اسلام لایا یا بقول سید قطب شہید "استسلام" کیا، مگر اس

"استسلام" کے بعد اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہوگئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے، اپنی انانیت کو بھول گئے عقلاً محال بات ہے"!.....

میرے نزدیک بالکل بدیہی بات یہ ہے کہ ان جملوں میں جو باتیں کہی گئی ہیں، ان سے رجوع کیلئے شرعی و علمی طور پر صرف یہ کہہ دینا ہرگز کافی نہیں ہوگا کہ "میرے قلم سے جو غلط عبارت نکل گئی تھی، اس سے میں رجوع کرچکا ہوں، مزید اپنی براءت ظاہر کرتا ہوں۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہوگا کہ عبداللہ عباس صاحب ان لوگوں کے خیالات کو پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ دلائل کی روشنی میں غلط قرار دیں جو یہ کہتے ہیں کہ بنو امیہ کے لوگوں نے فتح مکہ کے موقع پر حالات سے مجبور ہوکر ہتھیار ڈال دیئے تھے، مگر وہ دل سے کبھی مسلمان نہیں ہوئے (اور آگے چل کر انھوں نے اور ان کی اولادوں نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کرکے بدر کا حساب چکایا، گویا غزوۂ احد میں ستر بڑے بڑے صحابہ کو شہید کرکے بھی اور اتنے ہی کو زخمی کرکے بھی ان کے دل کو قرار نہیں آیا تھا) میں تو سمجھتا ہوں کہ ان حضرات کے اسلام کو سچا اسلام نہ ماننے والی مجرمانہ ذہنیت کے غلط ہونے کا جب تک صاف صاف اعتراف نہ ہو اور ان حضرات کے سچے مسلمان ہونے کا جب تک صاف صاف اعلان و اقرار نہ ہو، کوئی علمی ذوق رکھنے والا شخص صرف اتنا کہہ دینے کو ہرگز رجوع شرعی نہیں قرار دے سکتا، جتنا انھوں نے کہا ہے، اور جتنے کو آپ نے بھی شاید کافی سمجھ لیا، انھوں نے جو لکھا کم از کم اپنے خیال میں تاریخی و عقلی دلائل کے حوالہ سے لکھا، اور اس انداز سے لکھا جس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ یہ ان کے وہ خیالات ہیں جو ان کے دل و دماغ میں رچے بسے ہیں، پس کیا صرف عبارت اور الفاظ پر معذرت خواہی کی وجہ سے یہ مان لینا ممکن ہے کہ اب ان کے دماغ کے جالے صاف ہوگئے ہیں اور انھوں نے اپنے ان خیالات کا بالکل غلط ہونا صمیم قلب سے تسلیم کرلیا ہے؟

اس سلسلہ میں ایک اور بات جو اور زیادہ کھلی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ عباس ندوی صاحب نے پہلے تو کسی اور کے حوالہ سے کسی قدر ڈرتے ڈرتے یہ بات نقل کی کہ یہ لوگ فتح مکہ کے موقع پر اسلام نہیں لائے تھے، صرف مجبوراً ہتھیار ڈال دیئے تھے، اور پھر ذرا حوصلہ پاکر اس بنائے فاسد

پر اپنا یہ خیال بھی ظاہر کر ڈالا کہ: اس استسلام کے بعد (یعنی مقابلہ سے عاجز ہو کر ہتھیار ڈال دینے کے نتیجہ میں) اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہو گئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے اپنی انانیت کو بھول گئے "عقلاً محال بات ہے"!

ذرا گہرائی سے غور کیجئے کیسی خطرناک بات اس شخص کی زبان سے نکلی ہے ــــ یعنی یہ کہ اس گروہ کے دل سے بدر کا غم نکل جائے، یہ عقلاً محال ہے۔ یاد رکھئے گا کہ جو چیز عقلی طور پر محال ہوتی ہے اس کا وجود ناممکن ہوتا ہے ــــ تو اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اس شخص کے خیال کے مطابق یہ ناممکن ہے کہ بنو امیہ کے جو لوگ فتح مکہ مکرمہ کے موقع پر اسلام لائے تھے، کبھی بھی ان کے دل سے غزوۂ بدر کی شکست کا غم نکل سکے، اور کبھی وہ انانیت کو بھول سکے ہوں ــــ اب آپ خود ہی فیصلہ فرمایئے کہ کیا ایسے گہرے اور فاسد دلائل پر مبنی خیالات کو صرف "عبارت کی لغزش" قرار دیا جا سکتا ہے؟ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ فکر و نظر کا فساد ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک فاسد عقیدہ اور باطل خیالات سے علی الاعلان توبہ نہ کی جائے، صرف عبارت کی غلطی تسلیم کر لینے یا عبارت کو تھوڑا سا بدل دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس موقع پر اگر آپ عبداللہ عباس ندوی صاحب کے اس معصومانہ جملہ کو بھی پیش نظر رکھیں کہ یزید کے خلاف شدت جذبات میں میرے قلم سے ایک ایسی عبارت نکل گئی جس سے حضرت ابوسفیان، حضرت ہندہ اور بنی امیہ کے بعض دیگر صحابیوں کی تنقیص کا مطلب بھی نکالا جا سکتا ہے ــــ تو آپ کو موصوف کا تقیہ اور ڈھٹائی صاف نظر آ جائے گی کہ پورے ایک کالم میں مزعومہ دلائل کی بنیاد پر اور غیر مبہم الفاظ میں ان صحابہ کو اسلام سے خارج کرنے کے بعد جب کسی ٹوکنے والے نے انھیں ٹوکا تو ان حضرت نے اپنے ان خیالات سے توبہ کرنے کے بجائے صرف اتنے اعتراف سے کام چلانے کی کوشش کی کہ ہاں! میری عبارت سے ان صحابہ کی تنقیص کا مطلب بھی نکالا جا سکتا ہے۔

بہرحال میرا مدعا یہی ہے کہ اپنے وضاحتی بیان میں بھی عباس ندوی صاحب نے ہرگز ہرگز اپنے فاسد خیالات سے رجوع نہیں کیا ہے بلکہ عام لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی

کوشش کی ہے۔ کم از کم آپ حضرات کو اس سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے۔[1] یہ ایک علمی مسئلہ ہے، عوام اس کی نزاکت اور اس کے دوررس اثرات کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرا یہ عریضہ بھی الفرقان میں شائع کر دیں۔

دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو حق کی نصرت پر ثابت قدم رکھے، حضرت مولانا نعمانی دامت برکاتہم اور مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب کی خدمت میں احقر کا سلام اور درخواستِ دعا پیش فرما دیں۔

والسلام

منظور احمد مظاہری
قاضی شہر کانپور
۸ رجولائی ۱۹۹۲ء

(۲)

مولانا امام علی دانش
ادارہ محمودیہ، محمدی (کھیری)

مکرمی مدیر "الفرقان" عافاکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

محترمی مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی کتاب اور اس پر "تعبیرات" کا تبصرہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ کتاب تحقیقی ہے انداز بیان بھی سنجیدہ اور علمی ہے مصنف نے امکانی حد تک اظہار رائے میں غیر جانب داری کو برقرار رکھا ہے، البتہ زبان بوجھل ہے سلیس ہونی چاہئے تھی مضامین میں کہیں کہیں جگہ

---

[1] مولانا عبداللہ عباس صاحب کے اعلان رجوع کے بارے میں اسی قسم کے احساسات ہم لوگوں کے بھی تھے، اور اسی وجہ سے ہم نے "عبارت" سے رجوع پر اظہار مسرت کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ:۔

"مگر اس خوشی کے ساتھ ہم اس تمنا کا اظہار بھی مناسب سمجھتے ہیں کہ کاش وہ اپنے اس اعلان رجوع کے حق کو بے بنیاد الزامات سے داغدار نہ کرتے اور امید کرتے ہیں کہ زیادہ صاف لفظوں میں اور کسی داؤ کے بغیر صرف عبارت نہیں بلکہ اپنے ان خیالات اور تاریخی تجزیے سے بھی اعلان رجوع فرمائیں گے جو اس سارے ہنگامہ کا باعث بنے ہیں۔۔۔"

مگر افسوس کہ ہماری یہ امید پوری نہ ہوئی، اور اسی بنا پر حضرت مولانا مفتی منظور احمد صاحب کا یہ مکتوب شائع کرنے کا فیصلہ

تکرار محسوس ہوئی بعض ایسے سوالات بھی اٹھائے گئے ہیں جن کے جوابات تلاش کرنے کی ذمہ داری قارئین پر ڈالی گئی ہے ہونا یہ چاہیئے تھا کہ مصنف خود کسی نتیجہ تک پہونچنے کی سعی کرکے اپنا فیصلہ سامنے رکھدیتے۔ وہ فتنہ پرور گروہ جس کی سازشوں کے نتیجہ میں امام مظلوم سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا دلگداز واقعہ پیش آیا اور پھر اسی سبائی طائفہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مقدس جماعت میں اختلاف وجدال پیدا کرا دیا، اسی گروہ کی ریشہ دوانیاں حادثہ کربلا کا بنیادی سبب ہیں۔ جو لوگ قاتلانِ حسینؓ تھے وہی اس جدید مذہب کے بانی ہیں جو اسلام کے متوازی ایک مستقل دین ہے، مصنف کو اس سازشی گروہ کو جس درجہ بے نقاب کرنا چاہیئے تھا نہیں کرسکے ہیں۔ اور اس حادثہ کے بعد مسلمانوں میں جن بدعات وخرافات کو شہدائے کربلا کی یاد میں رائج کر دیا گیا ہے ان کی تردید بھرپور طور سے خاتمہ کتاب میں ہونی چاہیئے تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتاب لکھتے لکھتے اکدم قلم روک دیا گیا اور قارئین کی تشنگی کو نہیں بجھایا گیا ہے۔ سیدھی سادھی سچی تاریخی حقیقت یہ ہے کہ شہادت عثمانؓ اور کربلا میں ہونے والے ظلم وستم کے ذمہ دار دشمنان صحابہؓ ہیں ابن زیاد ان کا آلۂ کار بن گیا اسے بادشاہ گر بننے کا جذبہ لے ڈوبا اور یزید کی ناتجربہ کاری اور نااہلی نے اس کو تاریخ اسلام کا بدترین مجرم بنا دیا سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے ابتدا سے انتہا تک جتنے اقدامات کئے ان میں سے کوئی بھی غیر اسلامی اقدام نہیں تھا ان کا کردار ہمیشہ بے داغ رہا انکو خروج سے روکنے والے حضرات کی مصالح پر نظر تھی وہ ان کے اقدام کو غیر شرعی سمجھ کر نہیں روک رہے تھے، کتاب کے مصنف کو اس نازک موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے امت مسلمہ کے عام جذبات پر بھی گہری نظر ڈالنی مناسب تھی۔ احداث فی الدین کی تردید ضروری ہوتی ہے اس میں کسی لایعنی مصلحت کو یا کسی کی رعایت کو ملحوظ نہ رکھنا ہی حمیت اسلامی کا تقاضہ ہے لیکن احداث فی التاریخ کی اصلاح کوئی شرعی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ بحث طویل ہے مختصر یہ کہ کتاب عمومی حیثیت سے مفید ہے کاش کہ اردو محاورہ کی رعایت کرتے ہوئے اکابر کے اسمائے گرامی سے پہلے حضرت کا لفظ بھی لکھا جاتا۔ آئندہ ایڈیشن میں موقع ہو تو جو تشنگی رہ گئی ہے اسے بھی مٹانے کی سعی کرلی جائے تو بہتر ہے۔

"تعمیر حیات" کا تبصرہ بہت ہی دل آزار گمراہ کن اور رفض پرور ہے۔ ندوی تبصرہ نگار نے اسلامی عقائد سے انحراف کیا ہے صحابہ کرامؓ کے ایک پورے گروہ کو (معاذ اللہ) مسلم نہ تسلیم کرنا اور ان کے دلوں کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صاف نہ کہنا قرآن و حدیث کے خلاف ہے، صحبت نبوی کی اعجازی تاثیر کا انکار ہے واقعۂ کربلا کا غزوہ بدر سے کوئی ربط و تعلق نہیں ہے اس قسم کی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جنکو قاتلین عثمانؓ اور دشمنان حسینؓ سے ہمدردی ہے وہ منافقین اسلام کی بدکرداریوں سے توجہ ہٹانے کے لئے ہر واقعہ کو بنوامیہ اور بنوہاشم کی عداوت پر محمول کرتے رہتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے دیرینہ عداوتوں کو مٹا کر صحابہ کرام کے قلوب کو آپس میں ملا دیا اور ان میں الفت ڈالدی (جس پر قرآن شاہد ہے) پھر بیان قرآنی کے خلاف ان میں عداوت و بغض ثابت کرنا کہاں کا اسلام و ایمان ہے۔ ندوہ کے منتظمین کو اپنے آدمی کی حمایت میں عقائد اسلامی کے معاملہ میں تہاون سے اور مداہنت سے کام نہیں لینا چاہئے ایسے شخص کو جو صحابہ کرامؓ سے بغض کا مظاہرہ کرے اور توجہ دلانے پر بھی مسلمانوں کی دل آزاری سے باز نہ آئے اور بر سر عام معافی نہ مانگے جہاں تک ممکن ہو اپنے سے الگ رکھنا ضروری ہے احقر بہت علیل تھا اب کچھ حالت سنبھلی ہے۔ یہ خط دل کے بوجھ کو ہلکا کرنے کیلئے ضروری سمجھ کر تحریر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ غلطیوں کو معاف فرمائے۔ آمین

ادارہ کے دیگر اساتذہ کرام بھی "تعمیر حیات" کے تبصرہ کے اس حصہ کو جس میں صحابہ کرامؓ کے ایک طبقہ کی مذمت لکھی گئی ہے گمراہ کن قرار دیتے ہیں اور نفس کتاب پر جس انداز سے اظہار رائے ہوا ہے اسے بھی ناپسند کرتے ہیں البتہ اقدام حسینؓ کو برحق سمجھتے ہیں۔

دعاؤں کا بہت حاجت مند ہوں۔ اگر موقع ہو تو حضرت مولانا منظور نعمانی دامت برکاتہم سے سلام و درخواست دعا عرض کردیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو عافیت دارین سے نوازے۔ آمین

فقط والسلام

احقر امام علی دانش عفی عنہ صدر المدرسین ادارہ محمودیہ

کھری ضلع لکھیم پور کھیری

۳

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری
مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

محترم و مکرم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ڈاکٹر خالد صدیقی صاحب کی معرفت آپ کا انتہائی حسین، وقیع علمی تحفہ "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" ملا۔ اس خصوصی عنایت کے لئے میں آپ کا بے حد ممنون و متشکر ہوں حقیقت تو یہ ہے کہ اس جذبۂ امتنان کے اظہار کے لئے نہ میرے پاس مناسب الفاظ ہیں اور نہ ان کو ادا کرنے کی مجھ میں صلاحیت ہے۔

آپ نے ایک بہت ہی نازک اور جذباتی مسئلہ کو چھیڑا ہے۔ میں نے پوری کتاب کو شروع سے آخر تک مسلسل پڑھا کئی حصے مکرر اور سہ کرر پڑھے بلکہ کچھ تو اس سے بھی زیادہ اور متعدد بار پڑھے کبھی واقعات کا سلسلہ ملانے کے لئے اور کبھی محض آپ کے اندازِ بیان اور طرزِ استدلال سے لطف اندوز ہونے کے لئے یقین فرمائیے ہر بار نیا لطف آیا اور نئی باتیں منکشف ہوئیں۔ آپ نے تمام حقائق اتنے واضح انداز اور صحیح پس منظر میں پیش کر دیئے ہیں۔ اور اتنے مدلل انداز میں ان سے نتائج مستنبط کئے ہیں کہ کوئی بھی صاحبِ بصیرت اور انصاف پسند شخص ان سے انکار کی جسارت نہیں کر سکتا۔ مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہماری قوم انتہائی جذباتی ہے۔ عوام و خواص بھی اس مہلک مرض میں مبتلا ہیں۔ واقعۂ کربلا پر تو مذہب کی ایسی ملمع کاری کی ہے کہ اصلیت یکسر چھپ کر رہ گئی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑی نفسیاتی بات حضرت حسین کے "سبطِ رسول" ہونے کی کہی جاتی ہے۔ اور اس لئے حضرت حسین کے کسی بھی فیصلہ پر گفتگو کرنا گویا اسلام میں رخنہ ڈالنا ہے۔ آپ نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت بے شک قابلِ لحاظ اور واجب الاحترام شیئ ہے۔ وہ آدمی بدنصیب ہے جو آپ کے قرابت داروں کا لحاظ اور احترام نہ کر سکے لیکن لحاظ و احترام الگ چیز ہے اور معصومین محض کا درجہ کسی کو دینا الگ چیز ہے شیعیت آنحضرتؐ کے ساتھ حضرت فاطمہ،

حضرت علی اور حضرات حسن و حسین (رضی اللہ عنہم) کو بھی عصمت کے درجے پر فائز کرتی ہے۔ نتیجے میں ان محترم حضرات سے کسی خطا اور بھول چوک کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جب کہ ان سے اختلاف کی صورت میں اختلاف کرنے والا لازماً ہی خطا کار و گنہگار قرار پائے گا۔ "دراصل اہلِ تشیع کے مسلک کی بنیاد یہی ہے۔ اور افسوس ہوتا ہے اس بات پر کہ سنیوں کا بھی بہت بڑا طبقہ ان ہی خیالات کا حامل ہے۔

آپ قابلِ مبارکباد ہیں کہ آپ نے پورے واقعات کی تفصیلات بڑی تحقیق و جستجو سے جمع کیں اور ان پر غیر جانبدارانہ محاکمہ فرمایا، ان کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا اور کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا، یہ بات یقیناً باعثِ اجرِ عظیم ہے۔ اللہ نے آپ کو بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے۔ ان میں سے ایک بہت بڑی نعمت اپنی بات کو واضح اور مدلل انداز میں پیش کرنے کا ملکہ بھی ہے۔ اس کے ساتھ اندازِ بیان بھی سلیس اور شگفتہ ہے۔ اس سے عام قاری متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ نے جس انداز سے جناب یزید کی کردار کشی کا پردہ فاش کیا ہے، وہ صرف آپ ہی کا حصہ ہے۔ انشاء اللہ آپ کی سعی مشکور ہوگی اور جلد یا بہ دیر آپ کی حقیقت پسندی اور غیر جانبدارانہ رویہ سے متأثر ہو کر لوگ راہ راست پر آئیں گے۔

جناب یزید کی زندگی میں فتح قسطنطنیہ (۴۸ھ - ۶۶۹ء) کا واقعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس زمانہ میں عام طور پر یہ بات مشہور تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ "پہلا لشکر میری امت کا جو قیصر کے شہر پر حملہ آور ہوگا وہ مغفرت یافتہ ہے۔" چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت عبد اللہ بن زبیر، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت حسین ابن علی اور حضرت ابو ایوب انصاری (رضی اللہ عنہم) وغیرہ جیسے جلیل القدر صحابہ نے اس وعدۂ مغفرت کے شوق میں بڑے جوش و خروش سے حضرت امیر معاویہؓ کے تشکیل دیئے ہوئے لشکر میں شرکت فرمائی اور میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دی۔ اس لشکر کے سپہ سالار حضرت سفیان بن عوف تھے۔ اور آپ کے ماتحت لشکر کے ایک حصہ کے سوار جناب یزید تھے۔ آپ نے اس جہاد میں جس بہادری، دلیری اور عسکری صلاحیت کا ثبوت دیا، اس پر

ہمارے مورخین رطب اللسان ہیں۔ اس جنگ میں آپ نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اس لشکر میں آپ کو جو امتیازی حیثیت دی گئی تھی، وہ محض ولی عہدی کے طفیل نہیں ملی تھی، بلکہ غیر معمولی عسکری صلاحیت اور فقید المثال شجاعت کے سبب حاصل ہوئی تھی۔ کیا انکی براءت کے لئے یہی ایک واقعہ کافی نہیں ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ حضورؐ کا ارشاد گرامی غیر مشروط ہے۔ کیا یہ بشارت کسی ایسے شخص کیلئے ہو سکتی تھی جو بعد میں فاسق و فاجر ہو جائے، تارک صلوٰۃ ہو جائے، لہو و لعب میں پڑ جائے، تمام اخلاقی حدود کو پار کر جائے، انسانیت کو بالائے طاق رکھ دے، سبطِ رسول کی نعش کی بے حرمتی کرے یا کسی بھی درجے میں تقویٰ کی راہ سے ہٹ جائے۔ جو لوگ ایسا کہتے ہیں اور جناب یزید میں اس قسم کے نقائص تلاش کرتے ہیں، وہ اس بشارت کی توہین کرتے ہیں۔ آپ نے درست لکھا ہے: علاوہ ازیں یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اگر واقعتہً سنگین عیب یزید میں پائے جاتے اور اسکی ولی عہدی سے شدید اختلاف کرنیوالے حضرات انکی طرف اشارہ نہ کرتے جبکہ یہ کوئی چھپے رہنے والے عیب نہیں تھے۔ اور نہ ہی حقیقت میں یہ ہو سکتا تھا کہ حضرت امیر معاویہؓ ایسے فرزند کو جو ترکِ نماز اور اماتتِ صلوٰۃ کا عادی ہو اس اُمت پر خلیفہ بنا کر مسلط کر دیں جسکی سب سے بڑی پہچان اقامت صلوٰۃ ہے" اس سے حضرت امیر معاویہؓ اور جناب یزید دونوں کی پوزیشن بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

آخر میں آپ اگر اجازت دیں تو چند باتیں بطور شکایت عرض کر دوں۔ خو گر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لیجئے۔ جیسا کہ آپنے بھی واضح کیا ہے۔ اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا کہ جناب یزید خلافت کے نشہ میں اتنے سرشار ہو گئے کہ تمام اخلاقیات کو نقش و نگار طاق نسیاں بنا دیا اور صلوٰۃ جیسے اسلام کے بنیادی رکن سے بھی بے نیاز ہو گئے۔ اس سلسلہ میں ہمیں مستند عصری شہادت بھی نہیں ملتی بلکہ نہایت مؤقر معاصر شہادتیں تردید میں پائی جاتی ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود آپ نے ان کا تذکرہ ہر جگہ بے تکریمی اور بے تحریمی سے کیا ہے۔ اسکا سبب سمجھ میں نہیں آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جناب یزید کے سلسلہ میں آپکے ذہن میں اب بھی کچھ تحفظات ہیں یا اس قوم اور اس گروہ کا خوف غالب ہے جو پوری طرح سے شیعیت کے زیر اثر ہے۔ اسکے برخلاف آپنے اُن حضرات کیلئے تکریمی الفاظ کا استعمال مسلسل کیا ہے جو واضح طور پر حضرت حسینؓ کی شہادت کے ذمہ دار ہیں۔ طبری نے ایک روایت حضرت محمد الباقر کے حوالے سے درج کی ہے۔ اسے آپنے صفحہ ۸۰ اسے

۹، تک نقل کیا ہے۔ اسکی رو سے سانحۂ کربلا کی تمام تر ذمہ داری مسلم بن عقیلؓ کے بھائیوں کے سر جاتی ہے۔ اسکے باوجود آپنے اِن برادران مسلم تک کا تذکرہ ادب و احترام سے کیا ہے (جناب یزید ان لوگوں سے یقیناً بدرجہا بہتر تھے۔

اِن حضرات کے علاوہ آپنے جن لوگوں کا بھی تذکرہ کیا ہے یا حوالہ دیا ہے ان سب کے ساتھ آپ نے ادب و احترام کو ملحوظ رکھا ہے حتیٰ کہ مولانا علی نقی جن پر آپنے اخفائے حقیقت اور کذب و افترا کا الزام لگایا ہے (اور اس میں آپ صدفی صد حق بجانب ہیں) ان کا تذکرہ بھی آپنے شیعہ عالم جناب سید علی نقی صاحب اور مولانا نقن صاحب جیسے القاب و آداب کے ساتھ کیا ہے۔ ہمارے مولانا مودودی بھی واقعۂ کربلا کے سلسلہ میں شیعہ حضرات سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں ہیں جناب یزید کی خلافت کے سلسلہ میں آپنے انکی جو عبارت نقل کی ہے۔ اس میں انھوں نے حضرت امیر معاویہؓ اور جناب یزید دونوں کو لپیٹ دیا ہے۔ حضرت امیر معاویہؓ صرف جناب یزید کے والد ہی نہیں ہیں، وہ تو تاریخ اسلام کا ایک عظیم الشان باب ہیں۔ اور کچھ نہیں تو کاتب وحی کی حیثیت سے وہ جس پر عظمت اور بلند مرتبہ پر فائز ہیں۔ اسکا صحیح اندازہ کرنا بھی ہم لوگوں کیلئے مشکل ہے۔ چہ جائیکہ انکے کسی عمل پر ہم غیر ضروری حرف گیری کریں۔ اسکے علاوہ بھی خلفائے راشدین کو ہدف تنقید بنانا مودودی صاحب کا عام وطیرہ رہا ہے جناب یزید سے تو کوئی ایسی بات منسوب نہیں کی جاتی۔ مودودی صاحب کا تذکرہ بھی آپنے ادب واحترام سے کیا ہے۔ کیا جناب یزید نقن صاحب اور مودودی صاحب سے بھی گئے گزرے ہو گئے۔

والسلام محمد ضیاء الدین انصاری
۲۲ رجون ۱۹۹۲ء علی گڑھ

(۴)

محمد سعید
حیدرآباد (اے پی)

مکرمی جناب سجاد ندوی صاحب

السلام علیکم۔ امید کہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی دامت برکاتہم خیریت سے ہونگے۔ اللہ تعالیٰ انکو تا دیر سلامت رکھے۔ آمین

ماہنامہ الفرقان بابتہ ماہ مئی وجون ۱۹۹۲ء پیش نظر ہے تفصیلات معلوم ہوئیں۔ سخت صدمہ ہوا کہ جلیل القدر صحابہ کی شان میں قلم بڑی بے باکی سے چلا ہے۔ فطری طور پر

حضرت مولانا علی میاں صاحب دامت برکاتہم کی خاموشی پر حیرت ہوئی۔

جس وقت حضرت مولانا منظور نعمانی کی معرکۃ الآرا تالیف امام خمینی اور شیعیت شائع ہوئی تو ایک عریضہ حضرت کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔ مدعا یہ تھا کہ جو مواد اس کتاب کی تیاری میں کھنگالا گیا اس کی مدد سے تاریخ اسلام کے بعض نازک واقعات کے بارے میں کوئی کتاب یا مضمون مرتب کئے جائیں میری ناچیز رائے میں تاریخ کے بیحد نازک ابواب ہیں۔ (۱) شہادت عثمانؓ (۲) جنگ جمل (۳) جنگ صفین (۴) جنگ نہروان (۵) واقعہ تحکیم (۶) شہادت علیؓ (۷) بیعت خلافت حضرت علیؓ (۸) بیعت خلافت حضرت حسنؓ (۹) حضرت حسنؓ و حضرت معاویہؓ کی صلح اور حضرت حسنؓ کی دستبرداری خلافت۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اگرچہ یہ واقعات مختلف تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں لیکن مرتب طور پر کوئی کتاب غالباً موجود نہیں۔ اس عریضہ کے جواب میں حضرت مولانا نے (راقم کے نام اپنے گرامی نامہ مورخہ ۳ / اکتوبر ۸۵ء میں) مجھ سے اتفاق کیا کہ یہ بہت ضروری ہے مگر اپنی صحت کے پیش نظر یہ کام ان سے نہ ہو سکے گا، اللہ چاہے تو یہ کام اپنے کسی بندہ سے لے گا۔[1] اس خط کو میں نے محفوظ کر لیا تھا۔ اس کی ایک فوٹو کاپی منسلک ہے۔ اب ماہنامہ الفرقان دیکھنے سے پتہ چلا کہ یہ کام امت کے ذمہ ایک قرض ہے جس کو ادا کرنا بے حد ضروری ہے" واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" کی تیاری کے سلسلے میں حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے کتنی دفتر کو کھنگالا ہوگا، سارا مواد اُن کے سامنے ہے اُسکی مدد سے اگر حضرت مولانا ہی ان ابواب کے بارے میں کوئی کتاب مرتب کریں تو اس کام کی تکمیل بھی حضرت مولانا منظور نعمانی کی خواہش کی تکمیل ہوگی۔ موجودہ صورتحال کو دیکھ کر اسکی ضرورت کا ہر ایک کو اندازہ ہو جائے گا۔

بہرحال اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ابواب متذکرہ صدر کے بارے میں کوئی رجل رشید آگے آئے۔ راقم محمد سعید

---

[1] حضرت مولانا نعمانی کے الفاظ یہ تھے:۔ "جس کام کے بارے میں آپ نے لکھا ہے وہ یقیناً بہت ضروری ہے لیکن جیسا کہ عرض کیا یہ عاجز اب اس حال میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر چاہے گا، اپنے کسی بندے سے لے لے گا۔"

جلد ٦٠ | ستمبر و اکتوبر ۱۹۹۲ء مطابق ربیعین ۱۴۱۳ھ | شمارہ ۹-۱۰

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سرپرست
حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

مدیر
خلیل الرحمن سجاد ندوی

سالانہ چندہ برائے ہندوستان
عام ۶۰/-
اعزازی ۱۲۰/-
لائف ممبری ۲۰۰۰/-

پاکستانی خریدار صفحہ ۲ ملاحظہ فرمائیں

ہر شمارے کی قیمت
۱۰/- روپے

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے آپ کی خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی روانہ کیا جائے گا۔ منیجر

دفتر ماہنامہ الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی نظیر آباد لکھنؤ

فہرست مضامین

صفحہ نمبر	مضامین نگار	مضامین	نمبر شمار
۳	مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی	نگاہ اولیں	۱
۵	مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی	بات پہنچی ہے کہاں تک یہ تجھے کیا معلوم؟	۲
۳۱	مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی	یہ ملامت۔ زہے نصیب!	۳
۴۲	مرحوم مولانا مطلوب الرحمٰن ندوی نگرامی	تصویر کا دوسرا رُخ	۴
۵۸	جناب خالد مسعود (مدیر تدبر لاہور)	صدر اول کی تاریخ کیلئے چند رہنما نکات	۵
۶۱	مولانا انیس الرحمٰن قاسمی	تلک اور جہیز کی رسمیں	۶
۷۰		حضرت مولانا محمد مسعود شمیم صاحبؒ	۷
۷۵	یونیورسل میسیج کراچی	بے خبری میں بڑی راحت ہے	۸
۷۸		الفرقان کی ڈاک	۹

سالانہ چندہ ماہنامہ الفرقان

لائف ممبری	اعزازی	عام خریداری	برائے
۳۰۰/- روپے	۲۴۰/- روپے	۱۲۰/- روپے	پاکستان
۵۰۰/- ڈالر	۴۰/- ڈالر	۲۰/- ڈالر	دیگر ممالک بذریعہ ہوائی ڈاک
۳۰۰/- ڈالر	۲۴/- ڈالر	۱۲/- ڈالر	〃 〃 بحری ڈاک

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:۔ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور

برطانیہ میں ترسیل زر کا پتہ:۔ Mr. R. RAHMAN

90-B. HANLEY ROAD LONDON N4 3DW

محمد حسان نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی نظیر آباد لکھنؤ سے شائع کیا۔

عتیق الرحمن سنبھلی

نگاہِ اوّلیں

دعائے خیر کی درخواست

والد ماجد مدظلہ کو بڑھتی ہوئی معذوری کے ساتھ یہ تقاضہ بڑھتا جا رہا تھا کہ ایک دفعہ دارالعلوم دیوبند اور ہو آئیں۔ اپنی ذمہ داری کے ماتحت کچھ الوداعی باتیں دارالعلوم کے ذمہ داروں، اساتذۂ کرام اور عزیز طلبہ سے رُو در رُو کہنے کا موقع پالیں۔ گزشتہ سال بھی ایک شوریٰ کے موقع پہ سفر کا ارادہ فرمایا تھا۔ مگر ایک عارضہ سفر سے مانع ہو گیا۔ اسکے بعد اس سال صفر ۱۴۱۳ھ میں ۱۶، ۱۷، ۱۸ کو ہونے والی شوریٰ کیلئے عزم صمیم کر لیا۔ ریزرویشن وغیرہ تک کے سارے انتظامات ہو گئے لیکن دو دن پہلے بخار شروع ہوا۔ اور ۱۰۲ ڈگری تک جا پہنچا۔ پھر بھی ریزرویشن کو آخر وقت تک کینسل کرانے سے روکے رکھا مجبوراً عین وقت پر ہی کینسل کرایا۔ یہ بخار آج ۱۹ ربیع الاول تک اُترا نہیں ہے۔ کمزوری پہلے ہی بہت طاری تھی۔ دو ہفتے کے سلسلۂ بخار کے بعد غشی کی کیفیت ہونے لگی۔ علاج معالجے سے بالکل وقتی فائدہ ہوتا۔ سلسلہ ٹوٹنے میں نہ آتا تھا۔ ربیع الاول کا پہلا ہفتہ گزرتے گزرتے کیفیت ایسی ہو گئی کہ گھر میں رکھنے کے بجائے اب کسی اچھے نرسنگ ہوم میں لیجانا مناسب معلوم ہوا جس کے لئے سحر نرسنگ ہوم لکھنؤ کے مالک (قریشی برادران) پہلے ہی سے ازراہ تعلق و محبت باصرار مشورہ دے رہے تھے۔ ان کو جب ہم لوگوں کی آمادگی کا علم ہوا تو وہ ازراہ محبت و کرم خود ہی آکر اپنے یہاں لے گئے۔ یہ ۱۰ ربیع الاول کی بات ہے یعنی آج اسکو دس دن ہو جائیں گے۔ اور یہ دسوں دن بھی ہم لوگوں کیلئے برابر پریشانی ہی کے رہے ہیں۔ بلکہ کچھ اضافہ ہی رہا۔ بخار کے سبب کی اب تک تشخیص نہیں ہو سکی، جو چڑھتا اترتا اور گھٹتا بڑھتا

رہتا ہے۔ نرسنگ ہوم آنے سے پہلے ہی کچھ وقت پیشاب میں بھی شروع ہو گئی تھی جسے رفع کرنے کیلئے ٹیوب کا استعمال کیا گیا ہے۔ کوئی بھی معالج "ایلوپیتھ" "ہومیوپیتھ" یا طبیب کوئی خطرے کی بات' ساری کمزوری اور تکلیفوں کے باوجود نہیں محسوس کرتا تھا، لیکن حالت گرتی چلی جاتی تھی۔ کل صبح بالکل مایوس کن کیفیت تھی۔ خود نرسنگ ہوم کے ذمہ داروں نے آکسیجن کے انتظامات شروع کر دیئے تھے۔ مگر کل دوپہر ہی سے ایسی شکل رونما ہوئی ہے جیسے اب اللہ رب العزت کی طرف سے صحت دیئے جانے کا فیصلہ ہو گیا ہو۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی بندۂ مخلص کی دعا کا تیر نشانہ پہ جا لگا ہو، لیکن یہ محض ایک خیال ہے۔ حقیقت اللہ ہی کو معلوم ہے۔

اپنے قارئین سے جن میں زیادہ تر حضرت والد ماجد سے للہ محبت واخلاص ہی کا تعلق رکھنے والے ہیں، اپنی طرف سے اور اپنے سارے گھرانے بالخصوص مدیر الفرقان میاں خلیل الرحمن سجاد کی طرف سے درخواست ہے کہ والد محترم کی تکالیف دور ہونے اور صحت عاجلہ کاملہ میسر آنے کی دعاؤں سے ممنون فرمائیں۔ خاص کر یہ دعا کہ اللہ تعالیٰ ان کا سلسلۂ معارف الحدیث مکمل کرا دے جس کی آخری جلد میں اب تھوڑی سی کسر ہے۔

اوپر کی بیان کردہ صورت حال کی وجہ جس نے ہم سب کو مصروف کر دیا ستمبر کا الفرقان وقت پر نہ نکل سکا۔ اور اب ستمبر اکتوبر دونوں ماہ کا مشترک پرچہ کسی طرح تیار کر کے دفتر کو دیا جا رہا ہے۔

والسلام

عتیق الرحمن سنبھلی

۱۹ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ

۱۸ ستمبر ۱۹۹۲ء

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

بات پہنچی ہے کہاں تک یہ تجھے کیا معلوم؟

ترجمان دارالعلوم دیوبند "ماہنامہ دارالعلوم" کا ایک اہم اداریہ

["ملک میں پھیلے ہوئے مدارس، علماء اور حساس مسلمانوں کے پیہم اصرار کے باوجود ہم اس انتظار میں تاخیر پر تاخیر کرتے رہے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ یا تعمیرِ حیات کی جانب سے ڈاکٹر صاحب کی اس تحریر کی تردید و براءت پر کوئی بیان آجائے۔ لیکن ادھر سے جب بالکل مایوسی ہوگئی تو محض اظہارِ حق اور تردید باطل کی نیت سے یہ مضمون لکھنا پڑا۔"

اِن الفاظ پر ختم کئے جانے والے ۲۵ صفحے کے اس فاضلانہ اداریے میں مدیر "دارالعلوم" نے ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی صاحب کے اس تبصرے پر دینی اور علمی نقطۂ نظر سے اظہارِ خیال کیا ہے جس سے قارئین الفرقان بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔ الفرقان میں اس تبصرہ کی جانب جو کچھ لکھا گیا۔ افسوس اور انتہائی افسوس ہے کہ ندوے کے اربابِ حل و عقد نے اُسے ناقابلِ تصور شکوک وشبہات کے ماتحت ندوہ اور مولانا علی میاںؒ کے خلاف ایک رقیبانہ مہم کی نظر سے دیکھا۔ اور اُسکے کسی ایک بھی جزو کو اسکی

واقعی اسپرٹ میں دیکھنے سے انکار کر دیا۔ دعا ہے کہ "دارالعلوم" کے اس ادارے کے ساتھ اس طرح کی بدگمانی کا معاملہ نہ ہو اور دارالعلوم دیوبند کی طرف سے "اظہار حق اور تردید باطل" کی یہ کوشش بدگمانیوں میں کھوئے ہمارے بھائیوں کیلئے حق کو حق اور باطل کو باطل مان لینے کا ذریعہ بن جائے۔ اللّٰھم ارنا الحق حقًا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلًا وارزقنا اجتنابہ

[ـــــــــــ الفرقان]

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی معصوم نہیں ہے اگر کوئی فرد یا جماعت کسی غیر رسول کی عصمت کا مدعی ہے تو وہ اپنے دعویٰ میں کاذب اور جھوٹا ہے۔ اس لئے جماعتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ ہر انسان سے صواب وخطا اور خیر وشر کا صدور ہو سکتا ہے، البتہ بعض خدا کے ایسے سعید بندے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی پر خیر وصلاح کا غلبہ ہوتا ہے، اسی غلبۂ خیر کی بنا پر انھیں نیک صالح، ولی وغیرہ محترم ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، جس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ یہ زلّات وسیئات سے بالکلیہ پاک ہیں۔

اس کے بالمقابل کچھ نابکار ایسے بھی ہیں جو مجموعۂ شرور ومعاصی اور خزینۂ فسق وفساد ہوتے ہیں، ان کے فسق وفساد کی یہ کثرت انھیں ظالمین ومفسدین کے زمرے میں پہنچا دیتی ہے، بایں ہمہ ان کا بھی دامنِ حیات خیر وصلاح سے یکسر خالی نہیں ہوتا۔

صلحائے امت کی حیات وسوانح پر بحث وتحقیق کے وقت ان کی بعض لغزشوں اور بشری کمزوریوں کے پیش نظر ان کے جملہ محاسن ومزایا پر خط نسخ کھینچ دینا، اور ان کے سارے حسنات وخیرات کا انکار کر کے انھیں ظالمین ومفسدین کی صف میں کھڑا کر دینا علم ودیانت کے سراسر منافی ہے۔ ٹھیک اسی طرح ظالمین ومفسدین کے چند گنے چنے اچھے

کاموں کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی کے سارے سیاہ کارناموں سے آنکھیں بند کر کے انھیں صلحاء و اولیاء کی جماعت میں شامل کر دینا کسی طرح بھی درست نہیں ہوگا، بلکہ ہر ایک کے ساتھ اسکے اعمال خیر و شر کی قلت و کثرت کے اعتبار سے معاملہ کیا جائے گا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ننزل الناس منازلھم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیں حکم تھا کہ ہم لوگوں کو ان کے درجات و مراتب میں رکھیں۔

گر فرق مراتب نہ کنی . . . .

بحث و نظر اور تحقیق و تبصرہ کا یہ ایسا لازمی اصول ہے جس سے غفلت اور بے اعتنائی ایک محقق و مبصر کو دائرہ بحث و تحقیق سے نکال کر افراط و تفریط اور تنقیص و تفضیل کی سرحد میں پہنچا دیتی ہے، جس سے خود اسکی ذات مجروح اور علمی کاوشیں بے سود ہو کر رہ جاتی ہیں،

پھر ایک محقق کی علمی دیانت کا بھی یہ تقاضا ہے کہ کسی شخصیت پر بحث کرنے کے لئے اس سے متعلق جو درست، صالح، معتبر اور مستند مواد ہیں انھی کو کام میں لائے، خود تراشیدہ، بے سند غیر مقبول، اور گری پڑی باتوں کو بنیاد بنا کر اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا نہ صرف اس شخصیت پر ظلم ہے بلکہ خود علم و تحقیق کے ساتھ مذاق کرنا ہے، محقق کا یہ رویہ بھی اسے پایۂ اعتبار سے ساقط اور علمی خیانت سے متہم کر دیتا ہے، باری تعالیٰ عز اسمہ کا ارشاد ہے یاایھا الذین امنوا ان جاءکم فاسق بنباء فتبینوا جب غلط کار دروغ گو کوئی خبر دے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو۔ ایک دوسری آیت میں ہے اذا ضربتم فی الارض فتبینوا، اس لئے صحیح سقیم، قوی، ضعیف کی اچھی طرح چھان بین کے بعد ہی کوئی فیصلہ درست سمجھا جائے گا۔

عام اسلامی شخصیات سے ہٹ کر اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور ان کے مقام مرتبہ پر بحث و کلام کے لئے محض تاریخی روایات پر انحصار و اعتماد بھی ایک محقق کو جادہ اعتدال اور راہ صواب سے دور کر دیتا ہے، کیونکہ تاریخ کو ہرگز یہ حیثیت حاصل نہیں ہے کہ اس کی شہادت سے کتاب و سنت کے مسلمات کے خلاف استدلال فراہم کیا جائے، رسول خدا اور عام امت کے درمیان دین خالص کے صحیح تصور کے لئے اگر کوئی قابل اعتماد واسطہ ہے تو وہ صحابۂ کرام کی برگزیدہ اور مقدس جماعت ہے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے یہ

ساتھی ہی آپ کے پیغام اور آپ کی تعلیمات کو پورے عالم میں پہنچانے والے ہیں، صحابہ کرام کی اس داعیانہ حیثیت کا اعلان خود خدائے علیم وخبیر نے اپنے رسول ؐ کی زبانی یوں فرمایا ہے قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ الآیۃ آپ اعلان کردیں کہ یہ میرا راستہ ہے بلاتا ہوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر میں اور میرے ساتھی۔ مطلب یہ ہے کہ کسی اندھی تقلید کی بنیاد پر نہیں بلکہ حجت وبرہان اور بصیرت ووجدان کی روشنی میں، میں اور میرے اصحاب دین توحید کی دعوت دے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو نور بصیرت عطا فرمایا تھا آپ کے فیض صحبت سے ہر صحابی کا دل ودماغ اس نور سے روشن ہوگیا تھا اور دعوت الی اللہ علی وجہ البصیرۃ میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست وبازو اور رفیق کار بن گئے تھے، حدیث پاک۔ ما انا علیہ واصحابی۔ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صحابۂ کرام کے اسی رتبۂ بلند کو بیان فرمایا ہے۔ اس لئے صحابہ کی سیرت درحقیقت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا جزء ہے، عام شخصیات ورجال کی طرح انھیں صرف کتب تاریخ کی روشنی میں نہیں بلکہ قرآن وحدیث اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے آئینہ میں دیکھا جائے گا۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں

ومن توقيره صلى الله عليه وسلم توقير اصحابه وبرهم ومعرفة حقهم والاقتداء بهم وحسن الثناء عليهم والاستغفار لهم والامساك عما شجر بينهم ومعاداة من عاداهم والاضراب عن اخبار المؤرخين وجهلة الرواة

(الاساليب البديعة ص ٨)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتوقیر میں سے ہے صحابہ کی تعظیم کرنا، ان سے حسن سلوک کرنا ان کے حق کو پہچاننا، ان کی پیروی کرنا، ان کی مدح وستائش کرنا، ان کے واسطے استغفار کرنا، ان کے باہمی اختلاف کے ذکر سے (زبان وقلم کو) روکے رکھنا، ان کے دشمنوں سے دشمنی رکھنا مورخین اور جاہل راویوں کی (ان کی خلاف شان) روایتوں کے نقل وبیان سے باز رہنا۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہٗ اپنے ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں جو آیات وارد ہیں وہ قطعی ہیں، جو احادیث صحیحہ ان کے

متعلق وارد ہیں وہ اگرچہ ظنی ہیں مگر ان کی اسانید اس قدر قوی ہیں کہ تواریخ کی روایات ان کے سامنے ہیچ ہیں، اس لئے اگر کسی تاریخی روایت میں اور آیات و احادیث صحیحہ میں تعارض واقع ہوگا تو تواریخ کو غلط کہنا ضروری ہوگا (مکتوبات شیخ الاسلام ج ۱ ص ۲۴۲ مکتوب ۸۸)

حضرات صحابہ کا یہ تقدس و امتیاز کسی انسانی شخصیت و جماعت کا عطا کردہ نہیں ہے، بلکہ انھیں یہ رتبہ بلند خود مالک کائنات و خالق دو جہاں کے دربار سے مرحمت ہوا ہے، ذیل میں مذکور چند آیات ملاحظہ فرمائیں آپ پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہو جائے گی۔

(۱) کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنھون عن المنکر و تؤمنون باللہ (آل عمران آیت ۱۱۰)

تم لوگ بہترین جماعت ہو جو لوگوں کی نفع رسانی کیلئے پیدا کی گئی ہے، تم نیک کاموں کا حکم کرتے اور بری باتوں سے منع کرتے ہو، اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تلاوت کے بعد فرمایا "اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو انتم فرماتے اس وقت خطاب کی وسعت میں پوری امت مرحومہ براہ راست داخل ہو جاتی مگر اللہ تعالیٰ نے کنتم فرمایا اور صحابہ کی تخصیص فرما دی، اب رہے امت کے باقی لوگ تو جو صحابہ جیسے اعمال کریں گے وہ بھی ان کے تابع ہو کر اس خیریت و افضلیت کے مصداق ہو جائیں گے (اخرجہ ابن جریر و ابو حاتم عن السدی)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے آیت پاک کا مصداق اولین صحابۂ کرام کو قرار دیا ہے اور امت کے دیگر وہ افراد جو آیت پاک میں مذکور صفات کے حامل ہوں گے انھیں ثانوی درجہ میں شامل کیا ہے اور عربی زبان کے قواعد کی رو سے یہ بات اس طرح سمجھائی ہے کہ انتم خیر امۃ جملہ اسمیہ ہے جو ثبوت نسبت کو بتاتا ہے، تو انتم سے خطاب عام ہوگا جس کے عموم و وسعت میں موجود و غیر موجود سب داخل ہو جائیں گے، لیکن جب ضمیر "انتم" پر کان "فعل ماضی داخل کر دیا جائے تو وقوع و حدوث کا معنی پیدا ہو جائے گا، اس صورت میں کنتم کے مخاطب صرف موجودین ہونگے۔ یعنی نزول آیت کے وقت جو امت موجود ہے وہی اس کی مصداق اولین ہوگی یہ آیت صاف طور پر بتا رہی ہے کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم بلا تخصیص جماعت انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام

کے بعد سب سے افضل ہیں، علامہ سفارینی نے شرح عقیدۃ الدرۃ المضیۃ میں اسے جمہور امت کا مسلک قرار دیا ہے کہ انبیاء کے بعد صحابۂ کرام افضل الخلائق ہیں، ابراہیم بن سعید جوہری کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو امامہؓ سے دریافت کیا کہ حضرت معاویہ اور عمر بن عبدالعزیز میں کون افضل ہے تو انھوں نے فرمایا لا نعدل باصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم احدا (الروضۃ الندیۃ شرح العقیدۃ الواسطیۃ ابن تیمیہ ص ۴۰۵) ہم اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے۔

امام ابن حزم اپنی مشہور کتاب الفصل میں لکھتے ہیں ولا سبیل الی ان یلحق اقلہ درجۃ احد من اھل الارض کوئی شکل نہیں ہے کہ صحابۂ کرام میں سے کم رتبہ کے درجہ کو بھی کوئی (غیر صحابی) فرد و بشر پہونچ سکے۔

اب اگر کسی تاریخی روایت سے صحابۂ کرام کی تنقیص لازم آتی ہو تو وہ اس نص قطعی کے معارض ہونے کی بنا پر لازمی طور پر مردود ہوگی۔

(۱) لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولئک اعظم درجۃ من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا وکلا وعد اللہ الحسنیٰ۔ (الحدید آیت ۱۰)	برابر نہیں تم میں جس نے خرچ کیا فتح مکہ (یا صلح حدیبیہ) سے پہلے اور جنگ کی ان لوگوں کا درجہ بڑا ہے ان لوگوں سے جنھوں نے خرچ کیا اس کے بعد اور جنگ کی اور سب سے وعدہ کیا اللہ نے خوبی کا

سورۂ انبیاء میں الحسنیٰ کے متعلق ارشاد ہے ان الذین سبقت لھم منا الحسنیٰ اولئک عنھا معبدون جن لوگوں کے واسطے ہماری طرف سے حسنیٰ کا وعدہ ہو چکا ہے وہ جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ فرق مراتب کے باوجود سارے صحابہ جنتی ہیں یہی بات سورۂ توبہ میں ان الفاظ میں بیان فرمائی گئی ہے۔

(۲) السابقون الاولون من المہاجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ واعد لھم جنٰت تجری تحتھا الانھار	اور جو لوگ قدیم ہیں سب سے پہلے ہجرت کرنے والے اور مدد کرنے والے اور جو لوگ ان کے پیرو ہیں نیکی کے ساتھ اللہ راضی ہوا ان سے اور وہ راضی ہوئے اس سے تیار کر رکھے

خالدین فیہا ابدا ذلک الفوز العظیم (آیت ۱۰۰) — ہیں واسطے ان کے باغ کہ بہتی ہیں نیچے ان کے نہریں رہا کریں انھی میں ہمیشہ یہی ہے بڑی کامیابی۔

اس آیت میں صحابۂ کرام کو دو طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے ایک اولین سابقین کا اور دوسرا ان کے بعد والوں کا، اور دونوں طبقوں کے متعلق یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ اللہ ان سب سے راضی اور وہ اللہ سے راضی ہیں اور ان کے لئے جنت کا مقام دوام ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہٗ لکھتے ہیں جو شخص قرآن پر ایمان رکھتا ہے جب اس کے علم میں یہ بات آگئی کہ اللہ تعالیٰ نے بعض بندوں کو دوامی طور پر جنتی فرمایا ہے تو اب ان کے حق میں جتنے بھی اعتراضات ہیں سب ساقط ہو گئے کیونکہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ فلاں بندے سے فلاں وقت میں نیکی اور فلاں وقت میں گناہ صادر ہوگا اس کے باوجود جب وہ اطلاع دے رہے ہیں کہ میں نے اسے جنتی بنا دیا تو اسی کے ضمن میں اس بات کا اشارہ ہو گیا کہ اس کی تمام لغزشیں معاف کر دی گئی ہیں، لہٰذا اب کسی کا ان مغفور بندوں کے حق میں لعن وطعن اور برا بھلا کہنا حق تعالیٰ پر اعتراض کے مرادف ہوگا، اس لئے کہ ان پر اعتراض اور زبان طعن دراز کرنے والا گویا یہ کہہ رہا ہے کہ پھر اللہ نے اسے جنتی کیسے بنا دیا اور (فضائل صحابہ واہلبیت مجموعہ رسائل ص ۲۰۶، مطبوعہ انجمن حمایت اسلام لاہور ۱۹۶۷ء)

اور علامہ ابن تیمیہ نے الصارم المسلول میں قاضی ابو یعلیٰ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ رضا اللہ تعالیٰ کی ایک صفت قدیمہ ہے وہ اپنی رضا کا اعلان صرف انھیں کے لئے فرماتا ہے جن کے متعلق وہ جانتا ہے کہ ان کی وفات موجبات رضا پر ہوگی (معارف القرآن ص۔۔ ج ۸) لہٰذا اگر کوئی تاریخی روایت اس نص قطعی کے خلاف ہوگی تو وہ لائق اعتبار نہ ہوگی۔

هُوَ الَّذِیْ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ (الانفال آیت ۶۳)

اللہ ہی نے تجھ کو زور دیا اپنی مدد کا اور مسلمانوں کا اور الفت ڈال دی ان کے دلوں کے درمیان اگر تو خرچ کر دیتا جو کچھ زمین میں ہے سارا نہ الفت ڈال سکتا ان کے دلوں میں لیکن اللہ نے الفت پیدا کر دی ان کے درمیان بیشک وہ زور آور حکمت والا ہے۔

اسلام سے پہلے عرب میں جدال وقتال کا جو بازار گرم تھا اس سے کون ناواقف ہے، ادنیٰ ادنیٰ باتوں پر قبائل عرب باہم ٹکراتے رہتے تھے، اور بسا اوقات ان کی قبائلی جنگوں کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہتا، باہمی عداوت اور شقاق وعناد کے اس دور میں رحمۃ للعلمین توحید ومعرفت اور اتحاد واخوت کا عالمگیر پیغام لے کر مبعوث ہوئے کیا دنیا کی کوئی طاقت تھی جو ان درندہ صفت، جہالت پسند لوگوں میں معرفت الٰہی اور حب نبوی کی روح پھونک کر سب کو ایک دم باہمی اخوت والفت کی زنجیر میں جکڑ دیتی۔ بلا شبہ روئے زمین کے سارے خزانے خرچ کرکے بھی یہ مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا، یہ خدائی طاقت وحکمت کا کرشمہ ہے کہ کل تک جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اور عزت وآبرو کے بھوکے تھے ان کے درمیان اس طرح سے برادرانہ اتحاد واتفاق پیدا کر دیا کہ حقیقی بھائیوں سے زیادہ ایک دوسرے سے محبت والفت کرنے لگے صحابۂ کرام کی اس باہمی الفت ومحبت کا ذکر سورہ آل عمران میں اس طرح کیا گیا ہے

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا	یاد کرو اللہ کا احسان اپنے اوپر جب کہ تھے تم آپس میں دشمن پھر اللہ نے الفت پیدا کر دی تمہارے دلوں میں۔

آیت پاک محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم (الفتح) (محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں رحیم ومہربان ہیں) بھی حضرات صحابہ کی باہمی رحمت والفت کی خبر دے رہی ہے

امام قرطبی اور عامہ مفسرین لکھتے ہیں "والذین معہ" میں بلا تخصیص تمام صحابہ کرام داخل ہیں، اس آیت پاک میں تمام صحابہ کو آپس میں رحیم اور مہربان اور فضل خداوندی کا طالب بتایا گیا،

ان نصوص قطعیہ کے خلاف اگر تاریخی روایتیں یہ شہادت دیں کہ صحابہ آپس میں ذاتی پرخاش اور بغض وعناد رکھتے تھے تو یہ شہادت زور ہوگی جو کسی عدالت میں بھی قابل قبول نہیں ہے۔ رہا معاملہ صحابہ کے باہمی مشاجرات اور آپسی لڑائیوں کا تو اس کا منشاء بغض وعداوت اور شقاق وعناد قطعی نہیں تھا بلکہ اس میں ہر فریق اپنے نقطۂ نظر اور اجتہاد کے مطابق مسلمانوں کی مصالح اور راہ حق ورضائے الٰہی کے حصول میں کوشاں تھا، یہ الگ بات ہے کہ ایک فریق

اپنے اجتہاد میں چوک گیا جس پر وہ قابلِ گرفت نہیں بلکہ مستحق اجر ہے، چنانچہ علامہ سفارینی لکھتے ہیں۔

التخاصم والنزاع والتقاتل والدفاع الذی جری بینھم کان عن اجتھاد قد صدر من کل واحد من رؤس الفریقین ومقصد سائغ لکل فرقۃ من الطائفتین وان کان المصیب فی ذلک للصواب واحدھما .... غیر ان للمخطی فی الاجتھاد اجرًا وثوابًا۔ (مقام صحابہ ص ۱۰۴)

جو نزاع و جدال اور دفاع و قتال صحابہ کے درمیان پیش آیا وہ اس اجتہاد کی بنا پر تھا جو فریقین کے سرداروں نے کیا تھا اور فریقین میں سے ہر ایک کا مقصد اچھا تھا اگرچہ اس اجتہاد میں ایک ہی فریق صواب پر ہے .... مگر اپنے اجتہاد میں خطا کر جانے والے کیلئے بھی اجر و ثواب ہے

(۴) لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَادُّوْنَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ (المجادلہ ۱، آیت ۲۲)

تو نہیں پائے گا کسی قوم کو جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ دوستی رکھیں ایسے لوگوں سے جو اللہ اور رسول اللہ کے مخالف ہیں خواہ وہ ان کے باپ، بیٹے، بھائی یا اپنے گھرانے ہی کے کیوں نہ ہوں ان لوگوں کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور ان کو اپنے فیض غیبی سے مدد کی ہے۔

حضرت شاہ عبد القادر مفسر دہلوی رہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں، یعنی جو دوستی نہیں رکھتے اللہ کے مخالف سے اگرچہ باپ بیٹے (وغیرہ) ہوں وہ ہی سچے ایمان والے ہیں، ان کے یہ درجے (جنت و رضوان الٰہی) ملتے ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان یہی تھی کہ اللہ و رسول کے معاملہ میں کسی چیز اور کسی شخص کی پروا نہیں کی۔ الحاصل حضرات صحابہ اس آیت پاک کے مصداق اولین ہیں، چنانچہ امام قرطبی، زمخشری، حافظ ابن کثیر وغیرہ ائمہ تفسیر نے اس آیت کے تحت حضرت ابو عبیدہ، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت عمر فاروق وغیرہ رضوان اللہ علیہم کے بے لوث مخلصانہ واقعات بیان کئے ہیں۔

اب اس قرآنی اطلاع کے برعکس تاریخ کی روایتیں یہ خبر دیں کہ صحابہ خدا اور رسولِ خدا کے

مقابلے میں اپنے بیٹے عزیز واقارب اور قبیلے وگھرانے کو اولیت دیتے تھے تو یہ روایتیں ساقط الاعتبار ہوں گی انھیں کسی طرح بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

(۵) وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيْمَانَ وَزَيَّنَهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ أُولٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (الحجرات، آیت ۷-۸)

لیکن اللہ نے محبوب بنادیا تمھارے لئے ایمان کو اور اس کو مزین کر دیا تمھارے دلوں میں اور نفرت ڈالدی تمھارے دلوں میں کفر، گناہ اور نافرمانی کی ایسے ہی لوگ نیک راہ پر ہیں اللہ کے فضل واحسان سے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے،

یعنی اللہ سب کی استعداد وصلاحیت کو جانتا ہے اور اپنی حکمت سے ہر ایک کو وہ مقام و مرتبہ مرحمت فرماتا ہے جو اس کی استعداد کے مناسب ہو۔

یہ آیت ناطق ہے کہ بلا استثناء تمام صحابہ کے دلوں میں ایمان کی محبت اور کفر، گناہ، اور نافرمانی سے نفرت وکراہیت منجانب اللہ راسخ کر دی گئی تھی، اور "الیکم" میں حرف "الی" سے مستفاد ہوتا ہے کہ یہ ایمان کی محبت اور کفر وفسق سے نفرت انتہا درجے کو پہنچی ہوئی تھی کیونکہ "الی" عربی میں انتہاء وغایت کے معنی بیان کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ نیز آیت پاک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام سے جو لغزشیں صادر ہوتی ہیں اس کی بنیاد ضعفِ ایمان اور فسق وعصیان کا (نعوذ باللہ) استحسان نہیں ہے بلکہ بتقاضائے بشریت ان کا صدور ہو گیا ہے جس سے ان کے رشد پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ اس لئے ان کی معدودے چند لغزشوں کی بنا پر انھیں تنقید وتنقیص کا نشانہ بنانا کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں۔

ما ذکر عن الصحابة من السیئات کثیر منه کذب وکثیر منه کانوا مجتهدین فیه لکن لا یعرف کثیر من الناس وجه اجتهادهم وما قدر انه کان فیه ذنب من الذنوب لهم فهو مغفور لهم اما بتوبة واما بحسنات ماحیة، واما بمصائب مکفرة واما بغیر ذلك، فانه قد قام الدلیل الذی یجب القول بموجبه انهم من اهل الجنة، فامتنع ان یفعلوا ما یوجب النار لا محالة

واذا لم يمت احد هم على موجب النار لم يقدح ذالك فى استحقاقهم للجنة (المنتقى ص ۲۱۹ ــ ۲۲۰)

بعض صحابہ کی طرف جو برائیاں منسوب کی گئی ہیں ان میں بیشتر خود ساختہ ہیں، اور ان میں بہت سی ایسی ہیں جن کو انھوں نے اپنے اجتہاد (سے حکم شرعی سمجھ کر) کیا مگر لوگوں کو ان کے اجتہاد کی وجہ معلوم نہ ہوسکی، اور جن کو گناہ ہی مان لیا جائے تو ان کا وہ گناہ معاف ہوگیا، یہ عفو ومغفرت یا تو توبہ کی بنا پر ہے یا ان کی (کثرت) حسنات نے ان گناہوں کو مٹا دیا، یا دنیاوی مصائب ان کے لئے کفارہ بن گئیں، علاوہ ازیں دیگر اسباب مغفرت بھی ہوسکتے ہیں، کیونکہ قرآن وسنت سے ان کا جنتی ہونا ثابت ہوچکا ہے اس لئے یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا عمل ان کے نامۂ اعمال میں باقی رہے جو جہنم کی سزا کا سبب بنے، تو جب حضرات صحابہ میں سے کوئی ایسی حالت میں وفات نہیں پائیگا جو دخول جہنم کا ذریعہ ہے تو اب کوئی چیز ان کے استحقاق جنت میں مانع نہیں ہوسکتی۔

صحابہ کے ایمان واخلاص، دیانت وعدالت پر اس قرآنی شہادت کے بعد کسی تاریخی مفروضہ کی بنیاد پر صحابۂ کرام کے اسلام کو استسلام سے تعبیر کرنا ایمان بالقرآن سے میل کھاتا ہے؟ پرستاران تاریخ و دلدادگان سید قطب وطٰہٰ حسین کو سوچنا چاہئے کہ وہ کس سے رشتہ توڑ رہے ہیں اور کس سے ناطہ جوڑ رہے ہیں بقول دشمن پیمان دوست بشکستی

ببیں از کہ بریدی و باکہ پیوستی

قرآن مقدس کی مندرجہ بالا آیات بصراحت ناطق ہیں کہ۔

(۱) بغیر کسی استثنار کے تمام صحابہ جنتی ہیں۔

(۲) سارے صحابہ کو اللہ تعالیٰ کی دائمی رضا وخوشنودی حاصل ہے۔

(۳) جملہ اصحاب رسول آپس میں برادرانہ الفت واخوت رکھتے تھے

(۴) سبھی حضرات صحابہ اللہ ورسول کے معاملے میں نسبی وقبائلی عصبیت سے بالکل پاک تھے۔

(۵) ہر ایک صحابی کا دل ایمان واخلاص کی محبت سے مزین اور کفر فسق اور نافرمانیوں سے متنفر تھا۔

صحابہ کا مقام حدیث کی نظر میں

کتاب الٰہی کی ان واضح تصریحات کے ساتھ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی پیش نظر

رکھیں تاکہ بات بالکل منقح ہو جائے اور کسی تاویل باطل سے آپ شکوک و شبہات میں گرفتار نہ ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے۔

(۱) خیرالناس قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم، فلا ادری ذکر قرنین او ثلاثۃ الخ (الستۃ الا مالکا جمع الفوائد ص ۲۰۱ ج ۲ طبع الہند)	سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر ان کا جو اس سے متصل ہیں پھر انکا جو اس سے متصل ہیں، راوی حدیث کہتے ہیں مجھے یاد نہیں رہا کہ "ثم الذین یلونہم" آنحضرت ؐ نے دو مرتبہ فرمایا یا تین مرتبہ

اس حدیث پاک سے متعین طور پر معلوم ہو گیا کہ عہد نبوی کے بعد سب سے بہتر زمانہ صحابہ کرام کا ہے "اصابہ" کے مقدمہ میں مشہور شارح حدیث حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں۔ "تواتر عنہ صلی اللہ علیہ وسلم خیرالناس قرنی ثم الذین یلونہم الخ" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث محدثین کے نزدیک متواتر ہے جس سے علم یقینی حاصل ہوتا ہے۔

(۲) عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ اختار اصحابی علی الثقلین سوی النبیین والمرسلین، رواہ البزار وسند رجالہ موثقون۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے میرے اصحاب کو انبیاء و مرسلین کے علاوہ تمام انسانوں پر فضیلت دی ہے

یہ حدیث پاک اس بات پر نص ہے کہ تمام حضرات صحابہ اللہ تعالیٰ کے منتخب و برگزیدہ ہیں، جماعت انبیاء کے بعد گروہ جن و انس میں سے کوئی بھی ان کے مقام و مرتبہ کو نہیں پا سکتا، شرف صحابیت ایک ایسا شرف ہے جس کے مقابلے میں ساری فضیلتیں ہیچ در ہیچ ہیں، اسی لئے حضرت سعید بن زید (یکے از عشرہ مبشرہ) قسم کھا کر فرماتے ہیں

واللہ لمشھد رجل منھم مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یغبر فیہ وجھہ خیر من عمل احدکم ولو عمر عمر نوح (جمع الفوائد ص ۲۰۲ ج ۲)

خدا کی قسم صحابہ میں سے کسی کی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ کسی جہاد میں شرکت جس سے اس کا صرف، چہرہ غبار آلود ہو جائے غیر صحابی میں سے ہر فرد کی عمر بھر کی عبادت و عمل صالح سے بہتر ہے اگرچہ اس کو عمر نوح ؑ مل جائے۔

صحابی رسول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔

(۳) اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوھم غرضا من بعدی فمن احبھم فبحبی احبھم ومن ابغضھم فببغضی ابغضھم ومن اذاھم فقد اذانی ومن اذانی فقد اذی اللہ فیوشک ان یاخذہ

(الترمذی جمع الفوائد ص ۲۶۲)

اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو میرے صحابہ کے معاملہ میں میرے بعد ان کو (طعن وتشنیع) کا نشانہ نہ بناؤ کیونکہ جس نے ان سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی وجہ سے ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا تو مجھ سے بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھا، اور جس نے ان کو ایذاء پہنچائی اس نے مجھے ایذاء پہنچائی اور جس نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ کو ایذا پہونچائی اور جو اللہ کو ایذاء پہونچانا چاہے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو عذاب میں پکڑلے۔

آیت کریمہ فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ الخ کی تفسیر میں امام قرطبی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی درج ذیل حدیث ذکر کی ہے جس سے حدیث بالا کی تائید ہوتی ہے

(۴) من احب اللہ عزوجل فلیحبنی ومن احبنی فلیحب اصحابی ومن احب اصحابی فلیحب القرآن ومن احب القرآن فلیحب المساجد الخ

(الجامع لاحکام القرآن ج ۱۲ ص ۲۶۶)

جو اللہ سے محبت رکھتا ہے اسے چاہئے کہ مجھ سے محبت رکھے اور جو مجھ سے محبت رکھے اسے چاہئے کہ میرے اصحاب سے محبت رکھے اور جو صحابہ سے محبت رکھے اسے چاہئے کہ قرآن سے محبت رکھے اور جو قرآن سے محبت رکھے اسے چاہئے کہ مساجد سے محبت رکھے

کوئی انتہا ہے حضرات صحابہ کی رفعت مقام کا کہ سید المرسلین، محبوب رب العالمین، خلاصۂ کائنات، فخر موجودات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام کی محبت کو اپنی محبت بتارہے ہیں اور ان سے بغض وعناد کو اپنے ساتھ بغض وعناد قرار دیتے ہیں، جس کے دل میں نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی ادنیٰ درجہ کی محبت بھی ہوگی وہ اصحاب رسول کی شان میں لب کشائی کی جرأت کر سکتا ہے؟ اور جب کہ آپؐ نے صاف فرمادیا ہو کہ دیکھو میرے بعد میرے صحابہ کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہنا اور انھیں اپنے اعتراضات کا ہدف نہ بنانا،

ایک حدیث میں آپؐ کا ارشاد ہے لا تسبوا صحابی فمن سبھم فعلیہ لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین لا تقبل اللہ منہ صرفا ولا عدلا (شرح الشفاء للملا علی قاری ص۵۵۵ ج ۲)

ایک دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں:- اذا رأیتم الذین یسبون اصحابی فقولوا لعنۃ اللہ علی شرکم (الترمذی جمع الفوائد ص۲۰۱ ج ۲)

ان احادیث پاک پر بطور خاص ان لوگوں کو غور کرنا چاہیئے جو مؤرخین کی گری پڑی روایتوں اور مستورین کے طبع زاد مفروضوں کو بنیاد بنا کر صحابۂ کرام کے اخلاق و اعمال کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں جسے وہ خود اپنے یا اپنے بڑے بوڑھوں کے بارے میں قطعاً گوارہ نہیں کرسکتے تو کیا (نعوذ باللہ) صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ان مستورین و متجددین سے بھی انسانی و اسلامی اخلاق و شرافت میں فروتر اور پست تھے؟ (العیاذ باللہ)

(۵) عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثل اصحابی فی امتی کالملح فی الطعام لا یصلح الطعام الا بالملح (مشکوۃ شریف بحوالہ شرح السنۃ ص۵۵۴)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری امت میں میرے اصحاب کی وہی حیثیت ہے جو نمک کی کھانے میں ہے کہ بغیر نمک کا کھانا پسندیدہ نہیں ہوتا۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح عمدہ سے عمدہ تر کھانا بے نمک کے پھیکا اور بے مزہ ہوتا ہے بعینہٖ یہی حال امت کا ہے کہ اس کی ساری صلاح و فلاح اور اس کا تمام تر شرف و مجد صحابہ کی مقدس جماعت کا مرہون احسان ہے اگر اس جماعت کو درمیان سے الگ کردیا جائے تو امت کے سارے محاسن و فضائل بے حیثیت اور غیر معتبر ہو جائیں گے،

الحاصل اس حدیث میں واضح اشارہ ہے کہ امت مسلمہ کے دین کی صحت و درستگی کیلئے حضرات صحابہؓ کے اقوال و اعمال حجت و سند اور معیار کا درجہ رکھتے ہیں۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ

(۱) عہد نبوی کے بعد صحابہ کا دور سارے زمانہ سے بہتر ہے۔

(۲) حضرات صحابہؓ اللہ کے منتخب و برگزیدہ ہیں، جماعت انبیاء کے علاوہ جن و بشر کا کوئی بھی فرد ان کے مقام و مرتبہ تک نہیں پہونچ سکتا۔

(۳) صحابہؓ کی محبت محبت رسول کی علامت اور ان سے بغض و عناد رسول اللہ ﷺ سے بغض و عناد کی نشانی ہے، صحابہؓ کو ایذا پہونچانا خود نبی پاک ﷺ کو اذیت پہنچانے کے مرادف ہے۔

(۴) حضرات صحابہؓ کو تنقید و تنقیص کا ہدف بنانا ناجائز و حرام ہے۔

(۵) امت کا سارا شرف و مجد صحابہؓ کے ساتھ وابستگی پر موقوف ہے، اور ان کا قول و عمل امت کے لئے حجت ہے۔

آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے نصوص سے ثابت شدہ صحابہؓ کے اسی امتیازی مقام و مرتبہ کو ایک دو گمراہ فرقوں کے علاوہ ساری امت ہمیشہ سے مانتی چلی آرہی ہے، ان کے حق میں طعن و تشنیع، سب و شتم اور ان کی عیب جوئی اور اہانت کو اکبر کبائر میں شمار کیا جاتا رہا ہے۔

چنانچہ امام نوویؒ لکھتے ہیں۔

(۱) واعلموان سب الصحابة حرام من فواحش المحرمات سواء لابس الفتنة منهم او غيره۔ (شرح مسلم ص۲۱۰ ج۲)	اچھی طرح سمجھ لو کہ صحابہ کا نازیبا الفاظ سے ذکر کرنا حرام ہے اور بڑے حراموں میں ہے خواہ وہ صحابی باہمی جنگ کے فتنہ میں مبتلا ہوئے ہوں یا اس سے بری ہوں۔

حضرت امام مالکؒ کا قول مشہور شارح حدیث ملا علی قاریؒ ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔

(۲) من شتم احدا من اصحاب النبی صلی اللہ علیه وسلم ابابکر او عمر او عثمان او علیا او معاویة او عمرو بن العاص فان قال شانئهم کانوا علی ضلال او کفر قتل وان شتم بغیر هذا انکل نکالا	جس نے اصحاب رسول میں سے کسی کو (مثلاً) ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، معاویہؓ، عمرو بن عاصؓ، کو گالی دی اگر انھیں گالی دینے والا یہ کہتا ہے کہ وہ کفر و ضلالت پر تھے تو اسے قتل کیا جائے گا اور اگر اس کے علاوہ کچھ اور کہتا

شدیدا (شرح الشفاء ص۵۵۵ ج۲) ہے تو اسے سخت عبرتناک سزا دی جائے گی۔

عظیم المرتبت محدث امام ابوزرعۃ الرازیؒ فرماتے ہیں۔

(۳) اذا رأیت الرجل ینتقص احدا من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاعلموا انہ زندیق وذلک ان الرسول حق، والقرآن حق وما جاء بہ حق وانما روی الینا ذلک کلہ الصحابۃ وھؤلاء یریدون ان یجرحوا شھودنا لیبطلوا الکتاب والسنۃ والجرح بھم اولی وھم زنادقۃ۔ (الاصابۃ ص۱۱ ج۱)

جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ صحابہ میں سے کسی کی تنقیص کر رہا ہے تو سمجھ لو کہ یہ زندیق ہے اور یہ اس لئے ہے کہ رسول حق ہیں، قرآن حق ہے، قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے حق ہے اور ان سب کو ہم تک پہنچانے والے صحابہؓ ہیں تو یہ عیب جو ان صحابہؓ چاہتے ہیں کہ ہمارے گواہوں اور واسطہ کو مجروح کر دیں۔ تاکہ وہ کتاب و سنت کو باطل اور بے اصل ٹھہرا دیں لہذا یہی بدگو مجروح ہونے کے زیادہ مستحق ہیں یہ لوگ تو زندیق ہیں

(۴) امام ذہبیؒ اپنی مشہور کتاب "الکبائر" میں لکھتے ہیں۔

من ذم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشیء وتتبع عثراتھم وذکر عیبا واضافہ الیھم کان منافقا الخ (ص ۲۳۹)

جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی کسی نوع کی مذمت کی اور ان کی عیب جوئی اور لغزشوں کی تلاش کے پیچھے لگا رہا یا کسی عیب کا ذکر کر کے اسکی نسبت صحابہ کی جانب کر دی تو وہ منافق ہے۔

امام احمد بن حنبل رہ کا قول ان کے تلمیذ المیمونی ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔

(۵) سمعت احمد یقول مالھم ولمعاویۃ نسأل اللہ العافیۃ وقال لی یا ابا الحسن اذا رأیت احدا یذکر اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بسوء فاتھمہ علی الاسلام (مقام صحابہ ص۸۸)

میں نے امام احمد سے فرماتے ہوئے سنا لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ کی برائی کرتے ہیں ہم اللہ سے عافیت کے طلبگار ہیں پھر مجھ سے فرمایا کہ جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ صحابہؓ کا ذکر برائی سے کر رہا ہے تو اسکے اسلام کو مشکوک سمجھو۔

حضرات ائمہ و محدثین کے ان اقوال کا حاصل یہی ہے کہ حضرات صحابہؓ کی اہانت، برائی اور ان کے اوپر طعن و تشنیع عظیم ترگناہ کبیرہ ہے، کسی مخلص سچے مومن کی یہ شان نہیں ہے کہ رسولِ خدا کے مخلص و جاں نثار ساتھیوں کو ہدف ملامت اور نشانہ مذمت بنائے ایسی شنیع جسارت کوئی زندیق منافق اور مشکوک الاسلام ہی کر سکتا ہے (نعوذ باللہ منہ)

محقق ابن ہمامؒ اسلامی عقائد پر اپنی جامع کتاب مسایرہ میں لکھتے ہیں۔

واعتقاد اهل السنة والجماعة تزكية جميع الصحابة وجوبا باثبات العدالة لكل منهم والكف عن الطعن منهم والثناء عليهم (ص ۱۳۲)

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ تمام صحابہ کی لازمی طور پر پاکی بیان کرنا ہے، ان میں سے ہر ایک کی عدالت ثابت کرنے ان پر کسی قسم کا طعن نہ کرنے اور ان کی مدح و تعریف کے ساتھ۔

علامہ ابن تیمیہؒ نے شرح عقیدۂ واسطیہ میں اس عقیدہ کی تصریح ان الفاظ میں کی ہے۔

وعن اصول اهل السنة سلامة قلوبهم والسنتهم لاصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم (ص ۴۰۳)

اہل سنت کے اصول عقائد میں سے ہے کہ وہ اپنے دلوں اور زبانوں کو صحابہؓ کے معاملے میں صاف رکھتے ہیں

عقائد کی معروف کتاب شرح مواقف میں سید شریف جرجانی رقم طراز ہیں۔

المقصد السابع انه يجب تعظيم الصحابة كلهم والكف عن القدح فيهم لان الله عظيم واثنى عليهم في غير موضع في كتابهم (عقیدہ سے متعلق یہ تینوں حوالے "مقام صحابہؓ" از مفتی محمد شفیعؒ سے ماخوذ ہیں)

ساتواں مقصد اس بیان میں ہے کہ تمام صحابہ کی تعظیم اور ان پر طعنہ زنی سے رکنا واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ عظیم ہے اور اس نے اپنی کتاب میں ان حضرات کی بہت سے مقامات میں تعریف بیان کی ہے۔

کس قدر حیرت انگیز ہے یہ واقعہ کہ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی جو صرف مشہور صاحب قلم عالم ہی نہیں بلکہ ہماری معروف دینی درسگاہ ندوہ کے معتمد تعلیمات بھی ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے پیش نظر اصحاب رسولؐ سے متعلق کتاب و سنت کے نصوص اور علمائے امت کی تصریحات ضرور ہوں گی، بایں ہمہ موصوف ایک جدید کتاب "واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر" پر تبصرہ کرتے ہوئے صحابہؓ کے ایک طبقہ کو اپنے قلم کے تیر و نشتر کا اس بیبا کی سے ہدف بنایا ہے کہ اسے پڑھ کر یقین نہیں آتا کہ حضرات صحابہؓ کے بارے میں یہ خیالات جماعت اہل سنت سے وابستہ کسی صاحب علم و دانش کے ہیں

آں موصوف کی تحریر کا وہ حصہ جس میں انھوں نے حضرت سفیان اور دیگر اموی صحابہ رضوان اللہ علیہم کو اپنے طعن و تشنیع کا نشانہ ٹھہرایا خود انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے لکھتے ہیں۔

• کربلا کا واقعہ بنو امیہ اور بنو ہاشم کی دیرینہ عداوتوں کا ایک منطقی نتیجہ (CONSEQUENCE)

تھا وہ عداوتیں جو ظہور اسلام کے بعد بہت طاقتور شکل میں ابھر کر سامنے آئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ سالہ عرصہ نبوت میں ۲۱ سال تک بلکہ ساڑھے اکیس سال تک شدومد سے قائم رہیں، غزوۂ بدر میں مسلمان فوج کی کامرانی نے جس طبقہ کو سب سے زیادہ برافروختہ کیا اسکے سربراہ ابو سفیان تھے۔ اسی طرح غزوۂ احد میں ان کا اور ان کی اہلیہ جگر خوار حمزہ ہند کا کردار یہ سب وہ باتیں ہیں جن میں مورخین کا کوئی اختلاف نہیں ہے، فتح مکہ کے بعد یہ گروہ اسلام لایا (یا بقول سید قطب شہید کے استسلام کیا) مگر اس استسلام کے بعد اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہوگئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے، اپنی انانیت کو بھول گئے عقلاً محال بات ہے اور صحاح ستہ کی مستند روایات سے ثابت ہے کہ ہند نے بیعت کے الفاظ دہراتے ہوئے بھی اپنے اندرونی کرب وغم اور غیظ وغضب کا اظہار کیا تھا، حضرت سفیان نے احتجاج کیا تھا کہ اب وہ دن آگیا ہے کہ پسماندہ ہم اشراف پر فوقیت دیئے جاتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر کے خلاف حضرت علی کو اٹھانے کی کوشش بھی ان سے ثابت ہے۔

اسلام کے پورے طور پر فارغ ہو جانے کے بعد جب مقاومت کی تمام راہیں مسدود ہوگئیں تھیں اس عرصۂ مختصر میں اس گروہ کی طرف سے کسی واضح دشمنی کا ثبوت تاریخ میں نہیں ملتا ہے مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں میں شکست کا غم و غصہ آج تک موجود ہے اسی طرح اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینے کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت نے البتہ اسلام کی طرف سے ان کے عناد کو ختم کیا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ان کا دل صاف نہیں ہوا، احمد امین نے فجر الاسلام اور اس کے مقدمہ میں طہ حسین نے اس کی نشاندہی کی ہے۔"

(تعمیر حیات، اشاعت ۱۰ مارچ ۱۹۹۲ء)

ڈاکٹر صاحب کی اس طویل عبارت کا حاصل یہ ہے کہ

(۱) حضرت ابوسفیانؓ اور خاندان بنی امیہ کے دیگر صحابۂ کرام حقیقتاً مسلمان نہیں تھے بلکہ ظاہری طور پر اطاعت قبول کر لی تھی بالفاظ دگر یہ حضرات آیت پاک۔ قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا، قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوا وَلٰكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا کے مصداق تھے۔

(۲) اس اسلام (ظاہری تسلیم واطاعت) کے بعد اچانک زمانۂ کفر وشرک کی عداوتوں کو وہ بھول گئے یہ عقلاً محال ہے۔

(۳) ہند زوجہ حضرت ابوسفیانؓ (جنھیں موصوف نے جگر خوار حمزہ کا طعنہ دیا ہے) نے بیعتِ اسلام کے وقت اپنے کرب وغم کا اظہار کیا تھا (غالباً ڈاکٹر صاحب امت کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ عین اسلام قبول کرتے وقت بھی اللہ کے دین اور اللہ کے رسول سے ان کا دل صاف نہیں تھا بدرجۂ مجبوری استسلام کر رہی تھیں۔

(۴) حضرت ابوسفیانؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے خلاف (خلافت کے لئے) حضرت علی رضؓ کو اکسایا تھا۔

(۵) غلبۂ اسلام کے بعد یہ گروہ مقابلہ کی طاقت نہ پاکر ایک محدود عرصہ کیلئے خاموش ہو گیا تھا مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں کا غم آج تک موجود ہے اسی طرح اس گروہ کے سینہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مار رہا تھا۔

(۶) حضرت عثمان غنی رضؓ کی خلافت نے اسلام سے ان کے عناد کو ختم کر دیا مگر رسول اللہ صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا دل صاف نہیں ہوا۔

یہ ہے ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کی صحابہؓ کی اس جماعت کے بارہ میں رائے جن میں حضرت ابوسفیانؓ (عامل نجران) اور ان کی زوجہ ہندؓ کے علاوہ خال المومنین کاتب وحی حضرت معاویہؓ، عتابؓ ابن اسیدؓ (گورنر مکہ معظمہ) یزید بن سفیانؓ (عامل تیما) عبداللہ بن سعید (عامل فدک وکاتب وحی) عمرو بن سعیدؓ (عامل خیبر وکاتب وحی) عثمان بن سعیدؓ (عامل عرینہ) خالد بن سعیدؓ (کاتب وحی وعامل یمن) ابان بن سعیدؓ (عامل بحرین) سعید بن سعیدؓ (بازار مکہ کے نگران اعلیٰ) رضی اللہ عنہم اجمعین جیسی اسلام کی پاکباز شخصیتیں شامل ہیں۔

جن پر خود صاحب وحی، رسالت مآب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتماد کر کے اپنے عہد رسالت میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت پر مامور فرمایا تھا اور اپنے اس انتخاب کے ذریعہ اس جماعت کے ایمان و اخلاق پر ہمیشہ کیلئے مہر تصدیق ثبت فرما دی ہے۔ پھر حضرت ابو بکر صدیق رضؓ نے اپنے دور خلافت میں اسلامی لشکر کی قیادت اور صوبوں کی سربراہی جیسے اہم و نازک ترین عہدوں سے انھیں سرفراز کر کے ہمیشہ کے واسطے اسلامی تاریخ میں ان کے ناموں اور کارناموں کو روشن و تابناک بنا دیا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مسلمین جن کے سینوں میں غزوۂ بدر کے انتقام کا جذبہ بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مار رہا تھا اور قلوب اسلام اور داعئ اسلام سے صاف نہیں تھے (جیسا کہ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق ہے) کیا اس اعتماد و اعزاز کے مستحق تھے کہ کتابت وحی جیسی نازک ترین خدمت اور اسلامی ریاست کے اہم مناصب ان کے سپرد کر دیے جائیں؟ کیا ندوی صاحب کی اس تحقیق کو تسلیم کر لینے کے بعد سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ردائے عصمت کو (نعوذ باللہ) جرح و قدح کے دھبوں سے پاک و صاف رکھا جا سکتا ہے؟

بات پہونچی ہے کہاں تک یہ تجھے کیا معلوم

اس لئے یہ ہمارے ایمان بالرسول کا تقاضا ہے کہ بغیر کسی بحث و تحقیق اور ریب و شک کے کہدیں کہ ۔ واللہ ھذا بہتان عظیم ۔

ڈاکٹر صاحب ماشاء اللہ ندوہ جیسی مشہور علمی درسگاہ کے ہونہار فاضل ہیں ان کی نظر قدیم و جدید دونوں ماخذوں پر ہے، وہ اچھی طرح واقف ہیں کہ حضرات صحابہ کے متعلق فیصلہ محض تاریخی روایتوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ کتاب و سنت کی روشنی میں کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ امام ابن جریر طبری، حافظ ابن کثیر، ابن اثیر اور ابن عساکر جیسے مستند علماء جو فن تاریخ کے علاوہ حدیث، تفسیر وغیرہ اسلامی علوم میں بھی عبقریت کی شان رکھتے ہیں کی بیان کردہ وہ روایتیں جو کتاب و سنت کی تصریحات سے میل نہ کھائیں قابل قبول نہیں ہیں۔

اس کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے سید قطب، احمد امین اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین جیسے مستشرقین کے کارندوں اور اسلامی روایات و اقدار سے بیزار عصر جدید کے متجددوں کے خودساختہ مفروضوں

کو سامنے رکھ کر صحابہ کی ایک بڑی جماعت پر ایسی سخت ترین جرح کر ڈالی جس کے نتیجہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی وفاداری ہی نہیں بلکہ اسلام بھی مشکوک ہو جاتا ہے۔ کیا صحابہ کے اخلاق و کردار کی یہ صحیح منظر کشی ہے؟ کیا صحابہ کی یہ تصویر دیکھ کر امت کا وہ اجماعی اعتقاد جو ان کے بارے میں ہے باقی رہ سکتا ہے؟ ڈاکٹر صاحب کو خالی الذہن ہو کر غور کرنا چاہئے۔

اس اجمالی نظر کے بعد ڈاکٹر صاحب کی تحریر کے اجزاء پر تفصیلی گفتگو ملاحظہ فرمائیں

(الف)۔ کیا یہ مستسلمین جو حقیقی اسلام کی دولت سے محروم تھے جن کے سینوں میں اسلام سے انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی، جن کے قلوب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے صاف نہیں تھے کسی درجہ میں مستحق جنت ہیں؟ حالانکہ خدائے علیم و خبیر کا اعلان ہے لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح و قاتل اولئک اعظم درجۃ من اللہ و کلا وعد اللہ الحسنیٰ (آیت پاک کا ترجمہ و تفسیر آگے گذر چکی ہے) فرق مراتب کے باوجود تمام صحابہ کو بارگاہ الٰہی سے جنتی ہونے کی سند مل چکی ہے، اس لئے ڈاکٹر صاحب کی یہ تحقیق کسی اور حلقہ میں قابل قبول ہو تو ہو گروہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک قطعاً مردود و نامقبول ہے۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں "مگر اس استسلام کے بعد اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہو گئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے، اپنی انانیت کو بھول گئے عقلاً محال ہے":

(ب) ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ جس بات کو یہ محال عقلی ٹھہرا رہے ہیں اسی کے بارے میں کتاب الٰہی کی شہادت یہ ہے کہ چشم گیتی اس حیات بخش منظر کو عہد رسالت میں دیکھ چکی ہے اذکروا نعمت اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا۔ یعنی اللہ کے فضل و عنایت سے قدیم دشمنی بغیر کسی تاخیر کے دوستی میں بدل گئی اور کل کے دشمن آج کے بھائی بن گئے، اس آیت پاک میں اذ کنتم اعداء پر الف بین قلوبکم کا عطف کیا گیا ہے اور اس کے لئے حروف عاطفہ میں سے "فاء" کا انتخاب ہوا ہے جو تعقیب بلا تراخی کے معنی کے واسطے استعمال ہوتا ہے، جس کا حاصل یہی ہے کہ دشمنی و عداوت کے بعد اچانک ایک پل میں الفت پیدا ہو گئی اور پرانی ساری رنجشیں یک بیک کافور ہو گئیں۔

(ج) ڈاکٹر صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ "ہندہ (زوجۂ ابوسفیان) نے بیعت کے الفاظ دہراتے

ہوئے بھی اپنے اندرونی کرب وغم اور غیظ وغضب کا اظہار کیا تھا:

اس بیان میں ڈاکٹر صاحب صحیح علم وتحقیق کے حق کو فراموش کرگئے ہیں کیونکہ اس واقعہ میں جو بات انھیں اپنے مقصد کے مطابق نظر آئی اسے اٹھالیا اور جو خلافِ مقصد تھی اسے قلم انداز کردیا آج کل کے تاریخی تجزیے اور ریسرچ وتحقیق کی یہی ٹیکنک ہے۔ بیعت اسلام کے اس واقعہ میں ہند رضی اللہ عنہا کی آخری گفتگو جو انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی تھی یہ ہے

• یارسول اللہ! اسلام سے پہلے آپ کے چہرہ سے زیادہ کوئی چہرہ مجھ کو مبغوض نہ تھا اور آپ سے زیادہ کسی کو دشمن نہ رکھتی تھی، اور اب آپ سے زیادہ کوئی چہرہ مجھے محبوب نہیں، آپ نے فرمایا ابھی محبت میں اور زیادتی ہوگی: (سیرۃ المصطفیٰ ج ۲ ص)

کیا اسکے بعد بھی کہا جائے گا کہ وہ نبیؐ کریم سے بغض وعداوت رکھتی تھیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ان کے دل کی صفائی اور انتہائی اخلاص کی بات ہے کہ اسلام لانے سے پہلے کی اپنی قلبی کیفیات کو بلا تکلف بیان کردیا۔ چونکہ ہمارے محقق ومبصر طہٰ حسین اور احمد امین جیسے استشراق پسند مصنفین کی عینک لگا کر اس واقعہ کو دیکھ رہے ہیں اس لئے جو چیز قابل تعریف تھی وہی انھیں لائق مذمت نظر آرہی ہے۔

اس موقع پر موصوف نے حضرت ہندؓ کو "جگر خوارئ حمزہؓ" کا طعنہ بھی دیا ہے جو کسی طرح بھی ان کی علمی شان کے مناسب نہیں ہے کیونکہ حدیث پاک الاسلام یہدم ما کان قبلہ (اسلام نے اپنے سے پہلے سارے گناہوں کو ختم کردیا) اور التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ (گناہ سے توبہ کرنے والا گناہ نہ کرنے والے کے مثل ہوجاتا ہے) اس لئے اسلام لانے کے بعد زمانۂ شرک کے معاصی پر طعن و تشنیع کسی طرح بھی روا نہیں، اور اگر بالفرض اس دروازے کو کھول دیا جائے تو مہاجرین وانصار میں سے کون بچے گا جو اس قسم کے طعنہ کا مورد نہ ہو سکے، جانتے بوجھتے ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ رویہ خواہ مخواہ اس شبہ کو دعوت دیتا ہے کہ ان کا قلب خاندان بنی امیہ سے متعلق صحابۂ کرام سے صاف نہیں ہے، اللّٰھم احفظنا منہ۔

(د) موصوف حضرت ابوسفیان کے جرموں کو شمار کراتے ہوئے لکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق کے خلاف حضرت علی کو اکسانے کی کوشش بھی ان سے ثابت ہے،

ڈاکٹر صاحب جس بات کو ایک ثابت شدہ حقیقت کے انداز میں پیش کر رہے ہیں اس کی حیثیت بس اتنی ہے کہ ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ ابو سفیان، حضرت علی اور حضرت عباس کی خدمت میں آئے اور کہا کہ اے علیؓ و عباسؓ! کیا بات ہے کہ خلافت قریش کے اس قبیلہ میں گئی (مراد حضرت ابوبکر صدیقؓ کا قبیلہ ہے) جو مرتبہ کے اعتبار سے پست اور تعداد کے لحاظ سے قلیل ہے، بخدا اگر تم دونوں آمادہ ہو جاؤ تو ہم مدینہ کو اپنے حامیوں اور طرفداروں کے لشکر سے بھر دیں، حضرت علیؓ نے جواب دیا، بخدا میں ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتا الخ

اس روایت کو مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے اپنی مشہور کتاب "المرتضیٰ" صفحہ ۱۰۱ پر بحوالہ کنز العمال ج ۳ ص ۱۴۱ نقل کیا ہے، اسی روایت کی بنیاد پر کہا جا رہا ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی ابو سفیانؓ کے دل سے جاہلی عصبیت کا جرثومہ ختم نہیں ہوا تھا اسی لئے تو وہ خلافت صدیقی کے خلاف حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کو اکسا رہے تھے۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ اولاً تو خود اس روایت کی صحت ہی مشکوک ہے اس لئے ایسی روایت کی بنیاد پر کسی صحابیٔ رسول کے بارے میں اتنی بڑی بات کہدینا کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ ـــــ جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

علاوہ ازیں اگر کسی درجہ میں اس روایت کو مان لیا جائے تو حضرت ابو سفیان کی اس رائے کو حضرت ابوبکرؓ کے خلاف اکسانے کا معنی پہنانا کسی طرح صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر حضرت ابو سفیانؓ کی اس رائے کا یہی معنی درست مانا جائے تو پھر اس اعتراض سے عم رسول عباس رضی اللہ عنہ بھی بری نہ ہو سکیں گے کیونکہ حضرت ابو سفیانؓ سے پہلے خود حضرت عباسؓ کی رائے بھی یہی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت آل ہاشم کو ملنی چاہیے۔ چنانچہ بخاری کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات میں ایک دن حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رض کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ "انی اری الموت فی وجوہ بنی عبدالمطلب فتعال حتی نسأل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فان کان ھذا الامر فینا علمناہ" جس کے جواب میں حضرت علی رض نے فرمایا تھا انا واللہ لئن سألناھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فمنعناھا لا یعطیناھا الناس بعدہ وانی واللہ لا اسألھا رسول اللہ۔ (رواہ البخاری فی کتاب المغازی)

پھر یہی اعتراض حضرت سعد بن عبادہ اور ان کے حامی حضرات انصار پر بھی عائد ہوگا جو سقیفۂ بنی ساعدہ میں انتخاب خلیفہ کے لئے اکٹھا ہوئے تھے۔

درحقیقت اس موقع پر نہ کسی کے اندر خاندانی عصبیت کارفرما ہے اور نہ کوئی کسی کو کسی کے خلاف اکسا رہا ہے بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ حضرات صحابہ کے سامنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک ایسا مسئلہ کھڑا ہوگیا جس پر انھوں نے پہلے سے پورے طور پر غور وفکر نہیں کیا تھا اس لئے اول وہلہ میں استحقاق خلافت کے سلسلہ میں ان کی رائیں مختلف ہوگئیں، قریش کی وہ شاخ جو عبد مناف سے تعلق رکھتی تھی اس کے دو نوں بزرگ یعنی حضرت عباسؓ اور حضرت ابو سفیانؓ کی رائے یہ تھی کہ چونکہ آنحضرت کا نسبی تعلق بنو ہاشم سے ہے اور اس وقت بنو ہاشم میں اپنے فضائل و محاسن کے لحاظ سے حضرت علیؓ سب پر فوقیت رکھتے ہیں اس لئے وہی خلافت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں جس کا اظہار ان دونوں حضرات نے حسب موقع حضرت علی رضی اللہ سے کردیا، اس کے برخلاف حضرات انصار کا ایک طبقہ اپنی نصرت وتائید کے پیش نظر یہ سمجھ رہا تھا کہ مہاجرین کے مقابلہ میں خلافت کے زیادہ حقدار ہمی ہیں اپنی اسی رائے کے تحت وہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں اکٹھا ہوئے تھے لیکن بعد میں حضرت صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کے بیانات سے دلائل منقح ہوکر سب کے سامنے آگئے تو بغیر کسی تردد کے سب نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو خلیفۂ رسول تسلیم کرلیا اور مکمل بشاشت قلبی کے ساتھ خلیفۂ وقت کی سمع وطاعت قبول کرلی۔

(۵) موصوف آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں میں شکست کا غم وغصہ آج تک موجود ہے اسی طرح اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینے کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا"۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے اور اپنے کمال ادب وبلاغت کے اظہار کے لئے حضرات صحابہ کی مقدس جماعت کے ساتھ جس بے ادبی کا مظاہرہ کیا ہے وہ صاف طور پر غمازہے کہ "فی قلبہ شیئ" حضرت ابو سفیان، حضرت معاویہ، حضرت یزید بن ابوسفیان، حضرت عتاب بن اسید، حضرت خالد بن سعید وغیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد صحابہ کرام کو انگریزوں کی صف میں کھڑا کردینا حد درجہ کی جسارت ہے جو اہل سنت والجماعت کے صحابہ سے متعلق جماعی

عقیدہ کے یکسر منافی ہے۔

الحاصل ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب کی مندرجہ بالا تحریر کا ایک ایک جز کتاب وسنت سے معارض عقیدۂ اہل سنت کے خلاف ہے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بیان کے مطابق (شائع تعمیر حیات، ۲۵ر اپریل ۱۹۹۲ء) خود ندوہ کے مسلک کے بھی خلاف ہے جسکے معتمد تعلیمات کی مسند پر بیٹھ کر اسے لکھا گیا ہے اور ندوہ کے ترجمان "تعمیر حیات" کے ذریعہ جس کی اشاعت ہوئی ہے، مگر حیرت ہے کہ ترجمان ندوہ تعمیر حیات نے آج تک اس کی واضح طور پر تردید اور اس سے برأت کے سلسلہ میں کچھ نہیں لکھا۔ بعض علماء کی جانب سے حضرت مولانا علی میاں صاحب کو اس نامناسب تحریر کی طرف توجہ دلائی گئی بلکہ احتجاج کیا گیا تو موصوف نے " ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں کا صحابۂ کرام کے بارے میں مسلک وعقیدہ " کے عنوان سے ایک مختصر مضمون شائع فرمادیا جس میں ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب کی تردید میں ایک لفظ بھی نہیں ہے، البتہ ان کے بے بنیاد مفروضوں اور صحابہ بیزار خیالات کو "تاریخی تجزیہ وتبصرہ" کا نام دیکر یک گونہ علمی حیثیت دیدی گئی ہے، حضرت مولانا نے اپنے اس مضمون میں صحابۂ کرام بالخصوص حضرت علی، حضرت معاویہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کے بارے میں اہل سنت والجماعت کے عقیدہ کی جو تشریح وترجمانی فرمائی ہے وہ قابل [illegible] ہے، پھر حضرات صحابہ کے کارناموں اور عظمت کے اظہار میں ندوہ کی جس بے مثال خدمات کا ذکر فرمایا ہے اور اسکے ثبوت میں مولانا شبلی نعمانی مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی کی تصنیفات اور دارالمصنفین اعظم گڈھ کی صحابہ سے متعلق مطبوعات کا تذکرہ کیا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں مگر سوال یہ ہے کہ حضرت مولانا سے تو درخواست کی گئی تھی ڈاکٹر عبداللہ کے غلط مضمون کی تردید کی تاکہ ایک طاقتور تردید سے ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب کی تحریر کے وہ مسموم اثرات جو تعمیر حیات کے ذریعہ پورے ملک میں پھیل گئے ہیں ختم ہوجائیں۔ اس کے جواب میں ندوہ کے بانیوں اور کارکنوں کے مسلک اور صحابہ سے متعلق ندوہ کی خدمات کی وضاحت فرمائی جارہی ہے، آخر اس درخواست اور اس کے اس جواب میں ربط کیا ہے؟ حضرت مولانا سے نیازمندانہ گذارش ہے کہ وہ اس پر غور فرمائیں۔ ہم اگر عرض کرینگے تو شکایت ہوگی۔

ندوہ کے ایک پرجوش صاحب قلم استاذ کو یہ بات انتہائی گراں لگی کہ ڈاکٹر صاحب کی اس قابل اعتراض تحریر پر لوگ اعتراض کیوں کرتے ہیں، چنانچہ موصوف اپنی لسانی ہوشمندی اور جوش

حمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"مولانا کے مضمون میں اس عبارت کا آنا تھا کہ کچھ مدعیوں نے چیخ و پکار شروع کر دی وہ اخرس و گونگے جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف بیجا باتوں کی نسبت اور یزید کی وکالت پر نہیں بولتے .... وہ یہاں گویا ہو گئے۔"

ادبی اعتبار سے اس تحریر کے عیب و سقم کو تو اہل ادب جانیں، میری تو آں محترم سے بس اتنی گذارش ہے کہ جذبات کی رو میں اتنے آگے نکل جانا کسی طرح مناسب نہیں کہ پیچھے مڑ کر دیکھیں تو صرف آپ اکیلے رہ جائیں، پورے ملک کے علماء کو اخرس اور گونگا کہنے سے آپ کی گویائی میں کچھ اضافہ ہونے سے رہا البتہ اس کا انجام یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ آپ کی بات سننے سے لوگ اپنے کان بالقصد بند کرلیں۔ ــــــ آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"ایک ایسے صاحب کا مضمون داد تحسین کے خانہ میں شائع کیا گیا جو نہ قرآن پاک سے واقف نہ حدیث نبوی سے نہ اقوال صحابہ سے نہ علماء و مصلحین کی آراء سے، گستاخ و بے ادب محمود عباسی کی دو چار کتابیں جن کا سرمایہ حیات ہیں۔"

یہ ایک فاضل ندوہ کے بارے میں موصوف کی شہادت ہے "صاحب البیت ادری بما فیہ" ہم اس سلسلے میں کیا کہہ سکتے ہیں، البتہ آگے چل کر موصوف نے بلا وجہ اور بغیر کسی معقول ربط کے دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء کو بھی نشانہ بنایا ہے، اس بارہ میں موصوف سے صرف یہ گذارش ہے کہ جب طبیعت جوش میں آئے اور قلم خردہ گیریوں کیلئے بے چین ہو جائے تو اپنے گرد و پیش نظر اٹھا کر دیکھ لیا کریں تسکین کے سامان خود ندوہ اور لکھنؤ میں بہت مل جائیں گے اور آپ دہلی و دیوبند کے طویل سفر کی زحمت سے بھی بچ جائیں گے کیونکہ "این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند"

ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب کی تحریر کے درجۂ حرارت کو کم کرنے کی غرض سے موصوف رقم طراز ہیں

"مولانا عبداللہ عباس ندوی جن کا قلم ردعمل کے جوش میں بغیر قصد و نیت کے غلط رخ پر چل گیا۔"

یہ اصل حقیقت پر پردہ ڈالنے کی ایک ناکام کوشش ہے ڈاکٹر صاحب کی تحریر کا سیاق و سباق زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ پورے غور و فکر اور قصد و ارادہ سے صادر

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

یہ ملامت۔ زہے نصیب!

مدیر الفرقان عزیزی میاں سجّاد صاحب کے نام اُن کے ایک ندوی ساتھی کا خط دو ماہ پیشتر آیا تھا۔ اُس کا ایک حصہ ذیل میں پڑھیے:۔

"تعمیر حیات" میں آپ کے بھائی صاحب محترم کی کتاب پر مولانا عبداللہ عباس صاحب کا تبصرہ پڑھ کر یہاں سب لوگوں[1] کو سخت اذیت پہنچی ..... صاحب ..... صاحب ..... صاحب اور خاکسار، سب کا ردّ عمل یکساں ناگواری کا تھا۔ ندوہ کے پلیٹ فارم سے شیعیت کا پروپیگنڈہ اللہ کی پناہ۔ یہی مضمون مولانا عبداللہ عباس صاحب اپنے پرچے میں شائع کرتے تو اسکو ان کی ذاتی رائے شمار کر لیا جاتا، لیکن ندوہ کے ترجمان میں اس طرح کا مضمون شائع ہو جانے اس کا بہت دکھ تھا۔ وہ بھی اس اہتمام سے کہ پورے شمارے کے سارے مضامین کے برعکس اس کو سُرخ ہیڈنگ سے شائع کیا گیا ..... صاحب نے پچیس تیس فل سکیپ صفحوں پر ایک جائزہ لکھ کر تعمیر حیات کو بھیج دیا تھا جو اپنی جگہ اچھا تھا۔ مگر اسکی توقع نہیں کہ وہ شائع کرینگے۔ اولاً تو افسوس اس کا تھا کہ عبداللہ عباس صاحب کا یہ مضمون تعمیر حیات میں شائع کیسے ہو گیا پھر یہ کہ اسکے بعد دو ایک شماروں میں کوئی معذرت نہیں آئی۔ پھر حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ کا مضمون آیا جو اپنی جگہ درست تھا لیکن ضرورت تو اسکی تھی کہ اضافہ کی سرزنش کی جاتی۔ ابھی چند روز قبل ..... صاحب کو کسی نے عبداللہ عباس صاحب کے وضاحت کی ایک کاپی

[1] مراد ندوی برادری ہے اور آگے انہی لوگوں کا نام تھے جو حذف کر دیئے گئے ہیں۔

ارسال کی ہے۔ یہ وضاحت نہیں "غرّاہٹ" ہے۔ عذر گناہ بدتر از گناہ۔ موصوف کو پشیمانی کیا ہوگی وہ تو غیظ و غضب کا اظہار کرتے نظر آرہے ہیں۔ موقع اس کا تھا کہ اللہ تعالیٰ سے بھی توبہ کرتے اور ایک واضح اور مختصر اعتذار شائع کرا دیتے۔ بات ختم تھی۔ وہ کتنی عظیم نسل تھی جو اپنے بارے میں یہ رائے رکھا کرتی تھی کہ رحم اللہ امرءً اھدیٰ الی ذنوبی۔

یہ۔ال اب ہم لوگ خلافت و ملوکیت کی تغلیط کا منہ نہیں رکھتے۔ آپ کو شاید معلوم ہوا ہو کہ خلافت و ملوکیت گروپ نے عبداللہ عباس صاحب کے مضمون کی کاپیاں تقسیم کیں۔۔۔۔"

عبداللہ عباس صاحب کو چاہیئے کہ ذی الحجہ کے ماہ رواں کے بعد محرم منانے کا اعلان کرکے مومنین میں شامل ہو جائیں موصوف کو یقیناً اس حلقے میں آقائی مجتہد العصر آیۃ اللہ عبداللہ عباس کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔"

جو شخص یہ خط لکھ چکا ہو جس میں عبداللہ عباس صاحب کے تبصرے کو اُن کا ذاتی فعل ماننے سے انکار کرکے اُسے "ندوے کے پلیٹ فارم سے تشیعیت کا پروپیگنڈہ" کہا گیا ہو جس میں اس بات پر نکتہ چینی کی گئی ہو کہ تعمیر حیات نے دوسرے سارے مضامین کے برخلاف اس تبصرے کو سرخ ہیڈنگ سے شائع کرکے اہم بنایا۔ جس میں افسوس ظاہر کیا گیا ہے کہ بعد میں تعمیر حیات کی طرف سے اس تبصرہ کی اشاعت پر کوئی معذرت بھی نہیں آئی۔ اور پھر مولانا علی میاں کی طرف سے اس تبصرے کے سلسلے میں شائع کئے جانے والے مضمون (۲۵ راپریل ۹۲ء) کو بھی اس لحاظ سے ناقص قرار دیا گیا ہے کہ اس موقع کی جو اصل ضرورت تھی کہ اصاغر (عبداللہ عباس صاحب اور ارکان ادارہ تعمیر حیات) کی سرزنش کی جاتی وہ تو اس سے پوری نہیں ہوئی۔ کیا اُسی شخص سے یہ توقع کوئی کرسکتا ہے کہ جب اس تبصرے سے متعلق الفرقان کی اشاعت خاص (بابت مئی۔جون ۹۲ء) وہ دیکھے جس میں یہی سب باتیں جو اس نے اپنے خط میں کہی تھیں ذرا تفصیلی اور استدلالی انداز سے کہی گئی ہیں تو وہ ایک دوسرا خط بایں الفاظ لکھے گا کہ:-

"آپ حضرات نے اس قضیئے میں حضرت مولانا علی میاں صاحب اور ندوۃ العلماء کو

سمیٹنے اور مطعون کرنے کی بیجد مذموم کوشش کی ہے......!"

"اگر الفرقان نے صرف مولانا عبداللہ عباس صاحب کی تحریر کا رد اور موضوع کی اہمیت سے بحث کی ہوتی تو بڑی خوشگوار بات ہوتی!"

لیکن کتنی بھی حیرت ہمیں یا کسی اور کو ہو، واقعہ یونہی ہوا ہے۔ اور اس انداز کا خط بھی انہی عزیز کے قلم سے مئی جون کا الفرقان پڑھنے کے بعد مدیر الفرقان کے نام موصول ہوا ہے۔ اور اسے پڑھنے کے بعد اس کا بھی کوئی امکان سمجھ سے باہر نظر آتا ہے کہ انھیں اگر معلوم ہو گیا ہو یا اب معلوم ہو جائے کہ عبداللہ عباس صاحب کی وہ وضاحت جسے وہ "غرّاہٹ" اور "عذر گناہ بدتر از گناہ" سے تعبیر کرتے ہیں وہ حضرت مولانا علی میاں صاحب کے نزدیک بالکل کافی وشافی ہے۔ اور اُسکے بعد کوئی مسئلہ باقی نہیں رہنا چاہیئے[1] تب بھی وہ مولانا علی میاں کی اس پوزیشن پر کسی کی پبلک لب کشائی کو جائز رکھیں گے۔

مولانا عبداللہ عباس صاحب کو جو چاہیئے کہئے۔ انکی پوری "برادری" بخوشی تیار ہے۔ اس خط میں تو آپ نے سب کچھ پڑھ ہی لیا بالیقین فرمایئے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ایک بڑا حصہ اس بات کیلئے بخوشی تیار تھا کہ الفرقان اگر عبداللہ عباس صاحب کی خبر لے (جیساکہ وہ اندازہ کر رہے تھے) تو ندوے کے مقابلے کے طور پر ان کی قربانی کو کار ثواب سمجھ لیا جائے۔ اور ہمیں یہ سب معلوم تھا لیکن "مولانا علی میاں کو بھی اس میں سمیٹ لیا گیا" جن سے ندوہ اور ندوی برادری کی آبرو کو چار چاند لگے ہوئے ہیں ــــ بس یہ چیز سامان آوازِ فکر بگاڑ گئی ــــ بیشک چار چاند لگے ہوئے ہیں بلکہ ندوے ہی کی نہیں ہندوستانی مسلمانوں کی آبرو اُن کی وجہ سے دنیائے اسلام کے قلب ممالک عربیہ میں بڑھی ہے ــــ نادان قسم کے ندوی خواہ بھی گمان کریں اور کہتے پھریں پر ہمیں الحمدللہ نہ ندوے سے آج بھی کوئی کد ہے جبکہ وہاں ہمارے حق میں نادانیوں کی انتہا ہو رہی ہے[2]۔ نہ مولانا علی میاں صاحب کیلئے بدخواہی کا کوئی گز ہمارے سینے میں ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ ہم دین کے معاملے میں مولانا عبداللہ صاحب اور مولانا علی میاں صاحب میں کوئی فرق کرنے کی

---

[1] حضرت مولانا کی یہ رائے ریکارڈ پر موجود ہے۔ [2] اسکی صرف ایک مثال اگلے صفحے پر ایک اشتہار کے عکس کی صورت میں دیکھ لیجئے۔

دینی و ملی غداروں اور احسان فراموش لوگوں کے چہرے بے نقاب
واقعۂ کربلا کے پردے میں ناصبیت کا پرچار

ایک المناک سانحہ

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی شخصیت کو مجروح کر کے یزید کی حیثیت کو بڑھاوا دینے کی اسلام بیزار سازش کا پردہ چاک
گمراہ کن کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" عالم اسلام کے لئے کھلا چیلنج

مذکورہ کتاب ایک غریب اور دو کا ہے۔ در اصل اس کتاب میں جمہور علماء اسلام اور اکابر سلف کیخلاف زہر افشانی کی گئی ہے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور اسی طرح کے دوسرے اکابر کی رائے اور تحقیق سے کھلا انحراف کیا گیا ہے۔
حسب ذیل مضمون اسی آئینہ میں غور طلب ہے ملاحظہ فرمائیں۔

مذہب کے نام پر تفرقہ اندازی کرنیوالے گروہ سے ہوشیار

ہندستان کے تمام مسلمان واقف ہیں کہ پوری اسلامی دنیا میں حضرت علی میاں اور ندوۃ العلماء کی ہر قوم میں عزت و شہرت ہے اور آج ساری دنیا حضرت مولانا علی میاں کو اچھی طرح جانتی ہے۔ مولانا محترم کی کتابیں ملک کے اندر اور تمام عرب ممالک میں پڑھی جاتی ہیں۔ اور چوٹی کے دانشور اور علماء محدثین ان کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ندوۃ العلماء کا علمی دینی وقار سارے عالم میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر افسوس چند احسان فراموش جنہوں نے ندوہ ہی کے نام سے اپنے کو روشناس کرایا۔ اور حضرت علی میاں صاحب ہی کی بدولت باہر کی دنیا میں جانے پہچانے گئے اور ان ہی کے اشارے پر رابطہ عالم اسلامی کے ممبر بنائے گئے۔ آج ان کے اور ندوہ کے بدترین دشمن کے روپ میں سامنے آرہے ہیں زبان سے صحابہ صحابہ کی رٹ لگاتے ہیں اور صحابہ کا نام ان کی عظمت کو اجاگر کرنے والوں پر بہتان تراشی کرتے ہیں بجو حضرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کے مرتکب ہیں۔ بظاہر شیعوں کی مخالفت کا نقاب چہرے پر ڈالے ہیں اور بباطن یزید کی عظمت کا سکہ بٹھانا چاہتے ہیں۔ اور جو اصحاب کرام یزید کے ہاتھوں شہید ہوئے اور جس کی حکومت نے حضرت امام حسین اور خاندان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت تباہ کی توہین کی اس شخص کو تمام صحابہ کی موجودگی میں افضل و برتر بتاتے ہوئے نہیں شرمائے کیا مولانا منظور نعمانی اور ان کے فرزندوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم لکھنؤ اور یوپی کے رہنے والے اتنے بے غیرت نہیں ہیں کہ اپنے ان عظیم قائد اور عظیم اسلامی درسگاہ پر کیچڑ اچھالتے دیکھ کر صبر کریں۔ ہم قانونی چارہ جوئی کے ساتھ منظور نعمانی اور ان کے حواریوں کا اصلی چہرہ بے نقاب کریں گے۔ اور عوام کو بتادیں گے کہ صحابہ کا اصل دشمن کون ہے۔

ہم اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھنے والے مسلمان وہ ہیں جنہوں نے رافضیت اور شیعیت کا کھل کر اور بہادری کیساتھ مقابلہ کیا ہے۔ اور کرتے رہیں گے۔ اسی طرح خارجیت اور ناصبیت کو بھی ہم گناہ اور گمراہی سمجھتے ہیں اور ان کا بھی ہم ہر طرح سے مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔

حاجی نسیم الدین خاں۔ حافظ محمد اسحٰق۔ محمد اشتیاق ادیب۔ مولانا مصباح الحسن۔ ڈاکٹر عشرت علی صدیقی
ممتاز احمد صدیقی۔ لطیف عباس منیجر اسلامک اسکول۔ محمد اسلم خاں۔ مولانا سعید عالم ندوی۔ ظہیر احمد
رفیق الحسن نوری

یہ اشتہار نہ صرف یہ کہ مولانا علی میاں اور ندوے کی حمایت کے نام پر چھاپا گیا ہے بلکہ ۱۹ رجون ۹۲ء کو نماز جمعہ کے بعد ندوۃ العلماء کی مسجد کے دروازوں پر یہ تقسیم بھی ہوا۔

ہمت اپنے اندر نہیں پاتے۔ ہم کہیں دور کے لوگ نہیں کہ مولانا کے قدر سے ناواقف ہوں جس وقت مولانا علی میاں صاحب کا وہ مضمون (۲۵ اپریل ۱۹۹۲ء) اس تبصرے کے سلسلے میں نکلا جس کے انتظار میں ہم نے تبصرے کی بابت کچھ لکھنا موقوف کر رکھا تھا۔ اور اس سے ہمارے نزدیک یہ بات طے ہو گئی (چاہے وہ غلط طے ہوئی ہو) کہ یہ تبصرہ خود مولانا کے جذبات و خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ تب اس مرحلے پر ایک واضح سوالیہ نشان ہمارے سامنے تھا کہ ہم صرف تبصرے سے بحث کریں یا اسکے ساتھ مولانا کی رضامندی کو بھی زیر بحث لائیں۔ پہلی صورت صاف طور سے وہ تھی جسے "بے گٹھلی کا میوہ" کہا کرتے ہیں۔ اور دوسری میں اپنا سر پھوٹنے کا بھی خطرہ تھا۔ اسے دیوانگی کہئے یا اور جو کچھ آپ کا جی چاہے کہئے ہمیں دین کے نام پر ایک مسئلہ اٹھاتے ہوئے اسکی ہمت نہ ہو سکی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد گرامی ہم نے پڑھ رکھا ہے کہ :-

انما أهلك الذين من قبلكم	تم سے پہلی امتیں ایسی ہی باتوں میں (دینی
انهم اذا سرق فيهم الشريف	اعتبار سے) برباد ہوئیں کہ اُن میں اگر کوئی
تركوه واذا سرق فيهم الضعيف	بڑے درجے کا آدمی چوری کرتا تو اُسے چھوڑ
اقاموا عليه الحد۔[1]	دیتے تھے اور کوئی کمزور یہ کام کر لیتا تو
	اس پر حد قائم کرتے تھے۔

اُسے اس آزمائش کے موقع پر نظر انداز کر جائیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کی پوری اہمیت سمجھنے کیلئے مفید معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پورا موقع و محل اور سیاق و سباق عام ناظرین کیلئے بیان کر دیا جائے۔ حدیث کی پوری روایت کے مطابق موقع یہ تھا کہ (فتح مکہ کے بعد) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں فاطمہ نامی ایک قریشی عورت پر ایک چوری کا مقدمہ قائم ہوا۔ قریش کو اپنی شان و عظمت کی وجہ سے فکر ہوئی (کہ اس کا ہاتھ کٹے گا تو اُن کی آبرو خاک میں مل جائے گی) پس تلاش ہوئی کہ وہ کون شخص ہو سکتا ہے

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح (کتاب الحدود) بحوالہ بخاری و مسلم۔

جو بارگاہِ نبویؐ میں کچھ رُو رعایت کی سفارش ایسے موقع پر کر سکے، رائے قائم ہوئی کہ اسامہ بن زیدؓ جو حبّ رسول اللہ (محبوب رسول اللہ) کہلاتے ہیں وہ یہ کام کر سکیں گے حضرت اسامہؓ کو تیار کر لیا گیا۔ وہ سفارشی بن کر آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچے تب آپؐ نے فرمایا:۔

أتشفع في حدٍ من حدود الله ـ؟ کیا حدود الٰہی میں (رُو رعایت کی) سفارش کرنے آئے ہو؟

اور یہ کہہ کر آپ کھڑے ہو گئے اور ایک خطبہ دیا جس میں وہ بات ارشاد فرمائی جو اوپر نقل کی گئی کہ تم سے پہلی اُمتیں ایسی ہی باتوں میں (دینی اعتبار سے) برباد ہوئیں۔ کہ قانون الٰہی کے اطلاق میں کم حیثیت اور ذی حیثیت کا امتیاز برتا جاتا تھا۔ اور اس خطبہ کا خاتمہ آپؐ نے ان الفاظ پر فرمایا جن کی یاد ہمیشہ آپؐ کی اور آپؐ کے لائے ہوئے دین کی عزت بڑھاتی رہے گی کہ "لو ان فاطمہ بنت محمد سرقت لقطعتُ یَدَھا" (اگر چوری کرنے والی فاطمہ، فاطمہ بنت محمدؐ بھی ہوتی تب بھی مجھے اس کا ہاتھ کاٹنا ہی تھا) صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم۔

اس ارشاد نبویؐ کی رعایت و نگہداشت کے علاوہ جو کہ یہ چاہتی تھی کہ اگر ہم مولانا علی میاں صاحب کے موقف کے بارے میں لب کشائی نہیں کر سکتے تو پھر عبداللہ عباس صاحب پر گرفت بھی ہمیں زیب نہیں دیتی، معاملہ کا ایک اور اہم پہلو یہ بھی تھا کہ یہ دین کی اعتقادی اور فکری حفاظت کے سلسلے کی ایک بحث تھی۔ اور اس سلسلے کے مباحث میں بڑوں کی لغزش کا احتساب کسی چھوٹے کی لغزش یا کج فکری کے احتساب سے کہیں زیادہ ضروری اور مقدم ہے۔ اور کسی کی نہیں خود مولانا کی اس بارے میں ایک تحریر ہمارے سامنے ہے جسے قول فیصل کہنا چاہیئے۔ فرماتے ہیں:۔

"امت کی دینی، علمی، فکری و اصلاحی طویل تاریخ میں دینی و علمی احتساب، بے لاگ بے رُو رعایت اور تعمیری و صحت مند تنقید کی مثالوں کی کمی نہیں۔ بلکہ اس بارے میں ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ اس معاملہ میں کوئی قوم و ملت، ملتِ اسلامیہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اور یہ ہر طرح سے اس امت کے شایان شان ہے جس کو

"شهداء علی الناس" کا امتیاز عطا کیا گیا ہے اور جس کو "یاأیها الذین اٰمنوا کونوا قوامین بالقسط شهداء لله" کے امر کا مخاطب بنایا گیا ہے، علمائے امت کو اپنے اس فریضہ کے ادا کرنے سے نہ کسی کا زہد، روحانیت، عند اللہ و عند الناس مقبولیت روک سکی نہ وہ عظیم دینی خدمات اور ملی منافع بلکہ فیوض و برکات مانع بن سکے جو ان کی ذات سے مسلمانوں اور اسلام کو پہونچ رہے تھے اس کی تابناک مثالیں جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کی کتابوں، اور کتب طبقات و تراجم میں دیکھی جا سکتی ہیں، بلکہ مشہور اصول "زلّةُ العالِم زلّةُ العالَم" (عالِم کی لغزش عالَم کی لغزش ہے) کو پیش نظر رکھتے ہوئے جن لوگوں کو متبوعیت و مقتدائیت کا مقام حاصل تھا یا جنکے قول و عمل کو حجت و سند سمجھا جاتا تھا، ان پر تنقید و احتساب اور انکی غلطیوں کی نشاندہی میں ان ناقدین و مصلحین نے (اُن کی خدمات کے پورے اعتراف اور ان کی ذات کے کامل احترام کے ساتھ) اپنی ذمہ داری کا اور زیادہ احساس کیا اور دوسروں کے مقابلہ میں (جن کو امت اور اسلامی معاشرہ میں یہ مقام حاصل نہیں تھا) اس کام کو اور زیادہ ضروری سمجھا۔

ہمارے علم اور محدود مطالعہ میں قرن اول سے لے کر اس موجودہ عہد تک کبھی یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوا، اور اگر اس امت کیلئے اسلام کی صراط مستقیم پر قائم رہنے، کتاب الٰہی کا تحریف سے اور امت کا ضلالت عامہ سے محفوظ رہنے کا خدائی فیصلہ ہے (اور یہ اس امت کے لئے جو آخر الامم ہے ضروری ہے) تو یہ سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا، اور اس کو قائم رہنا بھی چاہیئے کہ اس میں اس امت کی حفاظت اور انسانیت کی فلاح مضمر ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ کے قیامت تک اس امت میں جاری رہنے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع بھی دی ہے۔ کتب حدیث میں آپ کا یہ ارشاد روایت کیا گیا ہے "یحمل هذا العلم من کل خلف عدوله ینفون عنه تحریف الغالین وانتحال

المبطلین وتاویل الجاھلین[1] (مشکوٰۃ المصابیح کتاب العلم) اور امم سابقہ اپنے علماء اور دین کے علمبرداروں کی اسی اخلاقی جرأت اور فرض شناسی کی کمی، دین میں مداہنت اور پاسداری (محاباۃ) اور دینی مصالح پر دنیوی مصالح کی ترجیح، مسئلہ کو مادی، سیاسی اور تنظیمی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی عادت کی بنا پر عمومی ضلالت و انحراف کا شکار ہوئیں، اور آخر میں وہ آخری اور کمزور دھاگا بھی ٹوٹ گیا جو انکو خدا سے اور اپنی کتاب و شریعت سے مربوط کئے ہوئے تھا"

مولانا کا یہ طویل اقتباس انکی اُس تحریر کا جزو ہے جو راقم کے والد ماجد (مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ) کی کتاب "مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف" کے "پیش لفظ" کے طور پر شائع ہوئی ہے. مولانا اُن حضرات میں ہیں جو مودودی صاحب کو اس عہد کی نہایت اہم اسلامی شخصیت مانتے اور پورے احترام سے اُن کا نام لیتے ہیں. مگر انکے بعض افکار و خیالات کو دین کے سلسلے میں خطرناک بھی مانتے ہیں. والد ماجد کی کتاب میں موصوف کے اسی قسم کے بعض افکار کی خطرناکی کو نمایاں کیا گیا تھا. محترم مولانا علی میاں صاحب نے اپنے "پیش لفظ" کے ذریعے کتاب کو خاص طور سے ان لوگوں کے لئے قابلِ توجہ بنانے کی کوشش فرمائی ہے جو مودودی صاحب کو اس دور کی عظیم اسلامی شخصیت سمجھتے ہیں، اور اس لئے ان پر تنقید ہضم کرنا انھیں مشکل ہو سکتا ہے ــ کاش مولانا کی تحریر کے یہ دو صفحے جو اوپر نقل کئے گئے خود مولانا کے اُن محبین کیلئے بھی قابلِ توجہ ہو جائیں جو مولانا کو اس دور کی اہم اسلامی شخصیت ماننے کا مطلب یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ مولانا سے کوئی علمی و فکری غلطی نہیں ہو سکتی. یا اگر ہو سکتی ہے تو اس پر نقد و احتساب کی اجازت کسی کو نہیں دی جا سکتی.

اس پیش لفظ میں مولانا نے آگے چل کر مودودی صاحب کے معتقدین کے اُس ردّعمل پر اپنی حیرت کا اظہار کیا ہے جو وہ مودودی صاحب کے سلسلے میں کسی صحیح سے صحیح اور ضروری سے ضروری تنقید پر بھی روا رکھتے ہیں. اور یہی ردّعمل انھوں نے خود مولانا کی ایک تنقیدی کتاب پر روا رکھا. فرماتے ہیں:-

---

[1] اس ارشادِ نبوی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو علم (کتاب و سنت کی شکل میں) آیا ہے ہر زمانہ کے قابلِ اعتماد بندے اس امانت کی حفاظت کریں گے. غالیوں کی تحریفات، اہلِ باطل کے غلط دعووں اور جاہلانہ تاویلوں کی تردید اور ان کا غلط باطل ہونا ثابت کریں گے.

"اس سلسلے میں حیرت کی بات صرف اتنی ہے کہ اس فکر (آگے ایک خاص فکر کا اشارہ بریکٹ میں دیا گیا ہے جس پر خود مولانا کی تنقید مبنی تھی) کی تنقید و احتساب کا استقبال بڑی ناگواری، استعجاب اور کسی قدر آزردگی کے ساتھ کیا گیا، جو ایک ایسی جماعت سے قطعاً غیر متوقع تھا جس کو اُس کا دستور اساسی ہدایت کرتا ہے کہ "رسول خدا کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنایا جائے کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھا جائے، اور کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہوا جائے' اسکے جواب میں وہی کہا جا سکتا ہے جو راقم السطور نے کتاب کے (یعنی اپنی کتاب کے) عربی ترجمے میں لکھا کہ عمل تنقید و احتساب پر سواریوں کے بلدیاتی بے لچک قانون نافذ نہیں کئے جا سکتے۔ تنقید و احتساب کا عمل یک طرفہ نہیں بلکہ دو طرفہ ہوتا ہے۔ اور اس کا حق ہر صاحبِ فکر و نظر کو حاصل ہے۔" (ص۴-۵)

الفرقان میں حضرت مولانا پر تنقید صرف اتنی کی گئی تھی کہ انکے معتمد تعلیم ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی صاحب نے ندوہ کے ترجمان تعمیر حیات میں ذاتی طور ہی پر نہیں بلکہ تعمیر حیات ہی کی طرف سے' راقم کی کتاب پر تبصرہ لکھتے ہوئے واقعۂ کربلا کے بارے میں ایسے خیالات پیش کئے کہ جو صرف کسی شیعہ ہی کو زیب دے سکتے تھے۔ اسکی بابت حضرت مولانا کو توجہ دلائی گئی تو آپ نے اس تبصرہ کے اثرات کے ازالے کے نام پر اپنا ایک پرانا مضمون صحابہ کی عظمت و منزلت پر تعمیر حیات میں شائع کرایا۔ مگر اسکو تبصرے کے کسی اثر کے ازالے سے ادنیٰ تعلق بھی نہیں تھا۔ یہ اس سے بالکل بے تعلق ایک مثبت مضمون شان صحابہؓ پر تھا۔ مضمون کی اس خامی پر مزید توجہ دلائی گئی تب آپنے ایک دوسرا مستقل مضمون اسی تبصرے کے حوالے سے تحریر فرمایا۔ مگر اُس کا مقصد مضمون کی تمہید میں از خود ہی یہ بیان کیا گیا تھا کہ عبداللہ عباس صاحب کے تبصرے سے "ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے ندوۃ العلماء کے بانیوں' ذمہ داروں اور کارکنوں کے بارے میں وضاحت کی ضرورت سمجھی گئی ہے جو پیش نظر ہے" ظاہر ہے کہ اس تمہید اور بیان غرض و غایت کے بعد اس مضمون کے اندر عبداللہ صاحب کے خیالات کی تردید کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا تھا چنانچہ وہ ناپید تھی۔ البتہ بالکل بے جوڑ اور بے ربط طور پر ایک ایسی چیز اسکے اندر آ گئی تھی جس سے عبداللہ عباس صاحب کے تبصرے کی فی الجملہ تائید

اور اُن سے یکجہتی کا اظہار ہو۔ مولانا جیسی معتبر اور معتمد دینی شخصیت کی طرف سے اس حیرت انگیز رویّے کا اظہار ظاہر ہے کہ کوئی نظر انداز کی جانے والی چیز نہیں ہوسکتی تھی چنانچہ اس پر اپنی حیرت کا اظہار بھی کیا گیا اور اسکی بھی ضرورت سمجھی گئی کہ اس رویّے کی تہ میں کام کرنے والے اسباب کی کھوج لگائی جائے۔ اس کھوج میں مذکورہ مضمون کے تجزیے، مضمون سے باہر کے کچھ واقعات کی شہادت اور مولانا کی بعض تحریروں پر نظر نے ہمیں اس نتیجے پر پہنچایا کہ عبداللہ عباس صاحب کے جن خیالات کی تردید سے مولانا محترم گریزاں ہیں وہ بظاہر خود اُن کے بھی خیالات ہیں۔ فرق اگر ہوگا ۔۔ اور غالباً ضرور ہوگا ۔۔ تو وہ تعبیر و تفصیل کا ہوگا۔

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ امت مسلمہ کے اندر تنقید و احتساب کے عمل کی جو ضرورت و اہمیت بلکہ غیرت و عظمت خود مولانا مدظلہ کی مذکورۂ بالا تحریر سے ثابت ہوتی ہے، اسکے بعد ہماری مذکورہ تنقید پر صرف تنقید ہونے کی حیثیت سے چیں بجبیں ہونے کا کس کو حق ہے، ہاں جس چیز کا حق ہے اور جو چیز مولانا کی اس تحریر کی روشنی میں معقول ہوسکتی ہے وہ یہ ہے کہ یا تو ثابت کیا جائے کہ مولانا عبداللہ عباس صاحب کے اُن خیالات کی تردید فرمائی ہے جن کی تردید کی ضرورت کی طرف مولانا کو توجہ دلائی گئی تھی۔ اور مولانا نے اس ضرورت سے انکار بھی نہیں فرمایا۔ یا پھر یہ ثابت کیا جائے کہ مولانا کے تردید نہ فرمانے (بلکہ ایک خاص انداز سے تائید و حمایت فرمانے) سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ یہ تبصرہ مولانا کے خود اپنے جذبات و خیالات سے ہم آہنگ بلکہ انہی کی ترجمانی تھا۔ اور یہ کہ اس نتیجے کے سلسلے میں جن دلائل اور شواہد و قرائن سے مدد لی گئی ہے وہ ناکافی یا بے بنیاد ہیں۔ الفرقان بابت مئی و جون ۱۹۹۲ء کی اشاعت خاص کے بعد ندوہ اور بیرون ندوہ ہر میدان میں۔ مولانا کے دست راست، اُنکے بھانجے اور میرے قدیم دوست مولانا سید محمد رابع ندوی سے اس معاملے میں تقریباً تیس صفحات پر مشتمل خط و کتابت ہوئی مولانا رابع صاحب کی سب سے بڑی شکایت یہی تھی کہ عبداللہ عباس صاحب کو جو کچھ کہنا تھا کہتے خالِ معظم کو اس معاملے میں کیوں گھسیٹا گیا؟ شکایت کے طویل جواب میں ایک مختصر بات یہی لکھی گئی تھی کہ ......

"اُس باب میں شکایت اور خفگی کی واحد معقول صورت یہ ہے کہ جو اسباب اس جرأت و جسارت (یعنی تنقید) کے بتائے گئے ہیں اُن کا بے بنیاد یا ناکافی ہونا ظاہر کیا جائے یا (کم از کم) طرزِ کلام کا قابلِ اعتراض ہونا..."

ایک اور اہم بات

اس سلسلے میں ایک بات اور بھی غور طلب ہے کہ جہاں تک عبداللہ عباس صاحب کے اُن خیالات کا تعلق ہے جنکی اہلسنت کے نقطۂ نظر سے سنگینی کی طرف مولانا علی میاں صاحب کو توجہ دلائی گئی، اور جن کے سلسلے میں یہ ساری بحث ہے' اُن خیالات کے سلسلے میں خود ندوے کے حلقے میں بھی سوائے حضرت مولانا علی میاں صاحب کے کوئی ایک آدمی ہمیں نہیں معلوم جو ان خیالات سے براءت اور بیزاری میں تأمل کرتا ہو۔ حد یہ ہے کہ خود عبداللہ عباس صاحب نے ایک چیختی چلاتی وضاحت کے ذریعے لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ وہ ان خیالات سے رجوع کر چکے ہیں اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ مولانا علی میاں صاحب کو ان خیالات سے براءت اور بیزاری کے ہلکے سے ہلکے اظہار میں بھی جو تأمل رہا۔ اسکی وجہ اگر یہ نہ سمجھی جائے کہ مولانا ان خیالات کو غلط ہی نہیں سمجھتے تو پھر اُنکے رویّے اور انکے موقف کی توجیہہ کیلئے کیا اسکے سوا کوئی دوسری صورت رہ جاتی ہے کہ وہ غلط سمجھتے ہوئے بھی اور یہ مانتے ہوئے بھی کہ اہلِ سنت کے نقطۂ نظر سے ایسے خیالات قطعاً ناقابلِ قبول ہیں آنکی تردید تو کیا، ان سے براءت بھی اپنے لئے ضروری نہیں سمجھتے؟ اگر کوئی تیسری صورت بھی اس معاملے کی توجیہہ میں نکالنا ممکن ہے تو لوگ ہمیں بتائیں۔ ورنہ غور کریں کہ ہماری اختیار کردہ توجیہہ بہتر ہے جس میں مولانا بہر حال ایک صاحبِ ضمیر انسان رہتے ہیں؟ یا وہ دوسری توجیہہ جو اسے ترک کرنے کی شکل میں اختیار کرنا پڑے گی؟ یعنی یہ کہ مولانا پورے عقیدۂ اہلِ سنت کے ساتھ علمائے اہلِ سنت میں ہوتے ہوئے بھی، کسی وجہ سے اسکے لئے تیار نہیں ہیں کہ اُنکے زیرِ انتظام ادارے کے اندر ایک ذی منصب شخص کے قلم سے ادارے کے پرچے میں عقیدۂ اہلِ سنت کے سو فی صد خلاف جو اظہارِ خیال ہوا اُسکی تردید یا کم از کم اُس سے براءت و بیزاری کا اظہار فرمائیں! ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ دوسری صورت پہلی سے بدتر ہے۔ یہ بات کہ مولانا کا ایک خاص مزاج ہے کہ وہ ردّ و تردید کا پیرایہ پسند نہیں کرتے۔ تو اولاً تو راقم کی کتاب کے سلسلے میں مولانا نے اس سے پوری طرح مختلف مزاج کا مظاہرہ فرمایا ہے۔ ثانیاً یہ عذر اور کسی دائرے میں معقول بلکہ محمود بھی ہو سکتا ہے لیکن دین و شریعت اور خاص کر اعتقادی معاملات میں مولانا جیسی پوزیشن کے حضرات کیلئے یہ عذر ذرا بھی قابلِ قبول نہیں۔ کوئی اسکا جواز نہیں بتا سکتا۔ اور مسائل کسی بڑے کیلئے بدلتے نہیں بلکہ اور زیادہ سخت ہو جایا

مرحوم مولانا مطلوب الرحمٰن ندوی نگرامی

تصویر کا دوسرا رُخ

[آج سے پچاس، باون سال پہلے کی بات ہے کہ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے ایک سلسلۂ مضامین "امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی" کے عنوان سے الفرقان میں شروع فرمایا تھا. اس میں بنو امیہ کی حکومت کے بارے میں مولانا مرحوم کا قلم بہت تیز چلا. شبلی اسکول کے فاضل مولانا مطلوب الرحمٰن صاحب ندوی نگرامی مرحوم نے اس پر اس عنوان سے تعاقب فرمایا کہ مولانا نے بنو امیہ کی یک رُخی تصویر پیش کی ہے اور وہ بھی جذباتی مبالغے کے ساتھ. — زمانے کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ آج شبلی اسکول (ندوہ) ہی سے مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب والے موقف کی حقانیت پر اصرار ہو رہا ہے. مناسب معلوم ہوا ہے کہ اس میں اعتدال کیلئے مولانا نگرامی مرحوم کے مضمون کا متعلقہ حصہ آج دوبارہ شائع کر دیا جائے —— مدیر]

.... اس میں شک نہیں کہ بنی اُمیہ کے دور میں خلفائے راشدین کا تقویٰ، زہد، ایثار، کسرِ نفس، خوفِ خدا، ذمہ داریوں کا احساس موجود نہ تھا، خلافت اب خدمتِ خلق کا نام نہ تھا، بلکہ خلافت ملوکیت اور شہنشاہیت کا نام تھا لیکن با اینہمہ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ خلفاء بنی اُمیہ رعایا پروری، خلق کی عام راحت رسانی، تمدنی و معاشرتی اصلاحات علوم و فنون کی خدمت، دین و مذہب کی اشاعت سے غافل نہ تھے. اب اگر اُن کی زندگی میں نقائص کا پہلو بھی پایا جاتا ہے تو اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ اُن کی زندگی کے صرف نقائص ہی کو منتشر عام پر لاکر تاریخ اسلام کے ایک طویل سلسلہ کو گندہ کر دکھایا جائے کاش مولانا کا قلم جہاں انکے نقائص کو جمع کرنے کیلئے گردش میں آیا انکے ان محاسن کی طرف بھی توجہ کر سکتا جسکے لئے مسلمان قیامت تک ممنون و احسانمند رہیں گے نقائص کے اظہار کیلئے بھی مولانا جیسے ثقہ عالم کو یہ زیبا نہ تھا کہ وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر گردشِ قلم کے پابند ہو جائیں اور قلم سے جو کچھ نکل جائے اُس پر دوبارہ نظرِ ثانی نہ فرمائیں کاش مولانا کسی ماہرِ نفسیات کے اس قول کی طرف توجہ فرما سکتے.

عیب او جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

مولانا بنی امیہؓ کے مثالب میں رقمطراز ہیں:۔

"امام (ابو حنیفہ) کی ولادت یا سعادت بنی امیہ کے اس عہد میں ہوئی تھی جب سارا عالم ان کے خونچکاں مظالم سے تھرّا رہا تھا دنیا کے ان متوالوں سے وہ سب کچھ سرزد ہو چکا تھا جس کی نظیر اسلام ہی کیا شاید تاریخ عالم میں موجود نہیں فرات کے ساحل پر اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نواسے اور ان کے خاندان کے پیاسے شہیدوں کے بہتے ہوئے لہو سے یہ اپنی حرص و آز کی پیاس بجھا چکے تھے رسول کا منوّر و پاک شہر حرّہ کے واقعہ میں لٹا جا چکا تھا اور اس بری طرح لوٹا جا چکا تھا کہ جان و مال ہی نہیں عصمتیان حرم کی آبرو و ناموس تک کی پروا نہیں کی گئی رسول کی مسجد میں سعید بن مسیّب کے سوا ایک زمانہ تک نماز پڑھنے والا کوئی باقی نہیں رہا تھا اللہ کا گھر کعبہ تک بھی دنیا طلبی کی اس بھٹی کی چنگاریوں سے نذرِ آتش ہو چکا تھا جو اس خاندان کے سینوں میں جل رہی تھی خلافتِ اسلامی کے پہلے خلیفہ کے نواسے حضرت عبداللہ بن زبیر بیت اللہ کی چوکھٹ پر اُن ہی کے ہاتھوں خاک و خون میں تڑپ چکے تھے (ظالم الامتہ) حجاج کی بے پناہ تلوار لاکھوں مسلمانوں کی گردنیں معمولی باتوں میں اُڑا چکی تھی جن میں جلیل القدر صحابہ اور تابعین بھی شامل تھے۔

الغرض بنی اُمیہ اور ان کے سنگدل و سیاہ دل ولاۃ (گورنروں) کی بدتمیزیوں کے اس بے پناہ طوفان نے ایک ایسا دہشت ناک مہیب منظر دنیائے اسلام میں قائم کر دیا تھا کہ ہر ایک اپنی اپنی جگہ دم بخود تھا"

بنی امیہ کے مثالب میں جس چیز کو مولانا گیلانی نے بہت دردانگیزی کے ساتھ رقم فرمایا ہے وہ حادثۂ کربلا" واقعۂ حرّہ" اور حضرت عبداللہ بن زبیر کا واقعۂ شہادت ہے" اس میں شک نہیں ہے کہ یہ واقعات مسلمانوں کے ادبار و نکبت کے آثار و علامات میں ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان حادثات کا سراسر ذمہ دار بنی اُمیہ ہی کو قرار دے کر اُن کو "دنیا کا متوالا" نواسۂ رسول کے خون سے حرص و آز کی پیاس بجھانے والا، "دنیا طلب" "بدتمیز" کہنا کہاں تک قرینِ انصاف ہے؟ مولانا نے حادثۂ کربلا کی طرف اشارہ جن الفاظ میں

کیا ہے علماء اہلسنت کے نزدیک یہ انداز کسی طور پر محمود نہیں کہا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنی تصنیف "حسین و یزید" میں تفصیلی طور پر علماء حق کے طرز عمل کو واضح کیا ہے جہاں کسی افراط تفریط کی گنجائش نہیں رکھی ہے میں اس وقت قصداً حادثۂ کربلا کی تفصیلات میں نہیں پڑنا چاہتا کہ بارہا اس واقعہ کی تفصیلات مسلمانوں کے سامنے آچکی ہیں۔ اور یہ امر پایۂ تحقیق کو پہونچ چکا ہے کہ حضرت حسینؓ کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں بڑا دخل خود اُن کے معاونین شیعان علیؓ کو تھا۔

واقعہ حرّہ میں بے شک تین دن تک باشندگان مدینہ کو مصائب کا سامنا رہا اور یزید کی فوجیں اپنا تسلط قائم کرنے کیلئے سرگرم پیکار رہیں لیکن کیا مولانا نے اس پر غور فرمانے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ آخر واقعہ حرّہ پیش کیوں آیا ارباب تاریخ لکھتے ہیں کہ ۶۳ھ میں اہلِ مدینہ نے عثمان بن محمد بن ابی سفیان والی مدینہ کو جو بنی امیہ کی طرف سے مدینہ پر مقرر تھے عضو معطل بنا دیا اور عبداللہ بن حنظلہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی بنی امیہ کے افراد کو جو مدینہ میں موجود تھے ہر طرف سے گھیر لیا یہ مروان کے گھر میں محصور ہو گئے ان کی تعداد حالانکہ ایک ہزار تھی لیکن اہل مدینہ کے جم غفیر کے سامنے یہ ایک ہزار کی جمعیت بے حقیقت تھی یزید کو خبر پہنچائی گئی اُس نے اہل مدینہ کے اس طرز عمل پر افسوس کیا اور حسرت سے کہا ؎

لقد بدّلوا الحلم الذی فی سجیتی   فبدّلت قومی غلظۃً بلیان   (تاریخ کامل جزء ۴ صفحہ ۴۴)

میں نے اپنی طبیعت میں جس طرح حکومت کرنے کا فیصلہ کیا تھا (مدینہ کے) لوگوں نے (اپنے طرزِ عمل سے) اس کو بدل دیا پس میں نے بھی اپنی قوم کی نرمی کو سختی سے بدل دیا۔

پھر اُس نے مسلم بن عقبہ کو حکم دیا کہ فوج لے کر مدینہ پہونچیں اور بنی اُمیّہ کو اہلِ مدینہ کے شدائد سے نجات دلائیں لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی تاکید کر دی:-

ادع القوم ثلاثا فان اجابوك   انھیں تین مرتبہ صلح اور اطاعت کی دعوت
والا فقاتلھم۔ (تاریخ کامل جزء ۴ صفحہ ۴۵)   دینا اگر وہ مان جائیں تو بہتر ورنہ پھر جنگ کرنا۔

پھر کہا:-

فاذا مضت الثلاث فاکفف   جب تین دن گزر جائیں تو جنگ روک دینا

عن الناس وانظر علی بن الحسین	علی بن حسین کا خیال رکھنا اور انکی ایذا رسانی
فاکفف عنہ واستوص بہ خیراً فانّہ	سے باز رہنا اُن سے اچھی طرح پیش آنا کیونکہ
لم یدخل مع النّاس وانہ قد اتانی	وہ اس معاملہ میں لوگوں کے ساتھ شریک نہیں
کتابہٗ۔ (تاریخ کامل جزء ۴ ص۴۵)	ہیں ان کا خط میرے پاس آگیا ہے۔

مسلم بن عقبہ فوج لے کر مدینہ روانہ ہوئے اس وقت اہلِ مدینہ کا جو رویہ بنی اُمیّہ کے محصورین کے ساتھ تھا اس کو مؤرّخ ابن اثیر لکھتے ہیں :۔

فبلغ اھل المدینۃ خبرھم فاشتد	جب اہلِ مدینہ کو مسلم بن عقبہ کے آنے کا حال
حصارھم لبنی امیہ بدار مروان	معلوم ہوا تو انھوں نے بنی امیہ پر اپنا محاصرہ
وقالوا واللہ لانکفّ عنہ حتّٰی نستنزلکم	اور سخت کر دیا اور محصورین سے کہا خدا کی قسم
ونضرب اعناقکم او تعطونا عھد	ہم تم سے باز نہ رہیں گے یہاں تک کہ تم کو ذلیل
اللہ ومیثاقہ ان لاتبغونا غائلۃ	کر دیں تمہاری شان و شوکت خاک میں ملا دیں
ولاتدلوا لنا علٰی عورۃ ولاتظاھروا	اور تمھاری گردنیں اُڑا دیں ہاں اگر تم ہم سے
علینا عدوًّا فنکفّ عنکم ونخرجکم	بحلف وعدہ کرو کہ اب ہماری دشمنی نہ کروگے
عنّا۔ (تاریخ کامل جزء ۴ ص۴۵)	ہمارے ممالک محروسہ پر حملہ آور نہ ہوگے اور
	ہم سے مقابلہ نہ کروگے تو ہم تمھیں یہاں سے
	نکال دیں گے۔

مسلم بن عقبہ مدینہ پہونچے تو اہلِ مدینہ کو مخاطب کر کے کہا :۔

انّ امیرالمومنین یذھم انّکم	امیرالمومنین آپ لوگوں کو شریف سمجھتے
الاصل وانی اکرہ اراقۃ دمائکم	ہیں اور میں بھی آپ کا خون بہانا بُرا سمجھتا
وانی اُجلّکم ثلاثاً فمن ارعوٰی	ہوں، لہٰذا میں تین دن کی مہلت دیتا ہوں
وراجع الحق قبلنا منہ	پس جو اپنے طرز عمل سے باز آجائے گا اور

وانصرفت عنکم۔	راہ حق اختیار کرے گا میں اُس سے اس کو
(تاریخ کامل جز ۴ صفحہ ۴۶)	قبول کروں گا اور واپس چلا جاؤں گا۔

جب تین دن گزر گئے تو مسلم بن عقبہ نے ایک موقع پھر صلح جوئی کا نکالا اور قبل اس کے کہ مدینہ پر حملہ کرے اہلِ مدینہ سے پوچھا:۔

یا اھل المدینۃ ما تصنعون تسالمون	اے اہلِ مدینہ تم نے کیا فیصلہ کیا؟ کیا کرو گے؟
ام تحاربون فقالوا بل نحارب۔	جنگ یا صلح؟ اہلِ مدینہ نے جواب دیا
(تاریخ کامل جز ۴ صفحہ ۴۶)	ہم جنگ کریں گے۔

مسلم بن عقبہ نے پھر کہا:۔

لا تفعلوا بل ادخلوا فی الطاعۃ۔	ایسا نہ کرو بلکہ اطاعت قبول کرو۔

(تاریخ کامل جز ۴ صفحہ ۴۶)

اہلِ مدینہ اپنی ضد پر قائم رہے بالآخر جنگ شروع ہوئی اور تین دن تک معرکہ ہوتا رہا بیشک مسلم بن عقبہ نے اپنا تسلط قائم کرنے کی ہر تدبیر کی البتہ "عصمتیانِ حرم کی ناموس" کے متعلق مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اُسکے وہی ذمہ دار ہیں ــــــ اب حالات آپ کے سامنے ہیں اسی کو واقعۂ حرّہ کہا جاتا ہے آپ ہی فیصلہ کریں کہ ان واقعات کے پیش نظر بالکلیّہ بنی اُمیّہ ہی کو قصور وار ٹھہرا کر ان کے لئے (جن میں بہت سے تابعی اور صحابی بھی تھے) غیر شائستہ الفاظ کا استعمال کہاں تک مناسب ہے ــــــ؟

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!

حضرت عبداللہ بن زبیر کے واقعہ شہادت اور استحلال کعبہ کے ذکر میں بھی مولانا نے صرف جذبات ہی سے کام لیا ہے اور اصل حالات کی تحقیق سے آنکھیں بند کر کے سارا الزام بنی اُمیّہ ہی کے سر رکھدیا ہے حالانکہ واقعات تاریخ میں تفصیلی طور پر موجود ہیں اگر مولانا تحقیق کی زحمت فرماتے تو حالات روز روشن کی طرح سامنے آجاتے مولانا نے شہادت عبداللہ بن زبیر اور استحلال کعبہ کے سلسلہ میں بنی اُمیّہ پر جو اعتراض فرمایا ہے حسنِ تو ارد ملاحظہ فرمایئے کہ مشہور دشمن اسلام جرجی زیدان نے "التمدن الاسلامی"

میں یہی اعتراض بنی اُمیہؓ پر کیا تھا اُس دور کے عالم محقق حضرت علامہ شبلیؒ نے تاریخ کی روشنی میں اعتراض کی اصل حقیقت واضح کردی تھی امام تاریخ حضرت علامہ شبلیؒ الانتقاد میں لکھتے ہیں:۔

ان ابن الزّبیر ادّعی الخلافۃ	حضرت ابن زبیر دعویدار خلافت بن کر حرمین
فملک الحرمین والعراق	اور عراق پر قابض ہو گئے تھے اور قریب تھا کہ
وکاد یغلب علی الشام وکان	وہ شام پر بھی قابض و متصرف ہوجائیں اُن کا
امرہ کلّ یومٍ فی ازدیادٍ۔	اثر و اقتدار روز بروز ترقی پر تھا۔

آگے لکھتے ہیں:۔

ان ابن الزبیر لمّا استولی علی الحرمین	حضرت ابن زبیر جب حرمین پر قابض ہو گئے
اخرج بنی امیّۃ من المدینۃ فخرج	تو بنی امیہ کو مدینہ سے نکال دیا چنانچہ مروان
مروان وابنہ عبد الملک	اور عبد الملک بھی مدینہ سے نکلے اور عبد الملک
وھو علیل مجدّر فاستولی علی	اُن دنوں چیچک میں مبتلا تھے انھوں نے شام میں اپنی
الشام وصدرت من ابن الزّبیر	حکومت قائم کی اسکے علاوہ حضرت ابن زبیر
افعال نقموا علیہ لاجلھا فمنھا	سے بعض ایسے افعال کا صدور ہوا جو لوگوں کیلئے
انّہ تحامل علی بنی ھاشم واظھر	باعث ناگواری ہوئے اور جنکی وجہ سے لوگوں نے
لھم العداوۃ والبغضاء حتّٰی	اُن پر اعتراضات کئے ازانجملہ یہ کہ ابن زبیر نے
انہ ترک الصلوٰۃ علی النّبی	بنی ہاشم کی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت
فی الخطبۃ ولمّا سألوہ عن	نہیں کیا یہاں تک کہ خطبہ میں نبی صلی اللہ
ھٰذا قال ان للنبی اھل سُوءٍ	علیہ وسلم پر درود وسلام پڑھنا بند کر دیا اور
یرفعون رؤسھم اذا سمعوہ۔	جب لوگوں نے اُن سے اسکی وجہ دریافت کی

ہے۔ (الجزء الثانی من الیعقوبی ص۳۱) تو کہا (اس عہد میں) نبی کے اہل خاندان بُرے لوگ ہیں جب خطبہ میں نبی پر درود وسلام سنتے ہیں تو (کبر و نخوت سے) اپنا سر اونچا کرتے ہیں۔

ومنها انّه هدم الكعبة ومع ان
هدمها لم يكن الا لترميمها واصلاحها
ولكن لم يكن هذا ما الوفا للناس
ولذا الله تحرّز النبي عليه السلام
عن ادخال الحطيم في الكعبة
فاتخذ الحجاج هذه الامور وسيلة
لاغراء الناس على ابن الزبير
ولعلّ ابن الزبير كان مضطرًّا
الى هذه الاعمال ولكن من
شريطة العدل ان نوفّي كل واحد
قسطه فاذا اعتذرنا لابن الزبير
فعبد الملك احق منه اعتذارًا
فان ابن الزبير هو البادي والبادي
اظلم ويظهر من هذا انّ عبد الملك
ما اراد الحط من شان الكعبة
ومتى شرفها ولكن اضطر الى
قتال ابن الزبير فوقع ما وقع عرضًا
غير مقصود بالذات ولذلك
لما نصب الحجاج المنجنيق على
الكعبة حوّلها عن الكعبة وجعل
للغرض الزيادة التي زادها

اُن امور میں سے جنھوں نے لوگوں کو حضرت
ابن زبیر کی مخالفت پر آمادہ کیا کعبہ کا گرانا
بھی تھا ہر چند کہ حضرت ابن زبیر نے کعبہ کو اسکی
از سر نو تعمیر و اصلاح کے لئے منہدم کیا تھا
لیکن لوگ اس کو ناپسند کرتے تھے اسی لئے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود
حطیم کو کعبہ میں ملا لینے کی خواہش کے اسکے
انہدام سے احتراز فرمایا حجاج نے انھیں
اُمور کو اچھال کر لوگوں کو حضرت ابن زبیر
کے خلاف اُبھارا اور شاید حضرت ابن زبیر
نے مجبوراً یہ سب کچھ کیا لیکن (اسکو ماننے ہوئے)
تقاضائے انصاف یہی ہے کہ ہم فریقین کے
معاملات میں عدل سے کام لیں پس اگر ہم
حضرت ابن زبیر کو معذور سمجھ سکتے ہیں تو
عبدالملک زیادہ مستحق ہیں کہ معذور سمجھے جائیں
کیونکہ (زیادتی کی) ابتدا حضرت ابن زبیر
ہی نے کی تھی اور پہل کرنے والا زیادہ ظالم
ہوتا ہے اس سے یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ
عبدالملک نے کعبہ کی بے حرمتی کا قطعاً قصد
نہیں کیا بلکہ وہ ابن زبیر سے جنگ کر رہے
تھے اور مقصود بالذات ابن زبیر ہی تھے پس کعبہ کو

ابن الزبیر صرّح بذالک العلّامۃ البشاری فی احسن التقاسیم۔

جو نقصان پہونچا وہ بالکل غیر ارادی طور پر (محض اس لئے کہ عبداللہ ابن زبیر نے کعبہ میں پناہ لی تھی۔)

ثمران من مسائل الفقہان البغاۃ اذا تحصّنوا بالکعبۃ لا یمنع ھٰذا عن قتالھم ولذالک امر النبی فی وقعۃ الفتح بقتل احد ھم وھو متعلق باستار الکعبۃ وابن الزبیر کان عند اھل الشام من البغاۃ والمارقین عن الدین۔

چنانچہ حجاج نے اس سلسلہ میں اس قدر احتیاط برتی کہ جب کعبہ پر منجنیقیں نصب کی ہیں تو اصل کعبہ سے اُس کا رُخ پھیر کر اُس زمین کی طرف کر دیا جو ابن زبیر نے کعبہ کو وسیع کرنے کے لئے خود اس میں شامل کی تھی۔ علامہ بشاری نے احسن التقاسیم میں اس کی تصریح کی ہے۔ پھر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ مسائل فقہ میں یہ تصریح موجود ہے کہ باغی جب کعبہ میں پناہ گزیں ہو جائیں تو اُن کی یہ پناہ گزینی جنگ و قتال سے روک نہیں سکتی اسی لئے رسول اللہ نے فتح مکہ میں ایک کافر کے جو غلاف کعبہ پکڑے ہوئے کعبہ میں پناہ گزیں تھا قتل کرنے کا حکم دیدیا تھا اور حضرت ابن زبیر بھی اہل شام کے نزدیک باغی تھے۔

ولوکان اراد الحجّاج الاستھانۃ بالحرم فما کان مرادہ من رمّتہ واصلاحہ بعد قتل ابن الزبیر ومعلومٌ ان تعمیر الحجاج ھو الیوم کعبۃ الاسلام وقبلۃ المسلمین کافۃ۔

اور اگر حجاج نے حرم کی اہانت کا ارادہ کیا تھا تو ابن زبیر کے قتل کے بعد اُس نے خانہ کعبہ کی اصلاح و تعمیر کیوں کی درانحالیکہ حجاج ہی کی تعمیر تمام مسلمانوں کا قبلہ ہے۔

علامہ شبلی مرحوم آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

قدمنا ان الکعبۃ لم تکن غرضًا

ہم اس کا پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں کہ حجاج کی

للحجّاج وانما كان نصب المناجيق	غرض کعبہ مکرمہ کی اہانت نہ تھی اور اسی لئے
على الزيادة الذى زادها ابن	اس نے اصل کعبہ کو چھوڑ کر اس حصہ عمارت کے
الزبير ولمّا كانت متّصلة	رُخ پر منجنیقیں نصب کی تھیں جس کو حضرت
بالكعبة نال الاحجار من الكعبة	ابن زبیر نے از خود کعبہ میں شامل کر لیا تھا
ولكن بعد ما انتهى القتال	لیکن چونکہ یہ کعبہ سے متصل تھی اس لئے
اوّل ما فعله الحجّاج كان	پتھر کعبہ مکرمہ میں بھی پہونچے اور اسکو نقصان
امره يكنس المسجد الحرام۔	پہونچا لیکن جب جنگ ختم ہو گئی تو سب سے پہلا حکم
	جو حجاج نے دیا ہے وہ مسجد حرام کی صفائی کے متعلق تھا۔

خلیفہ عبدالملک نے جس وقت حجاج کو حضرت عبداللہ بن زبیر سے جنگ کیلئے روانہ کیا تو اس کی فہمائش بھی کر دی تھی کہ اگر حضرت ابن زبیر امن طلب کریں اور اطاعت قبول کر لیں تو اُن سے تعرض نہ کیا جائے بلکہ ابن اثیر نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ قرطاس امان لکھ کر حجاج کے حوالہ کر دیا تھا۔

فبعثه وكتب معه امانًا لابن	حجاج کو روانہ کیا اور اس کو حضرت ابن زبیر
الزبير ومن معه ان اطاعوا۔	اور آپ کے ساتھیوں کیلئے بشرط اطاعت
(تاریخ کامل جزء ۴ ص۱۳۵)	"امان نامہ" لکھکر دیدیا۔

چنانچہ دس ہزار آدمیوں کو حجاج نے اُن کی اطاعت پر امن دے دیا جن میں حضرت عبداللہ بن زبیر کے دو صاحبزادے حمزہ اور خبیب بھی تھے۔

فلما كان قبيل مقتله تفرّق	حضرت عبداللہ بن زبیر کی شہادت سے کچھ پہلے
النّاس عنه وخرجوا الى الحجاج	لوگوں نے حضرت ابن زبیر کا ساتھ چھوڑ دیا اور
بالامان خرج من عنده نحو عشرة	حجاج سے امن طلب کیا ان لوگوں کی تعداد
الاف وكان ممن فارقه ابناه حمزة	دس ہزار تھی اور ان میں حضرت عبداللہ بن
وخبيب فاخذا لانفسهما امانًا (تاریخ کامل جزء ۴ ص۱۳۵)	زبیر کے دو صاحبزادے حمزہ اور خبیب بھی تھے۔

حضرت ابن زبیر نے چونکہ اطاعت قبول نہیں کی اسلئے جنگ ہوئی اور حضرت عبداللہ بن زبیر شہید ہوئے۔ یہ ہے حضرت ابن زبیر کی شہادت کا واقعہ کیا تقاضائے انصاف اور مقتضائے عدل یہی ہے کہ ساری ذمہ داری بنی اُمیہ کے حکمرانوں ہی کے سر رکھ دی جائے یا حالات ان تمام ذمہ داریوں کو طرفین میں تقسیم کر دیتے ہیں نیز مولانا نے یہ بھی غلط لکھا ہے کہ خانہ کعبہ کی چوکھٹ پر حضرت ابن زبیر کو شہید کیا گیا حالانکہ تاریخ کامل، تاریخ طبری اور دوسری تاریخوں میں موجود ہے کہ آپ مقام حجون میں شہید ہوئے۔

مظالم حجاج کے متعلق مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اُس کے متعلق بھی میں کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ حجاج کے جذبۂ رحم پر اس کا جذبۂ ظلم غالب تھا اسکے مزاج میں غضب کی تیزی تھی وہ اپنی سخت گیریوں میں ضرب المثل ہے لیکن ذرا اس پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر خوش حجاج کو اس ظلم و ستم پر آمادہ کس چیز نے کر دیا تھا کیا مولانا اس موقعہ پر ان بغاوتوں کو فراموش کر دینگے جو دم بدم بنی اُمیہ کے حدود سلطنت میں رونما ہو رہی تھیں جہاں تاریخ میں مولانا نے حجاج کے مظالم ملاحظہ فرمائے ہیں اُسی کے پہلو بہ پہلو ان بغاوتوں کا حال بھی تفصیل کے ساتھ موجود ہے جنھوں نے حجاج کی تلوار کو بے نیام ہونے پر مجبور کر دیا تھا غیر ذمہ دار جماعتوں کا ذکر نہیں اس سلسلہ میں علوی بزرگوں کا دامن بھی آلودگی سے پاک نہیں ہے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قرۃ العینین میں لکھتے ہیں کہ علویوں نے ایک سو مرتبہ سے زیادہ خروج کیا لیکن ہمیشہ یہ خروج سوائے خونریزی کے بے نتیجہ رہا۔

میں حجاج کی صفائی اور پاکیزگی کا ہرگز قائل نہیں لیکن میرے نزدیک مورخ اور مبصر کا فرض یہ ہے کہ وہ واقعات کا صرف ایک ہی رُخ نہ دیکھے بلکہ حالات کے استقصا کی کوشش کرے میں نے حجاج کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ملک کے ایک وسیع النظر اور بیدار مغز عالم مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تحریر سے جو ۱۲ راگست ۱۹۲۷ء کے الہلال میں شائع ہوئی ہے اس کی تائید ہوتی ہے، مولانا لکھتے ہیں:۔

عراق شروع سے شورش پسند قبائل کا مرکز تھا یہاں کی بے چینی کسی طرح ختم نہ ہوتی تھی والیوں پہ والی آتے تھے اور بے بس ہو کر لوٹ جاتے تھے لیکن حجاج بن یوسف کی تلوار نے اپنی ایک ہی ضرب میں عراق کی ساری شورش پسندی ختم کر ڈالی خود اس کے عہد کے لوگوں کو

اس پر تعجب تھا قاسم ابن سلام کہا کرتے تھے کوفہ کی خودداری و نخوت اب کیا ہو گئی؟
انھوں نے امیرالمومنین علی کو قتل کیا حسین ابن رسول کا سر کاٹا مختار جیسا صاحب جبروت
ہلاک کر دیا مگر حجاج کے سامنے بالکل ذلیل ہو کر رہ گئے۔"

میری محدود واقفیت کا جہاں تک تعلق ہے اس امر کو اسلام کے محاسن میں شمار کیا گیا ہے کہ اس نے موت کے بعد نام لے کر کسی مرنے والے کی تنقیص کی اجازت نہیں دی ہے۔ اور خصوصًا اس شخص کے تنقیص کی جس نے اپنی زندگی میں اپنے کردار پر ندامت کے آنسو بہائے جس نے خدا سے مغفرت چاہی اور جو اپنے کئے پر پشیمان ہوا ان حالات میں یزید اور حجاج بھی اسکے مستحق تھے کہ اُن کو "رسوائے زمانہ" کا خطاب مولانا نہ دیتے جیسا کہ مولانا نے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے۔ ہمیں شک نہیں کہ یزید سے زندگی میں اہم غلطیاں ہوئیں لیکن ساتھ ہی اُس کی مغفرت کی بشارت بھی زبان نبوی سے ایک طرح مل چکی ہے شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رسالہ حسین و یزید میں لکھتے ہیں کہ بخاری میں عبداللہ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

"سب سے پہلے قسطنطنیہ پر جو فوج لڑے گی اُس کی بخشش ہو گی۔"

اور معلوم ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے جس فوج نے قسطنطنیہ پر لڑائی کی اس کا سپہ سالار یزید ہی تھا، کہا جا سکتا ہے کہ یزید نے یہ حدیث سن کر ہی فوج کشی کی ہو گی بسا ممکن ہے لیکن اس سے اسکے فعل پر کوئی نکتہ چینی نہیں کی جا سکتی۔

ان حالات میں یزید کے معاملہ میں بھی زبان و قلم پر پورا قابو رکھنا ہمارے لئے ضروری ہے۔
حجاج کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد بہ عنوان "انسانیت موت کے دروازے پر" لکھتے ہیں کہ جب اسکی موت کا وقت قریب ہوا اسکو اپنے مظالم یاد آئے اور ان مظالم پر منفعل ہو کر کہنے لگا۔

ان ذنبی وزن السمٰوات والارض وظنی بخالقی ان یحابی
میرے گناہ آسمان اور زمین کے برابر بھاری ہیں مگر مجھے اپنے خالق سے امید ہے کہ رعایت کریگا

فلئن منّ بالرضاء فھو ظنی ولئن مر بالکتاب عذابی
اگر وہ اپنی رضامندی کا احسان مجھ پر کرے تو یہ اس کا احسان ہے اور یہی میری اُمید ہے

لیکن اگر وہ عدل کرکے میرے عذاب کا حکم دے۔

لم یکن ذاک منہ ظلما وھل یظلم رب یرجی لحسن ماب

تو یہ اُس کی طرف سے ہرگز ظلم نہیں ہوگا کیا یہ ممکن ہے کہ وہ رب ظلم کرے جس سے صرف
بھلائی ہی کی توقع کی جاتی ہے۔

پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا یہ موقع اس قدر رقت انگیز تھا کہ مجلس میں کوئی بھی اپنے آنسو نہ روک سکا ابو منذر نے جب حجاج کو مرض الموت میں اسکے مظالم پر بہت زیادہ فضیحت کی اور بہت سخت سست کہا تو راوی کہتا ہے کہ حجاج مبہوت ہو گیا دیر تک سناٹے میں رہا پھر اُس نے ٹھنڈی سانس لی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر کہا :-

الٰہی مجھے بخش دے کیونکہ یہ لوگ کہتے ہیں تو مجھے نہیں بخشے گا۔ پھر یہ شعر پڑھا ؎

رب ان العباد قد ایاسونی ورجائی لک الغداۃ عظیم

الٰہی بندوں نے مجھے نا اُمید کر ڈالا حالانکہ میں تجھ سے بڑی ہی امید رکھتا ہوں۔

حضرت حسن بصریؒ سے حجاج کا یہ قول بیان کیا گیا تو وہ پہلے تو متعجب ہوئے کیا واقعی اُس نے یہ کہا ؟ کہا گیا ہاں اُس نے ایسا ہی کہا ہے۔ فرمایا تو "شاید" (یعنی شاید اب بخشش ہو جائے) (الہلال ۱۲ اگست ۱۹۲۷ء)

غرض جو مرنے سے پہلے اپنے کردار پر اس طرح نادم ہوا اور پروردگار عالم سے معافی چاہے اس کو بُرے الفاظ سے یاد کرتے ہیں کیا ہم کو احتیاط نہ برتنا چاہیئے ؟

حضرت مولانا نے دو چار اور جزئی واقعات عمال و سلاطین بنی اُمیہ کے سلسلۂ مضمون میں درج فرما کر مثالب بنی اُمیہ کی فہرست مکمل کی ہے لیکن میں ان واقعات سے بحث نہیں کرنا چاہتا کہ میں انبیاء کرام کے علاوہ کسی کی معصومیت کا قائل نہیں یقیناً ہر شخص اور ہر جماعت میں کچھ نہ کچھ نقائص اور کچھ نہ کچھ خوبیاں ہوتی ہیں بنی امیہ کے افراد بھی اس کلیہ سے مستثنےٰ نہ تھے ان میں بھلائیاں بھی تھیں اور بُرائیاں بھی۔ البتہ میں اس امر کا مخالف ہوں کہ کسی کی بُرائیوں کو اس طور پر اُچھالا جائے کہ اسکی بھلائیاں بھی بُرائیوں کے پردے میں گم ہو کر رہ جائیں حضرت مولانا نے چونکہ بنی اُمیہ کے حق میں اسی "انصاف" کو

روا رکھا، جس سے بنی اُمیہؓ کے متعلق عام طور پر شدید اور واقعات کے خلاف بدظنی پھیلنے کا اندیشہ ہے لہذا ضروری ہے کہ اختتام کلام پر اُن کی اُن خدمات کو بھی اجمالی طور پر بیان کر دیا جائے جو مولانا گیلانی کی زبان میں ان دنیا کے متوالوں" نواسۂ رسول کے خون سے حرص و آز کی پیاس بجھانے والوں" دنیا طلب اور بدتمیزوں نے اسلام اور مسلمانوں کے حق میں انجام دی ہیں۔

قرآن کریم کی خدمت

جوں جوں عجمیوں سے اہلِ عرب کا اختلاط بڑھا اور زبان و لہجہ کے اختلاف نے تلاوتِ قرآن پر بُرا اثر ڈالنا شروع کیا حجاج بن یوسف نے اس خطرہ کا بر وقت احساس کیا قرآن کریم کے حروف پر نقطے اور اعراب لگوائے تاکہ عرب و عجم یکساں طور پر اس کی تلاوت کرسکیں اور لفظی تحریف کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ (ابن خلکان ذکر حجاج)

علامہ شبلیؒ حجاج کے اس عملِ خیر پر تحریر فرماتے ہیں:۔

وَاللہ ھٰذا اعظم میزۃ یتزبہا	خدا کی قسم یہ اسلام کے حق میں اتنی بڑی
الاسلام لا یساویہا میزۃ واعظم	بھلائی ہے کہ کوئی بھلائی اس کا مقابلہ نہیں
مِنّۃٍ من بہا علی الدین لا یوازیہا	کرسکتی اور دین پر اتنا بڑا احسان ہے کہ
منۃ۔ (الانتقاد ص۴۲)	اس احسان کے برابر کوئی احسان نہیں ہو سکتا۔

پھر حجاج نے اعراب اور نقطے لگوا کر قرآن کے بہت سے نسخے مختلف دیار و امصار میں بھجوائے۔ ولید لوگوں کو انعام و اکرام دیکر حفظ قرآن پر آمادہ کرتے تھے اور جو لوگ حفظِ قرآن میں سستی کرتے تھے انھیں سزا دیتے تھے چنانچہ ولید کے زمانہ میں حافظوں کی تعداد حدِ شمار سے خارج ہو گئی تھی۔

فنِ تفسیر "بنی امیہؓ" ہی کے زمانہ میں "مدوّن ہوا" "ابن جبیرؒ" پہلے مفسر ہیں جنھوں نے سب سے پہلے عبد الملک کے کہنے سے تفسیر کو کتابی شکل میں جمع کیا ان کے بعد مجاہد نے عبد الملک کے ہی حکم پر یہ خدمت انجام دی۔ (میزان الاعتدال ذہبی)

حدیث وفقہ کی خدمت

جس طرح سلاطین بنی اُمیہ کو قرآن کریم کی نشر و اشاعت سے غایت درجہ شغف تھا اسی طرح حدیث و فقہ کی خدمت بھی ان کا دلچسپ مشغلہ تھا جو علماء حدیث و فقہ کی خدمت میں مصروف رہتے انکے ساتھ یہ سلاطین ہمیشہ اچھا سلوک کرتے اُنکی خدمت میں ہدایا بھیجتے۔ اُن کی عزت و تکریم کرتے چنانچہ عبدالملک نے ایک مرتبہ حجاج کو جب امیر الحج بنا کر روانہ کیا تو یہ حکم دیدیا تھا کہ "مناسک" میں "ابن عمرؓ" کی تقلید کریں کیونکہ وہ بہترین فقیہ ہیں۔

حضرت مولانا گیلانی کی زبان میں "بنی امیہ کے سنگدل اور سبینہ گورنروں میں متعدد بزرگ ایسے تھے جن کے متعلق تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ اُنکے سینے علوم حدیث اور اسکے اسرار و معارف کا گنجینہ تھے۔ سالم بن عبداللہ، قاسم بن محمد، شعبی، میمون بن مہران، زہری، ایوب بن ابی تمیمہ، قبیصہ بن ذوئیب، رجاء بن حیوۃ، دربار بنی امیہ میں بہت با رسوخ تھے اور ان میں سے اکثر مختلف جگہوں پر اس حکومت کی طرف سے گورنری کے فرائض بھی انجام دے چکے ہیں ان کی زندگی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ نقل حدیث اور روایت کے امام ہیں۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اگر احادیث نبوی کو کتابی شکل میں جمع کر لیا جاتا تو انکے ضائع ہو جانے کا اندیشہ قوی تھا چنانچہ انھیں حالات کے پیش نظر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تمام دیار اسلامی میں احکام و فرامین جاری کئے۔

انظروا احادیث رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فاجمعوہ۔	سرورِ دو عالم کی احادیث جمع کرتے جاؤ۔

راس المحدثین ابوبکر بن حزم کو لکھا:۔

انظر ما کان من سُنّۃ او حدیث فاکتب لی فانی خِفتُ دروس العلم وذهاب العلماء۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث وسنت کو جمع کرو کیونکہ مجھے علم اور علماء کے مٹنے کا خطرہ لاحق ہو رہا ہے۔

چنانچہ ابوبکر بن حزم نے کئی کتابیں حدیث کی لکھیں، حضرت عمر بن عبدالعزیز لوگوں کو فرامین لکھتے اور ان فرامین میں لوگوں کو سنت و فقہ کی تعلیم دیتے۔

علم تاریخ، مغازی و سیر کی خدمت

تاریخ و سیر کی تدوین بھی سلاطین بنی امیہ ہی کے ایما سے ہوئی چنانچہ وہب بن منبہ المتوفی ۱۱۴ھ محمد بن مسلم زہری المتوفی ۱۲۴ھ موسیٰ بن عقبہ متوفی ۱۴۱ھ نے اپنی کتب تاریخ بنی امیہ کے عہد میں اور انھیں کے ایماء سے لکھیں عوانہ نے کتاب التاریخ اور سیرۃ معاویہ کی تالیف کی حضرت معاویہؓ نے صنعاء سے مشہور مورخ عبید بن شریہ کو بلا کر حکم دیا کہ وہ ملوک عجم کے حالات اُن کے طرز حکومت اور اُن کے سیاسی نقطۂ نظر کے متعلق ایک مفصل تاریخ لکھیں چنانچہ انھوں نے کتاب الامثال اور اخبار الماضیین تیار کیں، ہشام کے زمانۂ حکومت میں انھیں کے حکم سے جبلہ نے شاہانِ فارس کی تاریخ کا عربی میں ترجمہ کیا۔

علم نحو و صرف کی خدمت

ابن خلکان جلد اوّل صفحہ ۲۴۰ میں ہے کہ ابو اسود دوئلی نے زیاد والیِ عراق سے اجازت چاہی کہ انھیں عربی نحو و صرف کے قواعد ترتیب دینے کی اجازت دی جائے زیاد نے اس وقت تو اجازت نہیں دی لیکن کچھ دنوں کے بعد خود زیاد ہی نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور ابو اسود دؤلی سے کہا۔

ضع للناسِ الذی نھیتك ان	ہاں اُن اصول و قوانین کو مرتب کر ڈالو
تضع لھم۔	جن کی میں نے تم کو ممانعت کر دی تھی۔

چنانچہ ابو اسود نے نحو و صرف کے قواعد مرتب کئے پھر عنبسہ بن مہران، میمون، عبداللہ حضرمی عیسیٰ بن عمر اور خلیل وغیرہ نے ابو اسود کے اصول کو تفصیل کے ساتھ لکھا یہ سارے نحوی بنی اُمیہ ہی کے دور میں گزرے۔

شعر و ادب کی خدمت

شعراء اور ارباب ادب کی ہمت افزائی بھی بنی اُمیہ کے سلاطین کی علمی خدمات کا ایک جزء ہے فرزدق، دارمی، جریر خطفی، اخطل تغلبی، عمرو بن ربیعہ قرشی وغیرہ اپنے قصائد، سلاطین و عمال کے

دربار میں پیش کرتے اور انعام پاتے۔

یہ خدمات جو علوم و دینیات سے متعلق تھیں ان پر اجمالی طور پر بحث کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن انتظامی اور رفاہی کارگزاریوں کے متعلق بھی کچھ عرض کر دیا جائے جو بنی اُمیّہ کے بدنام سلاطین و عمال کے ہاتھوں انجام پہونچیں۔

اربابِ تاریخ متفق ہیں کہ ان سلاطین نے عام رعایا کی راحت رسانی کیلئے بے شمار نہریں کھدوائیں جابجا کنوئیں تعمیر کئے، سڑکیں بنوائیں، نئے نئے شہر بسائے شفاخانے قائم کئے، جذامیوں، اندھوں، اپاہجوں، مسکینوں کیلئے بیت المال سے وظیفہ مقرر کئے ان کے کام کاج کیلئے آدمی نوکر رکھے حضرت عمرؓ کے بعد انہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ سرائے اور مہمان خانے کھولے، یتیموں کی پرورش گاہیں بنائیں اور انکے لئے معلم مقرر کئے، خرید و فروخت میں آسانی پیدا کرنے کیلئے سکہ رائج کیا غرض وہ سب کچھ کیا جو ایک بیدار مغز، رعایا پرور و خیر خواہ سلطنت اپنے زیر سایہ لوگوں کے ساتھ کر سکتی ہے، خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کے سنہرے کلس اور نادر نقش و نگار اسی بدنام حکومت کے نامۂ اعمال کا ایک جزء ہیں اسلام کی آواز انہی کے زمانہ میں عراق، عرب اور شام سے نکل کر دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلی اور انھوں نے اسلامی فتوحات کی وہ نظیر قائم کی جس کی مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہے، انہی کے زمانہ میں طرابلس، طنجہ، اندلس، دیبل، سندھ، قبرس فتح ہوئے۔ یہ اسلام کا جھنڈا لے کر چین کی سرحد تک پہونچے، تیونس اور مراکش خراسان اور فارس، طبرستان، جرجان، سجستان و خوارزم، ماوراء النہر اور افغانستان میں رأیت اسلامی انہی کے ہاتھوں لہرایا۔

یہ نہایت ہی مختصر طریقہ پر دُنیا کے ان متوالوں، سیاہ دل اور سیاہ سینہ انسانوں کی خدمات بیان کردی گئیں، سُنا ہے کہ اسلام کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ "الحسنات یذھبن السیئات" لیکن کیا معلوم کہ اس اصول سے ان تیرہ بختوں کو بھی کچھ فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جائے گا یا نہیں؟

ختم کلام پر حضرت مولانا گیلانی سے مجھے اپنی اس جرأت کی معافی مانگنا ہے اور چلتے چلتے اتنی گزارش بھی کرنی ہے

شوخی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

جناب خالد مسعود (مدیر تدبر لاہور)

صدرِ اوّل کی تاریخ کے لیے چند رہنما نکات

تدبر کی گزشتہ اشاعت میں ہم نے مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کی کتاب "واقعہ کربلا" کا تعارف کرایا تھا۔ ہمارے ایک قاری نے یہ استفسار کیا ہے کہ اس واقعہ کے بارے میں تدبر کا اپنا موقف کیا ہے۔ یہ واقعہ امت مسلمہ کے اندر اختلاف کی جڑ ہے اور اس کی توجیہات کی بڑی بحثات ہے۔ اس لئے لوگ وقتاً "فوقتاً" اس کے بارے میں استفسارات کرتے رہتے ہیں۔ ادارہ تدبر کا موضوع تاریخ نہیں ہے۔ لہٰذا ہم تاریخ کے مسائل کے بارے میں تحقیق کے دعویدار نہیں ہیں۔ تاہم ہماری رائے میں صدر اول کی تاریخ کے بارے میں بنیادی رہنمائی خود قرآن و سنت سے مل جاتی ہے۔ اس کی روشنی میں اگر مورخین کے بتائے ہوئے ان امور پر غور کیا جائے جن پر ان کا اجماع ہے تو ہمارے خیال میں حق سے قریب تر نتائج تک پہنچا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم یہاں چند نکات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مقام حاصل ہے کہ آپ کے فرضِ رسالت کی کامیابی کے ساتھ تکمیل اور دوسرے ادیان پر غلبہ کی خبر خود قرآن نے دی ہے۔ تیئیس برس کی محنت کے بعد آپ نے انسانوں کی وہ جماعت تیار کی جو قرآن کے الفاظ میں کفار کے لئے بے حد سخت اور اہل ایمان کے لئے نہایت شفیق تھی۔ اس کی تمام جدوجہد کا مقصد اللہ کی رضا کی تلاش تھی' ایمان کی نورانیت ان پاکیزہ انسانوں کی جبینوں سے ہویدا تھی اور ان کے شب و روز خدا کی محبت میں رکوع و سجود میں بسر ہوتے تھے۔ لہٰذا قرآن کو ماننے والا کوئی شخص کسی ایسے نقطہ نظر کو نہیں مان سکتا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس جماعت کو اسلام کی باغی یا ایمان سے خارج بتایا گیا ہو۔ ایسا نقطہ نظر مان لینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ اللہ اپنے فرضِ رسالت میں ناکام ماننے کے مترادف ہے۔

۲۔ قرآن مجید نے صحابہ کرامؓ کی جماعت میں سابقون اولون' مہاجرین' انصار اور بعد میں اسلام لانے والوں

کے الگ الگ درجات بیان کئے ہیں۔ پہلے گروہوں کی بطور خاص تحسین فرماتے ہوئے خبر دی ہے کہ اللہ ان کے حسن کارکردگی کے باعث ان سے راضی ہو گیا۔ ان کا صلہ اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔ قرآن کے اسی بیان کی روشنی میں صدر اول کی اسلامی حکومت اور عوام دونوں نے جماعت صحابہ کے ان طبقات کے ساتھ ہمیشہ خاص معاملہ کیا اور ان کے اکرام میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان کے بارے میں یہی صحیح رویہ ہے۔ اللہ کے ان منظورِ نظر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد علیہ ساتھیوں کے ساتھ اس کے برعکس کوئی رویہ اختیار کرنا خدا اور رسول کے ساتھ دشمنی ہے۔

۳۔ اللہ کے نبی معصوم ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ وحی الٰہی کی نگرانی میں کام کرتے ہیں۔ اگر کبھی وہ جانب حق میں بھی کوئی غلطی کر بیٹھتے ہیں تو وحی کے ذریعے ان کی اصلاح کر دی جاتی ہے۔ انبیا کے سوا اور کسی کو' خواہ اس کا تعلق صحابہ کرام سے ہو یا صلحاء و ابرار سے' وحی کا یہ تحفظ حاصل نہیں۔ لہٰذا وہ معصوم نہیں ہیں اور ان سے اجتہادی غلطیاں سرزد ہوتی رہی ہیں۔ ان کے افعال کے لئے کسوٹی قرآن و سنت ہی ہے۔

۴۔ تاریخی طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شمار سابقون اولون میں ہے اور اسلام کے لئے ان کی خدمات نہایت شاندار ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ سے قبل اسلام اور ہجرت سے مشرف ہوئے' کتابت وحی کی عزت سے سرفراز ہوئے اور اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے رومیوں پر اسلام کی دھاک بٹھائی۔ حضرت علیؓ کے صاحبزادگان کا شمار صغار صحابہ میں ہے جن کو عالم شعور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت میں رہنے اور آپ کے ہمراہ دین کے لئے جدوجہد کا موقع نہیں ملا۔ یہ جب سن رشد کو پہنچے تو اسلامی مملکت مستحکم ہو چکی تھی۔ ان اہم شخصیات کے معاملات پر غور کرتے وقت ان کے فرق مراتب کو نگاہ میں رکھنا بے حد ضروری ہے۔

۵۔ مدینہ میں اسلامی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی مملکت اسلامیہ میں اسلامی شریعت کا نفاذ ہو گیا تھا۔ منصب قضاء پر فائز لوگوں کا انتخاب اہل علم و تقویٰ میں سے ہوتا۔ پورے دور بنی امیہ میں اسلامی قانون نافذ رہا اور اس سے کوئی انحراف نہیں ہوا۔ لہٰذا اس دور میں حکومت کے ساتھ کفر و اسلام کے معرکے پیش آنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ اگر شریعت سے انحراف کی کوئی صورت پیدا ہوئی ہوتی تو اموی دور کے دو تہائی عرصہ تک بڑے جلیل القدر صحابہ ابھی زندہ تھے۔ ان کا وجود اس بات کی ضمانت ہے کہ ان کے سامنے کسی حکومت سے کفر بواح کا صدور نہیں ہوا ورنہ وہ اس کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہ کرتے۔

۶۔ حکومت میں باپ کے بعد بیٹے کا جانشین ہونا خلاف شرع نہیں۔ سیدنا عمرؓ نے اپنی جانشینی کا فیصلہ کرنے والی کمیٹی میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو بھی رکن نامزد کیا تھا۔ وہ مشورہ میں شریک تھے لیکن حضرت عمرؓ کی ہدایت کے مطابق خلیفہ نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ اس لئے نہیں کہ ایسا کرنا خلاف شرع ہوتا بلکہ اس لئے کہ حضرت عمرؓ کے بقول بار خلافت کی جوابدہی کے لئے خاندان بنی عدی میں سے تنہا حضرت عمرؓ ہی کافی تھے۔ اسی

طرح حضرت علیؓ کی جانشینی کے لئے ان کے صاحبزادے حضرت حسنؓ کا انتخاب کیا گیا حالانکہ ان سے اہل تر اور زیادہ تجربہ کار عمر صحابہ بڑی تعداد میں موجود تھے۔

۷۔ خاص واقعہ کربلا میں اس امر پر مورخین کا اتفاق ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے کوفہ جانے کے فیصلہ سے متعدد صحابہ نے اختلاف کیا۔ اس لئے نہیں کہ وہ خدانخواستہ اسلام کے بہی خواہ نہ تھے بلکہ دین کے ان وفادار و جانثار خادموں کی نگاہ میں حقائق وہ نہیں تھے جو حضرت حسینؓ کو بتائے گئے تھے۔

۸۔ اصل صورت حال سے مطلع ہو کر حضرت حسینؓ کا تین شرائط پیش کرنا بھی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اس اقدام کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے اقدام کو کفر و اسلام کے معرکہ کی حیثیت نہیں دے رہے تھے بلکہ اب وہ اس غلط فہمی سے نکل آئے تھے جس میں مبتلا کئے گئے تھے۔ ورنہ کفر کے مقابل میں اسلام کے حق میں اٹھایا ہوا قدم واپس لینے کے کیا معنی!

۹۔ جس دور میں واقعہ کربلا پیش آیا اس زمانہ کے لوگوں نے اس کو بھی کفر و اسلام کی آویزش کے رنگ میں نہیں دیکھا بلکہ اس کو ایک افسوس ناک حادثہ کی حیثیت دی۔ اس حیثیت کا تعین کرنے والوں میں بڑے جلیل القدر صحابہ شامل تھے۔

ہمارے خیال میں اس پر آشوب دور کے ہر اس مورخ کی تحقیق یقیناً قابل قدر ہے جو مذکورہ بنیادی حقائق، جو قرآن و سنت کے نصوص اور مورخین کے اجماع پر مبنی ہیں، کا لحاظ رکھ کے حقیقت کو دریافت کرنے کی سعی کرے۔ ان حقائق سے ہٹ کر جب ہم کوئی رائے قائم کرتے ہیں تو یہ امت کے اندر تفرقہ اور انتشار کا باعث ہوتی ہے۔

(ماہنامہ "تدبر" لاہور بابت ماہ اگست ۱۹۹۳ء)

بقیہ ص ۳ کا

پنے خیال میں استدلال کی قوت سے طاقتور اور مدلل کرکے لکھا جا رہا ہے کیا بے قصد و نیت کی تحریریں اسی طرح کی ہوا کرتی ہیں؟ بلکہ اسکے پیچھے کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے۔

ملک میں پھیلے ہوئے مدارس، علماء اور حساس مسلمانوں کے پیہم اصرار کے باوجود ہم اس انتظار میں تاخیر پر تاخیر کرتے رہے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ یا تعمیر حیات کی جانب سے ڈاکٹر صاحب کی اس تحریر کی تردید و برأت پر کوئی بیان آجائے لیکن ادھر سے جب بالکل مایوسی ہو گئی تو محض اظہار حق و تردید باطل کی نیت سے یہ مضمون لکھنا پڑا۔

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه وصلی اللہ علی النبی الکریم

مولانا محمد انیس الرحمٰن قاسمی
نائب قاضی امارت شرعیہ بہار واڑیسہ

تلک اور جہیز کی رسمیں

جہیز کا مفہوم

جہیز کا لفظ جب بولا جاتا ہے تو اس سے دلہن کی آرائش وزیبائش کی چیزیں مراد ہوتی ہیں۔ عربی زبان میں اس کے لئے "جہاز" کا لفظ استعمال ہوتا ہے، اور اسی سے اردو میں جہیز مستعمل ہے۔ علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ :۔

شوہر کے یہاں دلہن کو رخصت کرتے وقت جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

ان کا نام جہیز ہے۔ (تفسیر قرطبی ص۲۲۱ ج ۹)

زمانۂ رسالت میں بناؤ سنگھار کے ساتھ دلہن کی رخصتی کو "تجہیز" سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اور عرف میں اس سے کپڑے اور خوشبو وغیرہ آرائش وبناؤ سنگھار کے سامان سمجھے جاتے تھے۔ اس سے شوہر کے گھریلو ضروریات کی چیزیں جیسے بستر، پلنگ اور برتن وغیرہ عام طور پر مراد نہ لی جاتی تھیں اس لئے کہ ان چیزوں کا مہیا کرنا شوہر کے ذمہ واجب ہوتا تھا۔ اور شرعی طور پر یہ چیزیں شوہر ہی پر واجب ہیں۔

جہیز کا اسلامی تصور

علامہ قرطبی کی تصریح سے معلوم ہوا کہ جہیز میں وہی چیزیں داخل ہیں جو دلہن کی ضروریات

کے لیے اس کے باپ بھائی دیتے ہیں۔ جیسے بناؤ سنگھار کے سامان یا زیادہ سے زیادہ بستر، پلنگ، کپڑے اور برتن وغیرہ اس کے علاوہ اس سے شوہر کے استعمال کی چیزیں مراد نہیں ہوتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حضرت فاطمہؓ کو انہی کے استعمال کے سامان دیئے تھے۔ اور یہ جہیز بھی اس لیے دیا گیا تھا کہ ان کے شوہر حضرت علی مرتضیٰؓ بچپن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت میں رہتے آئے تھے۔ اور فقیر حال تھے۔ گھر میں سونے اور کھانے پکانے کا کوئی انتظام نہ تھا یہی وجہ ہے کہ آپؐ کی دیگر صاحبزادیوں کے نکاح میں اس قسم کے جہیز دینے کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔ اور خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے آپؐ کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ کا نکاح ہوا تھا۔ اور ان کی وفات کے بعد دوسری صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ کا نکاح ہوا تھا مگر انھیں جہیز نہیں دیا گیا تھا اسی طرح صحابہ کرام کے یہاں بھی نکاح میں بیٹیوں کو جہیز دینے کا کوئی رواج نہ تھا۔ بلکہ لڑکیاں صرف بناؤ سنگھار کے ساتھ رخصت کر دی جاتی تھیں۔

حضرت فاطمہؓ کا جہیز

روایات میں حضرت فاطمہؓ کی شادی اور جہیز کا واقعہ اس طرح آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تو ہجرت کے دوسرے سال آپؐ کے پاس حضرت فاطمہؓ کی شادی کے کئی پیغام آئے لیکن آپؐ نے انھیں منظور نہیں فرمایا۔ ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے نکاح کا پیغام دیں۔ اس وقت حضرت علیؓ کی عمر ۲۱ سال تھی اور وہ کنوارے تھے۔ مگر ان کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ ان جیسا فقیر حال شخص حضرت فاطمہؓ جیسی بلند مرتبت خاتون کے لیے نکاح کا پیغام دے۔ اس لیے انھوں نے حضرت عمرؓ سے کہا:-

> میرے پاس تو کچھ نہیں ہے (یعنی مہر ادا کرنے کے لیے بھی نہیں ہے) صرف ایک تلوار، ایک زرہ اور ایک سواری (اونٹ) ہے۔ (کنز العمال ۶/۳۹۲)

مگر پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اور حسنِ سلوک کا خیال کر کے جھجکتے اور شرماتے ہوئے خدمت میں گئے اور حضرت فاطمہؓ کے لئے پیغام پیش کیا۔ جسے آپؐ نے باذن خداوندی قبول فرمالیا پھر اس کے بعد ایک دن اپنے خادم خاص حضرت انسؓ کو بلا کر فرمایا کہ:۔

اے انس جاؤ۔ اور ابو بکر، عمر، عثمان، عبدالرحمٰن، سعد بن ابی وقاص، طلحہ، زبیر اور چند انصار کو بلا لاؤ۔

چنانچہ یہ گئے اور ان حضرات کو بلا کر لائے جب سب لوگ آکر بیٹھ گئے تو آپؐ نے نکاح کا خطبہ دیا اور چار سو مثقال چاندی (۱۳۱ تولہ) مہر مقرر کر کے حضرت فاطمہؓ کا نکاح حضرت علیؓ سے کر دیا۔ اور حاضرین میں چھوارے تقسیم کر دیئے گئے۔ (یا لٹا دیئے گئے)۔ (مرقاۃ ۵۷۵/۶)

اس وقت مسجد نبوی کے اردگرد ازواج مطہرات کے مکانات بن گئے تھے حضرت علیؓ کا مکان مسجد سے ملا ہوا تھا، اور اس کا دروازہ مسجد کے صحن کی طرف کھلتا تھا۔ نکاح کے کچھ روز بعد جب حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کی رخصتی چاہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:۔

پہلے فاطمہؓ کو (مہر میں) کچھ دو۔

حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔

تو آپؐ نے فرمایا کہ تمھاری حطمی زرہ کہاں ہے؟

علیؓ نے جواب دیا کہ میرے پاس ہے۔

تو آپؐ نے فرمایا کہ اسے ہی دے دو۔ (نسائی)

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت علیؓ نے وہ زرہ فروخت کی۔ اور اسکی رقم لا کر آپؐ کے سامنے رکھدی جس میں سے کچھ رقم آپؐ نے حضرت بلالؓ کو دی کہ خوشبو وغیرہ سنگھار کے سامان خرید کرلائیں۔ اور باقی سے کپڑے اور جہیز کے سامان تیار کرائے جن میں بستر، چمڑے کا تکیہ، بان کی چارپائی، دو گھڑے ایک مشکیزہ، اور چکی کے دو پاٹ تھے۔ (زرقانی ۴۷۳/۲ صفوۃ ۴/۲)

اور پھر ان سامان جہیز کے ساتھ حضرت فاطمہ کو ام ایمن کے ہمراہ حضرت علیؓ کے گھر رخصت کر دیا۔

جہیز کا مطالبہ

لیکن ان چیزوں کا جہیز میں حضرت فاطمہؓ کو دیا جانا ضرورت کی بنا پر تھا۔ اس لئے کہ حضرت علیؓ آپ کی کفالت میں تھے اور فقیر حال تھے اسی لئے یہ چیزیں سنتِ عبادت میں داخل نہیں ہیں، بلکہ ان کا شمار سنّتِ عادت وضرورت میں ہے۔ اور ان کا مطالبہ بھی درست نہیں ہے۔ بلکہ سسرال سے زیورات، کپڑے یا فرنیچر وغیرہ کا مطالبہ کرنا ناجائز ہے۔ علامہ ابن حزم کہتے ہیں کہ:

عورت کو جہیز لانے پر مجبور کرنا قطعاً جائز نہیں ہے۔ نہ مہر کی رقم سے اور نہ اسکے کسی دوسرے مال سے۔ (المحلی ۱۱/۱۱۹)

اور جب بیوی کے لئے سامان جہیز کا مطالبہ جائز نہیں ہے تو شوہر کا اپنے لئے مطالبہ کرنا اور لینا بدرجۂ اولیٰ ناجائز ہے۔ یہ بڑی بے غیرتی کی بات ہے کہ شوہر سسرال سے اپنے لئے کپڑے گھڑی اور انگوٹھی وغیرہ مطالبہ کرکے لیتا ہے۔

دلہن کے والد کو ہدیہ دینا

حالانکہ جہیز لینے کے بجائے احادیث میں سسرال والوں کو ہدیہ وتحفہ دے کر اعزاز واکرام کرنے کا جواز آیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

۱۔ جس عورت کا نکاح مہر ذکر کرکے کیا جائے یا نکاح سے پہلے ہدیہ سامان کا ذکر کیا جائے تو وہ عورت کا ہوگا۔

۲۔ البتہ اگر نکاح کے بعد کسی دوسرے کو دیا جائے گا تو اس کا ہوگا۔

۳۔ اور لڑکی کے باپ اور بھائی اس کے مستحق ہیں کہ ان کا اکرام (کچھ دے کر) کیا جائے۔ (ابوداؤد)

اس حدیث میں اس کی اجازت بیان ہوئی ہے کہ نکاح کے بعد اگر لڑکی کے والد اور بھائی وغیرہ کو ہدیہ وتحفہ دیا جائے تو یہ جائز وحلال ہوگا اور اس کا شمار حرام رسوم میں نہ ہوگا بشرطیکہ لڑکی والے نکاح کے لئے اس کا مطالبہ نہ کریں۔ (بذل ۳/۳۴۲)

لیکن اگر دلہن کے بھائی یا والد وغیرہ دولہا سے مطالبہ کرکے لیں۔ اور بغیر لئے نکاح کرنے یا رخصتی دینے پر

راضی نہ ہوں تو یہ لینا حرام ہوگا، اور رشوت کے حکم میں ہوگا۔ (بحر ۳/۲۰۰۔ ردالمختار ۲/۲۷۲)

بعض جگہوں پر آج بھی یہ رواج ہے کہ دلہن کی بہنیں اور بھائی بغیر نقد رقم لئے دولہا کو خلوت میں جانے نہیں دیتے ہیں، یہ رسم بھی اسی قسم میں داخل ہے۔

شوہر کی طرف سے جہیز کی رقم

بلکہ شوہر کا سسرال سے جہیز لینے کا پہلے رواج ہی نہیں تھا۔ یہ رواج ہندوستان میں غیر مسلموں کے اثر سے مسلمانوں میں پیدا ہوا ہے۔ ورنہ پہلے مسلم علاقوں میں یہ رواج تھا کہ شوہر نکاح سے پہلے ایک بڑی رقم دلہن کے گھر بھیجتا تھا تاکہ دلہن کے والدین اس رقم سے جہیز کا سامان خرید کر رخصتی کے وقت دلہن کے ساتھ دیں۔ یہ صورت جائز تھی۔ اور اس شکل میں شوہر کو اپنی بھیجی ہوئی رقم کے مطابق جہیز لینے کا بھی حق ہوتا تھا۔ اور شوہر اس کا مطالبہ بھی کر سکتا تھا۔ اس لئے کہ شوہر کی یہ رقم اسی کام کیلئے ہوتی تھی۔ اور یہ "ہبہ مشروط بہ عوض" سمجھا جاتا تھا۔ (ردالمختار ۲/۲۶۷)

جہیز اور تلک!

لیکن اب اسکے برخلاف جہیز کے نام پر شوہر سسرال سے نہ صرف یہ کہ کپڑے اور فرنیچر لیتا ہے بلکہ گھڑی، سائیکل، موٹر سائیکل، ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ اور ٹی وی لیتا ہے بلکہ تلک کی شکل میں مکان، دکان، زمین، باغات کا کرایہ یا الگ سے نقد رقم لیتا ہے۔ اس طرح سے لینا ناجائز ہے۔

کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے عورت یا اسکے ولی پر نکاح کے بارے میں کسی طرح کا مالی بوجھ نہیں رکھا ہے، بلکہ عورت کو مطلوب اور مرد کو طالب بنا کر مرد پر عورت کیلئے مہر دینا فرض کیا ہے لیکن جہیز اور تلک کی صورت میں مرد مہر دینے کے بجائے خود لیتا ہے، جو خدائی حکم کے بالکل الٹا ہے۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی دوسرے کا مال لینے کے بارے میں فرمایا ہے:۔

"خبردار! ظلم نہ کرو اور یاد رکھو کسی کا مال (دوسرے کے لئے) جائز نہیں ہے، جب تک کہ

اس کے نفس کی خوشی سے حاصل نہ ہو۔" (مشکوٰۃ)

مال کے بارے میں شریعت کا یہ اہم اصول ہے جو اسی حدیث میں بیان ہوا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ موجودہ زمانہ میں جہیز چونکہ مطالبہ اور نکاح کے لئے ذاتی یا معاشرتی دباؤ سے لیا جاتا ہے۔ اور دینے والے کا نفس اس پر اندر سے راضی و خوش نہیں رہتا ہے۔ اس لئے وہ ناجائز ہے۔ اور اس لئے بھی کہ یہ نکاح کے شرعی حکم کے خلاف ہے۔

تلک رشوت ہے

علماء نے اس طرح سے جہیز اور تلک لینے کو رشوت قرار دیا ہے۔ اور رشوت کا حکم یہ ہے کہ رشوت لینے والا اس مال کا مالک نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کو لوٹانا واجب ہوتا ہے (قیر ۳۲۹/۲)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں فرمایا ہے کہ :-

رشوت دینے والا اور لینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ (مشکوٰۃ)

اس طرح سے حاصل کیا ہوا مال حرام و ناپاک ہے۔ اور حرام مال کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :-

جو حصۂ بدن حرام مال سے بڑھا ہو جہنم کی آگ اس کے لئے زیادہ مناسب ہے (بیہقی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:-

اگر کسی نے کوئی کپڑا دس درہم میں خریدا اور اس میں ایک درہم بھی حرام مال کا ہے تو اس وقت تک اس کی نماز قبول نہ ہوگی جب تک کہ وہ کپڑا جسم پر رہے۔ (مشکوٰۃ)

جائز جہیز

لیکن نکاح کے بعد مطالبہ کے بغیر اگر شوہر کو سسرال سے کپڑے وغیرہ ہدیہ و تحفہ میں دیئے جائیں اور ان کا عام رواجی جہیز سے تعلق نہ ہو تو جائز ہوگا بشرطیکہ دینے والے کی نیت نام و نمود

کی نہ ہو۔ اور بخوشی و بآسانی مہیّا کرکے دیا گیا ہو۔

البتہ وہ رقم جو نکاح سے پہلے سلامی وغیرہ کے نام پر دی جاتی ہے۔ اور اس کا مقصد رشتۂ نکاح کو پختہ و مضبوط کرنا ہوتا ہے وہ عام جائز ہدیہ کی قسم میں داخل نہ ہوگی۔ اس لئے اس سے بچنا ضروری ہے۔

مگر لڑکی کو نکاح سے پہلے یا بعد دونوں صورتوں میں نقد رقم یا ہدیہ و تحفہ دینا جائز ہے جیسا کہ ابوداؤد کی حدیث میں اس کی صراحت آئی ہے فقہاء نے بھی اسکو جائز قرار دیا ہے۔ (ردالمحتار ۳۶۴/۲)

جہیز کی ملکیت

جو سامانِ جہیز عورت کو اس کے میکہ سے ملتا ہے۔ ان کا پورے طور پر وہی مالک ہوتی ہے۔ ان کی ملکیت میں شوہر کا حصہ نہیں ہوتا ہے۔ البتہ جہیز کے سامانوں میں جو سامان عورت اور مرد دونوں کے کام آتے ہیں۔ شوہر انھیں استعمال میں لاسکتا ہے جیسے فرنیچر، بستر، تولیہ اور برتن وغیرہ۔

اسی طرح جو سامان شوہر کو خوشی و رضامندی سے ہدیۃً دیئے جاتے ہیں، جیسے کپڑے اُن کا مالک شوہر ہوتا ہے لیکن ایسے سامان جو مطالبہ کرکے اور زور ڈال کر لئے جاتے ہیں یا مختلف ناموں سے جو رقم لی جاتی ہے شوہر ان کا مالک نہیں بنتا ہے۔ بلکہ دینے والے کو واپس لوٹانا واجب ہوتا ہے۔ اور اگر شوہر واپس نہ کرے تو دینے والا ان کو شرعی عدالت کے ذریعہ واپس لے سکتا ہے۔

جہیز و تلک کا نتیجہ

آج کل تلک و جہیز لڑکوں کی تعلیمی ڈگری، دولت اور سروس کے حساب سے بڑھتا اور گھٹتا ہے جس کی وجہ سے اب غریب گھرانوں کے علاوہ متوسط خاندان والوں کے لئے بھی اس کو پورا کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ بلکہ یہاں تک نوبت پہونچ گئی ہے کہ بعض لوگوں نے جن کی کئی لڑکیاں تھیں اور وہ ان کی شادی نہ کرسکے تھے شرم و عار کی بنا پر خودکشی کرلی۔ اور اکثر اونچے خاندان کی

لڑکیاں سن رسیدہ ہو جاتی ہیں. بلکہ بعض جگہ پر فطری خواہشات کے ہاتھوں مجبور ہو کر غلط راہ بھی اختیار کر لیتی ہیں۔ اور اب تو جہیز کے لئے مسلمان گھرانوں میں بھی عورت کو زندہ جلانے کی جسارت کی جانے لگی ہے۔

اسی طرح جہیز کی بڑھتی مانگ اور پھیلتی وباء نے خاندانی شیرازہ کو بکھیر دیا ہے اور ازدواجی پرسکون زندگی کی جگہ اب خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے گھریلو جھگڑے بڑھ گئے ہیں اور عورتوں پر ظلم میں اضافہ ہو گیا ہے۔

وجوہات

جہیز اور تلک کی اس پھیلتی ہوئی وباء کے کچھ اسباب و وجوہات بھی ہیں چنانچہ اسکی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مسلمانوں میں مال و دولت کی حرص بڑھ گئی ہے۔ اور جائز و ناجائز کی تمیز اٹھ رہی ہے، جو ایک خطرناک اور تباہ کن رجحان ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں جو جاہ و حشمت یا مال و دولت کے لئے نکاح کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :۔

۱ ۔ جس نے کسی عورت سے اسکی عزت (وعظمت) کیلئے نکاح کیا اللہ اسکی ذلت میں اضافہ کرے گا۔

۲ ۔ اور جس نے کسی عورت کے مال کیلئے نکاح کیا، اللہ اس کے فقر میں اضافہ کرے گا۔

۳ ۔ اور جس نے کسی عورت کے حسن کیلئے نکاح کیا اللہ اس کی دناءت میں اضافہ کرے گا۔

۴ ۔ اور جس نے کسی عورت سے نگاہ کی حفاظت شرم گاہ کی عصمت اور صلۂ رحمی کیلئے نکاح کیا اُسے یہ ملے گا:

اور اللہ ایسی عورت کو شوہر کے لئے بابرکت بنائے گا اور شوہر کو عورت کیلئے بابرکت بنائے گا۔ (کنز العمال)

اس کے علاوہ جہیز کی وجہ یہ بھی ہے کہ غیر مسلم باشندوں کے اثر سے مسلمانوں میں یہ تصور آگیا ہے کہ لڑکا افضل و باعزت ہے اور لڑکی مفضول و لائق تحقیر ہے۔ اس غلط تصور کی وجہ سے شوہر نہ صرف بیوی کو لائق تحقیر سمجھتا ہے بلکہ سسرال والوں کو بھی کمتر نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور پھر سسرال والے لڑکی کو باعزت بنانے کے لئے داماد کو جہیز و تلک دے کر خوش رکھتے ہیں۔ اگرچہ یہ دے کر بھی ان کا سر جھکا رہتا ہے۔

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ والدین نے بھی لڑکیوں کو مفضول و نیچ قرار دے کر مال و دولت میں ان کو حصہ دینا چھوڑ دیا ہے اور ان کی وفات کے بعد بھائیوں نے حصہ نہ دے کر ظلم کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ طریقہ بھی ہندوؤں کا تھا جن کے یہاں وراثت میں لڑکیوں کو حصہ نہیں دیا جاتا تھا۔ اور جو کچھ دینا ہوتا شادی ہی کے موقع پر دے کر "کنیا دان" کر دیا جاتا تھا۔ مگر اب وراثت میں حصہ نہ دینے کا ظلم مسلمانوں میں بھی آگیا ہے۔

تلک و جہیز کیسے بند ہو؟

جہیز اور تلک کی اس وبا کو روکنے اور ختم کرنے کیلئے ایک "تحریک جہاد" کی ضرورت ہے۔ اس لئے علماء اور ائمۂ مساجد کو چاہیئے کہ وہ اپنی تقریروں اور خطبوں میں ناجائز ذریعہ سے اس طرح حصول مال کی حرمت کو واضح کریں اور بتائیں کہ یہ ایک ایسا ظلم ہے جس میں معاشرہ اجتماعی طور پر شریک ہے۔

- ہر بستی اور ہر شہر میں جہیز مخالف کمیٹی بنائی جائے اور جلسے کر کے بوڑھے اور نوجوان یہ عہد کریں کہ وہ نہ خود جہیز و تلک لیں گے اور نہ ایسی حرام اور قبیح رسم والے نکاح میں شریک ہوں گے بلکہ ضرورت ہوگی تو ایسی تقریب کا بائیکاٹ کریں گے۔
- ہر طرح میں مہر معجل (نقد) کا رواج ڈالا جائے یا مہر کا کچھ حصہ معجل اور کچھ اُدھار رکھا جائے۔ اور مہر نقد ادا کیا جائے تاکہ ادائیگیِ مہر کے فریضہ پر عمل ہو۔
- نکاح مسجد میں انجام دیا جائے اور لڑکی کے یہاں بارات نہ لے جائے اور نہ کسی طرح کی عمومی دعوت کا اہتمام کیا جائے بلکہ ولیمہ کی سنّت پر عمل کیا جائے۔
- جو لوگ اپنی لڑکیوں کے لئے جہیز و تلک کی پیش کش کریں ان کے یہاں رشتہ کرنے سے پرہیز کیا جائے۔
- جہیز کا لین دین بند کرنے کے لئے دستخطی مہم چلائی جائے۔ اور تلک لینے والے سے تلک کی رقم واپس لی جائے۔

مولانا ماجد مسعود شمیم مکی

حضرت مولانا محمد مسعود شمیم صاحبؒ

ناظم و مہتمم دار العلوم حرم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ

حضرت کی ولادت باسعادت بدھ کے دن بعد فجر بتاریخ ۵ صفر ۱۳۴۹ھ مطابق ۲ جولائی ۱۹۳۰ء بمقام کیرانہ ضلع مظفر نگر یوپی اپنے آبائی وجدی مکان میں ہوئی، دادا اعظم حضرت مولانا محمد سعید صاحبؒ ناظم اول دار العلوم حرم مدرسہ صولتیہ کی تربیت میسّر آئی، اُن کی خدمت میں ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا، قرآن کریم، فارسی اور اردو کی اوّلین کتابیں دادا مرحوم سے ہی پڑھیں، عمر جب تقریباً آٹھ سال کی ہوئی تو مشفق دادا اور مربی اور معلّم اوّل مولانا محمد سعیدؒ، ۱۷ ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ مطابق ۹ جنوری ۱۹۳۹ء کو انتقال پرملال نے بہت گہرا، شدید اور غمگین اثر چھوڑا، والدہ محترمہ کاندھلہ کے جناب حکیم عبد الحمید صاحب مرحوم کی دختر نیک اختر تھیں وہ اپنے غمزدہ فرزند کو کاندھلہ لے آئیں، اس زمانہ میں والد محترم مولانا محمد سلیم صاحب مکہ معظمہ میں رہ کر دار العلوم حرم مدرسہ صولتیہ کے ناظم کے فرائض انجام دے رہے تھے، کاندھلہ آکر اسکول میں داخلہ لے کر تعلیم کا آغاز کیا اور بعض اہلِ خاندان کے افراد سے بھی استفادہ کیا، والد محترم نے ۱۹۳۹ء میں دہلی قرول باغ میں مدرسہ صولتیہ کے تعارف کیلئے صدر دفتر کے نام سے امدادی مرکز کا آغاز فرمایا، یہاں بھی اپنے والد سے استفادہ کا طویل وقت حصہ میں آیا اور باقاعدہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے منسلک ہو کر اعلیٰ تعلیم کی ابتدا کی۔

۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹۴۵ء کو مولانا محمد سلیم صاحبؒ خاندان کے متعدد افراد کو لے کر حجاز مقدس پہنچے، چنانچہ مولانا محمد مسعود شمیمؒ نے یہاں ایک نیا ماحول اور نیا انداز پایا، والد نے انکو

مدرسہ صولتیہ کے شعبۂ ثانوی میں داخل کرایا، چھ سال کے بعد ۱۳۶۷ھ میں مدرسہ کے شعبۂ عالی سے فراغت حاصل کی اور ۱۳۷۱ھ میں سند فراغت نصیب ہوئی، آپ نے اس دوران مدرسہ کے مروجہ اور معتمد نصاب تعلیم کی اہم و اعلیٰ بلکہ تمام درسی کتب "جو دینی علوم اور شرعی کتابوں پر مشتمل تھا" حاصل کیں، اساتذہ میں فضلاء مکہ معظمہ، علماء صولتیہ، بزرگان حرم اور یادگار اسلاف کا شمار ہوتا ہے جن میں علامہ شیخ حسن مشاط محدث، علامہ شیخ عمر حمدان المحرسی محدث، علامہ فقیہ شیخ عصمت اللہ بخاری، علامہ شیخ مختار مخدوم بخاری، علامہ شیخ زکریا عبداللہ بیلا، علامہ شیخ علی بکر کنوی، علامہ سید ہاشم شطاکی وغیرہ حضرات ہیں، مدرسہ سے فراغت کے بعد والد محترم نے مدرسہ ہی میں مدرسی پر مامور فرمایا، چنانچہ مختلف علوم و فنون کی متعدد کتابیں پڑھائیں، شائقین طلبہ کو خارجی اوقات میں اردو فارسی اور انگریزی کی تعلیم بھی دیا کرتے تھے جو داخل نصاب نہیں تھی، ساتھ ہی ساتھ والد محترم کی معاونت، نیابت اور انتظامی و اہتمامی امور و مشاغل میں بھی مصروف رہے، چنانچہ والد محترم اور قدیم اہل مدرسہ و ذمہ داران دفتر کی سرپرستی اور معیت بلکہ تربیت حاصل رہی، اسی زمانہ میں مدرسہ صولتیہ پر بہت شدید وقت آیا، اور بہت عظیم امتحان سے مدرسہ والے گذرے، مولانا محمد سلیم صاحب نے بڑی جانفشانی، قوت و عزم، محنت اور صبر سے مقابلہ کیا کچھ عرصہ یہی سلسلۂ درس و تدریس کا چلتا رہا، پھر رک گیا اور دفتری امور و مشاغل اور سرکاری ذمہ داریوں نے گھیر لیا، اور آپ با قاعدہ نائب مہتمم کی ذمہ داریاں سنبھالنے لگے ۱۳۷۳ھ میں آپ کو مدرسہ کا اور اوقاف مدرسہ کا شرعی متولی اور ناظم بنایا گیا۔

۱۳۸۴ھ مطابق ۱۹۶۴ء میں مرحوم حضرت جی مولانا محمد یوسف کاندھلوی امیر جماعت تبلیغ کے ہمراہ سفر ہندوستان کیا، اس کے بعد پاک و ہند کے متعدد اسفار ہوئے ۱۳۹۵ھ ۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کی پچاسی سالہ تقریب میں بھی شرکت کی، ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۸۰ء میں دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ تقریب میں بھی شرکت فرمائی، ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء میں ہندوستان و پاکستان کا ایک اور دورۂ سفر کیا، ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۸۰ء میں دہلی میں حضرت مولانا

رحمت اللہ صاحب مرحوم کیرانوی کی صد سالہ وفات کی تقریب میں ایک سیمینار منعقد کرایا، ۱۳۷۱ھ سے ۱۳۹۷ھ تک یہ پورا عرصہ والد محترم کی نگرانی اور تربیت میں گذرا جس کی مدت چھبیس ۲۶ سال ہے، ۲ر شعبان المعظم ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۸ر جولائی ۱۹۷۷ء بروز دوشنبہ والد بزرگوار مولانا محمد سلیم صاحب نے اہل مدرسہ و ملت اسلامیہ کو داغ مفارقت دیا، تو مولانا محمد مسعود شمیم نے دار العلوم حرم مدرسہ صولتیہ کے اہتمام و انتظام کا عظیم بار سنبھالا، اور آپ مدرسہ صولتیہ کے ناظم و مہتمم کہلائے جانے لگے، اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق اور مدد شامل حال رکھی، غیبی نصرت و تائید الٰہی نے ساتھ دیا، اسلاف کی برکتوں کا اثر پڑا، بزرگان دین اور اولیاء و صالحین کی دعاؤں نے چاروں طرف سے گھیرا، اور مولانا مدرسہ کی خدمات کو آگے کی طرف لے کر چلنے لگے، انکے زمانۂ اہتمام میں متعدد بار مختلف اداری و مالیاتی و تعلیمی و اشاعتی سرگرمیوں نے توسع اور انتشار حاصل کیا، دفتر مدرسہ کی متعدد خدمات میں اضافہ ہوا، موسم حج میں ہر سال حجاج کرام کی خدمات میں نئی ترتیب اور نئے انتظامات مرتب کئے گئے، تعلیمی امور میں تعیین اساتذہ اور انتخاب کتب اور داخلہ طلبہ ایک مستقل باب ہے، یکم محرم الحرام ۱۴۰۰ھ کے حادثہ حرم عظیم کے بعد سرکاری نئے قوانین اور تحفظ امن و امان کی مد میں مولانا نے مدرسہ کی خدمات کو بھی حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے محدود کر دیا، لیکن وہی صبر و استقلال اور عزم و ہمت کا مظاہرہ کیا اور یہ خدمات جاری رہیں، مدرسہ کی ان طویل خدمات کی مدت تقریباً ۴۱ سال موجب فخر ہیں۔

مولانا مرحوم کی زندگی کا پورا دارومدار مدرسہ صولتیہ کی خدمت اور واردین و قاصدین مدرسہ کی ہی خدمت تھا، صحت اور آرام و راحت کا کوئی سوال نہیں، صبح سے جو کام میں لگتے تو آدھی رات گذر جاتی، مختلف النوع کی متعدد خدمات کبھی خود انجام دیتے، کبھی اہل مدرسہ سے لیتے اور سرپرستی بھی فرماتے، حج کے زمانہ میں حجاج کرام کی آمد و رفت مسلسل دفتر مدرسہ میں رہتی اور روزانہ سیکڑوں کی تعداد میں زائرین محبین متعلقین مخلصین دفتر مدرسہ میں تشریف لاتے، مدرسہ صولتیہ کے روز اول سے حضرت بانیٔ اعظم مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور اسلاف مدرسہ

کے زمانہ سے حجاج کیلئے جو خدمات چلی آرہی ہیں وہ بدستور باقی رہیں، بلکہ ان میں اضافے بھی فرمائے، ان خدمات میں حجاج کی رقوم بطور امانت رکھنی، حجاج کے نام آمدہ خطوط اور ڈاک، اردو اخبارات ورسائل کا انتظام اور فراہمی، طواف وسعی اور مدینہ منورہ وحج کی دعاؤں کے کتابچوں کی نشر واشاعت، سرمۂ زمزم کی فراہمی اور تقسیم، طواف اور سعی کے سات چکروں کیلئے سات دانوں کی تسبیح کا اہتمام اور تقسیم، ڈاک کے سعودی ٹکٹ، دم جنایت، دم احتیاط، دم شکرانہ دم تمتع وقران صدقہ اور عام نفلی قربانیوں کے جانوروں کا اہتمام اور متعدد خدمات کے علاوہ مدرسہ کی امداد ومعاونت اور مدرسہ سے متعلق تاریخی معلومات وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل کرنے والے الگ ہیں، علماء صلحاء اولیاء زائرین اور مہمانوں کا ہجوم خاص اور ان کے قیام وطعام وصنام کا اور آمدورفت کے انتظامات، خلاصہ یہ کہ مولانا نے اپنی ذات کو ایک انجمن بلکہ ایک ادارہ کی حیثیت اور شخصیت بنا رکھی تھی، تمام واردین وقاصدین سے الگ الگ مختلف النوع کی باتیں اور مقاصد کیلئے اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا، اور ہر ایک سے وسعت قلبی اخلاق حمیدہ اور خندہ پیشانی سے سلوک کرتے اور سب آپ سے اور آپ کی خدمات ومآثر سے متأثر ہوکر جاتے، مسائل حج وعمرہ وطواف معلوم کرنے والے — زبانی یا ٹیلیفون سے آپ کی تشریح وتوضیح اور تفسیر وتفہیم کے انداز طویل کے شائقین تھے، مولانا مرحوم نیک دل رکھنے کے ساتھ نہایت عابد ناسک زاہد متقی تھے، اکثر اوقات میں دوگانہ نفلی ادا کرتے رہتے اور قرآن شریف کی تلاوت کے علاوہ مختلف اوراد ووظائف کے پابند تھے، صدقہ کا بے انتہا اہتمام فرماتے تھے، تمام دن صدقہ میں کچھ دیتے رہتے، چاہے کھجور کا ایک دانہ یا مٹھائی کا ٹکڑا کیوں نہ ہو۔

مولانا کی اچانک اور ایکدم سانحۂ ارتحال نے تمام متعلقین ومنتسبین کو غمزدہ کر دیا، اتوار کی صبح بعد فجر ۲۷ شعبان المعظم ۱۴۱۲ھ مطابق یکم مارچ ۱۹۹۲ء کو مکہ مکرمہ میں داعی اجل کو لبیک کہا جس نے سنا دم بخود ہوگیا، سانحہ کی خبر منتشر ہوتی چلی گئی اور تعزیت

کرنے والوں کی آمد شروع ہوگئی، ظہر کی نماز کے بعد مدرسہ صولتیہ میں غسل اور تجہیز و تکفین انجام پائی، سوگواروں نے آخری زیارت کی، مدرسہ کے صحن میں پہلی بار نماز جنازہ ادا ہوئی، جس میں علماء صولتیہ اور طلبہ کے علاوہ کافی تعداد میں شرکت کرنے والے تھے، نماز جنازہ حرم پاک کے محترم عالم دین، مکہ معظمہ کی علمی شخصیت' اور دار العلوم حرم کے قدیم فاضل استاذ علامہ شیخ اسماعیل عثمان زین نے پڑھائی، پھر جنازہ حرم شریف لے جایا گیا، نماز عصر کے بعد حرم شریف میں اجتماعی اور عمومی نماز جنازہ دوبارہ امام حرم محترم کی امامت ادا ہوئی، جنۃ المعلاۃ کی طرف جنازہ نے رخ کیا اور با آواز بلند جہری کلمہ شریف کی فضاؤں میں بہ جم غفیر اور جمع کثیر مغموم فضاؤں اور محزون قلوب میں آبدیدہ رواں دواں تھا حضرت ام المؤمنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے جوار میں، صحابہ و صدیقین و علماء و ابرار کے پڑوس میں اور احاطۂ اکابر صولتیہ میں حضرت مولانا محمد رحمت اللہ کیرانوی رحؒ اور حضرت حاجی محمد امداد اللہ علیہما الرحمہ کے پہلو میں سپرد رحمت و آغوش مغفرت کیا گیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ـــ اللھم اغفرلہ وارحمہ

بے خبری میں بڑی راحت ہے

واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر

کراچی کے مؤقر انگریزی ماہنامہ "یونیورسل میسیج" کا تبصرہ (اشاعت جولائی ۱۹۹۲ء)

اردو تصنیفات میں تحقیق کی ہمیشہ شدید کمی محسوس کی گئی ہے۔ اور اگر اس تحقیق کا تعلق اسلامی تاریخ کے ایک ایسے المناک واقعہ سے ہو جسکے اندوہ ناک اثرات تنازعہ، اختلاف اور تشدد آمیز ردعمل کی صورت میں رونما ہوئے ہوں تو اسکی ضرورت اور اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مولانا عتیق الرحمن نے اپنی اس تصنیف میں جسے انکے وسیع مطالعے کا شاہ کار کہنا چاہیے، اسی علمی ضرورت کو پورا کیا ہے۔

اعتراضات کی پیش بندی کی خاطر مولانا عتیق الرحمن نے یہ وضاحت کردی ہے کہ: یزید سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں اور اگر ہے تو پہلے حضرت حسینؓ سے ہے حضرت معاویہؓ سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں اور اگر ہے تو پہلے حضرت علیؓ سے ہے (ص۲۰) اپنی اس

Waqai Karbala Aur Uska Pas Manzar

Author Maulana Atiqur Rahman Sambhali

Publisher Al-Furqan Book Depot 114/31, Nazirabad, Lucknow, India.

Pages 264

Price Rs.60.00

Research has always been in dire demand in Urdu works. If this research pertains to a tragic episode of Muslim history casting its ominous shadows of dispute, dissension and violent reactions, it becomes an acute need. What Maulana Atiqur Rahman has done through this book is to academically contribute towards this need, this is the magnum opus of his extensive study.

To forestall objections Maulana Atiqur Rahman writes: "We have no relationship with Yazid, if there is, it is firstly with Hazrat Hussain. We have no relationship with Hazrat Muawiyya; if there is, it is firstly with Hazrat Ali" (Page 20). And, throughout his research work, besides being guided by this memorable quote, he has indefatigably tried to be impartial and unprejudiced, a truth-seeker and a strict trasher of fact from fiction.

پوری تحقیقی تصنیف میں انھوں نے اپنے اس
یادگار تقوں کو محفوظ رکھا ہے اور ایک غیر جانبدار
اور بے تعصب طالب حق کی حیثیت سے
حقائق کو افسانوں سے الگ کرنے کے لئے
بے پناہ چھان پھٹک کی ہے۔

اس کتاب سے زیادہ متنازعہ مولانا
عبداللہ عباس ندوی کا اس پر وہ تبصرہ رہا ہے
جو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ترجمان
"تعمیر حیات" میں شائع ہوا ہے مولانا ابوالحسن علی
ندوی کی سربراہی میں چلنے والے اس باوقار
دینی و علمی ادارے میں مولانا عبداللہ عباس
ندوی معتمد تعلیمات ہیں۔ انھوں نے اپنے تبصرے
میں جو نکات اٹھائے ہیں ان پر الفرقان لکھنؤ
کے مئی جون ۱۹۹۲ء کے شمارے میں بحث
کی گئی ہے۔

مجھے جو بات دلچسپ بھی لگی اور
حیرت انگیز بھی وہ یہ ہے کہ ندوی تبصرہ نگار
نے مولانا عتیق الرحمٰن کو سلمان رشدی کے
زمرے میں رکھا ہے۔ غالباً تبصرہ نگار کو یہ علم نہیں
ہے کہ مولانا عتیق الرحمٰن برطانیہ کی اسلامی تنظیم
اسلامی دفاعی کونسل (اسلامک ڈیفنس کاؤنسل)

More than this book, Maulana Abdullah Abbas Nadvi's review in Taamir-e-Hayat, the official organ of Darul Uloom Nadwatul Ulama, Lucknow, whose administrator is Maulana Syed Abul Hasan Ali Nadvi, has become controversial. Maulana Abdullah Abbas is Secretary for Education of this prestigious Ulama institution and the points raised in his review are the subject matter of Al- Furqan, Lucknow May-June 1992 issue.

What amused rather amazed me was that Nadwa's reviewer has put Maulana Atiqur Rahman in the category of Salman Rushdie. Presumably, the reviewer does not know that M. Atiqur Rahman is the Chairman of Islamic Defence Council formed in United Kingdom and is one of those who led a massive demonstration of British Muslims organized by the British Muslim Action Front in London in protest against Rushdie's book on 27 May 1989. Ignorance is bliss and this bliss made Nadwa's reviewer to sketch a similarity in approach between Rushdie and M. Atiqur Rahman.

M. Atiqur Rahman's book is thought-provoking, informative and history. It is a MUST for research on Karbala.

Abul Amal.

کے صدر ہیں اور اُن لوگوں میں ہیں جن کی قیادت میں برطانیہ کے مسلمانوں نے برطانوی مسلم ایکشن فرنٹ کے زیر اہتمام لندن میں ۲۷ مئی ۱۹۸۹ء کو رشدی کی کتاب کے خلاف ایک زبردست احتجاجی مظاہرہ کیا تھا۔ؑ بے خبری میں بھی بڑی راحت ہے اور اسی راحت کا نتیجہ ہے کہ ندوی مبصرؔ کو رشدی اور مولانا عتیق الرحمٰن کے طرزِ فکر میں مماثلت نظر آئی۔

مولانا عتیق الرحمٰن کی کتاب فکر انگیز پُر از معلومات اور تاریخ پر مبنی ہے کربلا کے واقعہ پر تحقیق کیلئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

ع اس مظاہرے کی صحیح تاریخ جس کی قیادت مولانا عتیق الرحمٰن نے کی ۲۸ جنوری ۸۹ء ہے۔ تبصرہ نگار کو یہاں قدرے اشتباہ ہوا ہے۔ (الفرقان)

الفرقان کی ڈاک

فاضل مکتوب نگاروں کی ہر بات سے ادارۂ الفرقان کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

(۱)

پروفیسر محمد حاجن شیخ
حیدرآباد۔ سندھ (پاکستان)

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط مورخہ ۲۰/۷/۹۲ء موصول ہوا۔ ۴ عدد واقعۂ کربلا پہونچ گئی۔

حضرت مولانا عتیق الرحمن سنبھلی صاحب نے کتاب "واقعۂ کربلا" تصنیف فرما کر ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ میں ۱۹۵۲ء سے لیکر ۱۹۸۳ء تک اسلامی تواریخ کا پروفیسر رہا ہوں میں نے پرچہ "بنوامیہ" ایم اے والوں کو، سال "انگریزی زبان" میں ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۰ء تک پڑھایا ہے جس میں شیعہ طلبہ بھی موجود ہوتے تھے۔ اکثر حقائق جو حضرت مولانا نے دیئے ہیں ان کی تصدیق انگریزی زبان کی کتابوں میں بھی موجود تھی جن حالات میں حضرت حسینؓ کا خروج یزید کے مقابلہ میں تھا وہ اس وقت سازگار نہ تھے اور نہ اس وقت کوئی مصلحت تھی لیکن خدا تعالیٰ کی مشیت تھی جس کے تحت یہ سانحہ وجود میں آیا جس میں مستقبل میں امت محمدیہ کے لئے رہنمائی ہے۔

فقط والسلام
بندہ محمد حاجن شیخ
۱۲ر اگست ۱۹۹۲ء

(۲)

جناب عزیز الہٰی خاں صاحب (علیگ)
حسن پور۔ (ضلع مرادآباد)

حضرت مخدومنا دام ظلکم!

(حضرت مولانا نعمانی مدظلہ کے نام مکتوب سے اقتباس)

چند ماہ سے جو اضطراب تعمیر حیات میں شائع شدہ تبصرہ (اور اسکے نتیجہ میں بدمزگی اور ناہونی

ناقابلِ قیاس وگمان باتیں ظہور میں آگئی تھیں) پیدا ہوگیا تھا اس کے دفعیہ کیلئے مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی وقیع کتاب "واقعۂ کربلا اور اُس کا پس منظر" دوبارہ غور وفکر کے ساتھ دیکھی تو الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ علیہ السلام کے اہلِ بیت سے خود بخود تعلق ومحبت میں اضافہ ہی اضافہ محسوس ہوا، نیز اب روزانہ سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کے رفقاء کرام کے لئے ایصال ثواب کی توفیق ہوجاتی ہے۔ اور مولانا موصوف کے لئے دعا نکلتی ہے کہ کتنے اِشکالات اور توہمات اُن کی سعی ومحنت نے بندہ کے دور کردیئے۔

فقط بندۂ عاجز وفانی
عزیز الٰہی عفی عنہ
۵ / ۸ / ۹۲ء

(۳)

جناب امین الحسن رضوی (سابق ایڈیٹر ریڈینس دہلی)

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر کی تالیف پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر سے نوازے ص۱۳۱ پر یہ جملہ البتہ کھٹکتا ہے (یزید بڑا متقی وپرہیزگار) ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہوسکتا۔ اور غالب گمان یہ ہے کہ ایسا نہیں تھا" مجھے یہ جملہ یکسر غیر ضروری اور یک گونہ معذرت خواہانہ لگتا ہے۔ حضرت یزید اول جہاد قسطنطنیہ میں حصہ لینے کے باعث (جس میں ان کی شمولیت اور ایک دستہ کی قیادت جس دستہ میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ شامل تھے غیر اختلافی اور تسلیم شدہ تاریخی حقیقت ہے) مبشر بالجنہ اور غازی بہرحال ہیں پھر انکے بارے میں اس غالب گمان (بدگمانی) کی ضرورت ہی کیا ہے۔

بمبئی میں نہایت مختصر ملاقات ہوسکی۔ امید کہ بخیر ہوں گے۔ والد صاحب قبلہ سے سلام فرمائیں۔

امین الحسن رضوی
۱۰ / جون ۱۹۹۲ء

ہمارے اسٹاک میں نئی آنے والی کتابیں

حضرت شیخؒ کے حیرت انگیز واقعات
شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ ۴۰/-

تاریخ کی مظلوم شخصیتیں مولانا عبدالعلی فاروقی ۵۰/-

جواہر الکلمین معروف بہ چہل حدیث۔ مولانا الحاج وارث علی ۳۵/-

مثنوی اور گستاخیں یا کارآمد نصیحتیں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ۳۰/-

ذکر رسولؐ (مُردوں کی مسیحائی) " " ۳۰/-

معارف امدادیہ۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ ۴۰/-

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے اصلاحی پند و نصائح " " ۴۰/-

اصلاح النساء " " ۲۵/-

وصیۃ الاخلاص حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ ۱۲/-

ایک منٹ کا مدرسہ مولانا شاہ ابرار الحق صاحب ۲۵/-

نماز کی اہمیت مولانا عبدالباسط قریشی ۱۰/-

اسلام میں نومولود بچے کے احکام و مسائل پروفیسر ناصح علوان مرحوم ۲۰/-

فضائل تلاوت و سلام۔ حضرت مولانا محمد زکریاؒ ۳۵/-

اسلام میں جنسی تربیت پروفیسر ناصح علوان ۲۰/-

اسلام کے بنیادی سماجی اور معاشرتی آداب " " ۲۵/-

پیشۂ رزق حلال اور ارباب علم و کمال۔ مولانا عبدالقیوم حقانی ۳۵/-

انشائے ماجدی لطائف ادب مولانا عبدالماجد دریابادی ۱۵/-

حیات طیبہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ ۱۰/-

مرج البحرین حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ۴/-

تذکرۃ الحفاظ مکمل ۲ جلد۔ امام ابو عبداللہ شمس الدین محمد الذہبی ۲۵۰/-

تصوف و نسبت صوفیہ مولانا شاہ وصی اللہ صاحب ۲۰/-

تعلیم الصلوٰۃ۔ اشرفی نماز الثلا پبلیکیشنز نئی دہلی ۶/-

حسن بصری کلیم چغتائی ۳/۵۰

مسلم کا کفن دفن محمد عبدالحئیؒ ۲/-

تلاش مرشد۔ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب ۱/۵۰

راحت القلوب ۸/-

ہدیۃ النساء مولانا محمد ابراہیم پالن پوری ۵/-

سید قطب شہید جناب مظفر حسین غزالی ۵/-

ابوبکر و علی کے باہمی تعلقات پر ایک نظر۔ جناب عزیز حسن ایڈووکیٹ ۳/۵۰

آپ کے مسائل اور ان کا حل۔ مولانا محمد یوسف لدھیانوی ۵۰/-

تذکرۂ دانشوران سہارنپور۔ مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری ۵۰/-

کمالات اشرفیہ مولانا عیسیٰ صاحب الہ آبادیؒ ۱۱/-

نمازیں سنت کے مطابق پڑھئے مولانا محمد تقی عثمانی صاحب ۳/-

نفیر غیب خواجہ عزیز الحسن صاحب ۱/۵۰

دارالعلوم دیوبند اور اس کا مزاج و مذاق۔ مولانا مفتی محمد شفیعؒ ۵/-

اپنے ایمان کا جائزہ لیجئے۔ ڈاکٹر محمد عبدالحئی عارفی ۵/-

فدیہ و قضا مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی ۵/-

تلخیص مواعظ اشرفیہ حصہ دوم۔ جناب کریم الدین صاحب ۱۵/-

اسلام کو چھپاؤ ورنہ بغاوت پھیل جائے گی۔ آفتاب احمد شمسی ۳۵/-

ذکر اشرف مولانا باب الدین احمد مظاہری ۶/-

اسعاد الفہوم حضرت مولانا قاری صدیق احمد باندوی ۲۰/-

الفرقان بکڈپو۔ ۱۱۴/۳۱ نظیر آباد۔ لکھنؤ ۱۸

جلد ۶۰ | نومبر دسمبر ۱۹۹۲ء مطابق جمادین ۱۴۱۳ھ | شمارہ ۱۱-۱۲

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سرپرست
حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

مدیر
خلیل الرحمن سجاد ندوی

سالانہ چندہ برائے ہندوستان
عام ۷۰/-
اعزازی ۱۲۰/-
لائف ممبری ۲۰۰۰/-

پاکستان بیرونی ممالک کے خریدار ۲ گنا اضافہ فرمائیں

فی شمارے کی قیمت ۱۱/- روپے

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے آپ کی خریداری ختم ہو گئی ہے براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی روانہ کیا جائے گا۔ منیجر

دفتر ماہنامہ الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی نظیر آباد لکھنؤ

فہرست مضامین

صفحہ	مضامین نگار	مضامین	نمبر شمار
۳	مدیر	نگاہ اولیں	۱
۱۵	حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ	معارف الحدیث	۲
۱۹	حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی	مسلمانوں کو امت بننے کی دعوت	۳
۳۹	حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ	فتنۂ رفض و تفضیلیت کے خلاف حضرت مجدد الف ثانی کا جہاد	۴
۵۵	حضرت مولانا مفتی عبدالقدوس رومی	غازی طائف و یرموک سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ	۵
۷۵	مولانا عتیق الرحمن سنبھلی	یہ ملامت — زہے نصیب! (دوسری اور آخری قسط)	۶
۹۶	مولانا عبیداللہ سندھی	اموی دورِ حکومت کا تاریخی تجزیہ	۷

سالانہ چندہ ماہنامہ الفرقان

برائے	عام خریداری	اعزازی	لائف ممبری
پاکستان	۱۴۰/- روپے	۲۴۰/- روپے	۳۰۰۰/- روپے
دیگر ممالک بذریعہ ہوائی ڈاک	۲۰/- ڈالر (۱۳ پاؤنڈ)	۳۰/- ڈالر	۵۰۰/- ڈالر
" " بذریعہ بحری ڈاک	۱۲/- ڈالر (۸ ")	۲۴/- ڈالر	۳۰۰/- ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:- ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور

برطانیہ میں ترسیل زر کا پتہ:- Mr. R. RAHMAN

90-B. HANLEY ROAD LONDON N4 3DW

محمد حسان نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱- نیا گاؤں مغربی نظیر آباد لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

الفرقان کے اس شمارہ پر اُس کی ساٹھویں جلد پوری ہو رہی ہے ۔۔۔ محرم ۱۳۵۳ھ میں جب الفرقان کا پہلا شمارہ ہندوستان کے مشہور شہر "بریلی" سے شائع ہوا تھا تو اس کا آغاز و افتتاح اس دعا سے کیا گیا تھا :-

اے ساری کائنات کے پروردگار تیرا ایک عاجز اور سیہ کار بندہ تیرا کام تیرے ہی جلالت والے نام اور عظمت والے کلام سے شروع کرتا ہے، تو اس کے ارادوں میں برکت عطا فرما اور اُسکے دل کو صدقِ نیّت اور اخلاص کی توفیق دے ۔۔۔ تیرے پاک دین کی حمایت اور میری بساط، یقیناً چھوٹا مُنہ اور بڑی بات ہے، لیکن تیری تائید رفیق ہو جائے تو قطرہ کو دریا اور ذرّہ کو آفتاب بنتے دیر نہیں لگتی ۔۔۔ خداوندا! میں پاپیادہ ہوں اور وادی خاردار میں تنہا ہوں اور راستہ میں ہزاروں خونخوار درندے، میری کشتی شکستہ ہے اور سامنے حوادث کا طوفان، مگر تیری نُصرت ساتھ دے تو بیڑا پار ہے، اور اسی بھروسہ پر تیرے اِس کمزور بندے نے کمر ہمت باندھی ہے ۔

درمیں دریائے بے پایاں درمیں طوفانِ موج افزا
دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

تیری مقدس کتاب کا وعدہ ہے:۔

وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ

جو کوئی خدا کے دین کی حمایت کیلئے اٹھے گا خدا اسکی مدد کرے گا۔ یقیناً خدا بڑی قوت والا اور بہت غلبہ والا ہے۔

مگر کستا ہوں تیرے نام پر تو مجھ کو ہمت دے
جو ہو لغزش تو مجھ کو تھام میرا مہرباں ہو کر
بھروسے پر تری امداد کے بیڑا اٹھایا ہے
فلک کے بوجھ اٹھانے پڑ گیا ہوں ناتواں ہو کر

(الفرقان بریلی، بابت محرم ۱۳۵۳ھ ص۲)

اسی شمارہ میں سرورق کی پشت پر "میرا مقصد" کے زیرِ عنوان الفرقان کے اجراء کی اصل غرض و غایت صاحبِ الفرقان (اللہ ان کو عافیت نصیب فرمائے) نے اِن لفظوں میں بیان کی تھی:۔

"میرا مقصد دینِ الٰہی کی اشاعت اور توحید و سنت کی حمایت و حفاظت ہے"

پھر اپنے پہلے اداریہ میں توحید و سنت کی حفاظت و حمایت کے سلسلہ میں اپنے لائحہ عمل کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"الفرقان" ان بدعات اور مشرکانہ رسوم کے خلاف زبردست جہاد کرے گا جنھوں نے فرزندانِ توحید کے دین و دنیا کو برباد کر دیا ہے اور جنکے زہریلے اثرات سے مسلمانوں کا ایمان تک محفوظ نہیں ـــــ الفرقان خدا پرستی کا حامی اور مخلوق پرستی کا سخت دشمن ہے، وہ چاہتا ہے کہ انسان کی جبینِ نیاز صرف واحد قہار کے جلال و جبروت کے سامنے جھکے اسی لئے صلیب پرستی، بت پرستی کی طرح قبر پرستی، پیر پرستی نفس پرستی وغیرہ کو بھی وہ خلاقِ فطرت کی شدید بغاوت اور انسانیت کی سخت ترین اہانت سمجھتا ہے۔ لہذا اسکے خلاف بھی وہ زبردست جہاد کریگا اور قوم سے اس لعنت کے دور کرنے کیلئے اپنی ساری طاقت ختم کر دیگا۔

الفرقان کا مقصد بلا وجہ کسی جماعت یا کسی شخص سے الجھنا اور اس کو نیچا دکھانا یا اس پر غصہ اتارنا اور ان کی پگڑیاں اچھالنا ہرگز نہیں وہ صرف اعلاء کلمۃ الحق کیلئے

میدان میں آیا ہے، البتہ اگر کوئی خدا کا باغی اس کے اصل مقصد میں حائل ہوگا تو وہ اس کا بھی مقابلہ کرے گا لیکن اس میں بھی اس کی روش قرآن حکیم کے تعلیم کردہ اصول "وجادلھم بالتی ھی أحسن" سے متجاوز نہ ہوگی۔"

اس پہلے شمارے سے لے کر ساٹھویں[1] جلد کے اس آخری شمارے تک الفرقان کی اصل پہچان، اور اس کی مخصوص افادیت وانفرادیت "توحید وسنت کی حمایت وحفاظت" ہی رہی ہے۔ اسی وجہ سے اس کا نام "الفرقان" رکھا گیا تھا، یعنی "حق کو باطل کی ملاوٹ سے الگ کر کے خالص کر کے پیش کرنے والا"۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دعا الفرقان کے اجراء کے چند ہی مہینوں کے بعد دی تھی جو الفرقان (رمضان و شوال ۱۳۵۳ھ) میں شائع بھی ہوئی تھی، وہ دعا یہ تھی:۔

"رسالہ کے لئے دل سے دعا کرتا ہوں کہ اس کو مثل اپنے نام کے فارق بین الحق والباطل فرمائے، اور اہلِ حق کے لئے نافع اور باطل کے لئے دافع فرمائے اور اسکے بانی کو خلوص اور طالبانِ حق کو اشتراء ومطالعہ سے توفیقِ انتفاع بخشے۔"

یقیناً یہ انہی دعاؤں کی برکت ہے کہ ۶۰ سال کے اس عرصہ میں جو کام توفیق الٰہی نے "الفرقان" اور "صاحبِ الفرقان" سے لئے، ان میں بعض پہلوؤں سے اہم ترین کام، مختلف فتنوں اور گمراہیوں سے اس دین اور اُمّت کی حفاظت" کا وہ کام ہے جس کے بارے میں ہم نے اپنے بعض بزرگوں سے سنا ہے کہ:۔

"حفاظتِ دین کے شرائط وصفات، اشاعتِ دین کے شرائط وصفات سے زیادہ دقیق، زیادہ عمیق، زیادہ نازک اور زیادہ اہم ہیں، اس کیلئے دین کا عمیق فہم ہونا چاہیئے۔ اس کیلئے اسرار وحقائقِ دین سے واقفیت ہونی چاہیئے اس کیلئے صاحبِ فن اور ماہرینِ علوم دینیہ اساتذہ سے استفادہ وتلمذ اور براہِ راست دین کے سمجھنے اور عربی زبان پر عبور حاصل کرنے کی ضرورت ہے اسکے لئے تفسیر وحدیث اور تاریخ اصلاح وتجدید کے وسیع مطالعہ کی ضرورت ہے پھر ایک بیدار ضمیر اور اس سے بھی بڑھ کر حمیتِ دینی وغیرتِ اسلامی کی ضرورت ہے[1]۔"

---

[1] ۲۹، ۳۰، ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۶ء میں دار العلوم دیوبند کے زیرِ اہتمام تحفظ ختم نبوت کے عنوان پر ایک جلسہ ہوا تھا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے اس میں جو تقریر کی تھی، یہ اقتباس اسی سے ماخوذ ہے، وہ تقریر ختم نبوت اور محافظ ختم نبوت کے نام سے چھپ بھی گئی ہے۔

جس زمانہ میں "صاحب الفرقان" نے بریلی کے قیام اور پھر وہاں سے "الفرقان" کے اجراء کا فیصلہ کیا، اس وقت وہاں سے جو تکفیری فتنہ پھیل رہا تھا جس کی زد سے مسلمانوں کا کوئی ادارہ، کوئی حلقہ، کوئی جماعت، بلکہ شاید کوئی قابلِ ذکر شخصیت جو کسی نہ کسی میدان میں دین اور اُمت کی خدمت میں لگی ہوئی تھی محفوظ نہیں تھی، اس پوری صورتحال اور اسکے سلسلہ میں صاحب الفرقان کی کوششوں اور پھر ان کوششوں کے اثرات کی تاریخ بہت طویل ہے۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اُس زمانہ کے ایک بیان سے اس کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ انھوں نے لکھا تھا:۔

"بریلی کے رضاخانی کفرساز کارخانہ میں (جہاں مختلف کل پرزوں کے ذریعہ نئے نئے انداز سے کفر ڈھالا جاتا ہے اور جس کے بے پناہ چھینٹے ہر اس شخص پر پڑے بغیر نہیں رہتے جو حقیقی اسلام کا نام لیوا ہے) مجلہ الفرقان کا اپنی "فرقانی قوت" کے ساتھ "ایمانی بارش" لے کر اترنا اور ان غلیظ چھینٹوں کے بدنما دھبوں کو ایمانی قلوب سے دھو ڈالنے کے لئے برسنا بلاشبہ ایک اَیسے خدا کے پرستاروں کیلئے نعمتِ عظمیٰ اور ان کے بخت سعید کی یاوری ہے۔ الحمدللہ کہ الفرقان نے طلوع ہوتے ہی بدعات و محدثات کے ظلمانی حلقوں میں ہلچل ڈال دی اور ان کیلئے الفرقان ایک رسالہ ہی نہیں بلکہ ایک بے پناہ پلٹن اور جرار لشکر ثابت ہوا جہاں اُس نے ان جہالت زدہ حملہ آوروں کو پسپا کیا جو علم کے میدان میں جہالت کے بودے ہتھیار لئے کھڑے تھے وہیں اپنی سنجیدہ اور متین آواز سے ہر معقول پسند طبیعت کو اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور بھی کر دیا......." (الفرقان شعبان ۱۳۵۳ھ)

اُس زمانہ میں قادیانیت کا حملہ بھی بہت زوروں پر تھا، اسکے مقابلہ اور ایک مستقل دین اور متوازی مذہب کی حیثیت سے مسلمانانِ ہند کے عوام و خواص کو اس سے باخبر اور آگاہ کرنیکی جدوجہد میں بھی الفرقان اور صاحبِ الفرقان کا نمایاں حصہ رہا۔

بریلویت اور قادیانیت کے علاوہ انکار حدیث کا پرویزی فتنہ ہو یا خاکسار تحریک کے نام پر اٹھنے والا مشرقی کا تلبیسی و تخریبی حملہ ہو، یا آریہ سماجیوں کی برپا کی ہوئی شدھی (ارتداد) کی تحریک ہو

یا نیاز فتحپوری، حمید دلوائی، آصف فیضی اور پروفیسر مجیب جیسے نام نہاد "دانشوروں" کی شکست خوردہ ذہنیتوں کے مقابلہ کا محاذ، اِن سب موقعوں پر، اور کہا جا سکتا ہے کہ "حفاظت" دین کے ہر محاذ پر اللہ تعالیٰ نے "صاحبِ الفرقان" سے جو کام لیا، اسکی توفیق پر اس کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے تکوینی نظام سے جو لوگ واقف ہیں وہ بخوبی سمجھتے ہیں کہ اس طرح کے کام اتفاقاً کسی سے نہیں سرزد ہوا کرتے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی اُس خاص توفیق و عنایت اور تقدیر و انتخاب کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں جسکی بدولت مختلف صلاحیتوں کے افراد اور "رجالِ کار" آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آخری اُمت کو ہر زمانہ میں مہیا ہوتے رہے ہیں۔

حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ سے اور اُنکی "شخصیت" کے بعض مخصوص پہلوؤں سے شاید ہمارے سب قارئین پوری طرح واقف نہ ہوں۔ ان کی قوتِ کشف و ادراک کے بارے میں حضرت مولانا علی میاں مدظلہ، شاہد ہیں کہ:۔

"مولانا کی قوت روحانی اور اشراقی بہت بڑھی ہوئی تھی،..... انکے صحیح کشف کے بہت سے حیرت انگیز واقعات ہیں جو انکے مخصوص اہل تعلق کے علم میں ہیں....... فطری اور خداداد مناسبت کے علاوہ اس کمال میں جس میں وہ اپنے معاصرین میں ممتاز تھے اور جو کتابوں کے واقعات اور شیوخ متقدمین کی یاد تازہ کرتا تھا انکے مجاہدہ و ریاضت، دوام ذکر اور مشتبہ و مشکوک غذا سے احتیاط کو بہت دخل تھا۔" (پرانے چراغ، جلد اول ص ۱۵۱)

یہی حضرت مولانا احمد علیؒ نے صاحبِ الفرقان (مدظلہ) کے بارے میں بالکل شروع میں کچھ محسوس فرما لیا تھا، اور اسے اِن لفظوں میں بیان بھی فرما دیا تھا:۔

"..... خیر القرون کے گذرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ایسے حق پرست علماء کرام آپ کی اُمت میں پیدا کئے جنھوں نے کتاب و سنت کے منور چہرے کے گرد اگرد شرک و بدعت کی مکڑی کے تنے ہوئے جالے کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ انھیں مبارک وجودوں کی برکت سے آج اسلام کا منور چہرہ درخشاں نظر آتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ قسام ازل نے حضرت مولانا

محمد منظور صاحب نعمانی دام مجدہم کا وجود مسعود اسی غرض کے لئے تجویز فرمایا ہے کہ موجودہ دور کے دشمنوں سے اسلام کی عزت بچائیں۔ ان فتنوں کی فہرست طویل ہے۔ مگر مولانا ممدوح "مرزائیت" اور "الحاد بدعت" کے ازالہ میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اور ان کی تحریروں میں اِن دو فتنوں کے استیصال کا اتنا زبردست مواد ہوتا ہے کہ جو شخص ان کی تحریر کا مطالعہ کرے، انشاءاللہ وہ اس کفر والحاد سے یقیناً محفوظ رہے گا ـــ انھیں فتنوں کے انسداد کے لئے مولانا ممدوح نے الفرقان ماہوار جاری کیا ہے۔ میں حضرت مولانا کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں کہ ان کا الفرقان اسم با مسمّٰی ہے اور طالبانِ حق کی خدمت میں پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ اسے ضرور پڑھیں تاکہ بدعت و مرزائیت کے ڈاکوؤں سے اپنے متاع ایمان کو بچا سکیں"۔

جس زمانہ میں اللہ کے اِن خضر صفت بندوں نے صاحبِ الفرقان کے بارے میں قسام ازل کے اس فیصلے کو محسوس کیا تھا، اُس وقت ان کی عمر تیس ۳۰ سال کے قریب رہی ہوگی۔ اور اب جبکہ وہ ۹۰ کے لگ بھگ ہیں۔ ان کی ۶۰۔۶۵ سالہ محنتیں اور کاوشیں، جن میں سے بیشتر کا ریکارڈ الحمدللہ الفرقان کے صفحات میں محفوظ ہے۔ ان پر نظر پڑتی ہے تو ان حضرات کے اس احساس کی صداقت کا یقین ہوتا ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے ع

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

اور یہ بھی قسام ازل کی اسی تقسیم و انتخاب ہی کا نتیجہ تھا کہ جب چودھویں صدی کے آخر میں ایران میں ایک شیعہ مذہبی رہنما کے ذریعہ برپا کرائے گئے انقلاب کے بعد شیعیت و باطنیت کے تن مردہ میں نئی جان پڑی جو اسلام کی تاریخ میں سب سے زیادہ سخت جان اور طویل العمر فتنہ رہا ہے، تو شاید یہ کہنے میں ذرا بھی مبالغہ نہ ہو کہ اس فتنہ کی خطرناکی، اور اسکے سنگین اور دور رس اثرات کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ شدت سے محسوس کرنے، اور اس سے امت کا حفاظت کیلئے سب سے زیادہ بے فکر، و بے قرار اور مضطرب اور

سرگرمِ عمل ہونے کی توفیق بھی اسی اللہ کے بندے (صاحبِ الفرقان) کو ملی ـــــ اور پھر اس بندۂ خدا کا کیا حال ہوا؟ کتنا وہ رویا اور کتنا وہ تڑپا اور ایسے حال میں کہ دیکھنے والے کو رحم آئے، کتنی شدید محنت اس نے اس دجل و تلبیس اور کتمان و تقیہ کے دبیز پردوں کو چاک کرکے تشیعیت کے اصل اور نہایت مکروہ چہرے کو بے نقاب کرنے کیلئے کی، کتنا پڑھا، کتنا لکھا، کتنی خط و کتابت کی، کتنے لوگوں سے گفتگوئیں کیں، اور کتنے طویل اور دشوار سفر اس سلسلے میں کئے، اور پھر یہ سب کچھ پیرانہ سالی کی معذوریوں اور مختلف بیماریوں سے زار و نزار کس حالت میں کیا . . . اور یہی نہیں بلکہ کیسی کیسی غلیظ گالیوں، دھمکیوں اور پروپیگنڈے کا سامنا کیا؟ یہ سب کچھ قریب سے دیکھنے کا جن لوگوں کو موقع ملا ہے . اور ان سطور کا لکھنے والا بھی ان میں ہے . انھیں اس مشاہدہ کو اپنے لئے اللہ کی ایک بڑی نعمت سمجھنا چاہئے اور شاید اتمام حجت کا ذریعہ بھی!

یہ آخری بات تو جملۂ معترضہ کے طور پر درمیان میں آگئی . ورنہ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ یہ جو تشیعیت کے نئے حملے کا مقابلہ کرنے کی توفیق بھی صاحبِ الفرقان اور الفرقان ہی کو ملی یہ بھی کوئی اتفاقی بات نہیں تھی . اور خدا کی اس منصوبہ بند کائنات میں کوئی چیز اتفاقی طور پر ہوا بھی نہیں کرتی یہ بھی اسی توفیق و انتخاب کا نتیجہ تھا جسے اللہ کے کچھ مردانِ باصفا بہت پہلے محسوس کر چکے تھے اور جس کا مسلسل ظہور گذشتہ نصف صدی سے زائد مدت میں ہوتا رہا ـــــ واللہ اعلم

اور اب مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" نامی کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے ـــــ اسکی تصنیف کا قصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت والد ماجد مدظلہ کی مجلس میں یہ سوال زیرِ غور آیا کہ اب جب کہ شیعہ مذہب اپنے اصول و عقائد اور اغراض و مقاصد کے آئینہ میں . . . قادیانی مذہب کی طرح کلی طور پر ایک مستقل دین اور متوازی مذہب کے طور پر کھل کر سامنے آگیا ہے آخر کیا وجہ ہے کہ برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں میں عمومی طور پر تشیعیت کے بارے میں فیصلہ کن موقف کو وہ "قبول عام" نہیں مل رہا ہے جو قادیانیت کے بارے میں علماء کے فیصلہ کن موقف کو ملا تھا؟ تو اس وقت جن مختلف وجوہ کا تذکرہ اس گفتگو میں آیا تھا، ان میں ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تشیعیت مختلف راستوں سے اس طرح

ہمارے یہاں خصوصاً برصغیر کے مسلمانوں میں گھس آئی ہے کہ جب تک کوئی شخص اس پہلو سے خود اپنے افکار و خیالات اور تصورات و تعبیرات کا سخت تنقیدی جائزہ نہ لے، یہ دعویٰ کرنا مشکل ہے کہ اس کا تصور دین یا مطالعۂ تاریخ شیعی اثرات سے سو فیصد محفوظ ہے ـــــ اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ عام طور پر شیعیت کے بارے میں لوگوں کا تأثر یہ ہے کہ وہ صرف سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات اہلبیت نبوی کے ساتھ محبت میں کچھ غلو رکھنے کا نام ہے۔ (اور ظاہر ہے کہ یہ بات اتنی سنگین نہیں کہ اس کی وجہ سے اس کو ایک مستقل مذہب اور اسکے پیروکاروں کو ایک متوازی اُمت قرار دیا جائے)۔

یہ تصور دراصل نتیجہ ہے اس "کتمان و تقیہ" کا جس کے ذریعہ شیعیت نے اپنے اصل چہرے کو عام مسلمانوں سے پوشیدہ رکھنے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی، اور منجملہ ان تدبیروں کے جن کے ذریعہ شیعیت کو یہ کامیابی ملی، کربلا کا وہ المناک واقعہ ہے جسے برپا کرانے والے بھی وہی اور پھر اسے ایک خاص رنگ دے کر مظلومیت اہلبیت کے نام سے معصومیت اہلبیت کا خالص شیعی تصور عام مسلمانوں کے دل و دماغ میں بٹھا دینے والے بھی وہی ـــــ پس ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کی اس تدبیر کو بھی ناکام کرنے کی کوشش کی جائے، اور اس کے لئے طے ہوا کہ واقعۂ کربلا اور اس کے پس منظر میں پیش آنے والے واقعات کی صحیح تصویر عام مسلمانوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ لوگ اس المناک واقعہ کے آئینہ میں بھی شیعیت کے مکروہ چہرے کو دیکھ سکیں ـــــ اور پھر منافقین کے اس گروہ کے بارے میں از سر نو غور کرنے اور ایک فیصلہ کن موقف اختیار کرنے پر اپنے کو آمادہ کر سکیں۔

اسی گفتگو میں حضرت والد ماجد مدظلہ نے یہ طے فرمایا کہ یہ کام مولوی عتیق الرحمٰن کریں، اور وہ اس موضوع پر اپنے ایک پرانے مضمون ہی کو دوبارہ شائع کر دیں ـــــ حضرت والد ماجد مدظلہ کی اسی ہدایت کے بموجب برادر معظم مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب نے جب اپنے اس پرانے مضمون کو جو تقریباً ۴۰ سال پہلے انھوں نے لکھا تھا اس نظر سے دیکھا تو انھیں اس میں کافی ترمیم و اضافہ کی ضرورت محسوس ہوئی، اور پھر جب اس موضوع پر انھوں نے از سر نو لکھنا شروع کیا تو وہ کتاب تیار ہوئی جو واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر کے نام سے شائع ہوئی۔

یہ بات کہ کتاب کی اصل روح اور غرض و غایت شیعیت کے اثرات سے اُمتِ مسلمہ کو نجات دلانا ہے، کتاب کی سطر سطر سے عیاں ہے ــــ بلکہ مصنف کے مقدمہ اور حضرت والد ماجد مدظلہ کے ابتدائیہ دونوں میں اسکی صراحت بھی موجود ہے۔ والد ماجد مدظلہ کے ابتدائیہ کا یہ فقرہ ملاحظہ ہو:-

"آج سے ۷-۸ سال پہلے جب میری کتاب "ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت" شائع ہوئی تو بعض مخلص دوستوں نے توجہ دلائی کہ جس مقصد سے یہ کتاب لکھی گئی ہے، اسی مقصد کی خدمت کے لئے یہ بھی مفید ہوگا کہ مولوی عتیق الرحمٰن صاحب کا مضمون "واقعۂ کربلا" اور اس کے بعد کا وضاحتی مضمون بابت محرم ۱۴۰۲ھ بھی کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے میں نے اس رائے کو پسند کیا اور ....."

اور خود مصنف کتاب نے اپنے مقدمہ میں صاف صاف لکھا:-

"واقعۂ کربلا سے اور جو کچھ ہوا ہو یا نہ ہو، شیعیت کو اپنی دوکان چمکانے اور اپنے اثرات پھیلانے کا وہ بے پناہ موقع ملا ہے کہ کچھ کہا نہیں جاتا، اور اسی لئے ضرورت ہے کہ نہایت ٹھنڈے دل سے پورے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے"

بہرحال مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ یہ کتاب بھی عام مسلمانوں کے دل و دماغ سے شیعیت کے اثرات کے ازالہ کے مقصد سے لکھی گئی تھی، اور پھر اس کتاب پر ایک مخصوص حلقہ کے ردِ عمل کے تعلق سے بھی صاحبِ الفرقان اور الفرقان نے جو کچھ لکھا، وہ بھی اسی احساس کے ماتحت لکھا گیا کہ اس افسوسناک ردِ عمل سے شیعیت کو زبردست تقویت مل رہی تھی[1]۔ اور شیعیت کو تقویت پہنچے دینا ان لوگوں کے لئے ممکن نہیں ہے۔

---

[1] یہاں پر یہ بات ریکارڈ پر آنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شیعیت کے ساتھ اُس حلقہ کے "طرزِ عمل" سے جو تحفظ اور جو تقویت شیعیت کو خاص کر گذشتہ چند سالوں میں ملی ہے اسے شدید کرب والم کے ساتھ محسوس کیا جاتا رہا ــــ مگر اس کا اظہار مناسب نہیں سمجھا گیا ــــ لیکن جب بات "طرزِ عمل" سے آگے بڑھ کر کھلم کھلا شیعیت زدہ خیالات کی نشر و اشاعت تک پہنچ گئی تو یہ سمجھ کر کہ اب سکوت کا کوئی جواز نہیں رہا، شیعیت کے ہاتھ سے دفاع کا فریضہ جو صاحبِ الفرقان پر عائد ہوتا تھا اس کو ادا کرنا ضروری سمجھا گیا۔

جو اس خطرناک گروہ کے خوفناک منصوبوں اور امت مسلمہ کے لئے ہر پہلو سے اسکے دوررس اور نہایت ہلاکت خیز اثرات سے، نیز ماضی، حال اور مستقبل میں اس کی کارروائیوں اور پروگراموں سے واقف بھی ہیں اور کسی مصلحت اور کسی مجبوری نے ان کا دامن بھی نہیں تھام رکھا ہے۔ وللہ الحمد ولہ المنۃ۔

یہاں پر ہم ایک بار پھر یہ بات صاف صاف کہہ دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ مسئلہ ہرگز ہرگز کسی شخصیت یا ادارہ کا نہیں ہے، مسئلہ خالصۃً اصولی ہے۔ الفرقان کا یہ پختہ یقین ہے کہ شیعیت کے بارے میں قادیانیت کی طرح کا ایک واضح اور فیصلہ کن موقف اختیار کرنے ہی میں ہر لحاظ سے امت مسلمہ کی سلامتی ہے، ورنہ ہر لحاظ سے ہلاکت اور بربادی، ایسے نازک مسائل میں دو رخا پن اور بین بین والا طرز عمل ہرگز مناسب نہیں خاص کر علماء کرام کے لئے جن کے ذمے سب سے اہم کام دین کی حفاظت ہے ـــ اور اس ملت کی حفاظت بھی اس کے دین کے تحفظ ہی میں ہے۔

مسئلہ بہت اہم اور اصولی ہے، نتائج بہت دوررس ہیں اور "الفرقان" الفرقان ہے۔

یہ ہے وجہ ہماری سنجیدگی اور فکرمندی کی، واللہ علی ما نقول وکیل۔

اس شمارے میں بھی کئی مضامین اسی موضوع سے متعلق ہیں۔ ایک تو صاحب الفرقان حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ کا پرانا مضمون ہے جو شیعیت کے مقابلہ میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مجاہدانہ موقف اور مساعی کے بیان پر مشتمل ہے ـــ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں ہندوستان پر ہندو احیائیت کا کس قدر زبردست حملہ تھا۔ اور ہندوستان میں مسلمانوں کا ملی تشخص کس طرح خطرہ میں تھا؟ اور ان خطرات کا سب سے زیادہ احساس اور ان کے مقابلہ کے لئے عملی جدوجہد کی سب سے زیادہ توفیق بھی حضرت مجدد صاحب ہی کو ملی تھی ـــ اسکے باوجود اس مار آستین کے ساتھ کسی قسم کی نرمی یا چشم پوشی کا رویہ اختیار کرنے کے بجائے صاف اور سیدھا وار کرنے کا راستہ ہی انھوں نے اختیار کیا تھا ـــ

اہل علم، دینی کام کرنے والوں اور طلبہ سے خاص طور پر گذارش ہے کہ اس مضمون کو غور سے پڑھیں ـــ مگر اس سلسلہ کا دوسرا اہم مضمون سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی سیرت پر ہے ـــ ہم اس مضمون کیلئے جس سے

حضرت ابوسفیانؓ کی عظیم شخصیت کے کچھ نہایت اہم پہلو خود ہمارے علم میں پہلی بار آئے ہیں — حضرت مولانا عبدالقدوس رومی صاحب مدظلہ کے بہت ممنون ہیں — یہ مضمون بھی اہل علم و اہل نظر کی خاص توجہ کا مستحق ہے۔

بھائی صاحب مدظلہ کے مضمون "یہ ملامت — زہے نصیب!" کی دوسری اور آخری قسط بھی اس شمارے میں شامل ہے۔ گذشتہ ماہ ۱۱ مہینے یہاں قیام کے بعد وہ لندن واپس ہو گئے ہیں — وہیں سے یہ مضمون انھوں نے بھیجا ہے — امید ہے کہ جو لوگ اس مضمون کو بھی کھلے دل سے اور توجہ کے ساتھ پڑھیں گے انکے بہت سے اشکالات رفع ہو جائیں گے — خدا کرے ایسا ہی ہو۔

ایک معذرت: آج کل ہم لوگ جن احوال میں مبتلا ہیں جن کا کوئی ذکر ابھی تک الفرقان کے صفحات میں نہیں آیا ہے اور خدا کرے کبھی نہ آئے۔ انکی وجہ سے الفرقان کا نظام بھی متأثر ہوا ہے۔ یہ شمارہ بھی اسی وجہ سے دو مہینے کا مشترک نکالنا پڑا ہے — کوشش یہی ہے کہ آئندہ سے ہر شمارہ اپنے مقررہ وقت پر روانہ ہو، قارئین کرام، امید ہے کہ معذرت بھی قبول فرمائیں گے اور دعاؤں سے بھی نوازیں گے۔

حضرت والد ماجد مدظلہ کا حال: گذشتہ شمارے میں بھائی صاحب مدظلہ نے والد ماجد کی علالت کا حال لکھا تھا، اُن دنوں وہ نرسنگ ہوم میں تھے، اب تازہ حال یہ ہے کہ نرسنگ ہوم سے گھر تو ۲۵ اکتوبر کو تشریف لے آئے تھے لیکن مختلف امراض اور ضعف کے اثر سے جو حال ہے اسے بیان کرنا مشکل ہے، پیشاب اب بھی نلکی ہی کے ذریعہ ہو رہا ہے، نیند بہت کم ہو گئی ہے۔ اور کئی ماہ سے یہ حال ہے کہ خود سے کروٹ لینا بھی ممکن نہیں بولنا اور سننا بھی بہت مشکل ہے — کچھ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ مثانہ کے غدود PROSTATE GLANDS کا آپریشن ضروری ہے، اور کچھ کی رائے ہے کہ عام حالت آپریشن کی اجازت نہیں دیتی — مرض کے علاوہ کچھ دوسرے اثرات بھی ہیں۔ نہایت عاجزی کے ساتھ اپنے تمام بزرگوں اور دوستوں سے راقم الحروف سب اہلخانہ کی طرف سے درخواست کرتا ہے کہ ان کی عافیت کیلئے دعاؤں کا اہتمام فرمائیں، اور ساتھ ہی یہ بھی کہ ہم لوگوں کو کما حقہ خدمت اور اکتساب فیض کی توفیق ملے — سمر نرسنگ ہوم کے مالکان ڈاکٹر محمد غوث قریشی اور ڈاکٹر محمد عرفات قریشی علاج کے سلسلہ میں پوری ذمہ داری اپنے سر لئے ہوئے ہیں، بار بار خود آکر دیکھنا اور شہر کے مختلف معالجوں سے مشورے کرنا، اور علاج معالجہ کے سلسلہ میں ہر وقت ہر خدمت کیلئے حاضر رہنا

اُن کے لئے اور ان کے گھر والوں کے لئے بھی دنیا و آخرت کی بھلائیوں کی دعا فرمائیں۔

ایک گذارش حضرت والد ماجد مدظلہ کے اہلِ تعلق سے ان کیلئے صحت وعافیت کی دعاؤں کی درخواست کے علاوہ انہی کے حکم پر یہ کرنی ہے کہ اب وہ ایک خط بھی پڑھنے یا سننے اور پھر اس کا جواب لکھوانے کے حال میں نہیں۔ لہذا ان سے خط وکتابت بالکل نہ کی جائے ـــــ اور اس سلسلہ میں بالکل معذور سمجھا جائے[1]۔

آخر میں "الفرقان" کے قدرداں اپنے تمام بزرگوں اور کرم فرماؤں سے ان دعاؤں کے اہتمام کی خاص طور پر درخواست ہے کہ اپنے دین کی خدمت وحفاظت کا جو کام اللہ تعالیٰ نے الفرقان سے اب تک لیا ہے، وہ جاری رہے، اور ہر ہر قدم پر نیت، رائے اور عمل کی غلطی وکوتاہی سے ہماری حفاظت ہو۔ اور اس راہ میں درکار زادِ سفر یعنی ایمان واحتساب، اخلاص وللہیت، ہمت واستقامت اور صبر وتحمل کے اوصاف میں سے ہمیں حصۂ وافر ملے ـــــ آمین

ہیچمداں
خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی ندوی
۲۴ر نومبر ۱۹۹۲ء

---

[1] والد ماجد مدظلہ ہی کے حکم سے یہ وضاحت بھی کی جاتی ہے کہ اس شمارے میں سلسلۂ معارف الحدیث کی جو قسط شائع ہو رہی ہے وہ کافی عرصہ پہلے وہ لکھوا چکے تھے ـــــ اور اسی مناسبت سے گذارش ہے کہ اس مبارک اور مفید سلسلہ کی تکمیل [illegible] اور خاص کر اس کے حوالہ سے حضرت والد صاحب کی صحت کے لئے دعاؤں کا مزید اہتمام کیا جائے کہ یہ مبارک کام انہی کے ہاتھوں پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے۔

ایک ضروری اعلان

گذشتہ سال بھر کے اندر ہر چیز کی قیمت میں زبردست اضافہ ہوا ہے کاغذ اور کتابت طباعت کی اجرت اور دوسرے تمام ہی اخراجات میں ہونے والے اضافہ کی وجہ سے الفرقان کے سالانہ زرِ تعاون میں تھوڑا سا اضافہ ناگزیر ہو گیا ہے ـــــ نئی شرح ص۲ پر فہرست کے نیچے درج ہے۔ تمام نئے اور پرانے خریداروں نیز ایجنسیوں سے گذارش ہے کہ اب اسی تبدیل شدہ نرخ کے مطابق ترسیل زر فرمائیں۔

ناظم ادارہ الفرقان

مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ

معارف الحدیث

کتاب المناقب و الفضائل (۴۱)

فضائل اہلبیت نبوی: ازواج مطہرات اور ذریت طیبہ (۵)

اُمّ المؤمنین حضرت حفصہؓ (۳)

یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، کی صاحبزادی تھیں، حضرت عمرؓ کی اولاد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی تنہا یہی حقیقی بہن تھیں، اُن کی والدہ زینب بنت مظعونؓ تھیں جو مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعونؓ کی بہن تھیں، اور خود بھی صحابیہ تھیں۔ حضرت حفصہؓ کی ولادت بعثت نبوی سے ۵ سال پہلے ہوئی تھی، اس لحاظ سے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریباً ۳۵ سال چھوٹی تھیں۔

ہجرت سے پہلے ان کا نکاح حضرت خنیسؓ بن حذافہ سہمی نامی ایک صحابی سے ہوا تھا اور ان ہی کے ساتھ انھوں نے مدینہ منورہ ہجرت کی تھی، حضرت خنیسؓ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے تھے، اور راجح قول کے مطابق بدر ہی میں ان کے کاری زخم آئے جن سے وہ جانبر نہیں ہو سکے۔ اور کچھ ہی عرصہ کے بعد ان ہی زخموں کی وجہ سے شہادت پائی۔

حضرت خنیسؓ کے انتقال کے بعد حضرت عمرؓ کو اپنی بیٹی کی فکر ہوئی۔ یہ غزوۂ بدر کے بعد کا زمانہ ہے۔ اسی موقع پر حضرت عثمان کی اہلیہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوا تھا حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ سے حفصہ کے نکاح کی پیشکش کی۔ انھوں نے

غور کرنے کے لئے کچھ وقت مانگا اور چند دن کے بعد معذرت کردی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے یہی پیشکش کی، مگر انھوں نے خاموشی اختیار کی اور کوئی جواب نہیں دیا۔ حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ مجھے ان کی خاموشی حضرت عثمان کے انکار سے زیادہ ناگوار گذری ــــ اسکے کچھ ہی عرصہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کے لئے پیام دیا، اور جب یہ نکاح ہوگیا تب حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ سے لے اور کہا کہ میرا خیال ہے کہ جب تم نے مجھ سے حفصہ سے نکاح کی خواہش کی تھی اور میں خاموش رہا تھا تو تم اس سے رنجیدہ ہوئے تھے۔ اصل میں قصّہ یہ تھا کہ مجھے یہ معلوم ہوچکا تھا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ حفصہ کو اپنے نکاح میں لینے کا ہے۔ اور اسی وجہ سے میں نے تمھاری پیشکش کا کوئی جواب نہیں دیا تھا، میں یہ بھی مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات ابھی راز میں رکھی تھی، میں اس کو ظاہر کردوں۔ اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارادہ میرے علم میں نہ ہوتا تو میں ضرور تمھاری پیشکش قبول کرلیتا ــــ یہ ساری تفصیلات صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت حفصہ کے بھائی حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی کی روایت سے موجود ہیں۔ حدیث کی ایک اور کتاب مسند ابویعلیٰ میں اتنی بات کا اور اضافہ ہے کہ جب حضرت عثمان نے حضرت عمرؓ کی پیشکش قبول کرنے سے معذرت ظاہر کردی تو حضرت عمرؓ نے اسی کا شکوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ جس پر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ حفصہ کو عثمان سے بہتر شوہر دے گا اور عثمان کو تمھاری بیٹی حفصہ سے بہتر بیوی۔ چنانچہ کچھ ہی دنوں کے بعد حضرت عثمان کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی دوسری صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ سے ہوا اور حضرت حفصہؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کا شرف ملا۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے مناقب میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں قرآن مجید کا جو نسخہ مکمل شکل میں مرتب و مدون کیا گیا تھا۔ وہ نسخہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا ہی کی تحویل میں رہا، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں جب ضرورت پڑی کہ قرآن مجید کے

یکساں نسخے مرکزِ خلافت ہی سے مدوّن و مرتب کرا کے عالم اسلام میں بھیجے جائیں تو حضرت حفصہؓ کے پاس محفوظ نسخہ کو بنیاد مانا گیا تھا ــــ اس کی ضروری تفصیل اسی سلسلۂ معارف الحدیث میں حضرت عثمانؓ کے مناقب میں لکھی جا چکی ہے ــــ یہاں تو صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ عہدِ فاروقی کے بعد اس نسخہ کی حفاظت کا شرف حضرت حفصہؓ کے حصے میں آنا یقیناً انکی ایک قابلِ ذکر فضیلت ہے۔ ام المؤمنین حضرت حفصہؓ نے حضرت معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں ۴۵ھ میں انتقال فرمایا۔ اس وقت اُن کی عمر قریباً ۶۳ سال تھی۔

ان تعارفی و تمہیدی کلمات کے بعد وہ حدیث پڑھئے جس میں اللہ کے مقرب فرشتے حضرت جبرئیلؑ کی زبانی حضرت حفصہؓ کے بارے میں ایک شہادت نقل ہوئی ہے، اور اسی کی وجہ سے واقعہ یہ ہے کہ حضرت حفصہؓ کے فضائل میں تنہا یہی حدیث بالکل کافی ہے۔

عَنْ قَيْسِ بْنِ زَيْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم طَلَّقَهَا تَطْلِيْقَةً ثُمَّ ارْتَجَعَهَا. وَذَالِكَ اَنَّ جِبْرَئِيْلَ قَالَ لَهٗ ارْجِعْ حَفْصَةَ فَاِنَّهَا صَوَّامَةٌ قَوَّامَةٌ، وَاِنَّهَا زَوْجَتُكَ فِي الْجَنَّةِ.

ترجمہ: قیس ابن زید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کو ایک مرتبہ طلاق دی پھر رجوع فرما لیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپؐ سے کہا کہ آپؐ حفصہ سے رجعت کرلیں اس لئے کہ وہ بہت روزہ رکھنے والی اور بہت نماز پڑھنے والی ہیں۔ اور وہ جنت میں بھی آپؐ کی زوجہ ہونگی۔

تشریح: اللہ تعالیٰ کے یہاں حضرت حفصہؓ کی قدر و منزلت اور مقبولیت و محبوبیت کے اندازہ کرنے کے لئے یہ حدیث بالکل کافی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کسی وجہ سے انکو طلاق دے دی تو اللہ نے نہ صرف حضرت جبرئیل کے ذریعہ آپؐ کو رجعت کرنے کا حکم بھیجا بلکہ حضرت حفصہؓ کی سیرت و کردار کے بارے میں یہ سند اور یہ شہادت بھی عطا فرمائی کہ یہ دن کو کثرت سے روزہ رکھتی ہیں اور اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہو کر نمازیں پڑھتی ہیں اور یہی نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ خوشخبری بھی سنائی کہ جنت میں بھی ان کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کا شرف مقدر ہو چکا ہے۔

یہ بات تحقیقی طور پر نہیں معلوم ہو سکی کہ طلاق کے اس واقعہ کا اصل سبب کیا تھا۔ البتہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ طلاق اور رجعت ان دونوں کے سلسلہ کا یہ واقعہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں پیش آیا اسی سے امت کو طلاق اور رجعت کا صحیح اور مسنون طریقہ عملی طور پر معلوم ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ اس واقعہ کے پیش آنے کی ایک حکمت اسی طریقہ کی تعلیم ہو —— اس کے علاوہ یہ بھی اسی واقعہ کی برکت ہے کہ اس کی بدولت اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی بلند مقامی اور ان کے وہ خاص اوصاف جو اس کا سبب بنے، اور پھر اُن کا جنتی ہونا، یہ سب بھی معلوم ہو گیا۔ رضی اللہ عنہا وأرضاہا۔

مُسلمانوں کو اُمّت بننے کی دعوت

{ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وصال سے تین دن پہلے یعنی ۲۶ ذیقعدہ (مطابق ۳۰ مارچ) منگل کے دن، بعد نماز فجر رائیونڈ (ضلع لاہور) میں ایک اہم تقریر فرمائی تھی (یہ آپ کی زندگی کی اہم آخری تقریر تھی. (ہمیں یہ تقریر مولانا عبد العزیز صاحب گھلنوی کے ذریعہ حاصل ہوئی ہے) ــ یہ پوری تقریر ۲۶ صفحہ کی تھی، صفحات میں یا گنجائش کی کمی اور ناظرین کی سہولت فہم کے لئے ہم کسی قدر اختصار اور لفظی ترمیم کے ساتھ اس کو ذیل میں درج کر رہے ہیں۔ ہم نے اس کی کوشش کی ہے کہ اس کا کوئی اہم حصّہ چھوٹنے نہ پائے۔ حضرت مولانا مرحوم نے حمد و صلوٰۃ کے بعد خلاف عادت تقریر اس طرح شروع فرمائی }

"دیکھو میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ اس کے باوجود ضروری سمجھ کے بول رہا ہوں، جو سمجھ کے عمل کرے گا اللہ تعالیٰ اسے چمکائے گا ورنہ اپنے پاؤں پہ کلہاڑی مارے گا۔"

اس کے بعد فرمایا۔

"یہ امت بڑی مشقت سے بنی ہے اس کو امت بنانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے بڑی مشقتیں اٹھائی ہیں اور ان کے دشمنوں یہود و نصاریٰ نے ہمیشہ اس کی کوششیں کی ہیں کہ مسلمان ایک امت نہ رہیں بلکہ ٹکڑے ٹکڑے ہوں، اب مسلمان اپنا امت پنا (یعنی امت ہونے کی صفت) کھو چکے ہیں، جب تک یہ امت بنے ہوئے تھے چند لاکھ ساری دنیا پر بھاری تھے، ایک پکا مکان نہیں تھا،

مسجد تک پکی نہیں تھی مسجد میں چراغ تک نہیں جلتا تھا، مسجد نبوی میں ہجرت کے نویں سال چراغ جلا ہے سب سے پہلا چراغ جلانے والے تمیم داری ہیں وہ ۹ھ میں اسلام لائے ہیں ـــ اور ۹ھ تک قریب قریب سارا عرب اسلام میں داخل ہو چکا تھا، مختلف قومیں، مختلف زبانیں، مختلف قبیلے ایک امت بن چکے تھے تو جب یہ سب کچھ ہو گیا۔ اس وقت مسجد نبوی میں چراغ جلا، لیکن حضورؐ جو نور ہدایت لے کر تشریف لائے تھے وہ پورے عرب میں بلکہ اس کے باہر بھی پھیل چکا تھا اور امت بن چکی تھی، پھر یہ امت دنیا میں اٹھی جدھر کو نکلی ملک کے ملک پیروں میں گرے.... یہ امت اس طرح بنی تھی کہ ان کا کوئی آدمی اپنے خاندان، اپنی برادری، اپنی پارٹی، اپنی قوم، اپنے وطن، اپنی زبان کا حامی نہ تھا، مال و جائیداد اور بیوی بچوں کی طرف دیکھنے والا بھی نہ تھا بلکہ ہر آدمی صرف یہ دیکھتا تھا کہ اللہ و رسول کیا فرماتے ہیں، امت جب ہی بنتی ہے جب اللہ و رسول کے حکم کے مقابلہ میں سارے رشتے اور سارے تعلقات کٹ جائیں، جب مسلمان ایک امت تھے تو ایک مسلمان کے کہیں قتل ہو جانے سے ساری امت ہل جاتی تھی، اب ہزاروں لاکھوں کے گلے کٹتے ہیں اور کانوں پہ جوں نہیں رینگتی۔

سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے آگے آپ نے فرمایا۔

امت کسی ایک قوم اور ایک علاقہ کے رہنے والوں کا نام نہیں ہے بلکہ سیکڑوں ہزاروں قوموں اور علاقوں سے جڑ کر امت بنتی ہے جو کوئی کسی ایک قوم یا ایک علاقہ کو اپنا سمجھتا ہے اور دوسروں کو غیر سمجھتا ہے وہ امت کو ذبح کرتا ہے اور اس کے ٹکڑے کرتا ہے اور حضورؐ کی اور صحابہؓ کی محنتوں پر پانی پھیرتا ہے ـــ امت کو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پہلے خود ہم نے ذبح کیا ہے۔ یہود و نصاریٰ نے تو اس کے بعد کٹی کٹائی امت کو کاٹا ہے ـــ اگر مسلمان اب پھر امت بن جائیں تو دنیا کی ساری طاقتیں مل کر بھی ان کا بال بیکا نہیں کر سکیں گی۔ ایٹم بم اور راکٹ ان کو ختم نہیں کر سکیں گے لیکن اگر وہ قومی اور علاقائی عصبیتوں کی وجہ سے باہم امت کے ٹکڑے کرتے رہے تو خدا کی قسم تمہارے ہتھیار اور تمہاری فوجیں تم کو نہیں بچا سکیں گی۔

سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے آگے آپ نے فرمایا

مسلمان ساری دنیا میں اس لئے پٹ رہا اور مر رہا ہے کہ اُس نے اُمت پنے کو ختم کر کے حضورؐ کی قربانی پر پانی پھیر دیا ہے۔ میں یہ دل کے غم کی باتیں کہہ رہا ہوں، ساری تباہی اس وجہ سے ہے کہ امت اُمت نہ رہی بلکہ یہ بھی بھول گئے کہ اُمت کیا ہے اور حضورؐ نے کس طرح امت بنائی تھی۔

امت ہونے کے لئے اور مسلمانوں کے ساتھ خدائی مدد ہونے کے لئے صرف یہ کافی نہیں ہے کہ مسلمانوں میں نماز ہو، ذکر ہو، مدرسہ ہو، مدرسہ کی تعلیم ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قاتل ابن ملجم ایسا نمازی اور ایسا ذاکر تھا کہ جب اس کو قتل کرتے وقت غصہ میں بھرے لوگوں نے اس کی زبان کاٹنی چاہی تو اس نے کہا سب کچھ کر لو لیکن میری زبان مت کاٹو تاکہ زندگی کے آخری سانس تک میں اس سے اللہ کا ذکر کرتا رہوں۔ اس کے باوجود حضورؐ نے فرمایا ہے کہ علی کا قاتل میری امت کا سب سے زیادہ شقی اور بدبخت ترین آدمی ہوگا، اور مدرسہ کی تعلیم تو ابوالفضل اور فیضی نے بھی حاصل کی تھی اور ایسی حاصل کی تھی کہ قرآن پاک کی تفسیر بے نقط لکھ دی، حالانکہ انھوں نے ہی اکبر کو گمراہ کر کے دین کو برباد کیا تھا۔ تو جو باتیں ابن ملجم اور ابوالفضل فیضی میں تھیں وہ امت بننے کے لئے اور خدا کی غیبی نصرت کے لئے کیسے کافی ہو سکتی ہیں۔

سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے آگے حضرت مولانا نے فرمایا۔

حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے ساتھی دینداری کے لحاظ سے بہترین مجموعہ تھے، وہ جب سرحدی علاقے میں پہنچے اور وہاں کے لوگوں نے ان کو اپنا بڑا بنالیا تو شیطان نے وہاں کے کچھ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ یہ دوسرے علاقے کے لوگ ان کی بات یہاں کیوں چلے۔ انھوں نے ان کے خلاف بغاوت کرائی، ان کے کتنے ہی ساتھی شہید کر دیئے گئے اور اس طرح خود مسلمانوں نے علاقائی بنیاد پر امت پنے کو توڑ دیا، اللہ نے اس کی سزا میں انگریزوں کو مسلط کیا، یہ خدا کا عذاب تھا۔

یاد رکھو میری قوم اور میرا علاقہ اور میری برادری یہ سب امت کو توڑنے والی باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کو یہ باتیں اتنی ناپسند ہیں کہ حضرت سعدؓ بن عبادہ جیسے بڑے صحابی سے اس بارہ میں جو غلطی ہوئی (جو اگر دب نہ گئی ہوتی تو اس کے نتیجہ میں انصار اور مہاجرین میں تفریق ہو جاتی۔) اس کا نتیجہ حضرت سعد کو دنیا ہی میں بھگتنا پڑتا۔ روایات میں ہے کہ ان کو جنات نے قتل کر دیا اور مدینہ میں یہ آواز سنائی دی [illegible] بولنے والا

کوئی نظر نہ آیا۔

قتلنا سید الخزرج سعد بن عبادہ[1]

رمیناہ بسھم فلم یخط فوادہ

اس واقعہ نے مثال قائم کردی اور سبق دیا کہ اچھے سے اچھا آدمی بھی اگر قومیت یا علاقہ کی بنیاد پر اُمت بنے کو توڑے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو توڑ کے رکھ دے گا۔

اُمت جب بنے گی جب امت کے سب طبقے بلا تفریق اُس کام میں لگ جائیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم دے گئے ہیں اور یاد رکھو اُمت بنے کو توڑنے والی چیزیں معاملات اور معاشرت کی خرابیاں ہیں، ایک فرد یا طبقہ جب دوسرے کے ساتھ ناانصافی اور ظلم کرتا ہے اور اس کا پورا حق اس کو نہیں دیتا یا اس کو تکلیف پہنچاتا ہے یا اس کی تحقیر اور بے عزتی کرتا ہے تو تفریق پیدا ہوتی ہے اور اُمت بنا ٹوٹتا ہے، اس لئے میں کہتا ہوں کہ صرف کلمہ اور تسبیح سے امت نہیں بنے گی، امت معاملات اور معاشرت کی اصلاح سے اور سب کا حق ادا کرنے اور سب کا اکرام کرنے سے بنے گی بلکہ جب بنے گی جب دوسروں کے لئے اپنا حق اور اپنا مفاد قربان کیا جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اپنا سب کچھ قربان کر کے اور اپنے پر تکلیفیں جھیل کے اس امت کو امت بنایا تھا ___ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک دن لاکھوں کروڑوں روپئے آئے اُن کی تقسیم کا مشورہ ہوا۔ اس وقت امت بنی ہوئی تھی، یہ مشورہ کرنے والے کسی ایک ہی قبیلہ یا ایک ہی طبقہ کے نہ تھے بلکہ مختلف طبقوں اور قبیلوں کے وہ لوگ تھے جو حضورؐ کی صحبت کے اعتبار سے ...... بڑے اور خواص سمجھے جاتے تھے، انھوں نے مشورے سے باہم طے کیا کہ تقسیم اس طرح پر ہو کہ سب سے زیادہ حضورؐ کے قبیلہ والوں کو دیا جائے۔ اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ کے قبیلہ والوں کو، پھر حضرت عمرؓ کے قبیلہ والوں کو اس طرح حضرت عمرؓ کے اقارب تیسرے نمبر پر آتے ___ جب یہ بات حضرت عمرؓ کے سامنے رکھی گئی تو آپ نے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ اس امت کو جو کچھ ملا ہے اور مل رہا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے اور آپ کے صدقے میں مل رہا ہے، اس لئے بس حضورؐ ہی کے تعلق کو معیار بنایا جائے جو نسب میں آپ سے

---

[1] ہم نے قبیلۂ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو ہلاک کر دیا ہم نے اس کو تیر کا نشانہ بنایا جو ٹھیک اس کے دل پر لگا۔

زیادہ قریب ہوں اُن کو زیادہ دیا جائے، جو دوم سوم چہارم نمبر پر ہوں ان کو اسی نمبر پر رکھا جائے، اس طرح سب سے زیادہ بنی ہاشم کو دیا جائے اس کے بعد بنی عبد مناف کو پھر قصی کی اولاد کو، پھر کلاب کی، پھر کعب کو، پھر مرہ کی اولاد کو، اس حساب سے حضرت عمرؓ کا قبیلہ بہت پیچھے پڑ جاتا تھا اور اس کا حصہ بہت کم ہو جاتا تھا، مگر حضرت عمرؓ نے یہی فیصلہ کیا اور مال کی تقسیم میں اپنے قبیلہ کو اتنے پیچھے ڈال دیا —— اس طرح بنی تھی یہ اُمت۔

اسی سلسلہ میں آگے فرمایا۔

اُمت بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ سب کی یہ کوشش ہو کہ آپس میں جوڑ ہو پھوٹ نہ پڑے۔ حضورؐ کی ایک حدیث کا مضمون ہے کہ قیامت میں ایک آدمی لایا جائے گا جس نے دنیا میں نماز، روزہ، حج تبلیغ سب کچھ کیا ہوگا مگر وہ عذاب میں ڈالا جائے گا، کیونکہ اس کی کسی بات نے امت میں تفریق ڈالی ہوگی اُس سے کہا جائے گا پہلے اپنے اس ایک لفظ کی سزا بھگت لے جس کی وجہ سے اُمت کو نقصان پہنچا، اور ایک دوسرا آدمی ہوگا جس کے پاس نماز روزہ، حج وغیرہ کی بہت کمی ہوگی اور خدا کے عذاب سے بہت ڈرتا ہوگا، مگر اس کو بہت ثواب سے نوازا جائے گا، وہ خود پوچھے گا کہ یہ کرم میرے کس عمل کی وجہ سے ہے اسکو بتایا جائے گا کہ تو نے فلاں موقع پر ایک بات کہی تھی جس سے امت میں پیدا ہونے والا فساد رک گیا اور بجائے توڑ کے جوڑ پیدا ہو گیا۔ یہ سب تیرے اسی لفظ کا صلہ اور ثواب ہے۔

اُمت کے بنانے اور بگاڑنے میں جوڑنے اور توڑنے میں سب سے زیادہ دخل زبان کا ہوتا ہے، یہ زبان دلوں کو جوڑتی بھی ہے اور پھاڑتی بھی ہے زبان سے ایک بات غلط اور فساد کی نکل جاتی ہے اور اس پر لاٹھی چل جاتی ہے اور پورا فساد کھڑا ہو جاتا ہے اور ایک ہی بات جوڑ پیدا کر دیتی ہے اور پھٹے ہوئے دلوں کو ملا دیتی ہے —— اس لئے سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ زبانوں پر قابو ہو اور یہ جب ہو سکتا ہے جب بندہ ہر وقت اس کا خیال رکھے کہ خدا ہر وقت اور ہر جگہ اس کے ساتھ ہے اور اس کی ہر بات کو سن رہا ہے۔

اسی سلسلہ میں آگے فرمایا کہ۔

مدینہ میں انصار کے دو قبیلے تھے اوس اور خزرج، ان میں پشتوں سے عداوت اور لڑائی چلی آرہی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرماکر مدینہ پہنچے اور انصار کو اسلام کی توفیق ملی تو حضورؐ کی اور اسلام کی برکت سے ان کی پشتوں کی لڑائیاں ختم ہوگئیں اور اوس و خزرج شیر و شکر ہوگئے۔ یہ دیکھ کر یہودیوں نے اسکیم بنائی کہ کسی طرح ان کو پھر سے لڑایا جائے۔ ایک مجلس میں جس میں دونوں قبیلوں کے آدمی موجود تھے، ایک سازشی آدمی نے اُن کی پُرانی لڑائیوں سے متعلق کچھ شعر پڑھ کے اشتعال پیدا کردیا۔ پہلے تو زبانیں ایک دوسرے کے خلاف چلیں، پھر دونوں طرف سے ہتھیار نکل آئے۔ حضورؐ سے کسی نے جاکر کہا آپؐ تشریف لائے اور فرمایا کہ میرے ہوتے ہوئے تم آپس میں خون خرابہ کروگے، آپؐ نے بہت مختصر مگر درد سے بھرا ہوا خطبہ دیا، دونوں فریقوں نے محسوس کرلیا کہ ہمیں شیطان نے ورغلایا، دونوں روئے اور گلے ملے اور یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝ ـــــ الخ"

اے مسلمانو! خدا سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنا چاہئے اور مرتے دم تک پورے پورے مسلم اور خدا کے فرمانبردار بندے بنے رہو ـــــ جب آدمی ہر وقت خدا کا خیال رکھے گا، اس کے قہر و عذاب سے ڈرتا رہے گا اور ہردم اس کی تابعداری کرے گا تو شیطان بھی اسے نہیں بہکا سکے گا ـــــ اور اُمت پھوٹ سے اور ساری خرابیوں سے محفوظ رہے گی۔

آگے فرمایا۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا

اور اللہ کی رسی کو یعنی اس کی کتاب پاک اور اس کے دین کو سب مل کر مضبوطی سے تھامے رہو، یعنی پوری اجتماعیت کے ساتھ اور امت پنے کی صفت کے ساتھ سب مِل جُل کر دین کی رسی کو تھامے رہو اور اس میں لگے رہو اور قوم کی بنیاد پر یا علاقہ کی بنیاد پر یا زبان کی بنیاد پر ـــــ یا کسی اور بنیاد پر ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو اور اللہ کے اس احسان کو نہ بھولو کہ اس نے تمہارے دلوں کی وہ عداوت اور دشمنی ختم

کر کے جو پشتوں سے تم میں چلی آرہی تھی تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تمہیں باہم بھائی بھائی بنا دیا اور تم آپس میں لڑتے وقت دوزخ کے کنارے پر کھڑے تھے بس گرنے ہی والے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو تھام لیا اور دوزخ سے بچا لیا۔

اس کے آگے فرمایا کہ۔

شیطان تمہارے ساتھ ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جس کا موضوع ہی بھلائی کی اور نیکی کی طرف بلانا اور ہر برائی اور فساد سے روکنا ہو۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

امت میں ایک گروہ وہ ہو جس کا کام اور موضوع ہی یہ ہو کہ وہ دین کی طرف اور ہر قسم کے خیر کی طرف بلائے۔ ایمان کے لئے اور خیر اور نیکی کے راستہ پر چلنے کے لئے محنت کرتا رہے، نمازوں پر محنت کرے ذکر پر محنت کرے، حضورؐ کے لائے ہوئے علم پر محنت کرے، برائیوں اور معصیتوں سے بچانے کے لئے محنت کرے اور ان محنتوں کی وجہ سے امت ایک امت بنی رہے ـــــ آگے فرمایا۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَأُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ـــــ جو لوگ ان ہدایتوں کے بعد بھی شیطان کی پیروی کر کے اور الگ الگ راہوں پر چل کے اختلاف پیدا کریں گے اور امت کے امت بننے کو توڑیں گے تو ان پر خدا کی سخت مار پڑے گی (أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝)

دین کی ساری تعلیم اور ساری چیزیں جوڑنے والی اور جوڑنے کے لئے ہیں۔ نماز میں جوڑ ہے روزہ میں جوڑ ہے، حج میں قوموں اور ملکوں اور مختلف زبان والوں کا جوڑ ہے، تعلیم کے حلقے جوڑنے والے ہیں، مسلمانوں کا اکرام اور باہم محبت اور تحفہ تحائف کا لین دین، یہ سب جوڑنے والی اور جنت میں لیجانے والی چیزیں ہیں اور قیامت میں ان اعمال کے لئے محنتیں کرنے والوں کے چہرے نورانی ہوں گے اور ان کے برخلاف باہم بغض و حسد، غیبت، چغل خوری، توہین و تحقیر اور دل آزاری یہ سب پھوٹ ڈالنے والے اور توڑنے والے اور دوزخ میں لے جانے والے اعمال ہیں اور ان اعمال والے آخرت میں سیاہ ہوں گے

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ
أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝
وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝

جنھوں نے پھوٹ ڈال کے اور پھوٹ والے اعمال کر کے امت کو توڑا ہوگا۔ وہ قیامت کے دن قبروں سے کالے منھ اٹھیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ تم نے ایمان و اسلام کے بعد کفر والوں کا طریقہ اختیار کیا، اب تم یہاں دوزخ کا عذاب چکھو اور جو ٹھیک راستے پر چلتے رہے ہوں گے، ان کے چہرے نورانی اور چمکتے ہوئے ہوں گے اور وہ ہمیشہ اللہ کی رحمت میں اور جنت میں رہیں گے۔

میرے بھائیو دوستو! یہ سب آیتیں اس وقت اتری تھیں جب ہونے انصار میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی تھی اور ان کے دو قبیلوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیا تھا۔ ان آیتوں میں مسلمانوں کی باہمی پھوٹ اور لڑائی کو کفر کی بات کہا گیا ہے اور آخرت کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے ـــــ آج ساری دنیا میں امت بنانے کی محنت چل رہی ہے اس کا علاج اور توڑ یہی ہے کہ تم اپنے کو حضورؐ والی محنت میں لگا دو، مسلمانوں کو مسجدوں میں لاؤ، وہاں ایمان کی باتیں ہوں، تعلیم اور ذکر کے حلقے ہوں، دین کی محنت کے مشورے ہوں مختلف طبقوں کے اور مختلف برادریوں کے اور مختلف زبانوں والے لوگ مسجد نبوی کے طریقہ پر ان کے دلوں میں جڑیں جب امت بنا آئے گا اُن باتوں سے بچیں جن سے شیطان کو پھوٹ ڈالنے کا موقع ملے جب تین بیٹھیں تو اس کا خیال رکھیں کہ چوتھا ہمارے ساتھ اللہ ہے، چار پانچ بیٹھیں تو ہمیشہ یاد رکھیں کہ پانچواں یا چھٹواں اللہ ہمارے ساتھ ہی موجود ہے اور وہ ہماری بات سن رہا ہے اور دیکھ رہا ہے کہ ہم امت بنانے کی بات کر رہے ہیں یا امت بنا توڑنے کی۔ ہم کسی کی غیبت اور چغل خوری تو نہیں کر رہے ہے، کسی کے خلاف سازش تو نہیں کر رہے ہے ـــــ یہ امت حضورؐ کے خون اور فاقوں سے بنی تھی، اب ہم اپنی معمولی معمولی باتوں پر امت کو توڑ رہے ہیں یاد رکھو نماز جمعہ چھوڑنے پر بھی اتنی پکڑ نہیں ہوگی جتنی امت کے توڑنے پر ہوگی ـــــ اگر مسلمانوں میں امت بنا جائے تو وہ دنیا میں ہرگز ذلیل

نہ ہوں گے، روس اور امریکہ کی طاقتیں بھی ان کے سامنے جھکیں گی، اور امت پنا جب آئے گا جب "اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ" پر مسلمانوں کا عمل ہو، یعنی ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے مقابلہ میں چھوٹا بننے اور ذلت وتواضع اختیار کرنے کو اپنائے تبلیغ میں اسی کی مشق کرنی ہے جب مسلمانوں میں "اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ" والی صفت آجائے گی تو وہ دنیا میں "اَعِزَّةٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ" یعنی کافروں کے مقابلہ میں زبردست اور غالب ضرور ہوں گے چاہے وہ کافر یورپ کے ہوں یا ایشیا کے۔

میرے بھائیو دوستو! اللہ ورسول نے اُن باتوں سے شدت اور سختی سے منع فرمایا ہے جن سے دلوں میں فرق پڑے اور پھوٹ کا خطرہ بھی ہو، دو دو چار چار الگ کانا پوسی کریں۔ اس سے شیطان دلوں میں بدگمانی پیدا کرسکتا ہے اس سے منع فرمایا گیا اور اس کو شیطانی کام بتایا گیا "اِنَّمَا النَّجْوٰی مِنَ الشَّیْطَانِ لِیَحْزُنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَیْسَ بِضَآرِّهِمْ شَیْئًا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ" اسی طرح تحقیر اور استہزا اور تمسخر سے منع فرمایا گیا۔ "لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ" اس سے بھی منع فرمایا گیا کہ دوسرے کی کوئی برائی جو معلوم نہ ہو اس کو تجسس کرکے معلوم کیا جائے اور جو برائی کسی کو معلوم ہوگئی ہو اس کو دوسروں کے سامنے ذکر کرنے سے منع فرمایا گیا، اور غیبت کو حرام کیا گیا غیبت اس کا نام ہے کہ جو واقعی برائی کسی کی معلوم ہو اس کا ذکر کسی سے کیا جائے۔ "وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا" یہ تحقیر اور تمسخر اور تجسس اور غیبت سب وہ چیزیں ہیں جو آپس میں تفرقہ پیدا کرکے امت پنے کو توڑتی ہیں، ان سب کو حرام قرار دیا گیا ــــــ اور ایک دوسرے کا اکرام واحترام کرنا جس سے امت جڑتی بنتی ہے اس کی تاکید فرمائی گئی اور دوسروں سے اپنا اکرام چاہنے سے منع کیا گیا، کیونکہ اس سے امت بنتی نہیں بگڑتی ہے۔ امت جب بنے گی جب ہر آدمی یہ طے کرے کہ میں عزت کے قابل نہیں ہوں اس لئے مجھے عزت لینی نہیں بلکہ دوسروں کی عزت کرنی ہے اور دوسرے سب لوگ اس قابل ہیں کہ میں ان کی عزت کروں، ان کا اکرام کروں۔

اپنے نفسوں اور اپنی ذاتوں کو قربان کیا جائے گا تو امت بنے گی اور امت بنے گی تو عزت ملے گی، عزت اور ذلت روس اور امریکہ تک کے نقشوں میں نہیں ہے بلکہ خدا کے ہاتھ میں ہے اور

اُس کے ہاں اُصول اور ضابطہ ہے۔ جو شخص یا قوم، خاندان، طبقہ چمکانے والے اصول اور اعمال لاوے گا اس کو چمکا دیں گے جو مٹنے والے کام کرے گا اس کو مٹا دیں گے۔ یہود نبیوں کی اولاد ہیں، اصول توڑے تو اللہ نے ٹھوکر مار کے اُن کو توڑ دیا۔ صحابہ کرامؓ بُت پرستوں کی اولاد تھے، انھوں نے چمکانے والے اصول اختیار کئے تو اللہ نے ان کو چمکا دیا، اللہ کی رشتہ داری کسی سے نہیں ہے اس کے ہاں اصول اور ضابطہ ہے۔

دوستو! اپنے کو اس محنت پر جھونک دو کہ حضور کی امت میں امت پنا آجائے، اس میں ایمان و یقین آجائے، یہ ذکر و تسبیح اور تعلیم والی، خدا کے سامنے جھکنے والی، خدمت کرنے والی برداشت کرنے والی، دوسروں کا اعزاز و اکرام کرنے والی امت بن جائے، نجوی نہ کرنے والی، نافرمانی نہ کرنے والی، اپنے بھائیوں اور ساتھیوں کی تحقیر و تمسخر اور تجسس و غیبت نہ کرنے والی امت بن جائے۔ اگر کسی ایک علاقہ میں بھی یہ محنت اس طرح ہونے لگے جس طرح ہونی چاہئے تو ساری دنیا میں بات چل پڑے۔

اب اس کا اہتمام کرو کہ مختلف قوموں، علاقوں اور طبقوں اور مختلف زبان والوں کو جوڑ جوڑ کر جماعتوں میں بھیجو اور اصول کی پابندی کراؤ، پھر انشاء اللہ امت بننے والا کام ہوگا۔ اور شیطان اور نفس خدا نے چاہا تو کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔

اس کے بعد حضرت مولانا نے دیہات میں محنت کرنے اور فضا بنانے پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا ۔۔۔ اور حسب معمول دُعا پر تقریر ختم ہوئی۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ

فتنۂ رفض و تفضیلیت

کے خلاف

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا جہاد

اس سے پہلے بعض مضامین کے ضمن میں اُن اسباب کی طرف اشارات گذر چکے ہیں جنکی وجہ سے دورِ اکبری میں شیعوں کو مغلیہ حکومت کے اندر عمل دخل کا موقعہ ملا، اور عہدِ جہانگیری میں "نور جہاں" کے طفیل حکومت کی باگ ہی شیعوں کے ہاتھ میں چلی گئی بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ جہانگیر کے نام سے "نور جہاں" کا شیعی گھرانہ ہی اس وقت ہندوستان پر حکومت کر رہا تھا، خود جہانگیر کا اعتراف ہے :۔ ✓

درِ دولت پادشاہی من حالا در دست	اب میری ساری بادشاہی اسی سلسلہ (نورجہاں اور
ایں سلسلہ است، پدر دیوان کل، پسر وکیل	اسکے گھر والوں) کے ہاتھ میں ہے اس کا باپ دیوان کل
مطلق دختر ہمراز و مصاحب۔	ہے، اور بیٹا (نورجہاں کا بھائی آصف خاں) وکیل
(تزک جہانگیری)	مطلق ہے اور بیٹی (خود نورجہاں) ہمراز و ہم صحبت۔

جبکہ "تاج و تخت" پر اس طرح شیعیت کا قبضہ تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ "الناس علی دین ملوکھم" کے فطری اور طبعی اصول پر عوام میں رفض کے جراثیم نہ پھیلتے، چنانچہ شیعی خیالات عوام سنیوں میں بھی سرایت کرنے لگے ۔۔۔ حضرت علی مرتضیٰؓ کی افضلیتِ مطلقہ کا عقیدہ، اور جن صحابہ کرامؓ کے آپ سے اختلافات ہوئے انکی طرف سے بغض و عداوت اور اس قسم کے شیعیت کے دوسرے مبادی بھی وبائے عام کی طرح سنیوں میں پھیلنے لگے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ کھڑے ہی اس لئے کئے گئے تھے کہ اس قسم کے تمام فتنوں اور

ساری گمراہیوں کا قلع قمع کر کے دین کو پھر سے تر و تازہ اور ملت کو از سر نو زندہ کریں اس لئے اس فتنہ تشیع کے استیصال کی طرف بھی آپ نے خاص توجہ مبذول فرمائی اس سلسلہ میں آپ کی کوششیں تین طرح ظہور پذیر ہوئیں۔

۱۔ شیعی علماء سے آپ نے عام و خاص مجلسوں میں بالمشافہہ مناظرے اور مباحثے کئے جن میں انکو فاش شکستیں دیں اور حق یہ ہے کہ آپکے اسی اقدام نے تشیعیت کی ترقی کو بڑی حد تک روک دیا اور اسی ایک ضرب نے اس کی کمر توڑ دی۔

۲۔ مشہد کے بعض شیعی علماء نے ماوراء النہر کے سنی علماء کے ایک رسالہ کے جواب میں ایک نہایت پُر فریب اور سراپا تزویر رسالہ لکھا جس کا حاصل خود حضرت مجدد کے لفظوں میں "حضرات خلفاء ثلثہ رضی اللہ عنہم کی تکفیر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی مذمت و تشنیع تھی"۔۔۔ اس رسالہ کو ہندوستان کے شیعوں نے خوب پھیلایا اور خصوصاً امراء و حکام اور ارکان سلطنت کی مجالس میں اسکو خوب شہرت دی گئی یہاں تک کہ ہر طرف اور ہر جگہ اُسی کا چرچا ہونے لگا۔۔۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ نے پہلے تو خاص مجلسوں اور عام مجمعوں میں اس کا رد بیان کرنا شروع کیا اور اسکی مغالطہ آفرینیوں اور ابلہ فریبیوں کا پردہ خوب خوب چاک کیا۔۔۔ پھر اسکے بعد ایک مستقل رسالہ اسکے جواب میں لکھ کر شائع کیا۔ اس رسالہ کی اہمیت کا اندازہ بس اسی سے ہو سکتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ جیسے جلیل القدر امام نے اسکی شرح لکھی ہے۔

۳۔ اپنے سیکڑوں مکاتیب میں حضرت مجددؒ نے شیعی اصول و خیالات کی نہایت مدلل اور محققانہ تردید کی اور شیعوں کے بے پناہ پروپیگنڈے کی وجہ سے جو غلط خیالات خود سنیوں میں پیدا ہو رہے تھے نہایت حکمت کے ساتھ کتاب و سنت اور عقل سلیم کی روشنی میں اُن کی اصلاح فرمائی۔

اور معلوم ہے کہ آپ کے مکاتیب اگرچہ کسی خاص ہی شخص کے نام لکھے جاتے تھے اور بظاہر ان کی حیثیت نجی خطوط ہی کی ہوتی تھی لیکن اُنکی اشاعت و تداول اور نقل در نقل کا ایسا اہتمام تھا کہ گویا اس "غیر اخباری" زمانہ میں آپ کے یہاں سے "مجدد گزٹ" نکلتا تھا آپ کے خلفاء تمام اطراف ملک میں بلکہ ہندوستان سے باہر ماوراء النہر، بدخشاں، خراسان، توران اور طالقان وغیرہ وغیرہ میں بھی پھیلے ہوئے تھے، یا یوں کہئے کہ ایک خاص نظام اور نقشہ کے مطابق آپ نے ان کو مختلف مرکزوں میں بٹھا دیا تھا اور یہ سب ہی مختلف ذرائع سے مکتوبات شریف کی نقلیں حاصل کرتے رہتے تھے، اس لئے آپکے مکاتیب کی حیثیت فی الحقیقت نجی نہ تھی، بلکہ درحقیقت وہ تبلیغ و اشاعت کا ایک نہایت منظم اور مؤثر سلسلہ تھا۔۔۔ بہرکیف اس سلسلہ کے ذریعہ سے بھی آپ نے فتنہ رفض کی بڑی روک تھام کی،

اوراس وقت کے حالات کو پیش نظر رکھ کر یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اگر حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ اس طرف متوجہ نہ ہوتے تو اکبری الحاد سے جو مسلمان بچے تھے ان میں سے اکثر تشیعت کے جال میں پھنس چکے ہوتے ۔

اس سلسلہ میں حضرت علیہ الرحمہ نے متفرق طور پر جو کچھ ارقام فرمایا ہے اگر اس سب کو جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہوسکتی ہے، یہاں چند عنوانات کے ماتحت آپ کے مکتوبات گرامی کے چند ہی اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

فی زماننا اِن مجددی ارشادات کی اشاعت اس لئے بھی ضروری ہے کہ آج کل بعض تجارت پیشہ مدعیان فقر و تصوف" اپنی تجارت کی گرم بازاری کیلئے، اور بعض "موروثی پیر" اپنی جہالت و بے خبری اور ہوی پرستی کے باعث ادعاءِ "سنیت و حنفیت" کے ساتھ ساتھ انہی عقائد و خیالات کے حامل بلکہ مبلغ بنے ہوئے ہیں، جو دورِ اکبری اور عہد جہانگیری میں بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے شیعوں نے سنیوں میں پھیلائے تھے، بلکہ اب تو پوری بلند آہنگی کے ساتھ یہ دعوے بھی کئے جارہے ہیں کہ ہمیشہ سے اولیاء کرام اور صوفیاء عظام کا یہی مشرب رہا ہے، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے اِن ارشادات کے مطالعہ سے ناظرین کرام کو معلوم ہوجائے گا کہ اہل اللہ اور عرفاء امت کے نزدیک اس باب میں مسلک صحیح اور صراطِ مستقیم کیا ہے، اور اس مقدس گروہ کی نظر میں یہ خیالات (جن کو آج بعض حلقوں میں لازمۂ تصوف سمجھا جانے لگا ہے) کس درجہ گمراہانہ اور صحیح اسلامیت سے دور ہیں واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

افضلیت شیخین (رضی اللہ عنہما)

تشیعت کی پہلی سیڑھی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی افضلیت مطلقہ کا اعتقاد ہے اور چالاک روافض عوام سنیوں کو سب سے پہلے اسی عقیدے پر جمانے کی کوشش کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت علی مرتضیٰ کی قرابت قریبہ اور بعض دوسری وجوہ سے وہ اس ابلہ فریبی میں کسی قدر آسانی سے کامیاب بھی ہوجاتے ہیں پھر جب ایک شخص اتنی بات کو مان لیتا ہے کہ حضرت علی بلا استثناء تمام صحابہ کرام میں افضل تھے تو لازمی طور پر وہ اس نتیجہ پر بھی پہنچ جاتا ہے کہ صحابہ کرام نے خلافت کے انتخاب میں انکے ساتھ بے انصافی کی

یا کم از کم یہ کہ صحیح انتخاب نہیں کیا، اور جمہور صحابہ سے بدظنی اور بغض و عداوت ہی شیعی مذہب کا سنگ بنیاد ہے بہرحال شیعیت کا پہلا دروازہ یہی عقیدۂ تفضیل ہے حضرت مجدد علیہ الرحمہ نے بلامبالغہ بچاسوں جگہ اپنے مکتوبات میں اس پر روشنی ڈالی ہے جن میں سے صرف چند اقتباسات ملاحظہ ہوں ـــــ دفتر دوم کے پندرھویں مکتوب گرامی میں جو حکام بلدۂ سامانہ کے نام لکھا گیا ہے ارقام فرماتے ہیں[1]:۔

"حضرات شیخین (سیدنا ابوبکرؓ و سیدنا عمرؓ) کی افضلیت صحابہؓ و تابعین کے اجماع سے ثابت ہے جیسا کہ اکابر ائمہ کی ایک جماعت نے اسکو نقل کیا ہے جن میں سے ایک امام شافعی بھی ہیں، اور امام ابوالحسن اشعری نے فرمایا ہے کہ حضرت صدیقؓ و فاروقؓ کی افضلیت باقی تمام امت پر قطعی (غیر مشتبہ اور یقینی) ہے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے تواتر کے طور پر ثابت ہے کہ آپ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں خاص اپنے دارالخلافت میں اور اپنے تبعین کی کثیر جماعت کے سامنے اعلان فرمایا کہ ابوبکرؓ و عمرؓ بزرگ ترین امت ہیں"

اسی دفتر میں ایک طویل مکتوب آپ نے رکن سلطنت خان جہاں کو لکھا ہے جس میں آپ نے تمام ضروری عقائد تحریر فرمائے ہیں بلکہ اس لحاظ سے اگر اس کو "مجددی عقائد نامہ" کہا جائے تو بجا ہوگا۔ اس میں خلافت راشدہ اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"حضرت خاتم الانبیاء (علیہ و علیہم الصلوٰت والتسلیمات) کے بعد خلیفہ مطلق اور امام برحق حضرت ابوبکر صدیق ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہ انکے بعد حضرت عمر فاروقؓ انکے بعد حضرت عثمانؓ اور ان کے بعد حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور ان حضرات کی افضلیت بھی اسی ترتیب سے ہے یعنی سب سے بڑا درجہ حضرت صدیق اکبرؓ کا ہے انکے بعد فاروق اعظمؓ کا اُن کے بعد حضرت عثمان غنیؓ کا بعد ازاں حضرت علی مرتضیٰؓ کا (رضی اللہ عنہم اجمعین) اور شیخین کی فضیلت صحابہ و تابعین کے اجماع و اتفاق سے ثابت ہے ـــ حضرت امیر کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جو کوئی مجھے حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ پر فضیلت دے گا وہ مفتری ہے اور میں اسکو کوڑوں کی

[1] اصل مضمون میں مکتوبات کا فارسی یا عربی متن بھی دیا گیا ہے۔ ہم نے یہاں صرف ترجمہ پر اکتفا کیا ہے جو حضرات متن کا مطالعہ کرنا چاہیں ــــ وہ عنوان کے ماخذ "تذکرۂ مجدد الف ثانی" کا مطالعہ کریں ـــــ الفرقان

سزا دلواؤں گا جس طرح افترا کرنے والوں کو دیجاتی ہے۔ (مکتوب نمبر ۶۷ دفتر دوم ص۱۳۰)

بعض "الہامی معارف"

افضلیت شیخین اور حضرات خلفاء اربعہ کے باہمی فرق مراتب کے متعلق کہیں کہیں آپ نے "رسمی علوم" اور "اصطلاحی دلائل" سے گذر کر "اسرار و لطائف" کے رنگ میں بھی کلام کیا ہے منجملہ انکے دفتر اول کے ایک مکتوب میں تو اسی رنگ میں اتنا لکھا ہے کہ گویا "الہامی معارف" کا چشمہ ہی پھوٹ پڑا ہے، یہ مکتوب حضرت خواجہ محمد اشرف کابلیؒ کے نام ہے، اسکے بعض حصے تو عام افہام، بلکہ متوسطین کی عقول سے بھی بالا تر ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جن کو اوساطِ ناس بھی سمجھ سکتے ہیں یہاں اسی حصہ کا اقتباس درج کیا جاتا ہے (ترجمہ بطور حاصل مطلب عرض کیا جائے گا) :-

"حمد و صلوٰۃ اور تبلیغ دعوات کے بعد برادر باسعادت خواجہ محمد اشرف کو معلوم ہو کہ حضرات خلفاء اربعہ (رضی اللہ عنہم اجمعین) کے فضائل و کمالات کے متعلق بعض خاص علوم و معارف اور حق تعالیٰ کے بخشے ہوئے عجیب و غریب اسرار و لطائف حوالۂ قلم کرتا ہوں، توجہ سے سنیں۔ حضرت صدیق اکبر و حضرت فاروق اعظم (رضی اللہ عنہما) کو اگرچہ کمالاتِ محمدی حاصل ہیں اور یہ حضرات ولایتِ مصطفوی کے درجات اگرچہ طے کر چکے ہیں، تاہم انبیاء سابقین میں ان کو بلحاظ ولایت حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ سے اور باعتبار دعوت (جو مقامِ نبوت سے متعلق ہے) حضرت موسیٰؑ سے مناسبت اور مشابہت حاصل ہے اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کو "ولایت" و "دعوت" دونوں میں حضرت نوح علیہ السلام سے مناسبت خاصہ ہے اور حضرت علی مرتضیٰ کو نبوت و دعوت دونوں کے اعتبار سے حضرت عیسیٰؑ سے خاص مناسبت ہے ___ اور چونکہ حضرت عیسیٰ روح اللہ، و کلمۃ اللہ ہیں اس لئے بہ نسبت جہتِ نبوت کے اُن میں ولایت کی جہت غالب ہے اور اسی مناسبت سے حضرت علی مرتضیٰ میں بھی ولایت کی جہت غالب ہے"

پھر ایک دقیق تحقیق کے بعد فرماتے ہیں :-

"حضرت صدیقؓ اور حضرت فاروقؓ علیٰ فرقِ مراتب نبوت محمدی کے بار کے حامل ہیں، اور حضرت علی مرتضیٰؓ مناسبت عیسوی اور غلبہ جانب ولایت کی وجہ سے ولایت محمدی کے بار کے حامل ہیں اور حضرت عثمان ذوالنورینؓ اپنی "درمیانی حیثیت" کی وجہ سے نبوت محمدی اور ولایت محمدی دونوں نسبتوں کے حامل ہیں؛ اور ہو سکتا ہے کہ اس لحاظ سے بھی ان کو ذوالنورین کہیں"

پھر چند سطور کے بعد فرماتے ہیں:-

"اور چونکہ حضرت علی مرتضیٰ پر ولایت محمدی کی نسبت کا اثر غالب ہے اس لئے اولیاء اللہ کے اکثر سلسلے انہی سے نسبت رکھتے ہیں اور بہت سے گزشتہ اولیاء ہیں جن کو صرف کمالات ولایت ہی سے حصہ ملا ہے (اور کمالات نبوت سے انکو مناسبت نہیں ہے) حضرت امیرؓ کے کمالات حضرات شیخینؓ سے زیادہ ظاہر ہوتے ہیں حتیٰ کہ اگر شیخین کی افضلیت پر اہل سنت کا اجماع نہ ہوتا تو ان اکثر اولیاء کا کشف حضرت علی مرتضیٰ ہی کی افضلیت کا فیصلہ کرتا کیونکہ حضرات شیخینؓ کے کمالات انبیاء علیہم السلام کے کمالات کے مشابہ ہیں اور ان ارباب ولایت کی دسترس وہاں تک نہیں ہے، اور نیز ان کشف والوں کے کشف کی پرواز بھی ان "پیغمبرانہ کمالات" کی بلندی سے نیچے ہی نیچے ہے، ہاں! ہاں! کمالات ولایت ان کمالات نبوت کے مقابلہ میں بالکل ہیچ اور پیش پا افتادہ ہیں، کمالات ولایت کو کمالات نبوت کی بلندیوں تک پہنچنے کیلئے زینے ہیں، اور ان دونوں میں مقدمات اور مقاصد یا مبادی اور مطالب کی نسبت ہے نبوت کی روشنی سے دوری کے باعث بہت ممکن ہے کہ آج یہ بات بہت سوں پر گراں ہو اور وہ اس کو ماننے کیلئے تیار نہ ہوں لیکن میں کیا کروں اور کیا کرسکتا ہوں، میری مثال تو طوطی کی سی ہے سکھانے والے نے جو اسکو سکھا دیا ہے، وہی اس نے بول دیا بہر حال اللہ کا شکر اور اس کا احسان ہے کہ میں اس بارے میں حضرات علماء اہل سنت کی رائے کے موافق ہوں اور انکے اجماع سے متفق ہاں! انکو جو چیز استدلال سے معلوم ہوئی تھی مجھ پر اسکو منکشف کر دیا گیا ہے اور جو بات انکو بالاجمال دریافت ہوئی تھی وہ مجھ پر بالتفصیل ظاہر کر دی گئی ہے اس فقیر کو تو جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

نسبت اور آپ کے طفیل میں کمالات مقام نبوت تک پہنچا نہیں دیا گیا اور ان سے کافی حصہ عنایت نہیں فرما دیا گیا کشفی طور پر فضائل شیخین کی اطلاع ہی نہیں دی گئی اور اس بارہ میں سوائے تقلید کے کوئی راہ ہی نہیں دکھلائی گئی پس حمد ہے اس خدا کو جس نے ہم کو ہدایت دی اور اگر وہ رہنمائی نہ فرماتا تو ہم راہ یاب نہیں ہو سکتے تھے۔

ایک دن ایک شخص نے نقل کیا کہ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ حضرت علی مرتضیٰؓ کا نام نامی جنت کے دروازے پر لکھا ہوا ہے دل میں خیال آیا کہ پھر اس جگہ حضرات شیخین کو کیا خصوصیت حاصل ہوگی؟ توجہ سے معلوم ہوا کہ جنت میں اس امت کا داخلہ انہی ہر دو بزرگوں کی تجویز اور صوابدید سے ہوگا، گویا صدیق اکبر جنت کے دروازہ پر کھڑے ہیں اور لوگوں کا داخلہ تجویز کرتے اور حضرت فاروق گویا ہاتھ پکڑ پکڑ کے اندر لے جاتے ہیں اور یہ نظر آتا ہے کہ گویا ساری جنت حضرت صدیق اکبرؓ کے نور سے منور ہے اس حقیر کی نظر میں حضرات شیخین کی شان تمام صحابہ میں سب سے الگ اور بالکل نرالی ہے جس میں کسی کی کوئی شرکت نہیں۔

حضرت صدیق اکبرؓ تو گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم خانہ ہیں اور فرق ہے تو صرف نیچے اور اوپر کا یعنی حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم بالائی منزل میں ہیں اور حضرت صدیقؓ اسی محل کی تحتانی منزل میں اور حضرت فاروقؓ بھی بطفیل حضرت صدیقؓ اس دولت سے مشرف ہیں اور باقی تمام صحابہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ہمسرائی یا ہم شہر ہونے کی نسبت حاصل ہے پھر اولیاء امت کی وہاں کیا رسائی۔ ع

ہے یہی کافی کہ آئے دور سے بانگ جرس

پس یہ ارباب ولایت جبکہ شیخین کی منزل سے اتنے دور ہیں تو انکے کمالات کا کیا ادراک کر سکتے ہیں؟

پھر چند سطور کے بعد فرماتے ہیں:۔

"حضرات شیخین تو وفات کے بعد بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا نہیں ہوئے اور حضورؐ قبر مبارک سے اس حالی میں اٹھیں گے کہ ایک جانب حضرت صدیقؓ ہوں گے ا ... ... ط ...

حضرت فاروق جیسا کہ خود آنحضرتؐ نے ایک حدیث میں اسکی خبر دی ہے پس اس نزدیکی اور دائمی حضوری کی وجہ سے افضلیت انہی کو ہے' یہ ناچیز حضرات شیخین کے فضائل کے متعلق کیا بیان کرے اور کیونکر لب کشائی کرے' ذرہ کو کہاں طاقت کہ آفتاب کی باتیں کرے اور قطرہ کی کیا ہستی کہ عمان کے زخار سمندر کے متعلق زبان کھولے' وہ اولیاء کرام جنکو "دعوت خلق" کا کام سپرد ہے' اور جنھیں "ولایت و دعوت" دونوں چیزوں سے حصہ وافر ملا ہے انھوں نے کشف صحیح کی روشنی میں اور تابعین و تبع تابعین میں سے ائمہ مجتہدین نے اپنی فراست صادقہ اور احادیث و آثار متواترہ سے حضرات شیخین کے کمالات دریافت کئے ہیں' اور انکے فضائل میں سے بہت تھوڑا سا حصہ انکے علم میں آیا ہے' ناچار انھوں نے حضرات شیخین کی افضلیت کا حکم لگایا اور اس پر اجماع کیا اور طے کر دیا کہ اگر کسی کو اپنے کشف سے اسکے خلاف ظاہر ہو تو وہ غیر صحیح اور نامعتبر ہے ——

اور بھلا افضلیت شیخین کے خلاف کسی کا کشف کیونکر معتبر ہو سکتا ہے حالانکہ صدر اول (عہد نبوی) میں انکی افضلیت مسلّم ہو چکی تھی جیسا کہ امام بخاریؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ ہم عہد نبوت میں ابوبکرؓ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے تھے —— پھر عمرؓ کو، پھر عثمانؓ کو انکے بعد تمام صحابہؓ کو چھوڑ دیتے تھے اور ان میں سے کسی کو دوسرے پر فضیلت نہیں دیتے تھے۔ اور ابوداؤد کی روایت میں اس طرح ہے کہ جب رسول اللہ صلعم ہمارے درمیان میں دنیا میں رونق افروز تھے تو ہم کہا کرتے تھے کہ اس امت میں افضل ترین ابوبکرؓ ہیں پھر عمرؓ، پھر عثمانؓ (رضی اللہ عنہم اجمعین) (مکتوب ۲۵۱ ص ۲۶۹-۲۷۱)

افضلیت شیخین کے مسئلہ پر بعض اور مکاتیب میں بھی حضرت مجدد علیہ الرحمہ نے اس قسم کے معارف ارقام فرمائے ہیں' لیکن ہم بقصد اختصار یہاں انھیں اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں' اس آخری مکتوب کے اقتباسات سے دوسرے نادر فوائد اور عجیب و غریب اسرار و لطائف کے علاوہ ناظرین کرام کو اس سوال کا جواب بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ اکثر سلاسل اولیاء اللہ کا انتساب حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے کیوں ہے؟ اور عام ارباب ولایت کو جناب مرتضوی ہی سے زیادہ مناسبت کی وجہ کیا ہے؟ —— اور نیز اس مکتوب شریف سے

یہ عقیدہ بھی حل ہو گیا کہ بعض اربابِ ولایت پر حضرت علیؓ کے فضائل و کمالات بہ نسبت حضرات شیخین کے جو زیادہ منکشف ہوتے ہیں تو اس کا سبب اور منشا کیا ہے؟

حضرت مجدد علیہ الرحمہ کی تحقیق (صرف غور و فکر والی تحقیق نہیں بلکہ الہامی تحقیق اور ربانی تلقین) کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرات شیخین کو چونکہ مقام نبوت سے زیادہ قرب ہے اور نسبتہً کمالات نبوت کا زیادہ غلبہ ہے اس لئے اُنکے کمالات خاصہ تک اُن عام اربابِ ولایت کی رسائی ہی نہیں ہوتی جنکی پرواز صرف مقامِ ولایت تک ہے، اور چونکہ حضرت علی مرتضیٰؓ میں ولایت کی جہت ہی غالب ہے اور ان پر کمالاتِ ولایت ہی کا غلبہ ہے اس لئے عام اربابِ ولایت اُنکے کمالات و فضائل کا ادراک خوب کر سکتے ہیں اسی واسطے حضرت امیرؓ کے فضائل و کمالات بہ نسبت حضرات شیخین کے اُن پر زیادہ منکشف ہوتے ہیں، اور اسی قرب و مناسبت کا یہ اثر ہے کہ اولیاء اللہ کے اکثر سلاسل حضرت علی مرتضیٰؓ سے نسبت رکھتے ہیں۔

حق تعالیٰ حضرت مجدد علیہ الرحمہ کے مرقد پاک کو منور فرمائے اِس تحقیق انیق نے کتنی الجھنیں صاف کر دیں اور کتنی تاریکیوں کو روشنی سے بدل دیا ـــــ روح مجدّد شاد باد!

حضرت علیہ الرحمہ نے اپنے متعدد مکاتیب میں نہایت صفائی کے ساتھ یہ بھی تصریح فرمائی ہے کہ "افضلیت شیخین کا عقیدہ اہل سنت کے "ضروریات" اور اجماعیات میں سے ہے اور اس سے اختلاف کرنے والا اہلِ سنت سے خارج ہے چنانچہ دفتر اول کے مکتوب ۲۲۹ میں ارقام فرماتے ہیں:-

"جو کوئی حضرت علی مرتضیٰؓ کو حضرت صدیق اکبرؓ سے افضل کہے وہ گروہ اہلِ سنت سے خارج ہے۔

حضرت عثمانؓ کی افضلیت

معلوم ہو چکا ہے کہ جمہور اہلسنت کے نزدیک حضرات خلفاء اربعہ کی فضیلت کی ترتیب بھی وہی ہے، جو خلافت کی ترتیب ہے، یعنی جس طرح شیخین کے بعد خلافت کے اعتبار سے حضرت عثمان ذوالنورینؓ کا نمبر ہے اسی طرح فضیلت کے لحاظ سے بھی ان کا تیسرا مرتبہ ہے اور حضرت علی مرتضیٰؓ چوتھے نمبر پر ہیں (رضی اللہ عنہم اجمعین) ـــــ لیکن بعض حضرات اہل علم سے حضرت عثمانؓ کی افضلیت کے بارے میں تردد اور توقف کا

ظاہر ہوتا ہے بظاہر تو یہ ایک غیر اہم سی بات ہے لیکن درحقیقت اس کا نتیجہ بھی جلیل القدر صحابہ کرام کا تخطیہ ہے کیونکہ حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کے ہوتے ہوئے خلافت (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل نیابت وجانشینی) کیلئے حضرت عثمانؓ کا انتخاب جلیل القدر صحابہ کرام کی ایک مجلس شوریٰ ہی نے کیا تھا، اگرچہ اس مجلس شوریٰ نے (جس میں خود حضرت عثمانؓ وحضرت علیؓ بھی شامل تھے) آخر کار انتخاب کے پورے اختیارات عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو دیدیئے تھے لیکن حضرت عبدالرحمٰنؓ نے تنہا اپنی رائے سے فیصلہ کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اس وقت مدینہ طیبہ میں ان کی نظر میں جو ——— صاحب الرّائے اور قابلِ مشورہ حضرات تھے خفیہ طور پر ان سے فرداً فرداً انھوں نے رائے حاصل کی۔ اُن کا بیان ہے کہ "مجھے دو شخص بھی ایسے نہ ملے جو حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ پر ترجیح دیتے ہوں" ——— اور اس لئے انھوں نے حضرت عثمانؓ کو ہی منصبِ خلافت تفویض کر دیا۔

بہر حال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی افضلیت اور نسبت حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کے اُنکی فوقیت بھی گویا جمہور صحابہ کرام کی متفقہ رائے ہے پس اس سے اختلاف کرنا گویا تمام صحابہ کرام کو خاطی قرار دینا ہے اور بلاشبہ شیعی خیالات کے دل میں گھسنے کیلئے یہ پہلا چور دروازہ ہے، اس لئے حضرت مجدد علیہ الرحمہ نے اس کا انسداد بھی ضروری سمجھا، اور صاف ارقام فرمایا:-

> "اکثر علمائے اہلسنّت اس مسلک پر ہیں کہ حضرات شیخینؓ کے بعد افضل ترین امت حضرت عثمانؓ ہیں، اور انکے بعد حضرت علی مرتضیٰؓ اور ائمہ اربعہ کا مذہب یہی ہے، اور بعض لوگوں نے جو امام مالکؒ سے افضلیت عثمانؓ کے بارہ میں توقف نقل کیا ہے اسکے متعلق امام قاضی عیاض مالکی کا بیان ہے کہ امام مالک نے اس سے رجوع فرما لیا اور آخر الامر افضلیت عثمانؓ کے قائل ہو گئے تھے اور علامہ قرطبی نے بھی اس کی تصدیق اور تصحیح کی ہے۔"

[یہ ناچیز عرض کرتا ہے کہ اس بارہ میں حافظ علامہ ابن تیمیہ نے "منہاج السنۃ" میں اس کے متعلق حضرت امام مالکؒ کا جو ایک مقولہ نقل کیا ہے، اس کے بعد تو سکوت یا توقف کا احتمال باقی ہی نہیں رہا، "منہاج" میں امام مالک کا ارشاد حضرت عثمان وحضرت علی کے باہمی تفاضل کے باب میں یہ منقول ہے

"لا اجعل من خاض فی دماء المسلمین کمن لم یخض فیہا۔]

اس کے بعد حضرت مجددؒ علیہ الرحمہ نے حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کے ایک ارشاد سے پیدا ہونے والے ایک شبہ کا جواب دیا ہے' اس شبہ اور اس کے جواب کا حاصل یہ ہے :۔

"کہ حضرت امام اعظمؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اہلِ سنت وجماعت کی علامات میں سے شیخین کی افضلیت کا اعتقاد اور ختنین (حضرت عثمانؓ وحضرت علیؓ) سے محبت رکھنا بھی ہے"!

بادی النظر میں اس سے شبہ ہوتا ہے کہ (حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ) کے مراتب میں شاید کوئی فرق نہیں۔

اس کا جواب دیتے ہوئے حضرت مجدد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں :۔

"کہ جن لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے' انھوں نے حضرات امام کے اس ارشاد کی روح، اور اسکے محل کو نہیں سمجھا، اصل بات یہ ہے کہ اختلافات اور فتنے سوء اتفاق سے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ ہی کے زمانہ میں ہوئے ہیں اس وجہ سے بعض لوگوں کو ان بزرگوں کی طرف سے بدظنی اور کدورت پیدا ہو سکتی ہے حضرت امام نے اس صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے ختنین (حضرت عثمانؓ وحضرت علیؓ) کی صرف محبت ومؤدت کو شعائر اہلِ سنت میں سے قرار دیا ہے' اور اس جگہ ان ہر دو بزرگوں کے باہمی فرق مراتب سے نفیاً یا اثباتاً کوئی بحث بلکہ اس کا کوئی لحاظ بھی نہیں ہے"!

آخر میں حضرت مجددؒ فرماتے ہیں :۔

"کیف وکتب الحنفیۃ مشحونۃ بان افضلیتہم علی ترتیب خلافتہم"

"یعنی اور بھلا حضرت امام اعظم کے متعلق توقف یا عدم تفاضل مابین حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ کا خیال کیونکر قائم کیا جا سکتا ہے' حالانکہ کتب حنفیہ اس تصریح سے بھری پڑی ہیں کہ اُن کی افضلیت علی ترتیب خلافت ہے"!

باایں ہمہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کو اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہے کہ حضرت عثمانؓ کی افضلیت حضرت علیؓ وغیرہ دیگر صحابہ کرام پر اس درجہ یقینی اور قطعی نہیں ہے جس درجہ کہ حضرات شیخین کی افضلیت

جمیع صحابہ کرام پر چنانچہ اسی مکتوب میں فرماتے ہیں :۔

"الحاصل حضرات شیخین کی افضلیت یقینی ہے اور حضرت عثمانؓ کی افضلیت اس سے کم درجہ کی تاہم زیادہ احتیاط اس میں ہے کہ افضلیت حضرت عثمان کے منکر (بلکہ حضرات شیخین کی افضلیت کے بھی منکر) کو کافر نہ کہا جائے ہاں ہم اس کو صاحب بدعت اور گمراہ جانیں گے۔"

بعض "صلح کل" اور "رواداری" و "وسیع الخیالی" کے مدعی کہا کرتے ہیں کہ یہ تفضیل کی بحث ہی فضول اور لغو ہے، ہم تمام صحابہؓ کو برابر سمجھتے ہیں، آج کل اس قسم کے "وسیع الخیالوں" کی بڑی کثرت ہے حضرت مجدد علیہ الرحمہ ایسوں کے متعلق اسی مکتوب شریف میں فرماتے ہیں :۔

"اور جو شخص کہ سب کو برابر جانے اور ان کے باہمی تفاضل اور فرق مراتب کو فضول سمجھے وہ خود احمق اور بوالفضول ہے اور عجیب احمق، کہ تمام اہل حق کے اجتماعی مسئلہ کو "فضول" کہتا ہے۔"

(مکتوب ۲۶۶ ج ۱ ص ۳۳۱)

مشاجرات صحابہ اور محاربین علی (رضی اللہ عنہم)

شیعہ صاحبان جن پہلوؤں سے عوام سنیوں کو ورغلایا کرتے ہیں اُن میں سے ایک مسئلہ صحابہ کرام کے اُن نزاعات اور محاربات کا ہے، جو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں واقع ہوئے، حضرت علی مرتضیٰؓ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب اور دوہری قرابت پھر اُن کے فضائل و کمالات اور اُن کی اسلامی خدمات، اِن چیزوں کی وجہ سے ہر مسلمان کو جناب مرتضوی سے جو عقیدت و محبت ہو سکتی ہے ظاہر ہے۔ چالاک شیعہ اسی راہ سے ناواقف اور عوام سنیوں کے دلوں میں اترتے ہیں، اور صحابہ کرام کے اجتہادی اختلافات و نزاعات اور مشاجرات و محاربات کو اپنی حاشیہ آرائی کے ساتھ ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اور ابتداءً ان کے سادہ ذہن میں بس یہ بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ صحابہ میں گویا دو "پارٹیاں" تھیں ایک "پارٹی" حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اور دوسری "پارٹی" اُن کے مخالفین کی اور یہ دوسری پارٹی حضرت علیؓ سے بس خلافت چھیننا چاہتی تھی اور جمل و صفین کی لڑائیاں اور دوسرے اختلافات

سب اسی سلسلہ کے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام جو تفصیلی واقعات اور اصل حقائق سے بے خبر ہوتے ہیں اور اسی کے ساتھ ان کو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ سچی محبت اور پختہ عقیدت ہوتی ہے وہ حضرت علیؓ سے اختلاف کرنے والے صحابہ کرام یعنی حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت زبیرؓ حضرت طلحہؓ حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت معاویہؓ وغیرہ سیکڑوں اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بدظن ہو جاتے ہیں، اور کبھی یہ بدظنی بغض و بدگوئی تک پہنچ جاتی ہے۔"

حضرت مجددؒ علیہ الرحمہ نے اس اصولی گمراہی کے انسداد کے لئے بھی پورا زور قلم صرف کیا ہے اور بلا مبالغہ بیسیوں پچاسوں مکتوبات میں ان مشاجرات و محاربات کی صحیح نوعیت پر روشنی ڈالی ہے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

مکتوبات کے دوسرے دفتر میں حضرتؒ کا ایک طویل مکتوب (جو چودہ صفحہ پر ہے اور اس میں مسائل شیعہ اور شبہات شیعہ ہی پر بحث ہے) خواجہ محمد تقی کے نام ہے (یہ حکومت وقت کے اعلیٰ عہدہ دار تھے جیسا کہ خود مکتوب کے ابتدائی حصّہ سے معلوم ہوتا ہے) اس مکتوب میں صحابہ کرامؓ کے اُن نزاعات اور مشاجرات کے متعلق ارقام فرماتے ہیں:۔

"اہلِ سنت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نزاعات و اختلافات کو اچھے محامل پر محمول کرتے ہیں اور خواہش نفسانی و تعصب وغیرہ سے دور سمجھتے ہیں کیونکہ حضرت خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے اثر سے انکے نفوس صاف ہو گئے تھے اور سینے عداوتوں اور کینوں سے قطعی پاک۔ بیش ازیں نیست کہ ان میں سے ہر ایک کی ایک رائے تھی اور اپنا اپنا اجتہاد اور معلوم ہے کہ ہر مجتہد پر اپنے اجتہاد اور صوابدید کے مطابق عمل کرنا واجب ہے پس اختلاف آراکی وجہ سے یہ مخالفت اور منازعت ناگزیر ہوئی اور ہر ایک نے اپنی رائے کے مطابق عمل کرنا ضروری سمجھا لہذا انکی یہ مخالفت رائے حق کی موافقت کے رنگ میں تھی نہ کہ نفس امارہ کی خواہش سے۔ (مکتوب ۳۶ دفتر دوم ص ۵۸)

پھر چند سطر کے بعد ارقام فرماتے ہیں:۔

"جن لوگوں کے حضرت علیؓ سے نزاعات ہوئے اور جنگ و قتال تک نوبت پہونچی وہ اہل اسلام کی بہت کثیر جماعت ہے اور ان میں سے بہت سے جلیل القدر صحابی ہیں اور ان میں سے بعض تو وہ ہیں جن کو دنیا ہی میں زبان نبوت سے جنت کی بشارت مل چکی ہے انکی تکفیر اور علیٰ ہٰذا ان کو برا بھلا کہنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ کبرت کلمة تخرج من افواھھم دین و شریعت کا قریباً نصف حصہ ایسا ہوگا جو انہی کی وساطت سے امت کو پہنچا ہے اگر وہ بھی مجروح و مطعون ہو جائیں تو آدھا دین بے اعتبار ہو جائے"

پھر اسی مکتوب میں چند سطر بعد فرماتے ہیں :۔

معلوم ہونا چاہیئے یہ ضروری نہیں کہ تمام اختلافی امور میں حضرت علیؓ ہی برسرِ حق ہوں اور ان سے اختلاف کرنے والے ناحق پر، اگرچہ یہ مسلم ہے کہ ان جنگوں میں حق حضرت علیؓ ہی کی طرف تھا لیکن پھر بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہر اختلافی معاملہ میں وہی برسر حق تھے ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی جگہ قرن اول کے اختلافی مسائل میں علماء تابعین و ائمہ مجتہدین نے حضرت علیؓ کے مسلک کو چھوڑ کر دوسرا مسلک اختیار کیا ہے اور اسکے مطابق حکم دیا ہے حالانکہ اگر حق انہی کی جانب متعین ہوتا تو یہ حضرات ایسا نہ کرتے .... پس صرف حضرت علیؓ سے اختلاف کرنے کی بنا پر اعتراض کی گنجائش نہیں ہے اور ان اختلاف کرنے والوں پر طعن و ملامت کرنا روا نہیں ہو سکتا۔

اسی دفتر کے مکتوب ۶۷ میں جو حضرتؒ نے خان جہاں کو لکھا ہے اور جو تمام ضروری عقائد اہل سنت پر حاوی ہے فرماتے ہیں :۔

"اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے درمیان جو باہمی جنگیں ہوئیں مثلاً جنگ جمل اور جنگ صفین ان سب کو اچھے محامل پر محمول کرنا اور خود غرضیوں و تعصبات سے دور رکھنا چاہیئے یہ اکابر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی تاثیر سے ہوا و ہوس اور کینہ و حرص سے پاک صاف ہو گئے تھے یہ اگر کسی سے مصالحت رکھتے تھے تو صرف حق کیلئے اور اگر کسی سے لڑتے جھگڑتے

تھے تو صرف اللہ کے واسطے بلاشبہ ان میں سے ہر گروہ نے اپنے اجتہاد کے مطابق عمل کیا اور بغیر کسی تعصب اور خود غرضانہ جذبہ کے دوسروں کو اپنے سے دفع کیا پس اُن کا حال یہ ہے کہ جس کا اجتہاد ان میں سے ٹھیک تھا اس کو دو درجے اور ایک قول کے مطابق دس درجے ثواب ملے گا اور جس سے اجتہاد میں غلطی ہوئی ایک درجہ ثواب سے وہ بھی خالی نہیں رہے گا، غرض جن لوگوں سے اجتہاد میں غلطی ہوئی وہ اسی طرح طعن و ملامت سے دور ہیں جس طرح کہ فریق ثانی، بلکہ جیسا بتلایا گیا وہ بھی کم از کم ایک درجہ ثواب کے مستحق ہیں ـــــ ہاں علماء کرام نے یہ فرمایا ہے کہ ان جنگوں میں حق حضرت علیؓ ہی کی طرف تھا اور آپ کے مخالفین سے اجتہاد میں غلطی ہوئی ـــــ باایں ہمہ ان پر طعن نہیں کیا جا سکتا اور نہ کسی ملامت ہی کی گنجائش ہے کجا یہ کہ کفر یا فسق کی انکی طرف نسبت کی جائے خود حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے انکے حق میں فرمایا ہے "یہ ہمارے بھائی ہیں ہم سے باغی ہو گئے ہیں نہ وہ کافر ہیں نہ فاسق کیونکہ ان کا یہ اختلاف تاویل پر مبنی ہے جو کفر و فسق کیلئے مانع ہے ـــــ اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تم بچو میرے صحابہ کے اختلافات میں دخل دینے سے" پس ہم کو تمام اصحاب کرام کی تعظیم کرنا اور سب کو اچھے لفظوں سے یاد کرنا چاہئے اور ان میں سے کسی کے حق میں بدگوئی اور بدگمانی نہ کرنی چاہئے بلکہ انکے ان اختلافات کو دوسروں کی مصالحت سے بہتر سمجھنا چاہئے، نجات اور کامیابی کی یہی راہ ہے، کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے محبت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے واسطہ سے ہے، ایک بزرگ (حضرت شیخ شبلیؒ) فرماتے ہیں کہ جس نے اصحاب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی توقیر و تعظیم نہیں کی وہ گویا حضور پر ایمان ہی نہیں لایا۔ والعیاذ باللہ۔

صحابہ کرام کے مشاجرات کے متعلق اس قسم کے مضامین مکتوبات شریف میں بکثرت ہیں یہاں بقصد اختصار ان ہی چند اقتباسات پر اکتفا کیا جاتا ہے، ہاں اسی کے ساتھ یہ بھی بتلا دینا ضروری ہے کہ حضرت مجدد علیہ الرحمہ نے صرف اس اصولی بحث ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ جن صحابہ کرام کے حضرت علی مرتضیٰ سے نزاعات اور محاربات ہوئے ہیں انکے فضائل و مناقب بھی آپ نے اپنے مکتوبات شریف میں بڑے اہتمام سے لکھے ہیں جنکے

مطالعہ کے بعد کوئی صحیح الایمان اُن بزرگوں کی طرف سے کبھی بدگمان نہیں ہوسکتا، ملاحظہ ہو۔

حضرت عائشہ صدیقہ (رضی اللہ عنہا)

حضرت علیؓ مرتضیٰ کے محاربین میں ایک حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی ہیں حضرت مجدّد علیہ الرحمہ ان محاربات ہی پر کلام کرتے ہوئے ایک موقعہ پر ارقام فرماتے ہیں:۔

"حضرت عائشہ صدیقہؓ جو محبوب رب العالمین حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبہ اور اخیر لمحۂ حیات تک حضورؐ کی منظورۂ نظر رہیں اور جن کے حجرۂ مبارکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ کے آخری دن گذارے اور آخر کار جن کے آغوش میں حضرتؐ نے ملاء اعلیٰ کو رحلت فرمائی اور اُنہی کے حجرۂ مقدسہ میں آپ آجتک آرام فرما ہیں، اور پھر علاوہ ان تمام چند در چند فضائل وخصائص کے علم واجتہاد میں بھی اُن کا پایہ نہایت بلند تھا اور حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف دین کی تبلیغ واشاعت انکے سپرد کی تھی اور صحابہ کرام مشکل معاملات اور اہم مسائل میں اُن کی طرف رجوع کرتے تھے اور اُنہی سے ناقابلِ حل گتھیاں حل کراتے تھے ــــ پس ایسی صدّیقہ مطہرہ کو صرف حضرت علی مرتضیٰ سے اختلاف کرنے کی وجہ سے مطعون کرنا اور ناسزا باتیں ان کی طرف منسوب کرنا بہت نامناسب اور ایمان سے دور ہے۔

ہرگزم باور نمی آید زروے اعتقاد — ایں ہمہ ہا کردن و دین پیمبر داشتن

حضرت علیؓ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد اور آپ کے چچا زاد بھائی ہیں تو حضرت صدّیقہؓ آپ کی زوجۂ مطہرہؓ اور محبوب ترین شریک زندگی ہیں۔ اب سے چند سال سے پہلے فقیر کا یہ طریقہ تھا کہ اگر حضرت رسالتمآب صلعم کے ایصال ثواب کے لئے کھانا پکاتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی جگر گوشہ حضرت فاطمہؓ زہرا اور حضرت علیؓ اور حضرات حسنینؓ کو شامل کیا کرتا تھا ایک دن رات کو خواب میں دیکھتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں

میں سلام عرض کرتا ہوں اور آپ فقیر کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور رُخ مبارک دوسری طرف کئے ہوئے ہیں پھر اسی اثناء میں فقیر سے فرمایا کہ میں عائشہ کے گھر کھانا کھاتا ہوں جو مجھے کھلانا چاہے وہ عائشہ رضؓ کے گھر بھیجے (اللہ اکبر) اس وقت فقیر کو معلوم ہوا کہ حضرتؐ کی عدم توجہی کا باعث یہ ہے کہ میں حضرت صدیقہؓ کو ایصال ثواب میں شریک نہیں کرتا تھا اسکے بعد سے تو میں نہ صرف صدیقہ طاہرہ بلکہ باقی تمام ازواج مطہرات کو بھی کہ سب ہی اہل بیت ہیں شریک کرنے لگا اور سب سے توسل کرنے لگا ـــ الحاصل حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تکلیف حضرت علی مرتضیٰؓ کی شان میں گستاخی سے پہونچتی ہے اس سے کہیں زیادہ اذیت حضرت صدیقہؓ طاہرہ کے متعلق بیہودہ گوئی سے ہوتی ہے اور ہر صاحب عقل و انصاف اس فرق کو سمجھ سکتا ہے"۔

(مکتوب ۳۶، دفتر دوم ص ۵۹-۶۰)

حضرت طلحہ و زبیر (رضی اللہ عنہما)

جن صحابہ کرام سے حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کے محاربات ہوئے ان میں حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما بھی ہیں، ان دونوں حضرات کے متعلق حضرت مجدد علیہ الرحمہ اسی مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں:۔

"حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما جلیل القدر صحابہ کرام میں سے ہیں اور عشرہ مبشرہ میں داخل ہیں اُن پر کسی قسم کا طعن روا نہیں اور اگر کوئی بدنصیب ان بزرگ ہستیوں پر لعنت و ملامت کرے تو اسکی یہ لعنت و ملامت خود اس پر لوٹیگی یہ وہی طلحہؓ اور زبیرؓ ہیں کہ جن کو حضرت فاروق اعظمؓ نے ان چھ آدمیوں میں داخل کیا تھا جن کے متعلق فرمایا تھا کہ یہ اپنے میں سے کسی ایک کو میرے بعد خلیفہ منتخب کریں، ان دونوں حضرات نے باختیار خود اپنے نام واپس لے لئے اور صاف کہدیا "ترکت حقی" یعنی ہم خلافت نہیں چاہتے اور یہ وہی تو طلحہؓ ہیں جنھوں نے اپنے سگے باپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بے ادبی کی وجہ سے قتل کر دیا تھا اور ان کا سر حضورؐ کے قدموں میں لا کر ڈالدیا اور قرآن مجید میں اُن کے اس فعل پر تحسین و آفرین کی

آیت نازل ہوئی ــــ اور یہ زبیرؓ وہی زبیرؓ ہیں کہ مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُنکے
قاتل کے دوزخی ہونے کی وعید سنائی تھی جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ "قاتل زبیر فی النار"
یعنی زبیرؓ کا قاتل جہنم میں جائیگا، میں کہتا ہوں کہ حضرت زبیر پر لعن طعن کرنے والے بھی اسکے
قاتل سے کم نہیں ہیں (اور ان کے لئے بھی عذاب نار مقرر ہے) پس خبردار اں خبردار! بچو بچو!
اُن حضرات اکابر دین اور اسلام کے پہلوٹے مایہ ناز فرزندوں کی بدگوئی سے بچو جنھوں نے
اعلائے کلمۃ اللہ کیلئے اپنی کوششیں ختم کر دیں اور حضرت سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی
نصرت وحفاظت اور دین الٰہی کی تائید وحمایت کیلئے اپنی جان و مال کی بازی لگا دی
اور رات دن خفیہ وعلانیہ اسی مقصد کیلئے سرگرم عمل اور ساعی رہے اور انھوں نے صرف
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی خاطر اپنے کنبوں قبیلوں، اپنے دل کے ٹکڑوں لڑکوں
اور لڑکیوں، بیویوں اور دوسرے رشتہ داروں کو چھوڑ دیا اور اپنے وطنوں اور گھروں
اور اپنے چشموں اور کھیتوں اور نہروں اور باغوں کو خیرباد کہہ دیا۔ اور سخت اور خطرناک
موقعوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کو اپنی جانوں سے زیادہ عزیز سمجھا اور
اپنی محبت، اپنے مال واولاد کی محبت کے مقابلہ میں حضورؐ کی محبت کو ترجیح دی، وہ وہ ہیں کہ
انکو صحبتِ نبوی کا شرف حاصل ہوا اور برکات نبوت ان کے حصّہ میں آئے، انھوں نے وحی کو
آتے دیکھا فرشتوں کی حاضری سے وہ مشرف ہوئے، اپنی آنکھوں سے انھوں نے حضورؐ کے
معجزات اور آپ کی روشن نشانیاں دیکھیں حتیٰ کہ جو غیب تھا وہ ان کیلئے شہادت ہو گیا
اور جو علم الیقین تھا وہ عین الیقین سے بدل گیا، اور ان کو ایمان و ایقان کا وہ درجہ حاصل
ہوا جو ان کے بعد کسی کو نہیں حاصل ہو سکتا حتیٰ کہ خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد
فرمایا کہ اگر آئندہ آنیوالا کوئی مسلمان احد پہاڑ کی برابر سونا بھی اللہ کی راہ میں خرچ کردے تو
وہ میرے صحابہ کے ایک سیر بلکہ آدھے سیر جَو کی برابر بھی نہیں ــــ اور ہاں یہ قدوسیوں کی وہی
جماعت ہے جن کی تعریف حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں نازل کی اور اعلان کر دیا کہ میں اُن سے

راضی ہوں اور وہ مجھ سے راضی ہوں، اور دوسرے موقعہ پر فرمایا کہ یہ ان کا حال لکھا جا چکا ہے توراۃ میں اور انکی مثال انجیل میں یہ ہے کہ وہ کھیتی کی طرح ہیں کہ نکلا اس کا کھوا پھر اس میں طاقت آئی پھر وہ موٹی ہوگئی یہاں تک کہ وہ اپنے تنہ پر سیدھی کھڑی ہوگئی جس کو دیکھ کر کاشتکاروں کو خوشی ہوتی ہے یہ اس لئے کہ جلیں ان کی وجہ سے کفار" پس اللہ تعالیٰ نے اُن سے جلن اور عداوت رکھنے والوں کو کافر قرار دیا ہے لہذا ان کے بغض و عداوت سے ایسا ہی پرہیز کرنا چاہیئے جیسا کہ کفر سے کیا جاتا ہے، جو جماعت اس مرتبہ کی ہو اور اسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نسبت حاصل ہو اگر بعض معاملات میں اسکے افراد میں اجتہادی اختلاف ہو جائے اور نوبت نزاع تک پہنچے۔ اور ہر ایک اپنی رائے اور اپنے اجتہاد کے مطابق عمل کرے تو اس میں کسی کو طعن و اعتراض کی گنجائش نہیں بلکہ حق و صواب اس موقع پر اختلاف ہی ہے کیونکہ صاحب اجتہاد دوسرے کے اجتہاد پر عمل نہیں کر سکتا۔"

حضرت امیر معاویہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

جن صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے حضرت علی مرتضیٰ سے اختلافات ہوئے اور جنگ و قتال کی نوبت آئی اُن میں سے ایک حضرت معاویہؓ بھی ہیں، اور چونکہ حضرت علی مرتضیٰ سے انکی جنگ دیر تک رہی اور خلافت و امارت ان کے خاندان میں بہت دنوں تک رہی اس لئے ان کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈہ حضرت عائشہؓ و حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کی بہ نسبت بہت زیادہ کیا گیا اسی کا اثر ہے کہ بہت سے اپنے کو سنی کہنے اور سمجھنے والے بھی اگرچہ حضرت صدیقہؓ اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ سے کسی قسم کا سوءِ ظن نہیں رکھتے لیکن حضرت امیر معاویہؓ کی طرف سے بدگمانی رکھتے ہیں، اور ان کی شان میں بے ادبی کی جرأت کر جاتے ہیں حالانکہ یہ بھی رفض کا ایک شعبہ ہے، اس لئے حضرت مجدد علیہ الرحمہ نے حضرت معاویہ کے فضائل و مناقب کی نشر و اشاعت اور انکی پوزیشن صاف کرنے کی طرف بھی خاص توجہ مبذول فرمائی ہے چند اقتباس ملاحظہ ہوں، دفتر اول کا مکتوب نمبری ۲۵۱ جو خواجہ محمد اشرف کے نام ہے جو اسی قسم کے مباحث سے بھرا ہوا ہے اور

جس کے بعض اقتباسات تفضیل شیخین کے عنوان کے ذیل میں گذر بھی چکے ہیں اسی میں حضرت امیر معاویہؓ کے بارے میں ارقام فرماتے ہیں :۔

"شیخ ابو شکور سلمی نے اپنی کتاب "تمہید" میں تصریح کی ہے کہ حضرت معاویہؓ اور صحابۂ کرامؓ میں سے اُنکے وہ رفقاء جو جنگ میں انکے ساتھ تھے اگرچہ خطا پر تھے لیکن انکی یہ خطا اجتہادی تھی ، اور ابن حجرؒ نے صواعق محرقہ میں لکھا ہے کہ حضرت علیؓ سے حضرت معاویہؓ کا نزاع اجتہاد پر مبنی تھا، اور اسکو انھوں نے اہلسنت کے عقائد میں شمار کیا ہے۔"

اس کے بعد شارح مواقف کی ایک "موہم" عبارت پر تنبیہ اور ان کی غلطی کی اصلاح فرمانے کے بعد ارقام فرماتے ہیں :۔

"یہ بات صحت کے ساتھ معلوم ہے اور پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ حضرت معاویہؓ حقوق اللہ اور حقوق المسلمین دونوں کے پورا کرنے میں خلیفۂ عادل تھے۔"

پھر چند سطر کے بعد فرماتے ہیں :۔

"اور احادیث نبویہ میں ثقہ راویوں کی سند سے وارد ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب معاویہؓ کے حق میں دعا فرمائی کہ "اے اللہ اسکو کتاب و حساب کا علم دے اور عذاب سے بچا، "اور ایک اور موقع پر حضرت نے انکیلئے دعا فرمائی کہ "خداوندا! اسکو ہادی مہدی بنا" اور حضورؐ کی دعا بیشک مقبول ہے۔"

پھر چند سطر کے بعد فرماتے ہیں :۔

"اور امام مالک جو تابعین میں سے ہیں (۹) اور اپنے زمانہ میں مدینہ کے سب سے بڑے عالم تھے اُن کا فتویٰ ہے کہ حضرت معاویہؓ اور انکے رفیق عمرو بن العاص کو گالی دینے والا واجب القتل ہے۔ اور نیز امام مالک نے حضرت معاویہ کی گالی کو حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ و حضرت عثمان (رضی اللہ عنہم اجمعین) کی گالی کے حکم میں قرار دیا ہے (یعنی انکے نزدیک ان دونوں جرموں کی سزا قتل ہے)..... اے بھائی! یہ معاملہ تنہا امیر معاویہؓ کا نہیں ہے تقریباً نصف صحابہ کرام انکے ساتھ اس معاملہ میں شریک ہیں پس اگر

حضرت علیؓ سے جنگ کرنے والوں کو کافر یا فاسق کہا جائے تو آدھے دین سے ہاتھ دھونا پڑے گا جو انہی حضرات کی نقل و روایت سے ہم تک پہنچا ہے اور اس انجام سے کوئی ایسا زندیق اور ملحد ہی راضی ہو سکتا ہے جس کا مقصد ہی دین کو برباد کرنا ہو۔

پھر چند سطر کے بعد ارقام فرماتے ہیں:۔

"امام غزالیؒ نے تصریح کی ہے کہ حضرت معاویہؓ کی وہ جنگ خلافت کے بارے میں نہیں تھی بلکہ اس کا تعلق بھی حضرت عثمانؓ کے قصاص ہی سے تھا ——— اور شیخ ابن حجرؒ نے بھی اس کو اہلِ سنت کے عقائد سے لکھا ہے۔"

پھر چند سطر بعد فرماتے ہیں:۔

"اے برادر اس بارہ میں سلامتی کی راہ اور نجات کا راستہ یہی ہے کہ صحابہ کرام کے باہمی اختلافات و محاربات کے متعلق خاموشی اختیار کی جائے اور زبان کھولی ہی نہ جائے رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے "میرے صحابہ میں جو نزاعات ہوں اُن سے الگ تھلگ رہو" نیز حضورؐ نے فرمایا ہے کہ "میرے اصحاب کے بارے میں خدا کا خوف کرو اس کے مواخذہ سے ڈرو اور ان کو اپنی تیز کلامی اور بدگوئی کا نشانہ نہ بناؤ۔"

(مکتوب ۲۵۱ ص ۲۷۲-۲۷۳-۲۷۴ دفتر اول)

شرفِ صحبت

شیعہ اور اہلِ سنت کے نقطہائے نظر میں ایک اصولی اختلاف یہ بھی ہے کہ اہلِ تشیع کے نزدیک "صحبتِ رسول" کی کوئی خاص اہمیت نہیں، جمہور صحابہؓ کو تو معاذ اللہ وہ مومن ہی تسلیم نہیں کرتے اور جن تین چار حضرات (حضرت مقدادؓ، سلمان فارسیؓ، ابوذر غفاریؓ، زید بن ارقمؓ) کے ایمان کے وہ قائل ہیں اور ان کی جو تعظیم و توقیر وہ کرتے ہیں تو وہ بھی اس لحاظ سے نہیں کہ وہ "اصحابِ رسول" ہیں بلکہ صرف اس وجہ سے کہ وہ ان کے نزدیک حضرت علی مرتضیٰؓ کی "پارٹی" میں شامل اور ان کے ناصر و مددگار تھے۔ بہر حال نفسِ صحبتِ رسول کی ان کے نزدیک کوئی خاص وقعت نہیں، اور یہ حقیقت ہے کہ صحبتِ رسالت کی حقیقی عظمت اگر کسی کے دامن تھام لے اور

اس کے واقعی فضل و شرف کو وہ سمجھ لے تو کبھی تشیع کا شکار نہیں ہو سکتا، اسلئے حضرت مجدد علیہ الرحمہ نے اپنے مکتوبات میں اس اصول پر بھی بہت زیادہ زور قلم صرف کیا ہے دفتر اول کے مکتوب ۲۵۱ میں فرماتے ہیں :۔

" جاننا چاہیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ کرام واجب التعظیم ہیں اور ہم کو چاہیئے کہ ان سب کو عزت و عظمت کے ساتھ یاد کریں خطیب حضرت انسؓ سے راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوق میں سے مجھے چنا اور پھر میرے لئے اصحاب منتخب کئے اور ان میں سے میرے رشتہ داروں اور مددگاروں کا انتخاب کیا پس جس نے انکے بارے میں میرے حق کی رعایت کی اسکی اللہ تعالیٰ رعایت کرے گا۔ اور جس نے انکے بارے میں میرا دل دکھایا اللہ اسکو ایذا پہنچائیگا ــــــ اور طبرانی ابن عباس سے راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے میرے اصحاب کو گالی دی اس پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور سارے آدمیوں کی لعنت ' اور ابن عدی نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں بدترین وہ ہیں جو میرے اصحاب کے بارے میں زیادہ بے باک ہیں "

نیز اسی دفتر کے مکتوب ۵۹ میں ارقام فرماتے ہیں :۔

" اور صحبت نبوی کی فضیلت تمام دوسرے فضائل و کمالات سے اعلیٰ و بالا ہے اور اسی واسطے وہ اویس قرنی جو بلاشبہ تابعین میں افضل ترین ہیں کسی ادنیٰ صحابی کے مرتبہ کو بھی نہیں پہنچ سکے پس کسی چیز کو بھی صحابیت کی فضیلت کے ہم پلہ نہ ٹھیراؤ کیونکہ ان کا ایمان تو صحبت نبوی کی برکت اور نزول وحی کے مشاہدہ کی وجہ سے شہودی ہو گیا ہے " (دفتر اول ۵۹)

اور اس سے پہلے مکتوب میں فرمایا :۔

" حضرت عبداللہ بن المبارکؒ سے سوال کیا گیا کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز میں سے کون افضل ہے ؟ ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمراہی میں معاویہؓ کے گھوڑے پر سوار ہوتے اسکی ناک میں جو غبار پہنچا وہ بھی عمر بن عبدالعزیز سے بدرجہا بہتر ہے " (ص ۵۸)

نیز اسی دفتر کے مکتوب ۱۲۰ میں ارقام فرماتے ہیں :۔

صحبت کی برابر کسی بھی چیز کو نہ ٹھیرا ؤ کیا نہیں دیکھتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کرام صحبت ہی کی وجہ سے ماسوا انبیاء کے اور سب پر فوقیت لے گئے اور اویس قرنی اور عمر بن عبدالعزیز مروانی جیسے جلیل القدر حضرات سے بھی افضل ٹھیرے ـــــ حتیٰ کہ صحبت نبوی ہی کی برکت سے امیر معاویہؓ کی غلط رائے اور عمرو بن العاص کی بھول چوک اویس قرنی اور عمر مروانی کی صوابدید اور صحیح رائے سے افضل ہوئی، کیونکہ ان بزرگوں کا ایمان شرف صحبت، و دیدار حضرت رسالت، اور معائنہ وحی و ملائک، اور مشاہدہ معجزات و خوارق کی وجہ سے شہودی ہو گیا اور بعد والوں نے جس کو صرف سنا اسکو انھوں نے گویا اپنی آنکھوں سے دیکھا اور بھلا دوسروں کو یہ چیزیں جو تمام فضائل و کمالات کی اصل و بنیاد ہیں کہاں نصیب ہوئیں اور اگر حضرت اویس قرنی کو صحبت کی فضیلت ان خواص و برکات کے ساتھ معلوم ہو جاتی تو وہ اسکے مقابلہ میں کسی چیز کو بھی ترجیح نہ دیتے اور پھر انکو کوئی ضرورت بھی حاضری بارگاہِ نبوت سے نہ روک سکتی لیکن ـــــ

اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے اور وہ بڑے فضل و کرم والا ہے ؎

سکندر کو نہیں دیتے ہیں پانی ‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏ نہیں ملتی بزور و زر یہ دولت

اے اللہ اگرچہ تو نے ہمکو اس مقدس عہد میں پیدا نہیں کیا، مگر آخرت میں انکی جماعت اور انکے گروہ میں ہمارا حشر ضرور فرما بطفیل اپنے حبیب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے۔" (دفتر اول ص۱۳۵)

صحبتِ نبوی کی فضیلت و اہمیت کے متعلق اس قسم کے ایمان افروز مضامین مکتوبات شریف میں بکثرت ہیں جنکے مطالعہ کے بعد کوئی شخص رفض کی گمراہی کا شکار انشاء اللہ کبھی نہیں ہو سکتا یہاں ہم حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کی مذکورہ بالا دعا پر آمین کہتے ہوئے بقصد اختصار انہی چند اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں۔

سارے مطاعن کا ایک اصولی جواب

شیعوں کے پاس گمراہ کرنے کا سب سے بڑا حربہ "مطاعن" ہیں اور مکالمات و مباحثات میں بھی دیکھا گیا کہ وہ جب کسی بحث میں عاجز آتے اور میدان کلام کو اپنے لیے تنگ پاتے ہیں تو فوراً مطاعن صحابہ پہ آجاتے ہیں اور

ی صحبت کو وہ اپنا سب سے بڑا ہتھیار سمجھتے ہیں، صحابہ کرام کی طرف سے بدگمانی اور ان سے بغض و عداوت
کی اصل و اساس ہے۔ اور اس گمراہی میں دوسروں کو بھی شریک کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی "مطاعن" کی
اشاعت ہے۔ اس لئے "مطاعن" کے جوابات کی طرف بھی حضرت مجدد علیہ الرحمہ نے خاص توجہ مبذول فرمائی
ہے۔ شیعوں کے ان شبہات "مطاعن" کے مفصل جوابات جن کو شیعہ بہت زیادہ اچھالتے ہیں آپ نے اپنے رسالہ
"رد روافض" کے علاوہ متعدد مکاتیب میں بھی سپرد قلم فرمائے ہیں۔ ان تفصیلی جوابات کے علاوہ آپ نے تمام
مطاعن کا ایک اصولی جواب بھی دیا ہے جس کو ملحوظ رکھنے کے بعد اس سلسلہ کی ساری بحثیں کافور ہو جاتی ہیں اور
یقین و وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مصنفین شیعہ نے اس باب میں جو دفتر کے دفتر سیاہ کئے ہیں حضرت مجدد
علیہ الرحمہ کا یہی ایک اصولی جواب ان سب کو بے اثر کر دینے کے لئے کافی ہے۔

دفتر دوم کے مکتوب ۹۶ میں واقعہ قرطاس پر کلام کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:-

"حق تعالیٰ تم کو ہدایت دے اور سیدھے راستہ پر چلائے، تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ شبہ اور
اس جیسے اور شبہات جن کو فرقۂ شیعہ کے لوگ حضرات خلفاء ثلثہ اور دیگر تمام صحابہ کرام پر وارد
کرتے ہیں اور ان شکوک و اعتراضات سے ان کو مجروح و مطعون کرنا چاہتے ہیں، اگر یہ کچھ انصاف
سے کام لیں اور حضرت خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی فضیلت و اہمیت کو قبول کر لیں
اور جان لیں کہ حضور کی صحبت میں رہ کر انکے نفوس ہوا و ہوس سے صاف اور انکے سینے کینوں اور
کدورتوں سے پاک ہو گئے تھے اور سمجھ لیں کہ یہ وہ بزرگان دین اور عظمائے اسلام ہیں جنھوں نے
دن اور رات، خفیہ اور علانیہ غرض ہر وقت اور ہر طرح دین متین کی تائید و حمایت اور اعلاء کلمۃ
اسلام کیلئے اپنی تمام کوششیں اور طاقتیں صرف کر دیں اور حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم
کی محبت کی وجہ سے اپنے کنبے قبیلوں، اپنے بال بچوں، اپنی چہیتی بیبیوں کو چھوڑ دیا، اپنے
عزیز وطنوں اپنے آباد گھروں کو، اپنے چشموں اور کھیتوں کو اپنے درختوں اور اپنی نہروں کو ہمیشہ
کیلئے خیرباد کہہ دیا انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس مقدس کو اپنے نفوس پر ترجیح
دی اور حضور کی محبت کو اپنی اور اپنے اموال و اولاد کی محبت پر مقدم رکھا، انھوں نے حق کو اتنا ...

فرشتوں کو آتے دیکھا، حضورؐ کے معجزات اور آپ کی روشن نشانیوں کا انھوں نے بچشم خود مشاہدہ کیا یہاں تک کہ "غیب" انکے حق میں "شہادت" بن گیا، اور انکا علم الیقین عین الیقین سے بدل گیا۔ وہی وہ خوش نصیب ہیں جن کی مدح و ثنا حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں نازل فرمائی اور اعلان فرمایا کہ اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں، اور دوسری جگہ فرمایا کہ یہ حال مسطور ہے ان کا توراۃ میں اور انجیل میں الخ، پھر جبکہ تمام صحابہ کرام ان خصائص و فضائل سے مشرف ہیں تو پھر خاص اکابر صحابہ یعنی حضرات خلفاء راشدین کے متعلق کیا کہا جائے اور کیا کہا جا سکتا ہے

پھر چند سطور کے بعد ارقام فرماتے ہیں:۔

اگر ان اعتراض کرنے والوں کی نظر میں کچھ انصاف ہو اور یہ حضرت خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی عظمت کو مان لیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بزرگی اور عالی مرتبی کو جان لیں تو زیادہ بعید نہیں کہ یہ خود ہی اپنے ان شبہات کو ملمع شدہ مغالطوں اور سفسطوں کے رنگ میں دیکھنے لگیں اور انکو درجۂ اعتبار و اعتماد سے ساقط کر دیں اگرچہ غلط فہمی کے منشا کی تعیین نہ کر سکیں اور فریب وسفسطہ کے محل کو انگلی رکھ کر نہ بتا سکیں لیکن کم از کم اجمالاً اسقدر ضرور سمجھ لیں گے کہ یہ شکوک و شبہات لاحاصل ہیں بلکہ بہت سی بدیہی اور کھلی ہوئی حقیقتوں کے خلاف اور کتاب و سنت سے مردود مطرود ہیں۔ (دفتر دوم مکتوب ۹۶)

اس تمہید کے بعد حضرت مجدد علیہ الرحمہ نے واقعۂ قرطاس پر چند مقدمات قائم کر کے مفصل کلام فرمایا ہے اور اس سے متعلق شیعوں کے مشہور اعتراض کا تفصیلی جواب دیا ہے اور گویا اسکے مقدمات کی تحلیل کر کے انگلی رکھ رکھ کے یہ بھی بتلا دیا ہے کہ کہاں کہاں اس میں فریب دیا جاتا ہے۔ اسکے بعد پھر اسی اصولی رنگ میں فرماتے ہیں:۔

فقیر کے نزدیک ان شکوک و شبہات کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کوئی جادوگر کسی بیوقوفوں کی جماعت کے پاس پہنچے اور ایک پتھر کو جسکو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اپنے پر فریب دلائل اور ملمع شدہ باتوں سے سونا ثابت کرے اور یہ بیچارے اسکے پر تزویر دلائل کے جواب سے عاجز ہونے اور [illegible] غلطی نہ پکڑ سکنے کی وجہ سے خود شبہ میں پڑ جائیں بلکہ اپنے مشاہدہ کے خلاف اسکو سونا یقین کرنے لگیں [illegible]

اپنے احساس و ادراک کو ناقابلِ اعتماد سمجھ کر پس پشت ڈال دیں۔ لیکن عقلمند اور ہوشیار آدمی کا کام یہ کہ ایسے موقع پر اپنی حس اور اپنے ادراک کی ہدایت پر اعتماد کرے اور اُن ملمع شدہ بیہودہ مقدمات کو ناقابلِ اعتناء سمجھے ــــ بالکل یہی حال مسئلہ زیر بحث کا ہے کہ حضرات خلفاء ثلثہ بلکہ تمام صحابہ کرامؓ کی بزرگی اور عالی مرتبی قرآن و حدیث کی رو سے جانی بوجھی بلکہ گویا آنکھوں دیکھی حقیقت ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں لیکن یہ ناحق کوش جماعت اپنے ملمع شدہ دلائل سے ان پر طعن و قدح کرتی ہے پس انکی وہ جرح و قدح بالکل ایسی ہی ہے جیسے کہ کوئی عیار اپنے ہاتھ کے پتھر کے ٹکڑے کو سونا ثابت کرنے کی کوشش کرے اور اپنے "منطقی" دلائل سے سیدھے لوگوں کو بیوقوف بنائے۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد إذ هديتنا وهب لنا من لدنك رحمة انك أنت الوهاب ۵

درحقیقت شیعوں کے تمام مطاعن کی حقیقت یہی اور صرف یہی ہے اور اس کے جان لینے کے بعد تشیع کا سارا طلسم ٹوٹ جاتا اور اُن کی ابلہ فریبیوں کا پردہ تار تار ہو جاتا ہے۔

حضرت مجدد قدس اللہ سرہ العزیز نے فتنۂ رفض اور اسکے مختلف شعبوں کے خلاف اپنے مستقل رسالہ "رد روافض" کے علاوہ مکتوبات شریف میں بھی جو کچھ متفرق طور پر لکھا ہے اگر اُس سب کو جمع کیا جائے تو بلاشبہ ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ اس مختصر مقالہ میں ہم نے جو اقتباسات پیش کئے ہیں درحقیقت ان کو سمندر سے صرف کوزہ بلکہ قطرہ ہی کی نسبت ہے۔

اس "ایرانی فتنہ" کے خلاف اس قلمی جہاد کے علاوہ آپنے لسانی جنگ بھی بڑی پامردی سے کی اور اگرچہ یہ فتنہ حکومت وقت کے آغوش میں تربیت پا رہا تھا اور گویا شاہی محل ہی اس کا سرچشمہ بنا ہوا تھا پھر بھی آپ نے بارہا علیٰ روس الاشہاد عام معرکوں اور خاص محفلوں میں مناظروں اور تقریروں میں اسکی ناپید کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا، اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آپ ہی کی ان مجددانہ مساعی اور مجاہدانہ سرگرمیوں نے عام مسلمانوں کو اس سیلاب میں بہنے سے بچا لیا، ورنہ آج ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں میں اعداء ابوبکرؓ و عمرؓ کی تعداد صرف پچاس ساٹھ لاکھ ہی نہ ہوتی۔

اَللّٰهُمَّ نَوِّرْ مَرْقَدَهٗ وَبَرِّدْ مَضْجَعَهٗ وَاحْشُرْنَا مَعَهٗ۔

(ماخوذ از تذکرۂ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ مطبوعہ الفرقان بکڈپو لکھنؤ)

حضرت مولانا مفتی عبد القدوس رومی
مفتی شہر آگرہ

غازی طائف و یرموک

حضرت سیّدنا ابو سفیان رضی اللہ عنہ

مشہور جلیل القدر تابعی حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہما اپنے والد بزرگوار حضرت مسیب سے روایت کرتے ہیں کہ :۔

"جنگ یرموک کے موقع پر جب اہلِ اسلام اہلِ روم سے مصروف جہاد تھے گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی جنگ کی ہولناکی اور شدّت کا یہ عالم تھا کہ پورے میدان کارزار میں صرف نیزوں اور تلواروں کی سنسناہٹ اور جھنجھناہٹ کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی ____ ایسی حالت میں کسی مرد مجاہد کے یہ دعائیہ فقرے مجھے سنائی دیئے۔

یَا نَصْرَ اللّٰہِ اِقْتَرِبْ (اے نصرت خداوندی جلد آ) یَا نَصْرَ اللّٰہِ اِقْتَرِبْ (اے مدد خداوندی جلد پہنچ)

"میں نے (حضرت مسیب نے) جو سر اٹھا کر دیکھا تو نصرت خداوندی کو آواز دینے والی شخصیت حضرت ابو سفیان کی تھی جو اپنے بڑے بیٹے حضرت یزید بن ابی سفیان کی ماتحتی میں انکے جھنڈے تلے مشرکین روم سے نبرد آزما اور حق تعالیٰ سے مشغول فریاد تھے"۔ (تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۴۱۲، اسد الغابہ ج ۵ ص ۲۱۶ تاریخ اسلام ذہبی ج ۲ ص ۱۰۱)

اسی جنگ یرموک میں حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی دوسری آنکھ بھی جاتی رہی تھی جس کی وجہ سے وہ بینائی سے بالکل محروم و معذور ہو گئے تھے ____ ان کی ایک آنکھ اس سے چند سال پہلے غزوۂ طائف میں جا چکی تھی اس وقت حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں جلوہ فرما تھے آپؐ نے ان سے فرمایا تھا کہ :۔

"اے ابو سفیان کہو تو میں دعا کر دوں اور تمہاری آنکھ اچھی ہو جائے لیکن اگر تم پسند کرو

اور صبر کرو تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض تم کو جنت دیں گے"۔

حضرت ابوسفیان نے زبان رسالت سے جنت کی بشارت سنی تو اس تکلیف کو گوارا کر کے اس پر صبر کرنا ہی پسند کر لیا اور آپ سے عرض کیا کہ "مجھے تو جنت ہی چاہیئے"۔

اس روایت کی رو سے حضرت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مبشر بالجنۃ (جنتی) بھی کہا جا سکتا ہے۔

اس جنگ یرموک میں حضرت سیدنا ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے پورے گھرانے کے ساتھ شریک ہوئے تھے ان کے بڑے بیٹے حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو ایک حصۂ فوج کی قیادت بھی کر رہے تھے اور یہ حضرت ابوسفیان انھیں کی ماتحتی میں فوج کے اسی حصہ میں مصروف جنگ تھے، حضرت یزید کے علاوہ انکے دوسرے صاحبزادے حضرت سیدنا معاویہ ان کی صاحبزادی حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور انکی زوجہ محترمہ حضرت ہند رضی اللہ تعالیٰ عنہا ــــ یہ سب کے سب اس جنگ یرموک میں شریک ہوئے ہیں۔

• حضرت ہند لشکر اسلام کے بہادر مجاہدوں کو جوش دلا دلا کر مقابلے و مقاتلے پر ابھارتی ہیں، ان کی صاحبزادی حضرت جویریہ بھی خواتین اسلام کے طبقہ میں قائدانہ کردار ادا کر رہی تھیں۔

خود حضرت سیدنا ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق کتب تاریخ میں صراحتہً یہ بات موجود ہے:

وَشَهِدَ الْيَرْمُوْكَ وَكَانَ هُوَ الْقَاصَّ	(حضرت ابوسفیان) جنگ یرموک میں شریک ہوئے
فِي جَيْشِ الْمُسْلِمِيْنَ يُحَرِّضُهُمْ وَيَحُثُّهُمْ	لشکر اسلام کے واعظ و خطیب بھی تھے جو انھیں
عَلَى الْقِتَالِ" (المنتقیٰ)	جنگ و قتال پر آمادہ کر رہے تھے اور ان کے جذبات ابھار کر جوش دلا رہے تھے۔

اسی موقع کا ان کا یہ مشہور "خطاب" بھی صفحات تاریخ میں آج بھی دیکھا جا سکتا ہے:۔

اللہ اللہ! اے مجاہدین اسلام!

تم سب عرب کے چاند کا ہالہ اور اس کی رونق و زینت ہو۔ تم سب اس کے منتخب اور چیدہ افراد ہو۔ تم اہل عرب کا عطر اور نچوڑ ہو۔

تم اسلام کی قوت و شوکت اور اس کے دست و بازو ہو۔ اور یہ رومی کافر جو تمہارے حریف مقابل ہیں

یہ لوگ روم کے چاند کا ہالہ اور اس کے چنے ہوئے اور چھٹے ہوئے لوگ ہیں۔ یہ لوگ اہل شرک واہلِ کفر کے دست وبازو اور ان کی قوت وطاقت ہیں۔

اے اللہ! آج کا یہ دن تیرا دن ہے تو اپنے بندوں کو اپنی نصرت اور فتح وظفر سے نواز دے"۔

(المنتقیٰ ص۲۵۴ تاریخ اسلام ذہبی ج۲ ص۹۵ فتوح البلدان ص۱۴۳ اسد الغابہ ج۵ ص۲۱۶)

حضرت سیدنا ابوسفیان جنھیں بجا طور پر غازی طائف و یرموک کہا جا سکتا ہے اگرچہ مقام شہادت سے کلی طور پر تو فایز نہ ہو سکے تھے ـــــ لیکن طائف و یرموک کے معرکوں میں یکے بعد دیگرے اپنی دونوں آنکھیں اللہ کی راہ میں قربان کر کے اپنے بدن کے نہایت درجہ عالی وغالی اور عزیز ترین عضو بدن کا قیمتی نذرانہ بارگاہ خداوندی میں پیش کر کے سرخروئی حاصل کرتے ہیں تو ضرور ہی کامیاب ہو گئے[۱] رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

---

[۱] اس موقع پر ایک شکوہ کرنے کے لئے اپنے کو مجبور پاتا ہوں۔ ہمارے حضرت مولانا علی میاں مدظلہ نے حال ہی میں صحابۂ کرام کے بارے میں ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں کے مسلک کی وضاحت کیلئے ایک مضمون لکھا ہے جو تعمیر حیات (۲۵ اپریل ۱۹۹۲ء) میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں حضرت سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے متعلق مولانا نے لکھا ہے:۔

"حضرت ابوسفیان نہ صرف اسلام سے مشرف ہوئے بلکہ جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہوئے اور اس میں پامردی اور استقامت دکھائی اور "زخمی" ہوئے جو انکی قوت ایمانی۔ اور اخلاص کی دلیل ہے"۔

میرا شکوہ یہ ہے کہ اس موقع پر حضرت مولانا کے قلم سے حضرت ابوسفیان کے صرف زخمی ہونے کا تذکرہ پڑھ کر اور ان کی دونوں آنکھوں کی قربانی کا ذکر غائب دیکھ کر بہت عجیب سا محسوس ہوا۔ انسانی جسم میں جان عزیز کے بعد عزیز ترین عضو آنکھ ہی کو سمجھا جاتا ہے۔ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے یکے بعد دیگرے دو معرکوں میں اپنی دونوں آنکھوں کا بیش قیمت نذرانہ بارگاہِ خداوندی میں پیش کر کے پہلی ہی آنکھ کی قربانی پر لسانِ نبوت سے جنت کی خوشخبری حاصل کر لی تھی۔ سیدنا ابوسفیان کی یہ قربانی کوئی ڈھکا چھپا واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ تقریباً تمام ہی مؤرخین اسلام نے پوری فراخدلی کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔ اس لئے یہ بات تو کسی طرح سوچی بھی نہیں جا سکتی کہ حضرت مولانا کی تاریخ سے متعلق گہری اور وسیع نگاہ سے یہ مشہور بات اوجھل رہ گئی۔ اور انھیں اسالیب تعبیر اور ذخیرہ الفاظ پر جو قدرت و مہارت حاصل ہے اسے نظر میں رکھتے ہوئے ہمارے لئے یہ سوچنا بھی مشکل ہے کہ حضرت سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ جیسے مجاہد فی سبیل اللہ کی اس بیش قیمت اور گرانقدر قربانی پر خراج تحسین پیش کرنے کا حق ادا کرتے حقیقت کی صحیح عکاسی و تصویر کشی کے لئے مناسب و موزوں الفاظ کا انتخاب مولانا موصوف نہ فرما سکے۔ فالی اللہ المشتکی۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

(ترجمہ:۔ خدا کی رحمتیں ہوں عاشقان پاک طینت پر۔ جنھوں نے خاک و خوں میں لوٹنے کی یہ بنا ڈالی)

اپنی بات کو آگے بڑھانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ پیچھے لوٹ کر حضرت سیدنا ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مختصر حالات زندگی بھی پیش کر دیئے جائیں۔

نام و نسب

آپ کا نام صخر ولدیت حرب، کنیت ایک تو ابوحنظلہ تھی دوسری ابوسفیان تھی، نام اور ابوحنظلہ کنیت تو زیادہ مشہور نہیں ہے زیادہ شہرت ابوسفیان ہی کو حاصل ہوئی۔

نام کی گمنامی اور کنیت کی شہرت کی وجہ سے بعض اوقات بعض اہلِ علم بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں چنانچہ صاحبِ مشکوٰۃ شریف نے بھی "الاکمال" میں انھیں ابوسفیان ابن صخر ہی لکھدیا ہے حالانکہ ان کا اصل نام صخر بن حرب ہے اور ابوحنظلہ و ابوسفیان کنیت ہے۔

آپ کا سلسلۂ نسب چوتھی پشت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب شریف سے مل جاتا ہے اس اجمال کی تفصیل ذیل میں ملاحظہ ہو:۔

۱۔ نسب شریف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ابن عبداللہ بن شیبہ[۲] بن ہاشم[۳] بن عبد مناف[۴]۔

۲۔ نسب سیدنا ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

ابوسفیان صخر بن حرب[۱] بن امیہ[۲] بن عبد شمس[۳] بن عبد مناف[۴]۔

مخالفین اسلام۔ دشمنانِ صحابہ کرام کی عیاری آمیز ہوشیاری پر کھل کر داد دیجئے جنھوں نے انتہائی چالاکی و چابکدستی کے ساتھ بنو ہاشم اور بنو امیہ کی باہمی و آپسی قرابتوں اور رشتہ داریوں کو یکسر نظر انداز کر کے ان کے مابین فرضی رقابتوں اور بے بنیاد عداوتوں کا ایسا زبردست پروپیگنڈہ کیا ہے کہ

اب ان دونوں خاندانوں کے درمیان من گھڑت اور بے سروپا داستانہائے رقابت و عداوت پر ایمان رکھنا ہر مؤرخ اسلام کی گویا ــــ فنی ذمہ داری اور اس کے مستند مؤرخ ہونے کی پہلی شرط قرار پا گئی ہے۔

اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ یہ دونوں خاندان آپس میں بنی اعمام اور ایک دوسرے کے چچیرے بھائی ہی تو ہیں۔

حضرت ابوسفیان کے دادا امیہ جو اپنی بہادری و حوصلہ مندی کی وجہ سے بنو امیہ کے خاندانی سربراہ اور مورث اعلیٰ کی حیثیت سے شہرت پا گئے یہ امیہ ہاشم بن عبد مناف کے بھتیجے ہی تو تھے اور اس طرح خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوسفیان باہم چچیرے چچا بھتیجے ہی تو ہوتے ہیں۔

مکہ مکرمہ میں قبیلۂ قریش کے چند گھرانے بہت ممتاز و معروف تھے ان میں سب سے زیادہ شریف معزز محترم و مکرم بلکہ مقدس و مطہر گھرانا بنو ہاشم کا تھا، صرف شہر مکہ مکرمہ ہی نہیں بلکہ پورے ملک عرب کی دینی قیادت و سیادت (خانہ کعبہ کی دربانی و مجاوری) اسی خاندان بنو ہاشم سے متعلق تھی۔

اسی طرح قبیلۂ قریش کا دوسرا معزز گھرانہ انھیں بنو ہاشم کے بنی اعمام کا تھا جسکی سربراہی ہاشم کے بھتیجے امیہ کو حاصل تھی ـــــ اہل مکہ و خاندان قریش کی دنیاوی رہنمائی، سیاسی قیادت، فوج کی سرداری و سپہ سالاری بنو امیہ سے متعلق تھی (جسکی مثال موجودہ عرب میں آج کل بھی کسی نہ کسی شکل میں دیکھی جا سکتی ہے کہ سعودی عرب کے جملہ نظام ہائے زندگی اقتدار حکومت و سلطنت اور دینی ارشاد و دعوت کے دو متوازی نظام آل شیخ اور آل سعود کے مابین منقسم ہیں اور اس متوازی تقسیم میں کسی عداوت و رقابت کا سراغ بآسانی کیا شاید بہ دشواری بھی نہ مل سکے)

حضرت ابوسفیان اسی خاندان بنو امیہ کے پوتے اور اسکے ایک ممتاز فرد تھے، آپ کی پیدائش عام الفیل (ابرہہ کے واقعہ) سے دس سال پیشتر ہو چکی تھی، قریش و بنو امیہ کے معززین و اشراف میں آپ کا بھی شمار تھا۔ اپنے باپ حرب بن امیہ کی موت کے بعد قریش کی سیاسی قیادت اور فوجی سپہ سالاری آپ سے متعلق ہو گئی تھی ـــــ حالت کفر اور دور جاہلیت کا یہی منصبی اعزاز تھا جس نے اہل کفر و اہل اسلام کے درمیان برپا ہونے والی جنگوں میں انھیں اہل کفر کی قیادت و سپہ سالاری کا مرتکب ٹھہرایا اور ان کا

یہی منصب اللہ و رسول اور اہلِ اسلام کی نظر میں ان کا سب سے بڑا عیب اور ان کا سب سے بڑا جرم قرار پایا اور دشمن کا یہ جرم اس وجہ سے کچھ زیادہ ہی سنگین سمجھا یا اور باور کرایا گیا کہ وہ سیدنا حضرت امیر معاویہ کے والد بزرگوار تھے جن کا ناقابلِ معافی جرم یہ ہے کہ وہ سیدنا حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کے مقابل صف آرا ہوئے تھے ـــــ ورنہ جہاں تک حالت کفر و جہالت میں مخالفت اسلام اور دشمنی اہل اسلام کا معاملہ ہے، حضرت ابوسفیان اموی ہی اس کے تنہا مجرم نہیں ہیں۔

فتح مکہ کے وقت اسلام لانا اگر استسلام ہے تو پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اس موقع پر حضرت ابوسفیان ابن الحارث ہاشمی اور عقیل بن ابی طالب ہاشمی بھی ہیں یہ لوگ بھی غزوہ بدر کی شکست کا زخم کھائے ہوئے تھے ان سب کا اسلام پھر استسلام کیوں نہیں ہے، یہ حضرات اچانک پل بھر میں بدر کا غم کیسے بھول گئے؟ اور ان سب کے حق میں کچھ لوگوں کے پیمانۂ عقل کے مطابق یہ خلاف عقل بات کیسے واقع ہو گئی؟

ہمارے دین و ایمان کی سلامتی اسی میں ہے کہ ہم یہ حقیقت اچھی طرح ملحوظ رکھیں کہ اگر حضرت ابوسفیان یا کسی بھی صحابی کی حالت کفر و جہالت کے واقعات کو بنیاد بنا کر انھیں مجرم قرار دینے کی یہ غلط روش اپنائی جاتی ہے تو پھر یہ سلسلہ حضرات ابوسفیان و معاویہ اور ہند و وحشی ہی تک کیسے محدود رہ سکے گا کیونکہ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہونے والے صحابہ (جنھیں آج کل کے اصحاب قلم "طلقاء" کہہ کر مطعون کرنا چاہتے ہیں) علامہ ابن تیمیہ کے نزدیک ان کی تعداد تقریباً دو ہزار ہے جن میں سے چند مشہور نام انھوں نے یہ ذکر کیے ہیں:۔

صفوان بن امیہ، ربیعہ بن حارث، حارث بن ہشام، حکیم بن حزام، سہل بن عمرو، عکرمہ بن ابی جہل، عتاب بن اسید، عقیل بن ابی طالب، ابوسفیان بن الحارث، ابوسفیان بن حرب۔

یزید بن ابی سفیان، معاویہ بن ابی سفیان وغیرہم رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

حضرت سیدنا ابوسفیان بن الحارث الہاشمی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا زاد ہیں ...... یہ شاعر تھے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں اشعار کہا کرتے تھے۔ ان کے یہ ہجو اشعار کتب تاریخ میں آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں لیکن کوئی بھی صاحب ایمان جرأت نہیں کر سکتا کہ ان

تذکرہ طعنہ زنی اور عیب جوئی کے طور پر کرے۔

زرقانی میں حضرت عکرمہ بن ابی جہل کے حالات میں ذکر کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے باپ ابوجہل کی اور خود ان حضرت عکرمہ کی ایذارسانیوں کی بنا پر اعلان فرما دیا تھا کہ جو کوئی جہاں کہیں بھی انھیں پا جائے اور قتل کر دے تو وہ قتل کا مجرم نہ قرار پائے گا ـــــ فتح مکہ کی عظیم کامیابی کے بعد یہ اپنی جان بچا کر یمن چلے گئے تھے ان کی بیوی حضرت ام حکیم تھیں جو مسلمان ہوگئیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کر کے ان کی جان کی امان حاصل کر لی اور یمن جا کر انھیں بلا لائیں، ابھی حضرت عکرمہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں حاضر نہیں ہونے پائے تھے راستہ ہی میں تھے کہ آپ نے حاضرین مجلس صحابہ کرام سے ارشاد فرمایا:۔

یاتیکم عکرمۃ مومنا فلا تسبوا	(دیکھو) عکرمہ تمہارے سامنے ایمان لانے کو
اباہ فان سب المیت یوذی الحی.	آرہے ہیں تو ایسا تم لوگ انکے باپ (ابوجہل کو
(زرقانی ج ۳ ص ۳۱۵)	برا نہ کہنا کیونکہ مردہ کو برا کہنے سے اسکے زندہ
	عزیز کو ایذا اور تکلیف ہوتی ہے (زرقانی)

یہ ہے اسلام کی تعلیم اور یہ ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا "خلق عظیم" کہ عکرمہ جیسے شخص بھی جب ایمان سے مشرف ہوگئے تو انکی تطییب قلب اور دلجوئی اس حد تک ملحوظ رکھی کہ ابوجہل جیسے دشمنِ اسلام اور دشمن خدا و رسول شخص کو بھی ان کے بیٹے کے سامنے برا کہنے سے ممانعت فرما دی۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ بات خاص طور سے ملحوظ رہنی چاہئے کہ حضرت عکرمہ کا باپ ابوجہل اسی جنگ بدر میں قتل ہوا تھا، اس کا تقاضا لازمی اور بدیہی طور پر یہی ہونا چاہئے۔ حضرت عکرمہ کے سینہ میں بدر کی شکست کا زخم حضرت ابوسفیان کے زخم سے زیادہ گہرا ہو، دل پر میں اسے بھول جانے کا تصور کرنا ہی محال عقلی قرار دیدیا جائے لیکن کسی کو ناقص عقل نے بھی آج تک اسے محال عقلی نہیں سمجھا ہے۔

قرآن و حدیث میں حضرات صحابہ کا جو مقام بتایا گیا ہے اور ان کے حق میں جب کلام و اتہام کی

ہمیں تعلیم دی گئی ہے اس کا عین تقاضا یہی ہے کہ ان سبھی حضرات کی شان میں ادنیٰ گستاخی سے اپنی زبان اور قلم دونوں ہی کو محفوظ رکھا جائے۔

بات کچھ دور نکل گئی لیکن موضوع بحث کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ــــ کچھ اوپر سے سلسلۂ کلام جوڑ لیجئے ــــ حضرت ابوسفیان کے حالاتِ زندگی کا بیان ہو رہا تھا ــــ مزید حالات ملاحظہ ہوں۔

اعلانِ نبوت سے پہلے حضرت ابوسفیان اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایسی ہی محبت تھی جیسی عام طور پر قریبی رشتہ داروں میں ہوا کرتی ہے بلکہ واقعہ تو یہ بھی ہے کہ اعلانِ نبوت کے بعد بھی ان کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ذاتی طور پر ویسی دشمنی و عداوت نہیں تھی جیسی دشمنی و عداوت آپ کے ہاشمی چچا ابولہب اور مخزومی چچا ابوجہل کی طرف سے انکی پوری زندگی بھر ظاہر ہوتی رہی تھی۔

ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اعلانِ نبوت کے بعد پوری قوم نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت اور دعوت اسلام کی جو مخالفت کی تھی اس میں حضرت ابوسفیان نے بھی نہ صرف یہ کہ ان کا ساتھ دیا تھا بلکہ اپنی قوم کی سرداری اور سربراہی کے تقاضے کے مطابق کفر و اسلام کے درمیان ہونے والے معرکوں میں اپنی قوم کی قیادت اور سپہ سالاری بھی کی تھی ــــ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہ تو کیا جا سکتا ہے نہ کیا جانا چاہیئے، نہ ہی اسکی کوئی واقعی ضرورت ہے ــــ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ تقاضائے حق و انصاف یہ بھی ہے کہ حضرت ابوسفیان اور ان جیسے جملہ طلقائے فتح مکہ اور دوسرے صحابہ کرام کے مشرف بہ اسلام ہو جانے کے بعد پھر ہمارے لئے کسی طرح بھی یہ بات روا و زیبا نہیں ہے کہ ہم ان کے زمانۂ جہالت و کفر کے واقعات کی تلخ یادوں کو اپنے سینوں سے یوں لگائے رکھیں جیسے یہ تلخ یادیں بھی ہمارے دین و مذہب کا کوئی مقدس سرمایہ ہوں۔

جیسا کہ ابھی اوپر ذکر ہوا حضرت ابوسفیان کو حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم سے ذاتی طور پر کوئی کد و کاوش اور پرخاش بالکل نہ تھی کتب تاریخ نے بھی شاید اپنے صفحات میں کوئی ایسا واقعہ محفوظ نہیں رکھا ہے جسے رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ابوسفیان کی ذاتی دشمنی و ایذا رسانی کے ثبوت میں پیش کیا جا سکے ــــ ہاں اسکے برخلاف ان کے دورِ جہالت و زمانۂ کفر سے تعلق رکھنے والے

بعض ایسے واقعات ضرور ملتے ہیں جن کی روشنی میں ایک طرف اگر حضرت ابوسفیان کی خاندانی بلند کرداری اور شرافتِ نفس ظاہر ہوتی ہے تو دوسری طرف ہمارا یہ مدعا بھی قرینِ ثبوت ہوجاتا ہے کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے ساتھ حضرت ابوسفیان کی طرف سے ذاتی طور پر عداوت و دشمنی کا کوئی ثبوت بہ ظاہر نظر کتبِ تاریخ میں دستیاب نہیں ہے، اس قسم کے چند واقعات یہاں ذکر کئے جاتے ہیں۔

۱۔ احوال صحابہ سے متعلق مشہور کتاب "اصابہ" میں حضرت ابوسفیان کے اصل نام صخر کے تحت ان سے متعلق یہ عجیب و غریب انکشاف موجود ہے کہ اعلانِ نبوت کے بعد بعض اوقات جب کفار مکہ کی ایذا رسانی بہت زیادہ ہوجاتی تھی تو کبھی کبھی ان کے ہجوم اور شر سے بچنے کیلئے آپ انھیں حضرت صخر ابوسفیان کے گھر میں پناہ لینے کیلئے تشریف لیجایا کرتے تھے، وہ چونکہ مکہ کے معززین میں شمار ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی فوج کے سپہ سالار بھی تھے، اہلِ مکہ پر ان کا ایک اثر و رعب اور دبدبہ بھی تھا، اس لئے ان کے گھر میں داخل ہوتے ہی شر پسندوں کی ایذا و شرارت سے آپ کو امن بھی مل جاتا تھا، ایسے مواقع میں انکے پورے گھرانے کا برتاؤ آپ کے ساتھ صلہ رحمی و قرابت داری ہی کا ہوتا تھا (اصابہ ذکر صخر صفحہ ۸۴/۲)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جو حسنِ سلوک اور خلقِ عظیم کا مجسمہ اور سراپا کرم و احسان ہی تھے آپ نے اپنے اُس دورِ ابتلاء و اذیت میں ان کے گھر میں امن و سکون پاکر ان کے اس حسنِ سلوک کی قدر دانی کی اور اسے یاد رکھا ـــــ اور بالآخر فتح مکہ کے تاریخی موقع پر "مَنْ دَخَلَ دَارَ اَبِی سُفْیَانَ فَهُوَ اٰمِنٌ" (جو شخص بھی ابوسفیان کے گھر میں پناہ کیلئے داخل ہوجائے گا اسے پورا امن ہوگا) کا تاریخی اعلان فرماکر "هَلْ جزاء الاحسان" پر عمل فرماتے ہوئے ان کے اس پرانے حسن سلوک کا بدل بلکہ نعم البدل ادا فرمادیا۔

چنانچہ صاحب تہذیب التہذیب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس انعامی و شاہی اعلان کو اسی محمل پر محمول فرماتے ہیں لکھتے ہیں :۔

قال جعفر بن سلیمان الضبعی	جعفر بن سلیمان ضبعی حضرت ثابت البنانی،
عن ثابت البنانی ـــ انما قال	روایت کرتے ہیں کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم

النبی صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ دَخَلَ دَارَ اَبِی سفیان فَهُوَ اٰمِنٌ لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا اُوذِیَ بِمَكَّةَ دَخَلَ دَارَ اَبِی سُفیان رواہ ابن سعد ایضا باسناد صحیح۔ (تہذیب التہذیب ج۴ ص۴۱۲)

نے "من دخل دار ابی سفیان فھو امن" کا اعلان اس وجہ سے فرمایا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں ستائے جاتے تھے تو آپ ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جاتے تھے۔ یہ بات ابن سعد نے بھی سند صحیح کے ساتھ روایت کی ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس انعامی اعلان کی یہ توجیہ جو حافظ ابن حجر نے حضرت ثابت البنانی سے نقل کی ہے اور جسے ابن سعد نے بھی اسناد صحیح سے روایت کیا ہے، اس توجیہ و روایت کی روشنی میں اُس روایت کی حقیقت دیکھی اور سمجھی جا سکتی ہے جس میں آپ کے اس انعامی اعلان کا محرک حضرت سیدنا عباس بن عبدالمطلب کو قرار دیا گیا ہے کہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کی تھی اور کہا تھا کہ "حضورؐ! ابوسفیان ایک جاہ طلب آدمی ہیں ان کے ساتھ کچھ رعایت کی جائے تو مناسب ہے"۔

اس روایت کے راوی کی وقت نظر اور باریک بینی بھی قابل توجہ ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر تقریباً دو ہزار افراد قبول اسلام کرتے ہیں لیکن ان سب میں جاہ پسندی کے مریض صرف ابوسفیان ہی ہیں بقیہ سب کا تزکیۂ باطن شاید اسلام لانے سے پہلے ہی ہو چکا تھا ـــ پھر مزید قابلِ غور اور لائق توجہ بات یہ بھی ہے کہ حضرت ابوسفیان کی اس جاہ طلبی و شہرت پسندی کا علاج نہیں کیا گیا بلکہ اسے برقرار اور باقی رکھنے کی سفارش کی گئی جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قبول فرمائی۔

دشمنانِ صحابہ نے اپنی صحابہ دشمنی میں روایات حدیث و سیر میں ایسی ایسی چابکدستی اور ہاتھ کی صفائی دکھلائی ہے جس کا سراغ لگانا نہایت درجہ دشوار ہے، یہ موضوع بحث ایک مستقل مضمون کا متقاضی ہے یہاں صرف اشارۃً اتنی بات عرض کر دی گئی ہے۔

۴۔ اب حضرت ابوسفیان کے دورِ جہالت و زمانۂ کفر کا ایک دوسرا واقعہ ملاحظہ ہو علامہ

سیوطی علیہ الرحمہ نے تحفۃ الادیب میں تاریخ قزوینی کے حوالہ سے نقل کیا ہے جسکے راوی حضرت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ :-

"حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اعلان نبوت کے ابتدائی زمانے میں ایک دن ابوجہل نے جگر گوشۂ رسول حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ایک تھپڑ مار دیا۔ انھوں نے آکر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی شکایت کی آپ نے فرمایا بیٹی جاؤ یہ بات ابوسفیان سے کہدو ـــ وہ گئیں اور جاکر حضرت ابوسفیان سے شکایت کردی۔ ابوسفیان نے حضرت سیدہ فاطمہ کا ہاتھ پکڑا (ظاہر ہے حضرت سیدہ اس وقت چھوٹی کم عمر بچی ہی رہی ہونگی) اور سیدھے وہاں پہنچے جہاں ابوجہل بیٹھا ہوا تھا اور کہا بیٹی! تم بھی اس کے منہ پر تھپڑ مار دو جیسے اس نے تمہیں تھپڑ مارا تھا۔

چنانچہ حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بھی ابوجہل کو تھپڑ مار دیا اور حضرت ابوسفیان کے ساتھ اپنے گھر چلی آئیں اور گھر آکر یہ ساری سرگزشت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کردی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوسفیان کے اس برتاؤ سے بیحد متأثر ہوئے اور فوراً ہی آپ کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف خدا تعالیٰ کے آگے اُٹھ گئے اور آپ نے دل کی گہرائی سے یہ دعا فرمائی :-

"اَللّٰھُمَّ لَا تَنْسَاھَا لِاَبِیْ سُفْیَانَ" (اے اللہ ابوسفیان کی اس نصرت وحمایت کو نہ بھولیو گا۔)

حضرت شیخ احمد زینی دحلان (جنھوں نے تعمیر حیات کے تبصرہ نگار صاحب کے بیان کے مطابق العواصم کا رد بھی لکھا ہے) نے حضرت ابوسفیان کا یہ واقعۂ نصرت وحمایت اپنی سیرت نبویہ میں بھی نقل کیا ہے، ان کی یہ سیرت نبویہ سیرت حلبیہ کے حاشیہ پر چھپی ہوئی ہے۔

(ملاحظہ ہو حاشیہ سیرت حلبیہ ص ۲۹۵)

اب کیسے یہ سمجھ لیا جائے کہ بحالت مظلومی و بیکسی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی یہ دعا اللہ تعالیٰ نے قبول نہ فرمائی ہوگی۔ ہمارا ایمان و یقین یہی ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ دعا قبول فرمائی اور ضرور قبول فرمائی اور حضرت ابوسفیان کا قبول اسلام اسی مقبولیت دعا کا نتیجہ تھا۔

شیخ احمد زینی دحلان نے اپنی سیرت نبویہ میں حضرت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ جزم و یقین نقل فرمایا ہے وہ ارشاد فرماتے ہیں :۔

مَا شَكَكْتُ اَنَّ اِسْلَامَهٗ كَانَ لِدعوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (سیرت نبویہ ص۲۵۶)	مجھے کبھی بھی اس بات میں شک نہیں ہوا (بلکہ اس بات کا یقین ہی رہا) کہ حضرت ابوسفیان کا اسلام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی (اس) دعا کا ثمرہ و نتیجہ تھا۔

حضرت سیدنا ابوسفیان کے حقیقی و واقعی اسلام کو مجبوری و مایوسی کا اسلام اور استسلام کہنے والے لوگ جو بھی ہوں اور جہاں بھی ہوں اپنی آنکھیں کھول کر دیکھ لیں اور سمجھ لیں کہ حضرت سیدنا ابوسفیانؓ کے اسلام کو استسلام کہہ کر انھوں نے حضرت ابوسفیان کا کچھ نہیں بگاڑا ہے بلکہ اپنے ہی ایمان واسلام کو مشتبہ و مشکوک بنا دیا ہے اور آخرت کی باز پرس کیلئے ایک سخت خطرہ مول لے لیا ہے اللھم احفظنا منہ۔

اس سلسلہ میں اسی سیرت نبویہ (احمد زینی دحلان) کی ایک اور روایت بھی قابل توجہ ہے، روایت کا ترجمہ ملاحظہ ہو :۔

"حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مقام مرالظہران میں حضرات صحابہ و رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمہ زن ہونے سے پہلے ایک خواب دیکھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ہم سب مکہ شریف کے قریب پہنچ گئے ہیں تو ایک کتیا بھونکتی ہوئی ہماری طرف نکلی ہے لیکن جب اسکے قریب پہنچے ہیں تو بالکل چت لیٹ جاتی ہے اور اس کا دودھ بہنے لگتا ہے ـــــ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خواب کی یہ تعبیر بیان فرمائی کہ ان کی دشمنی و عداوت کا دور ختم ہو گیا اور اب ان سے خیر و انقیاد کے ظہور کا وقت آ گیا ہے اور اب یہ لوگ اپنی رشتہ داریوں کی وجہ سے ہمارے سہارے ہی برابر ہو گئے ہیں تم ان کے بعض لوگوں سے اب ملاقات کرو گے تو اگر (انکے سربراہ) ابوسفیان تمہارے سامنے آجائیں تو انھیں قتل نہ کرنا"۔ (سیرت نبویہ احمد زینی دحلان ص۲۵۵)

قابل غور بات یہی ہے کہ حضرت ابوسفیان اگر واقعی گردن تندی ہوتے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پہلے ہی سے کیوں ممانعت فرمادی تھی کہ دیکھو اگر ابوسفیانؓ سے آمنا سامنا ہو جائے تو انھیں قتل نہ کرنا۔ گویا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعا کی مقبولیت کے معاملہ میں پہلے ہی سے پرامید تھے کہ بارگاہِ خداوندی میں میری دعا مقبول ہو کر رہے گی اور حضرت ابوسفیان مسلمان ہو کر رہیں گے اسی وجہ سے آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا خواب سنکر پیشگی ہی ممانعت فرمادی تھی آپؐ کی یہ ممانعت جملہ صحابہ کے علم میں نہ ہو گی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قتل کی ممانعت فرمادی ہے۔ اسی وجہ سے روایات میں یہ بات بھی ملتی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوسفیان کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پہنچنے سے پہلے قتل کر ڈالنا چاہا تھا مگر سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر انھیں قتل کا موقع نہیں دیا کہ "میں انھیں امان دے چکا ہوں۔" (سیرت نبویہ ص۲۵۷)

حضرت ابوسفیان کے اسلام کو واقعی وحقیقی اسلام سمجھنے کیلئے بخاری شریف جلد اول باب بدء الوحی کی ایک طویل روایت کا ایک ٹکڑا اہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ یہ روایت حضرت سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اس میں حضرت ابوسفیان ہی سے متعلق اس تاریخی واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا دعوت نامۂ اسلام شاہ روم ہرقل کو بھیجا گیا تھا اور اس نے اصل صورت حال کو سمجھنے کیلئے اپنے دربار میں حضرت ابوسفیان کو بلوایا تھا اور ان سے کچھ سوالات وجوابات ہوئے تھے۔

اس وقت ہرقل کے دربار سے باہر آنے پر حضرت ابوسفیان کے قلبی احساسات وتاثرات کیا تھے اسے انھوں نے راوی حدیث حضرت عبداللہ بن عباس کے سامنے یوں نقل کیا ہے دو فقرے یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

(الف) لَقَدْ اَمِرَ اَمْرُ ابن ابی کبشۃ انہ یخافہ ملک بنی الاصفر۔	اچھا تو ابن ابی کبشہ (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا معاملہ اب اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ (گوری چمڑی والے) رومیوں کا بادشاہ بھی انکے غلبہ کا خوف محسوس کرنے لگا ہے۔

(نوٹ) ابن کبشہ کی تعیین وتشریح میں متعدد باتیں کہی گئی ہیں قریب الفہم بات یہ ہے کہ "ابی کبشہ" حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کے شوہر کی کنیت ہے اور انکے بیٹے کی تعبیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کیلئے بطور کنایہ

متعلق کی گئی ہے۔

پھر: فَمَا زِلْتُ مُوقِنًا اَنَّهٗ سَيَظْهَرُ حَتّٰى اَدْخَلَ اللّٰهُ عَلَيَّ الْاِسْلَامَ۔ (ہرقل کی اس گفتگو کے بعد سے) مجھے برابر اس بات کا یقین رہا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ضرور غلبہ و اقتدار حاصل کریں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو مجھ پر حاوی کر کے میرے دل میں پہنچا ہی دیا۔

بخاری شریف کا یہی دوسرا فقرہ خاص طور پر قابلِ غور ہے، عربی زبان کا ذوق رکھنے والے اہلِ علم اچھی طرح مجھ سے زیادہ ہی جانتے ہوں گے کہ "فَمَا زِلْتُ" عربی کے افعالِ ناقصہ (امدادی افعال) میں شمار ہوتا ہے اور استمرار و دوام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

اس بنا پر اس فقرے سے یہ بات بالکل صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ فتح مکہ سے پہلے ہی ہرقل سے ملاقات و گفتگو کے بعد انھیں اس بات کا یقین کامل حاصل ہو چکا تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو عنقریب ہی ہم کفارِ مکہ پر غلبہ حاصل ہو کر رہے گا اور ان کے دل کی یہ یقینی کیفیت صرف وقتی اور عارضی ہرگز نہ تھی بلکہ ہرقل سے گفتگو و مکالمے کے بعد سے اسلام لانے کے وقت تک استمرار و دوام کے ساتھ انھیں آپ کے اس غلبہ و اقتدار کا یقین رہا ہے۔

بخاری شریف میں منقول ان کے اس احساس و تأثر کو نظر میں رکھا جائے تو صاف سمجھ میں آ جاتا ہے کہ سیدنا حضرت ابوسفیان کا اسلام فتح مکہ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی مجبوری و مایوسی پر مبنی نہ تھا بلکہ وہ پوری طرح سے صدقِ دل اور اطمینانِ قلب پر مبنی تھا جس کی تخم ریزی ان کے دل میں بہت پہلے اسی وقت ہو گئی تھی جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مظلومیت کے وقت ان کی نصرت و حمایت آمیز سلوک سے متأثر ہو کر ان کے حق میں دعائے خیر فرمائی تھی جس کی تفصیل اوپر گزر چکی۔

حضرت ابوسفیان کا قبول اسلام

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ان کی اہلیہ [illegible]

کی ولادت باسعادت سے دس سال پہلے ہو چکی تھی یہ عمر میں حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم سے دس سال زائد تھے۔ ہجرت کے وقت انکی عمر تریسٹھ سال رہی ہوگی اور جس وقت یہ داخل اسلام ہوئے ہیں اس وقت ان کی عمر تقریباً اکہتر سال کی تھی یعنی اس وقت یہ دور شباب و کہولت سے آگے نکل کر ضعیفی و شیخوخت کی سرحد میں داخل ہو چکے تھے۔

آپ کے قبول اسلام کے وقت کی تعیین میں روایات تاریخ میں کچھ اختلاف ہے جو قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ مشہور روایت کے مطابق آپ کے قبول اسلام سے متعلق تفصیل یوں ملتی ہے :۔

"حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے ارادہ سے اپنا سفر مدینہ شریف سے شروع کر دیا ہے جنگی مصلحتوں کے تحت اپنے ارادہ کو مخفی ہی رکھا ہے عام طور پر لوگوں کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ آپ کا یہ سفر فتح مکہ کی نیت سے ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے قریب مقام "مرّ الظہران" تک پہنچے ہیں اور اس مقام پر رات گذارنے کا فیصلہ فرما لیا ہے جسکی اطلاع کفار مکہ کے سربراہ و سپہ سالار ہونیکی وجہ سے........ ابوسفیان کو بھی مل گئی ہے وہ اپنے دو ایک ساتھیوں کے ساتھ جاسوسی کے لئے رات کی تاریکی میں چھپتے چھپاتے لشکر اسلام کے قریب تک جا پہنچے، وہاں دیکھتے ہیں کہ ایک ٹڈی دل لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے الگ الگ فوجی دستے اپنا جھنڈا بلند کئے ہوئے ہیں، ہر دستہ میں الگ الگ آگ جل رہی ہے۔

لشکر کی یہ کثرت و شان دیکھ کر سناٹے میں آجاتے ہیں کیونکہ اسلامی لشکر جو تقریباً دس ہزار سرفروش مجاہدوں پر مشتمل تھا وہ اس مقام مرالظہران میں خیمہ زن تھا۔ اور یہ مجاہدین پورے میدان میں پھیلے ہوئے تھے کچھ نماز اور ذکر اللہ میں مشغول تھے تو کچھ کھانے پینے کی ضرورتوں میں مصروف۔ جگہ جگہ مشعلیں روشن تھیں۔

ابوسفیان نے اپنے کو ان مجاہدین سے چھپائے رکھنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن یہ اپنے ساتھی سے کچھ گفتگو کر رہے تھے کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انکی آواز سے انھیں پہچان لیا اور انکی کنیت "ابوالحنظلہ" کہکر انھیں پکارلیا۔ انھوں نے بھی حضرت عباس کی آواز پہچان لی کیونکہ یہ پرانے ساتھی "ابوالفضل عباس" کی آواز ہے جسکی وجہ سے انھیں کچھ اطمینان بھی ہو گیا کیونکہ یہ قریبی عزیز اور پرانے

ساتھی ہیں ان سے اس وقت بھی دوستی ہی کی امید ہے (روایت کے درمیانی غیر ضروری اجزا کو چھوڑنا مناسب معلوم ہوا۔)

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ انھیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لیکر حاضر ہو گئے اور آپ سے سفارش کی کہ میں نے انھیں امان دیدی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امان کو برقرار رکھا اور انھیں کلمۂ شہادت کی تلقین فرمادی۔

اس روایت کے مطابق آپ کا قبولِ اسلام ۸ھ میں فتح مکہ کی رات کو مرّ الظہران میں ہوا ہے بعض دوسری روایات میں آپ کا قبول اسلام یوم فتح مکہ میں بیان کیا گیا ہے یہ بہت معمولی اور ناقابلِ توجہ اختلاف ہے۔

ان تاریخی روایات میں جو بات خصوصی غور و توجہ کی مستحق ہے وہ روایت کا وہ جزء ہے جس میں قبول اسلام کے وقت شہادت رسالت ادا کرنے میں ان کی ہچکچاہٹ اور تردد کو ظاہر کیا گیا ہے اور شاید سید قطب اور ان کے متبعین کو تاریخ کے اسی جزء نے حضرت سیدنا ابوسفیان کے اسلام کو استسلام قرار دینے کا موقع فراہم کیا ہے۔

اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں تاریخ کے اس جزء سے متعلق اپنی معروضات پیش کردیں۔

۱۔ چونکہ تاریخی روایات میں دشمنانِ صحابہ کی تلبیسیں و تدلیسیں اسقدر موجود ہیں کہ ان روایات کی اسنادی تحقیق انتہائی ضروری ہے بالخصوص ایسے معاملہ میں جس سے کسی صحابی کے اسلام و کفر ہی کا فیصلہ متعلق ہو۔

۲۔ حضرت ابوسفیان کو شہادت رسالت کے وقت جو ہچکچاہٹ اور پس و پیش ہوا اسکے سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل دو واقعات پر نظر رکھنے اور ان پر غور و توجہ کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

(الف) ایک تو ابوطالب کے اسلام قبول نہ کرنے کا واقعہ، نفسیات انسانی کو اگر ذہن میں ملحوظ رکھا جائے تو بآسانی ان کے تامل اور ہچکچاہٹ کی وجہ سمجھی جاسکتی ہے۔

قضا و قدر کے فیصلوں کو زیر بحث لائے بغیر صرف اصل واقعہ پر غور کرنے سے یہ بات بآسانی

سمجھی جا سکتی ہے کہ ان کے اس تامل و تردد میں ان کا یہ جذبہ مستور کام کر رہا تھا کہ "میں چچا اور خاندانی سربراہ ہوتے ہوئے اپنے ہی تربیت و کفالت کردہ بھتیجے کی بات کیسے مان لوں؟ میرے ہم چشم، اعزہ واحباب اسے کھلی ہوئی میری کمزوری اور بزدلی پر محمول کریں گے چنانچہ "اِخْتَرْتَ النَّارَ عَلَى الْعَارِ" کا معنی خیز فقرہ آج بھی زبان زد ہے، انھوں نے نار دوزخ کو گوارا کرنا تو اختیار کر لیا لیکن ہم چشموں اور ساتھیوں کے سامنے شرمندہ ہونا گوارا نہ کیا۔

کچھ اسی قسم کا جذبہ تقاضائے نفسیات و نفسانیات ان کے دل میں بھی ہوگا وہ بھی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ کے چچا ہوتے تھے اور صرف چچا ہی نہیں تھے آپ کے خسر بھی تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین ایمان کے وقت عمر و رشتہ میں اپنی بڑائی کے احساس و شعور کا موجود ہونا فطرتِ انسانی کا عین تقاضا اور بالکل نفسیاتی بات ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس تامل و تردد کو مرادف ارتداد نہیں سمجھا بلکہ اپنی توجہ نبوت اور حکمت عملی سے اس کا ازالہ فرما دیا۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کسی صاحب کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے خسر ہونے کا رشتہ صرف حضرت ابوسفیان ہی کا تو نہ تھا ان کے علاوہ سیدنا حضرت ابوبکر صدیق اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہما بھی تو آپ کے خسر تھے؟ اس شبہ کا جواب بہ آسانی دیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں صاحبان پہلے قبول اسلام سے مشرف اور آپ کے امتی بن چکے ہیں اس کے بعد خسر ہوئے ہیں اسلئے انھیں اپنے خسر ہونے کی وجہ سے کسی بڑائی کا وہم و وسوسہ بھی نہ گزرا ہوگا۔

حضرت ابوسفیان کا معاملہ ان کے برعکس تھا وہ خسر پہلے بن چکے تھے اسلئے امتی بنتے وقت اپنے چچا اور خسر ہونے کی وجہ سے ایک احساس برتری ان کے دل میں موجود تھا جس کے تحت پہلے تامل و تردد کا اظہار تو ضرور کیا تھا مگر آناً فاناً ہی توجہ نبوت کے اثر سے وہ احساس دور اور وہ برتری کا شعور بالکل کافور ہو گیا۔

(۲) دوسرا واقعہ انھیں حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تعلق رکھتا ہے جنھوں نے حضرت ابوسفیان کا ادائے شہادت رسالت میں تامل و تردد دیکھ کر انھیں قتل کر ڈالنا چاہا تھا۔۔۔۔

حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ بخاری شریف میں موجود ہے کہ ایک بار
حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کمالِ ایمان کی شناخت و معیار بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے
کوئی بھی شخص اس وقت تک کامل الایمان نہیں ہو سکتا جب تک میری ذات اسے اپنی جان، مال اور اہل و آل سے
زیادہ عزیز نہ ہو جائے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جس وقت یہ ارشاد گرامی آپ کی زبان سے سنا تو اس وقت
دل میں جو بات تھی وہ سچ سچ اور صاف صاف عرض کر دی کہ اے حضور رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ یقیناً مجھے
دنیا سے زیادہ عزیز و محبوب ہیں لیکن میں اپنی جان سے زیادہ عزیز نہیں سمجھتا ہوں ـــــ حضور اقدس صلی اللہ علیہ
وسلم نے حضرت فاروق کے سینہ پر اپنا دست مبارک زور سے مارا اور فرمایا نہیں عمر (یہ معیار مطلوب نہیں ہے)
اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے (ایمان اسی وقت کامل ہوگا کہ) میں تمہارے نزدیک تمہاری جان
سے بھی زیادہ محبوب و عزیز ہو جاؤں ـــــ آپ کا ان کے سینے پر ہاتھ مار کر یہ فرمانا تھا کہ اب حضرت عمر فاروق
بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں کہ اب تو اے حضور بخدا آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ عزیز و محبوب ہو گئے ہیں تو
حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عمر اب تمہارا ایمان کامل و مکمل ہوا ہے۔ (بخاری شریف)

صاحبِ مرقاۃ ملا علی قاری اس حدیث کو ملحوظ رکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

ومن ارتقى الى غاية هذه المرتبة	اور ان لوگوں میں سے جو کہ اس مرتبہ کی انتہا اور
ونهاية هذه المزية سيدنا عمر	اس فضیلت کی آخری معراج کو پہنچ گئے ہیں،
رضي الله عنه فانه لما سمع هذا	سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہیں کیونکہ انھوں نے
الحديث اخبر بالصدق حتى وصل	جس وقت یہ حدیث شریف سنی تو اپنے دل کی
ببركة صدقه الى كمال ذالك	سچی بات بتا دی اور اپنی اسی راست گوئی اور
فقال بمقتضى الامر الطبعي لانت	سچائی کی برکت سے وہ اس درجہ کمال تک
احب الى من كل شيء	پہنچ گئے چنانچہ فطری تقاضے کے مطابق یہ بات
الا من نفسي فقال لا والذي نفسي	کہہ دی کہ یا رسول اللہ یقیناً آپ مجھے ہر شے

بیدہ حتی اکون احب الیك من نفسك فقال عمر فانك الآن واللہ احب الی من نفسی فقال الآن یا عمر تم ایمانك۔"

رواہ البخاری (مرقاۃ ج اول ص ۶۴)

زیادہ عزیز ہیں لیکن میری جان سے زیادہ عزیز نہیں ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نہیں یہ معیار مطلوب نہیں ہے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے (ایمان اس وقت تک کامل نہ ہوگا جب تک) میں تمہاری جان سے بھی زیادہ تم کو محبوب نہ ہو جاؤں تو حضرت عمر نے کہا کہ اب تو آپ بخدا واقعی مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز و محبوب ہو گئے ہیں تو حضور نے فرمایا اب اے عمر تمہارا ایمان کامل ہوا ہے۔

سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعلق مندرجہ بالا روایت کے پیش نظر اور عبارت میں آئے ہوئے خط کشیدہ الفاظ کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے حضرت ابوسفیان کے قبول اسلام سے متعلق روایات تاریخ کا وہ حصہ بھی آپ پڑھ لیجئے جس میں ادائے شہادت کے وقت ان کی ہچکچاہٹ اور تامل اور تردد کا ذکر کیا گیا ہے:۔

"حضرت ابوسفیان جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں تو آپ نے ان سے ارشاد فرمایا:۔

"ابوسفیان! تمہارا بھلا ہو، کیا ابھی تک اس کا وقت نہیں آیا کہ تم اس پر ایمان لاؤ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؟

انھوں نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ کتنے حلیم اور کتنے کریم ہیں اور کس قدر صلہ رحمی کرنے والے ہیں خدا کی قسم میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی اور معبود کا وجود ہوتا تو آج میرے کچھ کام آتا، آپ نے فرمایا ابوسفیان! خدا تمہیں سمجھ دے کیا اب بھی اس کا وقت نہیں آیا کہ تم اس بات کا اقرار کرو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ ابوسفیان نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ کتنے حلیم کتنے کریم اور کتنے صلہ رحمی کرنے والے ہیں، جہاں تک اس معاملہ کا تعلق ہے تو یہی بات

یہ ہے کہ اس بارے میں ابھی مجھے کچھ تردد ہے"۔

حضرت ابوسفیان کا یہ جواب بھی اسی طرح مبنی بر صدق و راست گوئی ہی ہے جس طرح اوپر کی حدیث میں حضرت عمر فاروق کی بات تھی اور جسے ملا علی قاری نے بھی صدق پر مبنی قرار دیتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا کہ حضرت عمر نے اپنی اس راست گوئی ہی کی بدولت کمال ایمان کا اعلیٰ درجہ حاصل کر لیا تو کیا عجب ہے کہ حضرت ابوسفیان کو جو دولتِ ایمان ملی اس میں بھی ان کی اسی صاف گوئی کا حصہ ہو۔

بت شکنی

سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو قبول اسلام کے جلد ہی بعد دو بتوں کے توڑنے کی سعادت نصیب ہوئی، ایک مناۃ اور ایک لات[۱]۔

سبحان تیری قدرت! تھوڑے دن پہلے جو شخص میدان بدر میں گروہ کفار کی قیادت کرتے ہوئے نعرہ لگا رہا تھا "لنا العزیٰ لکم" وہی شخص اب بت شکن بن کر بتوں پر کلہاڑیاں چلا رہا ہے۔

جہاد و غزوات میں آپ کی مجاہدانہ و سرفروشانہ شرکت کی خاصی تفصیل مضمون کے شروع میں عرض کی جا چکی ہے۔ کتب احادیث و سیر میں غزوۂ حنین میں بھی آپ کی شرکت کرنے اور دادِ شجاعت دینے کا ذکر موجود ہے۔

وفات

اچھی اسلامی زندگی گذارنے کے بعد آپ کی وفات، مختلف اقوال کے مطابق ۳۱ھ یا ۳۲ھ یا ۳۴ھ میں ہوئی ـــــ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو۔

---

[۱] ملاحظہ ہو اسد الغابہ ج۵ ص۲۱۶، اور المحبرّ ص۳۱۵ جس کا مصنف ایک شیعہ مؤرخ تھا۔ یہاں پر افسوس کے ساتھ پھر کہنا پڑتا ہے کہ مولانا علی میاں نے اپنی کتاب نبی رحمت میں منات کے توڑنے کے سلسلہ میں حضرت ابوسفیان کے انتخاب کا ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ اور لات کے سلسلہ میں حضرت ابوسفیان کے انتخاب کا ذکر کرنے کے بعد بت شکنی کے کام کو صرف مغیرہ بن شعبہ کے سپرد کیا ہے ـــــ اللہ جانے حضرت ابوسفیان کے فضائل کے بیان میں اتنی کفایت شعاری سے کام لینے کی کیا وجہ ہے؟

(دیکھئے نبی رحمت حصہ دوم)

مولانا عتیق الرحمن سنبھلی

یہ ملامت ــ زہے نصیب!

(دوسری اور آخری قسط)

جو لوگ مولانا (علی میاں) کے مضمون (تعمیر حیات ۲۵ راپریل ۹۲ء) پر ہمارے معروضات سے رنجیدہ ہوئے ہیں، اُن سے مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ ہم نے اس مضمون پر جو کچھ لکھا وہ واقعے میں بہت کم لکھا، ورنہ صورت بقول علامہ اقبالؒ[1] یہ تھی کہ ؎

سنائی کے ادب سے میں نے غوّاصی نہ کی ورنہ

ابھی اس بحر میں باقی (تھے) لاکھوں لولوئے لالا

مولانا کا مضمون اس شکایت پر لکھا گیا تھا کہ راقم کی کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" پر تعمیر حیات کے تبصرے میں کربلا کے سانحے کو بنو امیہ اور بنو ہاشم کی دیرینہ عداوتوں کا نتیجہ اور بالخصوص غزوۂ بدر میں شکست کا انتقام بایں طور بتایا گیا ہے کہ :-

"غزوۂ بدر میں مسلمان فوج کی کامرانی نے جس طبقے کو سب سے زیادہ برافروختہ کیا، اسکے سربراہ ابوسفیان تھے اسی طرح غزوۂ اُحد میں اُن کا اور انکی اہلیہ جگرخوارِ حمزہ ہند کا کردار یہ سب باتیں وہ ہیں جن میں مؤرخین کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ فتح مکہ کے بعد یہ گروہ اسلام لایا (یا بقول سید قطب شہید کے استسلام کیا) مگر اس استسلام کے بعد اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہوگئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے، اپنی انانیت کو بھول گئے

---

[1] بادنیٰ تصرف۔

عقلاً محال بات ہے' اور صحاح کی مستند روایات سے ثابت ہے کہ ہند نے بیعت کے وقت [illegible] دہراتے ہوئے بھی اپنے اندرونی کرب اور غیظ و غضب کا اظہار کیا تھا۔ لہ حضرت ابوسفیان نے احتجاج کیا تھا کہ اب وہ دن آگیا ہے کہ پسماندہ ہم اشراف پر فوقیت دیئے جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق کے خلاف حضرت علی کو اکسانے کی کوشش بھی ان سے ثابت ہے۔"

"اسلام کے پورے طور پر فاتح ہو جانے کے بعد جب مقاومت کی تمام راہیں مسدود ہو گئی تھیں، اس عرصۂ مختصر میں اس گروہ کی طرف سے کسی واضح دشمنی کا ثبوت تاریخ میں نہیں ملتا۔ مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں کی شکست کا غم و غصہ آج تک موجود ہے اسی طرح اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینے کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت نے البتہ اسلام کی طرف سے ان کے عناد کو ختم کیا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اُن کا دل صاف نہیں ہوا۔"

یعنی بدر کے انتقام کے جذبے کی جو آگ ابوسفیان و ہندہ اور اُن کی آل اولاد کے دلوں میں بھڑکتی رہی تھی وہ خاندانِ بنو امیہ سے تعلق رکھنے والے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو خلافت مل جانے پر اسلام کے حق میں تو ٹھنڈی پڑ گئی مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے حق میں یہ (معاذ اللہ) جوں کی توں بھڑکتی رہی[2] حتی کہ ابوسفیان اور ہند کے پوتے یزید کو موقع ملا کہ وہ نسلاً بعد نسل منتقل ہونے والی اپنے سینے کی اس آگ کو سبطِ رسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خون سے بجھائے۔

اس شکایت پر مولانا نے جیسا کہ بعض عقیدت مند حضرات کو جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ: "ہمیں افسوس ہے کہ مولوی عبید اللہ صاحب کے اس مضمون میں بعض ایسے فقرے آ گئے ہیں جن سے غلط فہمی پیدا ہونے کا

لہ اس دعوے کی حقیقت "الفرقان" اشاعت خاص کی [illegible] میں بتائی جا چکی ہے۔

[2] خدا معلوم وہ کون سا اسلام ہو سکتا ہے کہ آدمی اس سے راضی ہو مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن!

اندیشہ ہے، حالانکہ ان کی نیت ایسی نہ ہوگی۔ اب انشاء اللہ کوئی ایسا مضمون شائع کرنے کا اہتمام کیا جائے گا جس سے صحابہ کرام کے بارے میں اہل سنت کے مسلک اور عقیدہ کا اظہار ہو[1]" بعینہٖ اسکے مطابق اپنے مضمون (مجریہ ۲۵ راپریل) میں تبصرہ نگار کے کھلے رافضانہ خیالات سے کسی براءت و بے تعلقی یا اُن کی تردید و مذمت کے بجائے صحابۂ کرام کے بارے میں بانیان و کارکنان و ذمہ دارانِ ندوہ (جن میں تبصرہ نگار مولوی عبداللہ عباس صاحب بھی لازماً شامل تھے) کا عقیدہ (مطابق عقیدۂ اہلسنت) بیان کرکے اور مزید برآں صحابۂ کرام کے سیر و سوانح کی تحریری نشر و اشاعت میں اکابر ندوہ اور فضلاء ندوہ کا قابلِ فخر حصہ یاد دلا کر یا بالفاظ دیگر یہ اعلان کیا کہ مولوی عبداللہ صاحب نے "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" کے تبصرے میں جو کچھ بھی لکھا ہو اس سے نہ اُن کے عقیدے کے بارے میں کسی وسوسے کی ضرورت ہے اور نہ ندوے سے اُن کے ذمہ دارانہ تعلق کی بنا پر ندوے کے لئے کسی پریشانی کی۔ لیکن اسکے برعکس تبصرہ نگار نے زیرِ تبصرہ کتاب اور اسکے مصنف کے خیالات میں جو عیب محسوس کرکے اپنے قارئین کو بتائے تھے اُن سے بیزاری اور اُن کی تردید و تنقید مولانا نے اپنے اسی مضمون میں ضروری خیال فرمائی اور ایسا انداز اس ضرورت کی ادائیگی کیلئے اختیار فرمایا جیسے کسی بدعقیدگی کی تردید اور اسکے مقابلے میں صحیح عقیدے کا بیان کیا جا رہا ہو۔ اور اس میں بھی کہا جا سکتا تھا کہ کوئی مضائقہ نہیں، ایک انداز بیان ہی تو ہے۔ مگر بے ادبی کی معافی چاہتے ہوئے یہ عرض کرنا ناگزیر ہے کہ مضمون کے اس حصے میں حضرت مولانا نے بھی کتاب اور اسکے مصنفؒ کے فکر سے اختلاف فرمانے میں اس حد تک غلو کو راہ دیدی ہے کہ اُن کے ارشادات اسلامی آداب سے بھی ٹکرائے ہیں اور اسلامی عقیدے سے بھی (اسے آپ اہلِ سنت کا ادب اور اہلِ سنت کا عقیدہ بھی کہہ سکتے ہیں)

مولانا کے ارشادات پر ایک نظر

اہلِ سنت کیلئے تو ننگ ابتک اتفاق ہی رہا ہے کہ خلافت راشدہ کا دور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ختم ہو گیا لیکن کیا اس موقف کو بیان کرنے میں اہلِ سنت نے یہ کہنا بھی ضروری یا صحیح سمجھا ہے کہ

---

[1] مکتوب بنام چودھری غلام علی صاحب مورخہ ۱۲ ربیع الاول ۱۴۱۲ھ

"حضرت معاویہؓ کی حکومت خلافتِ راشدہ نہیں تھی"۔ اس راقم کے اور حضرت مولانا کے علم کا کیا مقابلہ! وہ اُن کے خوشہ چینیوں کی صف میں ہے لیکن جب یہ کہنے سے کہ خلافت راشدہ کا دور حضرت علیؓ پر ختم ہوگیا حضرت معاویہ کا دورِ خلافت آپ سے آپ خلافتِ راشدہ کے زمرے سے نکل جاتا ہے تو پھر صراحتہً یہ بھی کہنا کہ "اُن کی حکومت خلافتِ راشدہ نہیں تھی"۔ کیونکر ایک صحابیؓ کی محض تنقیص نہ سمجھی جائے گی؟ اور کیونکر اس پیرایۂ بیان کو مذاقِ اہلِ سنت کے مطابق سمجھا جا سکے گا؟ مزید برآں جب اس سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ کی تحقیق کا حوالہ دیا جائے گا۔ جیسا کہ دیا گیا ہے تو پھر اس حقیقت کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے تو خلافتِ راشدہ کے معیاری دور کو (جسے وہ "خلافت خاصہ منتظمہ" کہتے ہیں) حضرت عثمانؓ پر ختم کر دیا ہے۔ اور اُس کے بعد حضرت علی اور حضرت معاویہ کا تقابلاً ذکر کرکے جو کچھ لکھا ہے، اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ اُس معیاری خلافت کے بعض اوصاف ان میں سے ایک میں تھے۔ اور بعض دوسرے میں۔ تمام ضروری اوصاف کا جامع ان دونوں میں سے کوئی نہیں تھا۔ ایک میں سابقیت اسلام کے فضائل اور سابقین اوّلین والا مزاج اور مذاق تھا۔ جو خلافت خاصہ کیلئے شرط ہے۔ دوسرے میں قیادت اور نظم مملکت کے لئے مطلوب اوصاف تھے، جو "خلافتِ منتظمہ" کی شرط ہیں ـــ ازالۃ الخفاء حصہ اول کی فصل پنجم میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

باید دانست کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم	جاننا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
در احادیثِ متواتر بالمعنیٰ افادہ فرمودند	چند در چند ایسی حدیثوں میں جو کہ معناً متواتر
کہ حضرت عثمان مقتول خواہد شد و نزدیک	ہیں ارشاد فرمایا تھا کہ حضرت عثمان شہید
بقتلِ او فتنۂ عظیمہ خواہد برخاست کہ	ہونگے اور اُنکی شہادت کے دنوں میں ایسا
تغیرِ اوضاع و رسومِ مردم کند و بلائے	عظیم فتنہ برپا ہوگا کہ لوگوں کے احوال و عادات
آن منتظر باشد زمانے کہ پیش از آن	بدل ڈالے گا۔ اور اسکی مصیبت ہمہ گیر ہوگی۔
فتنہ است آنرا باوصافِ مدح ستودند	نیز آپؐ نے اس فتنے سے پہلے کے زمانے کو
و ما بعد آنرا باصنافِ ذم نکوہیدند۔	اچھے الفاظ سے یاد فرمایا اور اُس سے

واستقصاء نمودند در بیانِ آں فتنہ
تا آنکہ مطابقتِ موصوف برآنچہ واقع
شد بر ہیچ خردے مخفی نماند و بالغ بیان
واضح ساختند کہ انتظام خلافتِ خاصّہ
بآں فتنہ منقطع خواہد شد و برکاتِ ایّام
نبوت رویٔ باختفا خواہد آورد و ایں
معنیٰ را تا بحدّے ایضاح کردند کہ پردہ
از روئے کار برخاست و حجۃ اللہ ثبوت
آں خبر در خارج متحقق گشت بآں وجہ
کہ حضرت مرتضیٰ با وجود رسوخِ قدم
در سوابق اسلامیہ در خورِ اوصافِ
خلافت خاصّہ و انعقاد بیعت برائے
او و وجوب انقیاد رعیت فی حکم اللہ
بنسبت او متمکن نہ شد در خلافت و در
اقطار ارض حکم او نافذ نہ گشت و تمامہ
مسلمین تحتِ حکم او سر فرو دنیا وردند و جہاد
در زمان وے رضی اللہ عنہ بالکلیہ منقطع
شد و افتراقِ کلمۂ مسلمین بظہور پیوست
و انبساطِ ایشاں رخت بعدم کشید و
مردم بحروب عظیمہ با ویش آمدند و دستِ
او را از تصرف ملک کوتاہ ساختند

یں ے زمانے کو مذموم بتایا۔ اور اس فتنے کے
بیان میں اسقدر وضاحت فرمائی اور اس کا
کوئی پہلو بیان سے نہ چھوڑا تاکہ کسی شخص کو بھی
اُسکے بارے میں اشتباہ کا موقع نہ رہے۔ نیز
نہایت صریح الفاظ میں فرمایا کہ اس فتنے
کی آمد سے خلافت خاصہ (راشدہ) کا
نظام درہم برہم ہوگا اور زمانۂ نبوت
کی برکتیں (جن کا اِس دور میں بھی سلسلہ
قائم تھا) اُٹھ جائیں گی ـــ یہ بات
آپ نے اسقدر وضاحت سے فرمائی کہ
معاملے کا کوئی پہلو مخفی نہ رہا اور پھر آپ کی
اس خبر کے خارج میں مطابق واقعہ ثابت
ہونے سے اللہ کی حجّت (آپ کی صداقت
پر) قائم ہوگئی بایں طور کہ حضرت علی مرتضیٰ
میں باوجود اسکے کہ خلافتِ خاصہ کے
بھرپور اوصاف پائے جاتے تھے اور سابقیت
اسلام والے فضائل میں آپ کا پایہ بہت
اونچا تھا۔ اور آپ کیلئے بیعت کا انعقاد
اور رعیت پہ آپ کی اطاعت کا وجوب
بھی ہوا اگر آپ کی خلافت مضبوطی سے
قائم نہ ہوسکی۔ آپ کا حکم پوری مملکت

وہر روز دائرۂ سلطنت ایشاں بعد تحکیم
تنگ تر شدن گرفت تا آنکہ در آخر بجز
کوفہ و نواحی آں برائے ایشاں صافی
نماند و ہر چند ایں خللہا در صفات
کاملۂ نفسانیۂ ایشاں خللے نینداخت
لیکن مقاصد خلافت علیٰ وجہہا متحقق
نگشت و بعد حضرت مرتضیٰ چوں معاویہ
بن ابی سفیان متمکن شد و اتفاق
ناس بر وے بحصول پیوست
و فرقت جماعۂ مسلمین از میان
برخاست و رسم سوابق اسلامیہ
نداشت و لوازم خلافت خاصہ
در وے متحقق نبود و بعد از او
بادشاہان دیگر از ہر کنج حتیٰ دور تر
از قسم [illegible] لا یخفی اینست خبر آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم بانقطاع خلافتِ
خاصہ منتظمہ نافذہ ازیں جہت
متحقق گشت۔[2]

میں نافذ ہوا اس کے سب مسلمانوں نے آپ
کے حکم کے آگے سر نہیں جھکایا، آپ کے زمانے
میں جہاد بالکل منقطع ہو گیا مسلمانوں میں
افتراق رونما ہوا اور اتحاد راہیِ عدم،
لوگوں نے بڑی بڑی جنگوں کی شکل میں آپ کا
مقابلہ کیا، اور آپ کا دائرۂ سلطنت
ہر روز، خاص کر تحکیم[1] کے بعد تنگ سے
تنگ تر ہوتا گیا حتیٰ کہ سوائے کوفہ اور
اسکے اردگرد کے اور کوئی حصۂ سلطنت
آپ کے لئے صافی نہ رہ گیا۔

ہر چند کہ ان باتوں سے آپ کے ذاتی
صفات اور کمالات پر کوئی حرف نہیں
آتا لیکن خلافت کے مقاصد بہر حال
اچھی طرح پورے نہ ہو پائے اور پھر حضرت
مرتضیٰ کے بعد جب معاویہ بن ابی سفیان
تختِ خلافت پر متمکن ہوئے اور اُن پر
لوگوں کا اتفاق ہوا اور اُمت مسلمہ کا تفرقہ
مٹ گیا انکی سیرت میں رسم سوابق اسلامیہ کے

---

[1] "تحکیم" سے اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے جس میں حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان صفین کی جنگ اس قرار داد پر رُک گئی کہ دو پنچ (حَکَم) فیصلہ کریں گے۔

[2] ازالۃ الخفاء ج ۲ اول ص ۱۳۳-۱۳۲ (مطبع صدیقی بریلی)

حامل نہ تھے اور خلافت خاصہ کے خصوصی
شرائط ان میں نہ پائے جاتے تھے: انکے بعد
جو دوسرے بادشاہ آئے وہ جیسا کہ معلوم
ہے مرکزِ حق سے دور تر ہوتے گئے، پس اس
طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ خبر
جو آپ نے خلافت خاصہ منتظمہ و نافذہ کے
(حضرت عثمان کے ساتھ) منقطع ہوجانے کی
دی تھی وہ حقیقت واقعی بن گئی۔

اور مان لیا جائے کہ بے ضرورت یہ کہنا بھی مذاقِ اہلِ سنت کے اعتبار سے روا ہے کہ حضرت معاویہؓ خلیفہ راشد نہیں تھے[1] تب بھی یہ کوئی عقیدے سے تعلق رکھنے والی چیز تو بہر حال نہیں ہوسکتی۔ پھر حضرت مولانا نے جو اسکو اس طرح اپنے مضمون میں درج فرمایا ہے کہ ایک عام آدمی اسے عدالتِ صحابہ جیسا واجب الاعتقاد معاملہ سمجھ لے اور اپنے عقیدے کا جزو بنانے پر مجبور ہو یہ تو اُن کیلئے نظرثانی فرمانے والی بات ہے۔

اسی طرح یزید بن معاویہؓ کے بارے میں "گروہِ اہلِ سنت" کا جو موقف مولانا نے بیان فرمایا ہے اس میں بھی سب سے پہلے نمبر پر محسوس ہونے والی بات یہی ہے کہ اسے جس طرح اور جس سیاق و سباق میں بیان فرمایا گیا ہے وہ اُسے ایک عامی آدمی کی نظر میں ایک عقیدے کی چیز بناتا ہے یعنی یہ کہ جیسے ایک سُنّی مسلمان کو یزید کی بُرائی پر عقیدہ رکھنا لازم ہے۔ حالانکہ مولانا جب "گروہِ اہلِ سنت" کے اس موقف کو "معتبر تاریخ و سیر کی روشنی" پر مبنی قرار دیتے ہیں تو کوئی سوال ہی نہیں رہتا کہ یہ عقیدے کی چیز بنے۔ اور ہر آدمی کا حق ہی نہیں بلکہ یہ اُس کا دینی اور اخلاقی فرض نہ ٹھہرے کہ وہ یزید بن معاویہؓ کو ویسا سمجھے جیسے کہ وہ انکے اپنے

[1] ایسے کچھ الفاظ کا حوالہ شاہ ولی اللہ صاحب کے یہاں بھی دیا جاسکتا ہے مگر ان کے یہاں موقع و محل میں صاف طور سے ضرورت پائی جاتی ہے اسے بے ضرورت نہیں کہا جاسکتا۔

(یا علم تاریخ کے اعتبار سے آپکے کسی معتمد کے) مطالعۂ تاریخ و سیر کی روشنی میں نظر آتے ہوں۔ ورنہ اس معاملے میں اندھی تقلید مزاجاً اُسی طرح کی تقلید ہوگی جیسی تقلید کو قرآن مجید میں بایں الفاظ ذکر کیا گیا ہے کہ اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَاءَنَا عَلٰی اُمَّۃٍ وَّاِنَّا عَلٰی اٰثَارِھِمْ مُّقْتَدُوْنَ ○ (۲۳/۴۳) (ہم نے اپنے باپ داد اکو ایک طریقے پر پایا تھا اور ہم انھیں کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں)

مزید برآں اِس ذیل میں حضرت مولانا نے شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کا جو حوالہ اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہی رائے اُن کی ہے۔ اور یہ کہ انھوں نے سخت الفاظ میں یزید کی مذمّت کی ہے۔ سو یہ نہایت حیران کن ہے۔ فتاویٰ ابن تیمیہؒ جلد ۴ ص۴۸۵ جس کا حوالہ اس سلسلے میں دیا گیا ہے۔ ہمیں کہیں اس میں سخت مذمّت کے الفاظ نہیں مل سکے۔ اور یہ تلاش ہم نے اس بنا پر کی کہ یزید بن معاویہؓ سے متعلق امام ابن تیمیہؒ کا سب سے زیادہ مفصل اور بسوط اظہار خیال اُن کی معرکۃ الآراکتاب منہاج السنّہ میں پایا جاتا ہے، جسے راقم نے اپنی کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" کی تصنیف کے زمانے میں اچھی طرح پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ اور اُس مطالعے کی رو سے مولانا کا یہ بیان بہت چونکانے والا تھا کہ ابن تیمیہؒ نے کہیں یزید کی سخت الفاظ میں مذمّت بھی کی ہے۔ اور یہ کہ وہ بھی اُنھیں علمائے اہلِ سنت کے ہم خیال ہیں جو یزید بن معاویہؓ کو صرف برائی سے یاد کئے جانے کا مستحق جانتے ہیں۔ فتاویٰ کی جلد ۴ کا ص۴۸۵ اس جلد کے ۸ صفحوں کی اُس پوری بحث (فصل) کا ایک صفحہ ہے جس میں یزید ہی کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے نہ اس صفحے میں اور نہ ہی کسی اور صفحے میں ایسے الفاظ ملتے ہیں جن کو سخت مذمّت کے الفاظ سے تعبیر کیا جاسکے۔ اسکے برعکس بالکل منہاج السنّہ کے اس بیان کے مطابق جس کو راقم نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے اس میں بھی دونوں انتہا پسندیوں سے اختلاف کرکے (جن میں سے ایک کے مطابق یزید ولی کامل تھے اور دوسرے کے مطابق مجسّم شیطان) اعتدال پسندی کی حمایت کی ہے۔ بلکہ اس ذیل میں انکے یہ الفاظ یاد رکھنے کے ہیں کہ:-

وبلغنی ایضًا انّ جدّنا ابا عبداللہ بن تیمیہ سئل عن یزید فقال:	اور مجھے یہ بات بھی پہنچی ہے کہ ہمارے اجداد میں سے ابوعبداللہ بن تیمیہؒ سے یزید کے بارے میں

لا تنقص ولا تزید. وھٰذا اعدل الاقوال فیہ وفی امثالہ واحسنھا.	پوچھا گیا تو آپ نے جواب دیا کہ انھیں نہ گھٹاؤ نہ بڑھاؤ۔ اور یہ (میرے نزدیک) یزید بن معاویہؓ اور اُن جیسے دوسرے لوگوں کے سلسلے میں سب سے بہتر اور سب سے متوازن بات ہے
(فتاویٰ ج ۴ صـ۴۸۳)	

واقعہ میں اور حضرت مولانا کے بیان میں اتنا بڑا اختلاف دیکھ کر ہمارے نزدیک یہ بات یقینی سی ہوئی جاتی ہے کہ مولانا اپنے مضامین اور تصانیف کی تسوید میں مواد تلاش کرنے اور حوالے نکالنے کا کام جن حضرات سے لیتے ہیں (اور یہ ہمیں معلوم ہے کہ ایک عرصے سے مولانا کا معمول ہے۔) یہ چوک اُن میں سے کسی کی نظر کی ہے۔ اور اس طرح کی چوک کی کئی ایک مثالیں مولانا کی کتاب "المرتضیٰ" میں ہماری نظر سے گزری ہیں۔ ورنہ مولانا سے ایسے خلاف واقعہ بیان کا تو تصور ہی کیا، ایسی چوک کا بھی تصور آسان نہیں۔ مولانا نے فتاویٰ کی یہ فصل اگر خود ملاحظہ فرمائی ہوتی تو مزید یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس چیز کو کیسے نظر انداز فرما سکتے تھے۔ شیخ الاسلام نے اس فصل کا آغاز یزید کے بارے میں جس انتہا پسندی کے بیان سے کیا ہے وہ بعینہٖ وہی نقطۂ نظر ہے جسے تعمیر حیات کے تبصرہ نگار نے واقعۂ کربلا کا حقیقی پس منظر بتایا تھا یعنی غزوۂ بدر کے وقت سے چلا آرہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بنو امیہ کا انتقامی جذبہ جس کی آگ یزید کے سینے میں بھی بھڑک رہی تھی۔ شیخ الاسلام نے اس انتہا پسندی کا بیان کرکے فرمایا کہ:۔

وھذا القول سھل علی الرافضۃ الذین یکفرون ابابکر وعمر وعثمان فتکفیر یزید اسھل بکثیر۔	اور یہ قول رافضیوں کیلئے بلا شبہ آسان ہے جو کہ ابوبکر و عمر اور عثمان کی تکفیر کیا کرتے ہیں پھر یزید کی تکفیر تو اس سے کہیں زیادہ آسان ہے۔
(صـ۴۸۲)	

اسکے بعد مولانا نے جو تیسری بات فرمائی وہ اس سے بھی زیادہ حیران کن اور پریشان کن ہے فرمایا کہ:

"اسکے نتیجے میں اور اس پس منظر میں (یعنی یزید کے بارے میں جو گروہ اہل سنت" کی رائے ہے اسکے نتیجے اور پس منظر میں۔ ع) محققین اہل سنت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام کو

عزیمت سمجھتے ہیں جو انھوں نے یزید کے معاملے اور مقابلے میں اختیار کیا اور اُن کو برسرِ صواب، شہید راہِ حق اور اُمت کیلئے ایک نمونہ پیش کرنے والا باور کرتے ہیں۔

اگر ایک جمی جمائی حکومت کے خلاف جس کا حاکم و فرماں روا مسلمان ہو، لیکن اُسکی سیرت غیر اسلامی، اسکے اخلاق و عادات قابلِ تنقید ہوں اور اس سے مسلمانوں کے اخلاق اور اسلامی معاشرے پر برے اثرات پڑنے کا اندیشہ ہو کسی قسم کا اقدام خروج و بغاوت اور انتشار انگیزی کے مرادف قرار دیا جائے تو پھر خاندانِ سادات ہی کے ان تین صاحبِ عزیمت افراد، زید شہید، محمد ذو النفس الزکیہ اور اُنکے بھائی ابراہیم بن عبد اللہ المحض کے متعلق کیا رائے قائم کی جائے گی جن میں سے اوّل الذکر نے اموی خلیفہ ہشام بن عبد الملک بن مروان اور دو آخر الذکر حضرات نے خلیفہ منصور عباسی کے مقابلے میں علم جہاد بلند کیا جو بہرحال یزید سے غنیمت اور کہیں بہتر تھے۔"

یزید سے متعلق حضرت مولانا کے ارشادات، جن کا تذکرہ ابھی گزرا، اور حضرت حسینؓ کے اقدام بمقابلہ یزید سے متعلق یہ اقتباس سامنے آجانے کے بعد راقم کے ظاہر کردہ اس خیال کے حقیقت ہونے میں غالباً کسی شبہے کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ حضرت مولانا نے اپنے مضمون میں تعمیر حیات کے تبصرہ نگار کے عقائد کی طرف سے صفائی دینے کے بعد ان چیزوں کی تردید کی طرف توجہ فرمائی ہے جو تبصرہ نگار نے زیرِ تبصرہ کتاب "واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر" کی طرف بطور عیب منسوب کی تھیں۔

ہر چند کہ حضرت مولانا کی یہ توجہ تردید کے انداز میں ہے اور اس لئے کوئی مسرت کی بات نہیں۔ تاہم اہمیت کی بات ضرور ہے کہ ایک کتاب کسی بھی انداز میں سہی اس قدر توجہ کی مستحق مولانا کی نظر میں قرار پائے لیکن افسوس (اور سخت پریشانی) ہے کہ حضرت مولانا کی اس توجہ نے ہمیں بڑی سخت آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ تبصرہ نگار نے اولاً اپنے تبصرے کے ذریعہ اور ثانیاً اپنی "وضاحت" کے ذریعے اپنے آپ کو جس سطح کا ثابت کیا اسکی بنا پر ہمیں اُن سے کوئی شکایت نہیں تھی کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام (بمقابلہ یزید) کے بارے میں جو بات کتاب کے مصنف نے نہیں بلکہ اس وقت کے بعض صحابۂ کرام

نے فرمائی یا بعد میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اپنے انداز سے کہی (مصنف اسے صرف نقل کرنے کا گنہگار ہے) اسکے بارے میں تزلہ غریب مصنف پر کیوں گرایا گیا؟ اگر نقل کرنا بھی گناہ تھا تو اصل کہنے والے کے "گناہ" سے تو بہرحال کم ہی ہونا چاہیئے تھا. لیکن ہم حیران ہیں کہ مولانا نے بھی اپنے لئے وہی بات جائز سمجھی! بلکہ اُس سے بھی کچھ آگے کی بات کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا نام وہ اس سے پہلے یزید کی بات گفتگو میں اس طور سے لے آئے ہیں جس سے لازمی طور پر تأثر ہوتا ہے کہ کم از کم ابن تیمیہ اُن لوگوں میں نہیں ہوسکتے جنھوں نے حضرت حسینؓ کے اقدام کے بارے میں حضرت مولانا کے بیان کردہ مسلک اہلِ سنت سے کچھ مختلف رائے ظاہر کی ہو۔ اور یہ بات اصل حقیقت اور واقعے سے کتنی دور ہے' اسے ہر وہ شخص خود معلوم کرسکتا ہے جو شیخ کی کتاب منہاج السنہ جلد دوم کے صفحات ۳۲۲ تا ۳۲۵ کا مطالعہ کرسکے. یا اس کے اقتباسات کے سلسلے میں راقم کی کتاب پر اعتماد کرسکے۔

دوسری بات اس سلسلے میں ہماری پریشانی کی یہ ہے کہ کیسے یہ کہنے سے باز رہیں کہ حضرت مولانا کے مذکورہ بالا اقتباس سے جو اُن کا یہ موقف ظاہر ہوتا ہے کہ ائمۂ وقت اور حکومتِ وقت (یعنی مسلم حکومت وقت) کے خلاف اقدامِ خروج کرنے والے حضرات اگر "خاندان سادات" سے ہوں تو اُن کے خروج کو "خروج" نہیں کہا جاسکتا، سو یہ موقف تو جبھی قابلِ قبول ہوسکتا ہے جبکہ ہم خاندانِ سادات سے متعلق رکھنے والے حضرات کو نہ صرف معزز و محترم ہی مانیں بلکہ شیعہ حضرات کے بارہ معصومین کے مقابلے میں ان سب ہی کو بلا تحدید معصوم مان لیں یا کم از کم قانون سے بالاتر۔ ورنہ یہ تو حضرت مولانا پر بھی مخفی نہیں ہوسکتا کہ اس مقابلے کا قانون جسے اہلِ سنت نے غیر معمولی اہمیت کا حامل قرار دے کر قانونِ عقائد کے زمرے میں شامل کر دیا ہے وہ تو بلا کسی استثناء کے ہم سے یہ اقرار کراتا ہے کہ:۔

ولا نرى الخروج على أئمتنا وولاة	اور (یہ کہ) ہم اپنے ائمہ اور حکام کے خلاف
أمورنا، وإن جاروا، ولا ندعوا	خروج (مسلح اقدام) کو جائز نہیں جانتے اگرچہ
عليهم ولا ننزع يداً من طاعتهم	وہ ظلم یا انحراف کریں، اور ہم ان کیلئے بددعا
ونرى طاعتهم من طاعة الله عزوجل	بھی نہیں کرتے۔ نہ انکی اطاعت سے دستکشی جائز

فریضۃً، مالم یأمروا بمعصیۃٍ، وندعوا لھم بالصلاح والمعافاۃ۔[1]

رکھتے ہیں۔ بلکہ انکی طاعت کو اللہ عزّوجل کی طاعت کے قبیل سے فریضہ جانتے ہیں جب تک وہ اللہ کی نافرمانی کا حکم نہ دیں اور ان کیلئے صلاح و فلاح کی دعا کرتے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ مولانا کا موقف فی الواقع وہ نہیں ہوسکتا جو اُن کے الفاظ "تو پھر خاندانِ سادات ہی کے اِن تین صاحب عزیمت افراد الخ ..." سے ظاہر ہو رہا ہے اور جو ایک نہیں کئی ایک سنّی عقیدوں سے ٹکرا رہا ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ اس بارے میں وضاحت فرمادی جائے۔ اور اسی ضمن میں ذرا اس پر بھی غور کر لیا جائے کہ ایک مسلم حکومتِ وقت کے خلاف اقدام ہر حالت میں "خروج" ہوتا ہو[2] یا نہ ہوتا ہو، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام کو صحیح اور صواب سے بھی آگے بڑھا کر جب "امّت کیلئے ایک نمونہ عمل" یا ورثہ کئے جانے کو بھی کہا جائے گا تو لازمًا یہ سوال پیدا ہوگا کہ آپ کے عمل کے کون سے حصے کو اُمّت اپنے لئے نمونہ سمجھے۔ ابتدائی حصہ جس میں اقدام نظر آتا ہے۔ یا انتہائی حصہ جس میں اقدام سے دستکشی ہے اور ٹکراؤ سے بچنے کی ہر ممکن سعی؟

شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ (اور حضرت نانوتویؒ) کا مسلک

حضرت معاویہؓ، یزید بن معاویہؓ اور حضرت حسینؓ کے سلسلے میں محقق و معتبر علماءِ اہلِ سنت کی بات چلی ہے تو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے مسلک اور اُن کے اُن مکتوبات پر بھی کچھ ضروری گفتگو یہیں ہوجانی چاہئے جنکے پیچھے تعمیر حیات کے تبصرہ نگار نے چھپنے کی اور ہمارے لئے اُن کے حوالے سے مسئلہ پیدا کرنے کی کچھ ایسی ہی کوشش کی جیسے ایک ڈوبنے والے کے ذکر میں قرآن پاک کے اندر آتا ہے کہ حَتّٰی اِذَا اَدْرَکَہُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا الَّذِیْ اٰمَنَتْ بِہٖ بَنُوْا اِسْرَآئِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (یہاں تک کہ جب وہ ڈوبنے ہی لگا تو بولا کہ میں ایمان لاتا ہوں کہ وہی اللہ معبود برحق ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان

---

[1] عقیدۂ طحاویہ کی دفعہ ۷۲۔ شرح العقیدۃ الطحاویہ۔ مطبوعہ المکتب الاسلامی دمشق و بیروت ص ۴۲۸

[2] جیسا کہ عقیدۂ طحاویہ کے اقتباس بالا میں نظر آتا ہے۔ یا امام ابن تیمیہ وغیرہ کہتے ہیں اس ضمن میں ازالۃ الخفاء کے

رکھتے ہیں۔ (سورہ ۱۰ آیت ۹۰)

اللہ کی شان تو دیکھئے کہ جہاں ہمیشہ سے امام ابن تیمیہؒ کی "شیخ الاسلامی" چلتی آرہی تھی۔ اور انھیں کی بات بالا و برتر رہا کرتی تھی وہاں ایک دم سے حالات نے تحویل قبلہ کی ضرورت پیدا کی تو یہ شیخ الاسلامی ہمارے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے سر کی زینت بن گئی جن کی ہم نے وہاں کبھی کم از کم اس درجے کی پوچھ تاچھ تو نہ دیکھی تھی کہ شیخ الاسلام کے لقب سے نام لیا جائے حضرت مدنیؒ کے مکتوبات جو "مکتوبات شیخ الاسلام" کے نام سے چار جلدوں میں چھپے ہیں، اُن کی پہلی جلد میں مکتوب ۸۸ اور ۸۹ حضرت کے ایک مسترشد مولانا ابوالحسن حیدری غازی پوری کے ایک سوال کے جواب میں ہیں۔ مکتوبات کے مرتب نے مکتوب ۸۸ کے حاشیے پر اس سوال کا خلاصہ جس کے جواب میں مکتوب لکھا گیا ہے ان الفاظ میں درج کیا ہے کہ "حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ فعل کیا غیر مستحسن نہیں ہے کہ انھوں نے یزید جیسے فاسق و فاجر کو خلافت کیلئے نامزد کیا؟" اسکے جواب میں حضرتؒ مدنی کے دس صفحے کے اس مکتوب میں تبصرہ نگار کے مسلک کے برعکس ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ حضرتؒ نے کیسی کیسی کوشش حضرت معاویہؓ کے دامن کو اس الزام سے پاک دکھانے کی نہیں کی ہے۔ انگریزی محاورے کے مطابق "کوئی پتھر اس کوشش میں اُلٹے بغیر نہیں چھوڑا ہے"۔ جتنی بھی ممکن صورتیں حضرت معاویہ کو یزید کی نامزدگی کے سلسلے میں کسی الزام سے بچانے کی سوچی جا سکتی تھیں خواہ وہ عقل و عادت کے اعتبار سے بعید تر ہی کیوں نہ ہوں وہ سب حضرت کے قلم سے یکے بعد دیگرے اس کوشش میں نکلتی چلی آئی ہیں تاکہ کسی بھی طرح معترض کے ذہن کو اس معاملے میں مطمئن کر دیں جناب سائل مطمئن نہیں ہوئے اور دوسرا خط لکھتے ہیں۔ جسکے مضمون کی بابت مرتب نے کوئی فٹ نوٹ نہیں دیا ہے مگر جواب سے پتہ چلتا ہے کہ اس دفعہ انھوں نے مزید یہ اشکال بھی سامنے رکھ دیا کہ اگر یزید بن معاویہؓ کی نامزدگی کو غلط نہیں مانا جاتا اور وہ اس طرح خلافت پاکر شرعاً قابل قبول خلیفہ بن گئے تو پھر اُن کے خلاف حضرت حسینؓ کے اقدام کو کیا کہا جائے گا؟ وہ تو اُس خروج اور بغاوت کے حکم میں آجائے گا جس کی شریعت میں اجازت نہیں، اس دوسرے خط کے جواب میں حضرت مدنیؒ نے ۲۲ صفحے کا والا نامہ تحریر فرمایا۔ وہ مکتوب ۸۹ ہے جس کے ابتدائی ۱۲ صفحوں میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ

کے ایک طویل مکتوب کا اقتباس ہے[1] جو اتفاق سے ایک ایسے ہی سوال کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

ان دونوں مکاتیب میں دو باتیں قدر مشترک ہیں۔ (۱) حضرت معاویہؓ کو ہر طرح کی قابلِ اعتراض باتوں سے، دلائل کی بنیاد پر بری الذمہ بتانا۔ (۲) یزید کو ویسے ہی فاسق و فاجر ماننا جیسے سائل نے اپنے خط میں فاسق و فاجر ٹھہرایا ہے۔ دوسرے خط میں ایک تیسری چیز بھی آ گئی ہے۔ اور وہ ہے حضرت حسینؓ کے اقدام کو دلائل کی بنیاد پر اعتراضات سے بری قرار دینا۔

تعمیرِ حیات کے تبصرہ نگار نے جو ان دو خطوں کے مضمون کو اپنا عقیدہ بنایا اور اِن بزرگانِ دیوبند کو ایسی غیر معمولی اہمیت دی تو اس میں جہاں تک صحابۂ کرام کے بارے میں اُس بلا امتیاز حسنِ عقیدت اور فدائیت کا تعلق ہے جو اِن دونوں کی اصل روح ہے۔ اسکے بارے میں اپنے دل کی ہم آہنگی کا اظہار کر کے تو تبصرہ نگار صاحب نے سوائے اپنی کمزوری کے اور کسی بات کا ثبوت نہیں دیا۔ اور ایسا لگتا ہے کہ "استسلام" کا جو کہ وہ لفظ انھوں نے بعض اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں بولا تھا وہ اُن پر اُلٹ آیا۔ ورنہ وہ اس معاملے میں بزرگانِ دیوبند کی ہم عقیدگی سے بمراحل دور تھے جیسا کہ الفرقان بابت ماہ جولائی ۱۹۹۲ء میں یہ بات کھل کر سامنے آ چکی ہے۔ البتہ یزید کے فسق و فجور اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام کے بارے میں جو کچھ ان مکاتیب میں نظر آتا ہے اسکی بنا پر اگر انھوں نے سوچا کہ اس سے ان کے موقف کی تائید ہوتی ہے تو ایک سرسری نظر کے تأثر کے طور پر ٹھیک ہی سوچا لیکن ایک گہری نظر میں معاملے کی صورت بالکل مختلف ہو جاتی ہے۔ اور کم از کم حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مکتوب جس کا طویل اقتباس حضرت مدنی کے مکتوب ۸۹ میں دیا گیا ہے وہ تو اُن کی اکثر تحریروں کی طرح معمولی گہری نظر نہیں بلکہ بہت گہری نظر چاہتا ہے بلکہ ہم جیسوں کی تو بار بار کی گہری نظر اور کوشش چاہتا ہے جس کے بعد وہ سمجھ میں آسکے (اہلِ دیوبند جانتے ہیں کہ وہاں صرف بڑے بڑے اساتذہ کا مقام تھا کہ کما حقہ حضرت نانوتوی کے مدّعائے کلام کو سمجھتے تھے اور چھوٹوں کو ضرورت پڑتی تھی کہ اس کلام کو سمجھنے میں اُن سے مدد لیں) اور حضرت حسینؓ اور یزید کے نزاع اور سانحہ کربلا کے سلسلے میں جو کچھ بحث ہے وہ ہے بھی اسی میں، مکتوب ۸۸ میں یہ بحث بالکل نہیں ہے وہاں صرف یزید کو خلافت کیلئے نامزد

---

[1] یہ بارہ صفحے مع ترجمے کے ہیں کیونکہ اصل مکتوب فارسی میں ہے، گویا اصل کے حساب سے کوئی ۶ صفحے کا اقتباس۔

کئے جانے کی بحث ہے۔

راقم السطور نے جب حضرت نانوتوی کے اس اقتباس کو سمجھنے کی کوشش کی جو مکتوبات شیخ الاسلام کے مکتوب ۸۹ میں دیا گیا ہے اور جو فارسی زبان میں ہے تو باوجود اسکے کہ ساتھ میں اس کا اردو ترجمہ بھی دیا ہوا تھا حضرت نانوتوی کا اصل مقصد و مدعا پوری طرح سمجھ میں نہ آسکا۔ اور ضرورت محسوس ہوئی کہ آپ کے جس مکتوب سے یہ اقتباس ہے وہ پورا مکتوب دیکھنے میں آئے، اتفاق سے انہی دنوں میں ماہنامہ "دارالعلوم" دیوبند نے حضرت نانوتوی کے اس پورے مکتوب کا ترجمہ اپنے دو شماروں میں شائع کیا، تو بہت کچھ بات واضح ہوئی۔ پھر بھی نہ صرف یہ کہ احتیاط کا تقاضہ تھا کہ اصل مکتوب (فارسی) سامنے ہو۔ بلکہ ترجمہ جگہ جگہ اس بات کی چغلی بھی کھا رہا تھا کہ مکتوب نگار کی بات پوری طرح مترجم کے قابو میں نہیں آئی ہے۔ اس لئے اصل کے حصول کی کوشش میں مدیر دارالعلوم مولانا حبیب الرحمن قاسمی کو لکھا۔ اور اُن کی عنایت سے اصل کی فوٹو کاپی میسّر آئی۔ اور اسکو پڑھ کر مترجم سے کچھ بہت زیادہ شکایت نہیں رہی کیونکہ واقعی اس مکتوب کو لفظ بلفظ پوری طرح حل کرنا "جوئے شیر" لانے سے کم نہیں ہے۔ اور اسکی زحمت اٹھانے کی ضرورت بھلا لائق تبصرہ نگار کو کیوں محسوس ہونے لگی تھی۔ ورنہ وہ اگر مکتوبات شیخ الاسلام کے اور دیئے گئے اس کے اقتباس میں صرف یہ دیکھ لینا کافی نہ سمجھ لیتے کہ یزید کو پلید لکھا گیا ہے۔ اور پورے اقتباس ہی کو نہیں بلکہ پورا مکتوب حاصل کر کے اسکو سمجھنے کی کوشش کرتے تو یقین ہے کہ صرف مکتوب ۸۸ کا حوالہ دینے پر اکتفا کرتے مکتوب ۸۹ کا ذکر مناسب نہ سمجھتے۔

حضرت نانوتوی کا مکتوب

معلوم ہونا چاہیئے کہ حضرت نانوتوی کا یہ خط آپ کے لائق و فاضل شاگرد حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی کے ایک خط کے جواب میں ہے۔ راقم السطور نے اپنی بساط بھر ہر ممکن کوشش کی مولانا فخر الحسن صاحب کے خط کا متن بھی کہیں دستیاب ہو جاتا۔ جہاں جہاں امکان سمجھا اس بارے میں خطوط لکھے مگر کہیں سے کامیابی نہیں ہوئی۔ اسکی ضرورت اس لئے تھی کہ جواب میں انکے سوال کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ وہ کیا تھا۔ اور

ظاہر ہے کہ سوال معلوم ہو تو جواب کو سمجھنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ تاہم مکتوب کے عنوان سے اور پھر آخری حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فخر الحسن صاحب نے کچھ اس طرح کا سوال بھیجا تھا کہ شیعہ حضرات کہتے ہیں کہ سنّیوں کے عقائد و اصول پر تو سبط رسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کو شہادت بھی نہیں کہا جا سکتا بلکہ (معاذ اللہ) ایک واجب القتل باغی کی موت کہا جائے گا۔ اور پھر اُن اصول و عقائد کا حوالہ بھی بظاہر مولانا فخر الحسن صاحب نے دیا جن کی طرف شیعہ معترضین کا اشارہ تھا۔ چنانچہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے پندرہ صفحے کا یہ پورا مکتوب صرف اسی بات کو ثابت کرنے کیلئے لکھا ہے کہ نہیں، ہمارے اصول و عقائد کی رو سے بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید ہی قرار پائیں گے۔ بلکہ ہاں یہ تمہارے (یعنی شیعہ کے) اصولِ دین ہیں جن کی رو سے ان کو شہید نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ہے حضرت نانوتوی کے پندرہ صفحے کے پورے مکتوب کا مکمل خلاصہ۔

ہمیں رہ رہ کر افسوس ہوتا ہے کہ یہ کیسی محبتِ سبطِ رسول علیہ السلام ہے جو آپ کے حق میں اپنے غالبانہ خیالات ہی پر راضی نہ رہ کر دوسروں کو بھی مجبور کرنا چاہتی ہے کہ وہ اسی کی زبان اس معاملے میں بولیں جس کے نتیجے میں ایسی باتیں بھی کھول کر کہنے کی مجبوری لاحق ہوئی جاتی ہے جنھیں نہ کہنا ہی مناسب تھا۔ پندرہ صفحے کے اس مکتوب گرامی میں اوّلاً پورے دس صفحوں کے طول و عرض میں پندرہ (۱۵) مقدّمے حضرت والا تے یہ کہہ کر قائم فرمائے ہیں کہ:۔

بعد حمد و صلوٰۃ اوّل مقدّمات چندمی نویسم	بعد از حمد و صلوٰۃ اولاً چند مقدّمات لکھتا ہوں
کہ ثبوتِ مدّعا و وضوحِ آں بے آں مقدمات	کیوں کہ ان مقدمات کے بغیر مدّعا کا ثابت ہونا
دشوار است۔	اور واضح ہونا مشکل ہے۔

"عقلمندان را اشارہ کافیست" کے مطابق ذرا غور کرنے کی بات ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی جیسا فاضل بے بدل اور قادر الکلام انسان اہلِ سنت کے اصول کے مطابق حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت ثابت کرنے کیلئے بھی اتنے طولِ عمل کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ ایک دو نہیں پندرہ (۱۵) مقدمے (اور وہ بھی دس صفحوں کے سائز کے) بیان کر کے ثبوتِ مدّعا کی زمین ہموار کرے!

اسکے بعد اور کچھ سننے کی ضرورت تو نہیں رہنی چاہئے لیکن خدا ہی جانے کہ یہ اشارہ کافی ہوا یا نہیں۔ اس لئے مزید یہ بھی سن لیجئے کہ مقدّمات کی بسم اللہ یہاں سے ہوتی ہے:۔

اول آنکہ حضرت امام حسین و دیگر ائمہ اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین نزد اہل سنت مثل دیگر ائمۂ مجتہدین امام و مجتہد اند کہ خطاء اجتہادی از ایشاں ممکن. عقیدۂ ما مثل شیعہ نیست کہ امام را خطا محال و غلطی ازاں ممتنع باشد۔	اوّلاً یہ کہ حضرت امام حسین اور دوسرے ائمہ اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین اہل سنت کے نزدیک دوسرے ائمۂ مجتہدین ہی کی طرح کے امام ہیں کہ اُن سے اجتہادی خطاء ممکن ہے۔ ہمارا عقیدہ شیعہ عقیدہ کی طرح نہیں ہے کہ امام سے خطاء محال اور غلطی ناممکن ہے۔

اور اسکے بعد مزید مقدمات یکے بعد دیگرے قائم کرکے اُن اعتراضات کے سائے سے حضرت حسینؓ کے اقدام کو نکالنے کی کوشش کرتے کرتے جو شیعوں کے کہنے کے مطابق اصول اہلِ سنّت کی رو سے آپ کے اس اقدام (بمقابلۂ یزید) پر عائد ہوتے اور آپ کی شہادت کو شہادت کہے جانے سے بھی روکتے تھے، آخر میں اسی اولین مقدمے کا سہارا لے کر بے تکلّف یہ بھی ماننے کو تیار ہو جاتے ہیں کہ:۔

زیادہ از زیادہ اگر کسے گوید ایں بگوید کہ حضرت امام دریں مسئلہ خطا کردند لیکن چہ حرج، المجتہد یخطئ و یصیب بنائے ثواب بر نیت خطاء اجتہادی دریں بارہ مزاحم حال نمی شود۔	زیادہ سے زیادہ اگر کوئی کہے گا تو یہ کہہ سکے گا کہ حضرت امام نے اس مسئلے میں غلطی کی لیکن اس سے کیا حرج؟ مجتہد غلطی بھی کرتا ہے اور صحیح بھی کرتا ہے۔ ثواب کا مدار نیت پر ہے۔ اجتہادی خطا سے اس میں رکاوٹ نہیں پڑتی۔

اور اسی طرح یہ بھی کہنے میں آپ کو کوئی تأمل نہ ہوا کہ:۔

اگر موجبات جہاد نبودند او شاں	اگر اس اقدام کو جہاد نہیں کہا جا سکتا تھا

نیز از تصدّیٔ جہاد باز آمدہ می خواستند	تو (بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ) آپ
کہ براہِ خود روند. لشکریانِ یزید پلید	ارادۂ جہاد سے باز آکر اپنی راہ چلے جانے
نگزاشتند و محاصرہ کردہ ظلماً شہید	کے خواہاں ہو گئے تھے. مگر یزید پلید کے
ساختند، مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مالہٖ	لشکریوں نے راستہ نہ دیا اور گھیر کر ظالمانہ
وَعِرْضِہٖ فَہُوَ شَہِیْد.	شہید کر دیا. اور (بموجب حدیث) اپنے
	مال اور آبرو کی حفاظت میں مارا جانے
	والا بھی شہید ہے.

اب اسکے بعد اس مکتوب گرامی کی روشنی میں اگر کوئی سوال راقم السطور سے کرنا کسی بھی درجے میں مناسب ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ سوال ہے کہ تم اپنے اِن بزرگوں کے بارے میں کیا کہتے ہو جنھوں نے یزید بن معاویہ کو پلید اور فاسق و فاجر یا جبکہ تم نے اُس پر فسق و فجور کے الزامات میں کلام کیا ہے؟

اس سوال کو بھی صرف اپنے یہاں کے عام مزاج اور مذاق کی بنا پر "مناسب" کہنا پڑا ہے، ورنہ سچ یہ ہے کہ یہ کوئی معقول سوال نہیں ہے. خود ہمارے ہی بزرگوں میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے یزید ہی کے معاملے میں سوال کیا گیا کہ کچھ علماء لعنت جائز رکھتے ہیں اور کچھ منع کرتے ہیں. آپ کا کیا ارشاد ہے؟ آپ نے اس اختلاف کے پیچھے تاریخی روایات کے ردّ و قبول میں علماء کے اختلاف کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا کہ "پس جوازِ لعن و عدمِ جواز کا مدار تاریخ پر ہے"[1] یعنی جس کے نزدیک یزید سے ایسے افعال ثابت ہیں کہ انکی وجہ سے لعنت جائز ہو وہ جواز کا فیصلہ کرتے ہیں جنکے نزدیک ثبوت نہیں ہے وہ منع کرتے ہیں. الغرض یہ لعنت و عدمِ لعنت کا معاملہ ہو یا فسق و فجور کا اس میں کسی کو کسی کی رائے کا پابند نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ متضاد روایتوں کی وجہ سے تاریخی ثبوت میں رایوں کا اختلاف ہو سکتا ہے. ایک آدمی اگر ایمانداری سے اس بات پر مطمئن ہے کہ فلاں شخص کے بارے میں فاسقانہ اعمال کی روایتیں صحیح نہیں ہیں یا قوی نہیں ہیں تو اسکے لئے تو بظاہر شرعاً بھی گنجائش نہیں کہ وہ محض اپنے بزرگوں یا دوسرے اکابر علماء کی پیروی میں اس شخص کے

فسق وفجور کا قائل ہو جائے۔[1] لیکن یہاں تو راقم کے معاملے میں مسئلے کی صورت بھی یہ نہیں ہے کہ ہمارے بزرگوں نے کچھ فرمایا تھا اور ہمیں کچھ اور عرض کرنا پڑ رہا ہے۔ راقم کی کتاب میں یزید کے فاسق و فاجر ہوتے یا نہ ہوتے کے بارے میں ضمناً کوئی بات نہیں کہی گئی۔ جو بات ضمناً کہی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ یزید کی ولی عہدی سے حضرت حسین بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ کے اختلاف کے سلسلے میں جو یہ شہرت ہے کہ یہ اختلاف یزید کے فاسق و فاجر اور بداعمال ہونے کی وجہ سے تھا، اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اور اپنی تلاش و تحقیق کے اس نتیجے کو بہت زور دے کر کیوں کہا گیا تھا کیا یزید کی محبت اور حضرت حسین بن علیؓ کی (معاذ اللہ) عداوت میں؟ جو لوگ اس طرح کی باتیں کر رہے اور پھیلانے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں، انھیں کاش کوئی یاد دلا دے کہ ایک دن مر کر خدا کے یہاں جانا ہے۔ اور ان بے باک الزام تراشیوں کا وہاں جواب دینا ہوگا۔ ورنہ ہر معقول پسند آدمی دیکھے گا کہ اس معاملے میں تلاش و تحقیق کی ساری جد و جہد اگر محض حقیقت واقعہ کی یافت کے علاوہ کسی اور غرض سے بھی کی گئی تھی تو وہ صحابیٔ رسول حضرت معاویہؓ کے اسی دامن کو ہر ممکن جائز حد تک بے داغ دکھانے کی غرض تھی جس کو ولی عہدی کے سلسلے میں ہر الزام سے پاک بتانے کیلئے حضرت نانوتوی اور حضرت مدنی (رحمۃ اللہ علیہما) اپنے ان مکتوبات میں بے چین نظر آتے ہیں۔ خاص کر حضرت مدنیؒ جن کا مکتوب اول ہے ہی اسی سوال پر۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ اگر میری حقیر تلاش و تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے جس یزید کو ولی عہد بنایا تھا وہ فسق و فجور کے اعمال میں مبتلا نہیں پایا جاتا تھا حتیٰ کہ آپ کی وفات تک بھی ایسی کوئی بات نہیں پائی جاتی تھی تو یہ چیز میرے ان بزرگوں کی روحوں کو خوش کرنے کے بجائے الٹی ناخوشی کا باعث کیوں کر ہوگی اور یہ انکے کس عقیدے کے خلاف ہو جائے گا؟ ہاں اُن لوگوں کیلئے یقیناً کچھ خوشی کا باعث ہونے والی نہیں ہے جو یزید کے فسق و فجور پر تو زور دیتے ہیں مگر واقعۂ ولی عہدی کا تذکرہ اپنی کتابوں میں کرتے ہوئے ادنیٰ دلچسپی اس بات میں نہیں دکھاتے کہ ارباب تاریخ کے بیان سے جو چھینٹیں اُڑ کر حضرت معاویہؓ کے دامن پر لگتی ہیں انھیں صاف کیا جائے۔ یا وہ لوگ جو حضرت معاویہؓ

---

[1] یہاں اس ضمن میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ حضرت مدنیؒ نے اپنے بزرگوں کی پیروی کے غیر معمولی ذوق کے باوجود جو ان کی بے حد نمایاں خصوصیت تھی یزید کے ذکر میں کہیں بھی پلید کا لفظ نہیں استعمال فرمایا ہے۔

کے لئے خطاء اجتہادی کا لفظ دس بار بولنے کو تیار ہیں۔ مگر حضرت حسینؓ کیلئے اس کا تصور بھی گناہ سمجھتے ہیں اور اس لئے انھیں ضرورت ہے کہ یزید کا فسق و فجور ہر شک وشبہے سے بالاتر رہے۔

حرفِ آخر

جی چاہتا ہے کہ اب اس قضئے میں مزید کچھ نہ لکھنا پڑے۔ اور یہی سمجھ کر یہ تحریر انشاء اللہ اس سلسلے کا آخری باب ہے۔ بلکہ اسی کوشش میں کہ یہ آخری باب ہی ثابت ہو جائے، چند باتیں مختصراً لکھی ہیں۔

۱۔ جو شخص کتاب (واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر) کا مقدمہ توجہ سے پڑھے گا۔ اسے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں رہے گا کہ کتاب نہ کسی کی تائید میں لکھی گئی ہے نہ تردید میں نہ کسی کی حمایت میں نہ مخالفت میں۔ بلکہ صرف حقیقت اور سچائی کی تلاش میں لکھی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ واقعۂ کربلا کی اور اسکے پس منظر کی وہ واقعی صورت کیا ہے جو اس سلسلے کی تاریخ کے بے لاگ مطالعے میں نظر آتی ہے۔ خود کتاب کا انداز بیان اور انداز بحث بھی اسی بات کا شاہد ہے کہ مصنف کو فریقین میں سے کسی کی بھی تائید و تردید سے ذرّہ برابر دلچسپی نہیں ہے۔ دلچسپی صرف اس بات سے ہے کہ قاری پر سچائی اور حق ظاہر ہو۔ اور یہ اندازِ مطالعہ، اندازِ بیان اور اندازِ بحث اس نظریے کے ماتحت اختیار کیا گیا ہے کہ لوگ حقیقتوں اور سچائیوں کو بغیر جذباتی مداخلت کے انکی اصل شکل میں دیکھنے کے خوگر ہوں جسکے بغیر ہم موجودہ پسماندگی سے اوپر نہیں اٹھ سکتے۔

۲۔ جن لوگوں نے ۔۔ کتاب کے خلاف شور مچایا ہے کہ یہ حضرت حسینؓ کی مخالفت وعداوت اور قاتل حسینؓ یزید کی نصرت وحمایت میں لکھی گئی ہے۔ وہ اگر اللہ سے ڈرتے ہیں تو انھیں سوچنا چاہیئے کہ کسی مسلمان کے بارے میں ایسی ایمان سوزنیت کے الزام کا کوئی ثبوت وہ اللہ کی عدالت میں پیش کر سکیں گے؟ اور خاص کر ایسی صورت میں کہ یزید کے بارے میں تو کئی حضرات نے متعین طور سے کتاب کے الفاظ بتا کر یا انکی طرف واضح اشارہ کر کے (جیسا کہ الفرقان کی ڈاک میں ناظرینِ الفرقان دیکھ چکے ہونگے) اہانت یا ناانصافی کی شکایت کی ہے۔ مگر حضرت حسینؓ کے بارے میں کوئی ایک شخص نہیں پوچھنے کے باوجود ایک لفظ یا ایک جملہ کتاب میں حضرت حسینؓ کی اہانت وعداوت کا مظہر نہ بتا سکا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جو کتاب لکھی ہی کسی کی مخالفت میں گئی ہو اس کے

کسی ایک لفظ میں بھی اس جذبے کا اظہار نہ ہو؟

۳۔ ابتک کوئی معترض یہ نہیں بتا سکا کہ کتاب میں کونسی بات کہاں پر غلط لکھی ہوئی ہے کہاں تاریخی دیانت اور امانت کی خلاف ورزی کی گئی ہے؟ تمام معترضانہ باتوں کا حاصل صرف یہ نکلتا ہے کہ کربلا کے قصے میں فریقین کی جو تصویر ذہنوں میں بنی ہوئی تھی، اس کتاب نے اُس تصویر میں فرق ڈالا ہے۔ یا یہ کہ بزرگوں کی جو رائے یزید کے بارے میں عام طور سے چلی آرہی تھی اُسکی صحت مشکوک ہو گئی۔ مگر کم از کم اہل علم کے لحاظ سے تو ان میں کی کوئی بات پریشان ہونے کی نہیں ہے۔ تاریخ کا فن تو جغرافیہ اور علم ہیئت کی طرح کا ہے، جن میں روز نئی نئی دریافتیں سامنے آتی ہیں۔ اور آتی رہیں گی۔ اس سے ہمارے اُن بزرگوں کی کوئی توہین نہیں ہوتی جو ان باتوں کو مانتے ہوئے قبروں میں چلے گئے جن کا قول آج مضحکہ خیز ہے۔ مثلاً زمین کے بجائے سورج کا متحرک ہونا۔ یا بقول حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کے اس (فن تاریخ) کی مثال ایک منہدم قصر کی ہے جو کھنڈر کی شکل میں ہو[1]۔ اسکے آگے مولانا نے فرمایا کہ "اسکے ملبہ کے نیچے سے وہ سب کچھ نکل سکتا ہے جس کی کسی طالب صادق یا جویائے حق کو ضرورت پڑ سکتی ہے[2]"۔ راقم اسکی جگہ یہ کہنا پسند کرے گا کہ ڈھونڈنے والے سلامت' اس ملبے کے نیچے سے تو روز نئی چیزیں نکل کے آویں گی۔ ان سے ڈرنے اور گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ہمت افزائی کی ضرورت ہے۔ اور اگر یہ چیز ڈرنے ہی کی ہے کہ اس سے عقیدے خراب ہوں گے۔ جیسے کلیسا کا عقیدہ زمین کے گھومنے کی خبر سے پریشانی میں پڑ گیا تھا۔ تو پھر شرعی حکم جاری کرا دینا چاہئے کہ تاریخی ریکارڈوں کی مزید چھان بین ممنوع ہے۔ جیسا کہ یورپ میں کلیسا نے سائنسدانوں کے خلاف کیا تھا۔ مگر پھر اس کا انجام بھی وہی ہو گا جو کلیسا نے یورپ میں بھگتا۔ ؎

الحذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

بزرگوں اور دوستوں سے گزارش ہے کہ اپنے جذباتی خیالات یا بزرگوں کی معلومات وخیالات اور عقیدے میں فرق کریں۔ دونوں چیزوں کو گڈمڈ نہ کریں۔ اور دوسرے یہ کہ حق اور صواب کی اجارہ داری کا ذہن یہ حق اور صواب کیلئے سب سے زیادہ خطرناک ذہن ہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

[1،2] المرتضیٰ (دوسرا ایڈیشن) صفحہ ۱۴

اموی دَورِ حکومت کا تاریخی تجزیہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے ساتھ۔ السابقون الاولون۔ کا دورِ اقتدار ختم ہوتا ہے اور اب عربوں کی قومی حکومت شروع ہوتی ہے، جب اسلام کی تحریک کی حفاظت عربوں نے اپنا قومی مسئلہ بنا لیا تو ظاہر ہے کہ اسلام سے پہلے قریش کے جس خاندان کے ہاتھ میں اقتدار تھا وہ برسرِ عروج ہوتا، یہی وجہ ہے کہ عربوں کی قومی حکومت کی قیادت بنو امیہ کو ملی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ مسلمان عربوں کی قومی حکومت کا بہترین نمونہ تھی اور اس میں شک نہیں کہ وہ مسلمان عربوں کے بہت بڑے آدمی تھے، عام عربوں کا رجحان بنو ہاشم کے مقابلہ میں امویوں کی طرف زیادہ تھا اور اسکے اپنے اسباب ہیں، خلافت راشدہ کے بعد امویوں کا اقتدار میں آنا، اموی دور اسلام کی بین الاقوامی تحریک کے ارتقاء کی ایک لازمی کڑی کا حکم رکھتا ہے۔ ہمارے تاریخ نگاروں نے بنو امیہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور بنو امیہ کے سیاسی مخالفوں نے بھی جو بعد میں ان کے تخت و تاج کے وارث بنے انھیں بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا پہلے ہم بھی بنو امیہ کے خلاف اپنے مؤرخوں کی باتیں پڑھ کر متاثر ہو جاتے تھے لیکن اب جو ہم نے دنیا کی انقلابی تحریکوں کا بغور مطالعہ کیا اور ایک انقلابی تحریک کو جن جن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے ان کو جانا تو ہم پر اس دور کی اصل حقیقت واضح ہو گئی۔

ہم نے بنو امیہ کی غلطیوں کو تو خوب اچھالا لیکن ان کی حکومت کی جو اچھائیاں تھیں ان کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیا بیشک امویوں نے اسلامی حکومت کو قومی اور عربی رنگ دیا لیکن انھوں نے اسلام کے بین الاقوامی فکر کو اپنی حکومت کے تابع نہ بنایا، چنانچہ عہدِ اموی میں اسلام کا سیاسی مرکز دمشق تھا لیکن ذہنی اور علمی مرکز مدینہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی فکر کی بین الاقوامیت بحال رہی۔

مولانا عبید اللہ سندھی

بہ شکریہ ماہنامہ "دار العلوم" دیو بند (ستمبر ۱۹۸۲ء)

مختلف موضوعات پر چند کتب

ہمارے یہاں اپنی مطبوعات کے علاوہ دوسرے اداروں کی بہت سی مطبوعات ہمہ وقت موجود رہتی ہیں، ان صفحات میں ہم ان میں سے انتخاب کر کے کچھ کتابوں کی فہرست شائع کر رہے ہیں۔ ہمارے اسٹاک کی تمام کتب کے بارے میں جاننے کے خواہشمند حضرات ہماری تفصیلی فہرست کتب طلب فرمائیں ــــــ

ہماری مطبوعات کے نام اور قیمتیں آپ اس شمارے کے ٹائٹل کے صفحات پر ملاحظہ فرما سکتے ہیں

اسلام مکمل دین مستقل تہذیب	40.00	حیات مولانا گیلانی رح	48-00	احیاء العلوم اشرفی مکمل ۴ جلدیں	600/
ام الکتاب	40-00	خینیت عصر حاضر کا عظیم فتنہ	15-00	اللہ کا پیغام بنی نوع انسان کے نام	20/
اسلامی قانون	50-00	خطبات الاحکام	36-00	اسلامی ثقافت	65/
آپ بیتی حضرت شیخ الحدیث مکمل	65-00	راہِ سنت	45-00	اصح السیر	60/
ایک منٹ کا مدرسہ	25-00	رسول اکرم کا طریقۂ نماز	50-00	بہشتی زیور کامل (تاج)	90/
اتباع سنت اور عشقِ رسول	15-00	سیرت خلفائے راشدین	25-00	بہشتی زیور مدنی	80/
اسلام اور عصری مسلمان	7-00	شمائل ترمذی	50-00	تاریخ مظاہر مکمل	60/
اسلام میں علم کا مقام	30-00	شرقِ اوسط کی ڈائری	50-00	تذکرۃ الرشید	130/
اسلام کا قانون طلاق	20-00	صفائی معاملات	8-00	تفسیر ابن کثیر مکمل	475/
اسلام میں زکوٰۃ کا نظام	3-00	عرب اور اسلام میں ہندوستان کا حصہ	50-00	تفسیر معارف القرآن مکمل ۸ جلدیں	700/
اجتہاد و تقلید کا آخری فیصلہ	16-00	فضائل استغفار	5-00	تفسیر معارف القرآن خورد	500/
اکابر کا رمضان	31-00	فیضانِ محبت	23-00	تفسیر حقانی مکمل	490/
انسان اور اس کا مستقبل	12-00	فیضانِ نسیم	25-00	تفسیر بیان القرآن	400/

آداب افتاء، واستفتاء	20-00	فتنۂ جہیز	20-00	ترمذی شریف مترجم	26-00
اکمال الشیم	30-00	قرآنی تقریریں	15-00	سنن ابوداؤد شریف مترجم	290-00
اغلاط العوام	35-00	کانوینٹ کی تعلیم اور مسلم بچے	16-00	سنن ابن ماجہ شریف مترجم	190-00
بدعات محرم اور تعزیہ داری	8-00	معارف شیخ جلد اول	15-00	سنن نسائی شریف مترجم	290-00
بینک انشورنش اور سرکاری قرضے	22-00	محبت الٰہی اور نفس	35-00	سفر حجاز	50/
تمباکو زہر قاتل	20-00	مکتوبات ماجدی جلد اول	40-00	سیاحت ماجدی	40-00
تعبیر نامۂ خواب	20-00	مکتوبات ماجدی جلد دوم	50-00	قاموس القرآن	55-00
تقیہ کی حقیقت	20-00	مودودی صاحب اکابر امت کی نظر میں	23-00	حیات امام ابوحنیفہؒ	60/
تاریخ کی مظلوم شخصیتیں	50-00	مستند طب نبویؐ	20-00	سیرت ائمہ اربعہ	50/
تبلیغ دین محشی	30-00	مذہب شیعہ کے بنیادی چالیس عقیدے	6	قرآن ایک نظر میں	60/
تعارف مذہب شیعہ	25-00	مکتوبات سلیمانی	12-00	کمالات اشرفیہ	11/
تقویۃ الایمان	50-00	مقدس آیات	25-00	کتاب الروح	60/
تقویۃ الایمان (محشی علی میاں)	20-00	مکتوبات اکابر دیوبند	20-00	کلیات امدادیہ	30/
چند سوانحی تحریریں	6-00	نفحۂ عنبریہ	10-00	مکاتیب رشیدیہ	21/
حکیم الامت	6-00	نصف صدی قبل کا سفرنامۂ حج	20-00	مکاتیب رسول	15/
حب رسول	4-00	اسوۂ رسول اکرمؐ	60-00	مصباح اللغات	180/
حیات عبدالحیؒ	45-00	القاموس الجدید عربی اردو	35-00	ذکر اشرف	6-00
حکیم الامت۔ نقوش تاثرات	00	القاموس الجدید اردو عربی	45-00	رسول اللہؐ کی سنتیں	7-00
المنطق	2-00	ضمیمہ القاموس الجدید عربی لغات		رسول اللہؐ کی پچپن وصیتیں	6-00
الفلسفہ	3-00	تحقیقی جائزہ یا توحید کا نغمہ	35-00	روح	3-00
آسان تجوید	1-75	تقریر سیکھئے	30-00	رفیق سفر	4-00

اسلامی معاشرت	10-00	تعلیم المتعلم عربی	7-50	زلزلہ در زلزلہ	15-00
اصلاح المسلمین	10-00	تنقید انبیاء و طعنِ صحابہؓ	8-00	سیرت حضرت یوسفؑ	20-00
اصلاح المسلمین اوّل	6-00	تقریر کیجئے	3-00	سیرت طیبہ	30-00
اسلام میں عورت کا مقام	12-00	تقریر ایسے کیجئے اول دوم	22-00	اسمارٹ اردو انگلش لیٹر رائٹر	8-00
اُمت کی مائیں	10-00	تاریخ حسین رضؓ	20-00		
اسلامی عقیدے	6-00	تقدیر کیا ہے	23-00	اسمارٹ اردو انگلش ٹیچر	25-00
اصلاحِ نیت	8-00	تیسیر المبتدی	3-00	شمائل ترمذی خصائل نبویؐ	30-00
ارکانِ نماز	4-00	تحریکِ ایمان	3-50	شیخ عبدالقادر جیلانیؒ	8-00
اسلام کے چار رکن	8-00	جدید عربی لغات	35-00	شکار	30-00
اصولِ تبلیغ	8-00	عربی اردو، اردو عربی		شرح بیسک ریڈر سوم	20-00
اسلامی حکومت کی کہانی	5-00	چہل حدیث مع ادعیہ	2-00	شرح بیسک ریڈر چہارم	2-00
الیس منکم رجل رشید	10-00	حج و عمرہ	22-00	شرح بیسک ریڈر پنجم	2-00
اسلام میں اہانتِ رسول کی سزا	10-00	حق نما	3-00	طریقہ حج	10-00
اصلاحی تقریریں	8-00	حضرت شیخ کے وصال کے بعد	4-00	طریقہ حج (تاج کمپنی)	15-00
اسلامی سیاست	25-00	حصن حصین	26-00	عورت اور پردہ	5-00
آداب الشیخ والمرید	5-00	حیوٰۃ المسلمین	25-00	مفتاح القرآن اوّل	3-00
اسلامی آداب	5-00	حیاتُ المسلمین	15-00	مفتاح القرآن دوم	4-00
ایک تبلیغی جماعت کی کارگزاری	6-00	حضرت تھانویؒ اور اعلیٰ حضرت	9-00	مفتاح القرآن سوم	6-00
اسلام اور سائنس	6-00	" حسن بصریؒ	3-50	مفتاح القرآن چہارم	7-00
احکام المیت	2-00	حقوقِ زوجین	10-00	مفتاح القرآن پنجم	8-00
اصولِ فارسی اوّل دوم	7-50	حج کی شرعی حیثیت	3-00	تعلیم الصلوٰۃ	6-00

آئینۂ نماز 10-00
آئینۂ نماز مجلد 12-00
بدعتی ملاؤں کے ہتھکنڈے 3-00
شرح بانگِ درا 60-00
تقلید اور اجتہاد 14-00
تراویح کی بیس رکعات یا آٹھ 6-50
المرتضیٰ 60-00
ارکانِ اربعہ 45-00
انسانی دنیا پر مسلمانوں کا عروج و زوال کا 42-00
انسانی علوم کے میدان میں 12-00
اسلامی مزاج و ماحول کی تشکیل میں 5-00
اسلامیات اور مغربی مستشرقین 10-00
اسلام اور غیر اسلامی تہذیب 22-00
اسلامی فکر و تہذیب کا اثر 6-00
انسانیت کے محسنِ اعظم 6-00
آئندہ نسلوں کے ایمان کی حفاظت کی ذمہ داری 4-00
اسلام مکمل دین مستقل تہذیب 4-00
اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں 4-00

سیرۃ الفقہ 3-50
حقوق الوالدین 12-00
حیاۃ النبیؐ 4-50
حقوق الوالدین 7-00
خلاصہ و تسہیل قصد السبیل 5-00
خواتین کا حج و عمرہ 12-00
خواب نامہ مع تعبیر نامہ 3-50
دیارِ حبیبؐ 25-00
دینِ حق اور علمائے ربانی 4-00
دوا اور دعا سے علاج 6-00
ذکر النبیؐ 8-00
تاریخ ندوۃ العلماء اول و دوم 72-00
ترکی کی مجاہد ملت اسلامی 4-00
تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب 20-00
تحفۂ کشمیر 12-00
تحفۂ مشرق 6-00
تحقیق و انصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ 6-00
تہذیب و تمدن 18-00
اسلام کے اثرات و احسانات
تحفۂ دین و دانش عام 12-00

نماز کے بعد اجتماعی دعا 7-00
نکاح، جہیز، بارات 5-00
ہادیٔ اعظم 7-50
ولادتِ نبویؐ 9-00
ہماری دعا قبول کیوں نہیں ہوتی 12-00
ہندوستان اور نظامِ قضا 6-00
ہدیۃ النساء 5-00
علم جدید کا چیلنج 28-00
عالم عربی کا المیہ 22-00
طوفان سے ساحل تک 30-00
علم کا مقام اور اہل علم کی ذمہ داری 2-00
عصر جدید کا چیلنج اور اس کا جواب 6-00
عصر حاضر میں دین کی تفہیم 12-00
عربی میں نعتیہ کلام 15-00
فسادات اور ہندوستانی مسلمان 3-00
قادیانیت تحلیل و تجزیہ 26-00
قادیانیت 6-00
کاروانِ مدینہ اعلیٰ 22-00
مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت 35-00

پندرہویں صدی ہجری ایک تاریخی جائزہ 5-00
پرانے چراغ اول دوم 70-00
تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک 20-00
تاریخ دعوت و عزیمت اول 55-00
〃 〃 دوم 50-00
〃 〃 سوم 40-00
〃 〃 چہارم 35-00
پنجم اعلیٰ 60-00
〃 〃 عام 35-00
مولانا فضل رحمن گنج مرادآبادی 20-00
مولانا الیاسؒ اور انکی دینی دعوت 20-00
اشرفی نماز مترجم 2-50
امت مسلمہ کی مائیں 15-00
جماعت تبلیغ پر اعتراضات 20-00
حیاۃ الصحابہؓ اول 80-00
〃 〃 دوم 90-00
〃 〃 سوم 90-00
رسول اللہ کی صاحبزادیاں 11-00
فضائل درود شریف 15-00
فضائل ذکر عکسی 16-00

تحفۂ دین و دانش اعلیٰ 16-00
جب ایمان کی بہار آئی 20-00
جزیرۃ العرب 35-00
دریائے کابل سے دریائے یرموک تک 32-00
دستور حیات 28-00
دو مہینے امریکہ میں 40-00
سیرت سید احمد شہیدؒ اول دوم 110-00
مشرق اوسط کی ڈائری 45-00
فضائل رمضان 8-00
فضائل قرآن مجید 11-00
فضائل مسواک 11-00
مسلم خواتین کے لئے بیس سبق 11-00
مسلمان بیوی 5-00
مسلمان خاوند غیر مجلد 90-00
مکاتیب مولانا الیاسؒ 18-00
مسنون دعائیں 8-00
مرنے کے بعد کیا ہوگا 25-00
مسنون و مقبول دعائیں 4-00
نماز کامل 8-00
نماز مترجم مکمل عکسی 1-75
نماز مترجم مکمل عکسی کلاں 4-00

معرکۂ ایمان و مادیت 19-00
منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین 30-00
مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں 22-00
مذہب و تمدن 15-00
مقالات سیرت 30-00
مذہب اور سائنس 50-00
معاشرتی مسائل 30-00
مسیحیت تاریخی حقائق و معلومات 22-00
مسلم پرسنل لا اور اس کا عائلی نظام 30-00
نبی رحمت 100/-
نئی دنیا امریکہ میں -00
صاف صاف باتیں
نقوش اقبال 0-00
ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں -00
یاد ایام -00
فضائل اعمال اول -00
فضائل اعمال دوم -00
فضائل تبلیغ 00
فضائل توبہ و استغفار 00
فضائل تہجد 00

ہندی زبان میں اسلامی کتب

اسلام اور سائنس	6-00	تعلیم الاسلام	20-00	رمضان کی باتیں	15-00
مسائل رمضان و زکوٰۃ	2-00	ہندی اردو ٹیچر	4-00	چھ باتیں عکسی	5-50
ہندی بال پتک	5-00	ہماری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتی؟	12-00	اسلام اور چھوت چھات	4-00
رحمتِ عالم	16-00	ایک تبلیغی جماعت کی کارگزاری	6-00	تجہیز و تکفین کے احکام	6-00
حج کی باتیں	12-00	اعمالِ قرآنی	15-00	ارکانِ نماز	4-00
میاں بیوی کے حقوق	5-00	حضرت محمدؐ	12-00	حج و عمرہ	24-00
رسول اللہ کی جیونی	10-00	دانش پہاڑہ	00-50	قیامت کب آئیگی؟	10-00
رسول اللہ کی دعائیں	12-00	رسولِ اکرمؐ	2-00	میری نماز	10-00
رسول اللہ کی نعتیں و سلام	10-00	مسلمان خاوند	10-00	جنت کی کنجی	27-00
مانوتا کا استر	6-00	اسلام میں پردے کی حقیقت	5-00	مرنے کے بعد کیا ہوگا	32-00
ارکانِ اسلام	12-00	مسلمان بیوی	7-00	احوالِ برزخ	8-00
موت کی یاد ہندی	8-00	مانوتا کا سندیش	8-00	دانش بہشتی زیور	30-00
آدرش شاسک	10-00	ہندی بال پستک و شکا	4-00	رسول اللہ کے تین سو معجزات	15-00
اچھے اچھے نام اللہ کے	5-00	پھلوں سے علاج	10-00	فضائل درود شریف	25-00
نشانِ راہ	4-00	سبزیوں سے علاج	10-00	مدینہ کی ڈگر	15-00
جگ کے محسن	4-00	عکسی پارۂ عم مترجم	5-00	بہشتی زیور مکمل عکسی	65-00
اسلام مکمل دین مستقل تہذیب	5-00	پنجسورہ شریف	10-00	فضائل اعمال ہندی { اول / دوم	75-00 / 100-00
آئینہ نماز	10-00	سورۂ یٰسین	2-00	فضائل صدقات	75-00

ملنے کا پتہ: الفرقان بکڈپو ۱۱۴/۳۱ نظیر آباد لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

ھمارى مطبوعات

از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

تجلیات ربانی ۔ تلخیص وترجمہ مکتوبات مجدد الف ثانیؒ

جلد اول .. .. ./۴۰

" دوم .. .. ./۳۰

مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ عکسی ایڈیشن ۔ .. .. ./۵۰

تذکرہ خواجہ باقی باللہؒ .. ../۲۰

تذکرہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ .. .. (زیر طبع)

وصایا شیخ شہاب الدین سہروردیؒ .. ../۴

قافلۂ اہل دل .. ../۳۰

تذکرہ شاہ عبدالرحیم وابوالرضا دہلویؒ .. ../۱۶

تذکرہ شاہ ابوسعید حسنیؒ اور سلسلۂ ولی اللہی کا ایک گمنام درویش ./۱۲

تذکرہ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ .. ../۱۹

از مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

واقعۂ کربلا اور اُس کا پس منظر ــ ایک نئے مطالعہ کی روشنی میں

۱۶ ماہ کے مختصر عرصہ میں دوسرا ایڈیشن شائع ہوگیا

" قسم اعلیٰ ./۶۰ قسم عام .. ./۴۰

انقلاب ایران اور اُس کی اسلامیت .. ../۱۵

دیگر مصنفین کرام کی تصانیف

صحبتے با اہل دل .. .. از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی .. .. ./۵۲

رہنمائے تلاوت یا قرآن کریم کی بیسک ریڈر

از جناب سید محمود حسن صاحب .. ./۱۸

بریلوی فتنہ کا نیا روپ .. از مولانا محمد عارف سنبھلی .. ./۲۰

تاریخ میلاد .. از مولانا عبدالشکور مرزاپوری مرحوم ./۱۸

دربار نبوت کی حاضری .. از مولانا مناظر احسن گیلانی .. ./۸

معمولات یومیہ .. .. از حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ .. ۳/۵

صبح وشام کی دعائیں .. از مولانا عبدالغفور عباسی .. ./۴

انیس نسواں .. .. از بیگم اصغر حسین صاحبہ .. ./۸

احکام نماز .. ../۲

مکتبۂ الفرقان لکھنؤ کی خاص اشاعتوں کے کتابی ایڈیشن

تذکرۂ حضرت جی مولانا محمد یوسفؒ .. ../۲۶

تذکرۂ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ دوم .. ../۲۵

تذکرۂ مولانا نسیم احمد فریدیؒ ./۳۰

ساتھ میں مولانا ابوالحسن زید دہلوی کی کتاب

"مولانا اسمٰعیل دہلوی اور تقویۃ الایمان" پر تبصرہ مع پیش لفظ و تکملہ

اور مناظرۂ جامع مسجد دہلی (۱۲۴۰ھ) کی روداد بھی۔

خمینی اور اثنا عشریہ کے بارے میں علمائے کرام کا متفقہ فیصلہ ۴/

مکمل ۲ جلد ۴۵/

ہمارے یہاں دوسرے بہت سے اداروں کی مطبوعات بھی ہمہ وقت موجود رہتی ہیں انکے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کیلئے ہماری مکمل فہرست کتب طلب فرمائیں۔

ناظم۔ الفرقان بکڈپو لکھنؤ

ملنے کا پتہ: الفرقان بکڈپو نظیرآباد (۳۱ نیا گاؤں مغربی) لکھنؤ ۱۸

Regd. No. LW/NP-62 Vol. 60 No 11 12

ALFURQAN MONTHLY

31, NAYA GAON WEST, LUCKNOW-226018

Phone 245547 NOVEMBER : 1992 DECEMBER

Only Cover Printed at : Classic Printers, Khayaliganj, Lucknow-18